رجسٹرڈ نمبر ایل ۱۶۱

زمانہ

مرتبہ : دیا نراین نگم بی ۔ اے

نمبر ۱	جولائی سنہ ۱۹۳۴ء	جلد ۶۳

فہرست مضامین

تصاویر* : مسٹر ہیری ہیگ آئندہ گورنر صوبہ متحدہ آگرہ و اودھ ۔ سر شیخ عبد القادر مع لیڈی صاحبہ ۔ مسٹر راس مسعود

* (پچھلے مہینہ تصاویر وقت پر تیار نہ ہو سکی تھیں ۔ اس لئے اس مرتبہ نذر کی جاتی ہیں)

زمانہ پریس کانپور سے شائع ہوا

قیمت سالانہ ممالک غیر سے ۔ ششماہی ، ہندوستان کیلئے ششماہی ،

چندہ سالانہ [illegible]

قیمت فی پرچہ [illegible]

شائع ہوگئی　　　　شائع ہوگئی

قوم کی آواز

یعنے

مہاتما گاندھی کی نئی کتاب

اُن تقریروں کا مجموعہ جو گاندھی جی نے گول میز کانفرنس میں کیں اور لندن کے سفر کے حالات ۔ ہندوستانیوں کے حقیقی جذبات و خیالات کا آئینہ ۔ انگلستان کے مختلف طبقے اور مختلف خیالات کے لوگوں سے مہاتما جی کی ملاقات کا ذکر ۔ اس کتاب سے آپ کو ہندوستان اور انگلستان کے آئندہ سیاسی و معاشرتی تعلقات کی رفتار کا اندازہ ہوگا

ضخامت تقریباً چار سو صفحات شروع میں مہاتما جی کا ایک نیا فوٹو

قیمت صرف ڈیڑھ روپیہ عہ

تلاشِ حق

یعنی مہاتما جی کی آپ بیتی ۔ بچپن سے لیکر تحریک ترک موالات تک تمام حالات ۔ قیمتی تجربات اور وہ سب مراحل جو حق کی تلاش میں انھیں پیش آئے

سادہ ۔ دلکش زبان ۔

ضخامت سات سو صفحات سے زیادہ ۔ متعدد تصاویر

قیمت قسم اول (دونوں حصے) دو روپے

قسم دوم (دونوں حصے) ایک روپیہ

مکتبۂ جامعۂ ملیہ دہلی

فہرست مضامین "زمانہ" جلد ۶۳ جولائی لغایتہ دسمبر ۱۹۳۴ء

تصاویر۔ ہز اکسیلنسی سر ہیری ہیگ گورنر صوبۂ متحدہ۔ سر شیخ عبد القادر ممبر انڈیا کونسل۔ حج کبیلدی صاحب۔ سر راس مسعود وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی علیگڈھ۔ فیلڈ مارشل فان ہنڈنبرگ۔ سرور جہان آبادی۔ مسٹر اے پی سین۔ جناب رونق دہلوی۔ چودھری جگت موہن لال رواں مرحوم۔ بابو راجیندر پرشاد صدر کانگریس۔ مسٹر اے۔ ایچ۔ میکنزی سابق ڈائرکٹر سررشتۂ تعلیم صوبۂ متحدہ۔

حصہ نثر

حصۂ نظم



سر هیری هیگ هوم ممبر گورنمنٹ هند و آینده گورنر
صوبه متحده آگره و اوده

زمانہ

جلد ۶۳ جولائی ۱۹۳۴ء نمبر ۱

اسکندر اعظم کا ہندوستانی بیڑا

(از محمد یعقوب خاں صاحب کلام بی۔اے)

۳۳۴ء قبل مسیح مغرب کی جانب سے ایک بے پناہ سرخ وسفید آندھی اٹھی جس نے ایشیائے کوچک کے سواحل سے لیکر ہندوستان میں دریائے ستلج اور جنوب میں مصر سے لیکر شمال میں ترکستان تک تمام بلادِ مشرق کو تہ وبالا اور برباد کر دیا۔ اس آندھی کے تند وتیز جھونکوں میں صدہا فرمانرواؤں کے تخت وتاج اڑ گئے، صدہا فلک بوس محل زمین دوز ہو گئے، لاکھوں بندگان خدا پیوند خاک ہو گئے۔ یہ آندھی اسکندر اعظم کی ستر ہزار فوج کا ایشیا پر حملہ تھا۔

ایران، توران اور ترکستان کو فتح کرنے کے بعد سکندر اعظم نے ہندوستان پر حملہ کرنے کی غرض سے اپنی فوجوں کو از سر نو ترتیب دیا اور ان کو ہر طرح سے کیل کانٹے سے درست کر دیا۔ اس لشکر کی نسبت جسمیں چالیس ہزار تجربہ کار سپاہی بہترین اسلحہ جنگ سے آراستہ اور سر سے پاؤں تک دریائے آہن میں غرق تھے۔ قدیم مورخین نے لکھا ہے کہ "لشکر کیا تھا ایک چلتی پھرتی ریاست تھی"۔

اس لشکر کا اہم ترین جزو گھوڑے چڑھی فوج تھی جس میں زیادہ تر مقدونیہ کے شریف زادے بھرتی کئے گئے تھے اسکا کچھ حصہ جسمیں عجمی امیر زادے بھی تھے خاص اسکندر اعظم کی کمان میں رہتا تھا۔ اس کا بقیہ حصہ چار رسالوں میں منقسم تھا اور ہر رسالہ ایک جنرل کے ماتحت تھا۔ بعد میں ایک پانچواں رسالہ ہندوستان میں بھرتی کیا گیا تھا۔

پیادہ فوج دس بٹالین پر مشتمل جنرل سلوکس[1] کے ماتحت تھی، اس فوج میں جزیرہ کریٹ کے تیر انداز قبرص کے برقنداز، باختر، توران، خوارزم اور خراسان وغیرہ کے شمشیرزن تھے، انھیں میں ایک بٹالین کا کمانڈر نیارخس (Nearchus) تھا جو آئندہ چلکر اسکندر اعظم کے ہندوستانی بیڑے کا امیر البحر بنا اور جو ہمارے اس مضمون کا ہیرو ہے۔

ان کے علاوہ ادیبوں، حکیموں، انجینیروں، جغرافیہ دانوں، چاہ اندازوں، سرویروں، ماہرین نباتات سفر مینا، شاگرد پیشہ لوگوں کا ایک جم غفیر ساتھ تھا، ایک چھوٹی سی کمپنی نوعمر شریف زادوں کی بھی تھی جنھیں فنون سپہگری سکھاکر فوجی افسر بنانا مقصود تھا، یہی اسکندر اعظم کے ذاتی محافظ یا باڈی گارڈ تھے

اس زبردست فوج کے ساتھ سکندر ہندوکش کے دروں سے ہوتا ہوا ہندوستان کی طرف آیا اس نے لشکر کے تین حصے کئے۔ ایک حصہ جنرل بردیقاس[2] اور دوسرا جنرل ہیفیسٹیون[3] کی ماتحتی میں بطور مقدمۃ الجیش بڑھا اور ولایت الئے تا جور، صوات اور بنیر کو فتح کرتا ہوا پشاور کے قریب چارسدہ تک پہونچگیا۔ تیسرا حصہ لیکر خود سکندر بڑھا اور دریائے کابل کی وادیوں کو پامال کرتا ہوا اٹک کے کنارہ تک پہونچگیا۔ اس تمام مہم میں صرف پیر سر[4] کی جنگ مشہور ہے جہاں بالائی صوات کے باشندوں نے سکندر کی فوجوں کا غیر معمولی بہادری کے ساتھ مقابلہ کیا بہرحال میدان یونانیوں کے ہاتھ رہا۔

اسی اثنا میں یونانی جرنیلوں نے شہر اٹک سے سولہ میل جانب شمال مقام اوہند[5] میں دریائے سندھ پر ایک مضبوط پل تعمیر کرلیا جس کے ذریعہ سے ۳۲۶ قبل مسیح سکندر اعظم اور اسکی فوجیں ہندوستان میں داخل ہوگئیں۔

اس زمانہ میں پنجاب میں تین قابل ذکر ریاستیں قائم تھیں یعنی ریاست امبھی[6] جو دریائے سندھ اور جہلم[7] کے درمیان واقع تھی۔ اس کی راجدھانی پشاور کے قریب مقام ٹکشاشلا[8] میں تھی۔ اس کا راجہ پہلے ہی اسکندر اعظم سے ملگیا تھا۔ اسی کی کوششوں سے دریائے سندھ پر کشتیوں کا پل تعمیر ہوا۔ دوسری ریاست جہلم اور چناب کے درمیان پورا[9] راجہ کی تھی، تیسری ریاست جانب شمال کشمیر سے ملی ہوئی ابھیسار کی تھی۔

چونکہ امبھی کے راجہ کی پورا راجہ سے دشمنی تھی اس لئے اس نے سکندر کو اپنے علاقہ میں سے گذرنے کی اجازت دینے کے علاوہ اس کی ہر طرح سے مدد کی۔ ادھر ابھیسار نے پورا راجہ کی کوئی مدد نہ کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ پورا راجہ کو شکست فاش ہوئی جس کی وجہ سے اسے سکندر کی اطاعت قبول کرنا پڑی۔ اس کے بعد

---

[1] Seleucus [2] Perdiccas [3] Hephaestion [4] اسے یونانی زبان میں Aornus لکھا ہے۔

[5] Ohind [6] Omphis یونانی [7] Hydaspes یونانی [8] Taxila جسے اب سر جان مارشل نے کھود نکالا ہے

[9] یونانی Porus اور چناب کو یونانی میں Acesines کہتے ہیں۔ یونانی Abisares ماخوذ از ترجمہ انگریزی مترجمہ اسٹین۔

سکندر پہاڑوں کے راستے سے ہوتا ہوا مشرق کی طرف بڑھا اور دریائے راوی[۱] کو عبور کر کے دیگر شہروں اور قصبوں پر چھاپہ مارنا شروع کر دیا۔ اس وادی کے باشندوں نے یونانیوں کا زور و شور سے مقابلہ کیا مگر بالآخر مغلوب ہو گئے۔

رفتہ رفتہ سکندر کی فوجیں دریائے بیاس[۲] کے کنارے گورداسپور تک پہونچ گئیں اور سکندر نے مشرق کی طرف مزید مہم بھیجنے کا ارادہ کیا اور کچھ سپاہ کو دریائے ستلج[۳] کے پار جانے کا حکم دیا لیکن چونکہ یونانی سپاہیوں کا لڑتے لڑتے دل گھبرا گیا تھا اس لئے اُنھوں نے آگے بڑھنے سے قطعی انکار کر دیا اور واپسی کا تقاضا کیا۔ اس واقعہ سے سکندر اعظم کو اتنا صدمہ ہوا کہ وہ دو روز تک اپنے خیمہ سے باہر نہیں نکلا، معلوم ہوتا تھا کہ اس کے تمام منصوبے خاک میں مل گئے اور اُسکی امیدوں پر پانی پھر گیا۔

جب سکندر اعظم اپنی فوج سے مجبور ہو گیا تو اُسے ایک نئی بات یہ سوجھی کہ خلیج فارس کے ساحل کی پیمائش کر کے یونانی نو آبادیاں قائم کی جائیں، چنانچہ تیسرے روز اُس نے اپنے خیمہ سے برآمد ہو کر لشکر کی واپسی کے ارادہ کا اعلان کر دیا۔ اسی کے ساتھ اُس نے دریا کے کنارے ایک درجن الطارین تعمیر کرانے کا حکم دیا۔ اس طرح اُس نے اپنی پیشقدمی کی حد مقرر کر دی۔ بہر نوع دیوتاؤں کی پوجا کرنیکے بعد اُس نے اپنی فوج کو دریائے جہلم تک واپس جانے کا حکم دیدیا، اور یہاں اس نے کوہستان کشمیر کے جنگلوں سے دریائے جہلم کے راستے چیل، دیودار کٹوا کر منگوائے اور بیڑہ تیار کرایا، جس میں کشتیوں کے علاوہ بہت سے چھوٹے چھوٹے جنگی جہاز بھی تھے جن میں ہر طرف پندرہ پندرہ چپو کام کرتے تھے۔

جہلم دریائے سندھ کا معاون ہے اور سندھ کو سکندر مصر کے دریائے نیل کا بالائی حصہ[۴] خیال کرتا تھا، کیونکہ اُس نے مصر میں دریائے نیل کے کنارے جیسے مگرمچھ دیکھے ویسے ہی اُسے سندھ کے کنارے نظر آئے۔ اور جس قسم کی سیم اُس نے مصر میں دیکھی تھی اسی قسم کی بیلیں اسے پنجاب کے دریاؤں کے کنارے دکھائی دیں۔ اِن دریاؤں کے قریب کے علاقے کی آب و ہوا بھی مصر سے ملتی جلتی تھی، بہر حال انھیں باتوں سے اُسے مغالطہ ہوا مگر اس کا نتیجہ بالآخر اچھا ہی نکلا

---

[۱] یونانی Hydraotes [۲] Hyphasis [۳] Zaradrus

[۴] سکندر کے زمانہ میں یونانیوں کو شمالی، وسطی و مشرقی ایشیا اور ہندوستان کا کوئی حال معلوم نہ تھا۔ نہ وہ جمنا سے واقف تھے نہ گنگا سے۔ وہ صرف یہ جانتے تھے کہ ہندوستان ایک جزیرہ نما ہے جو سلطنت داریوس (Darius) سے ملحق مشرقی سمندر تک چلا گیا ہے وہ بحیرۂ خوارزم (Sea of Aral) کو سمندر اور بحر عرب کو ایک بڑی جھیل سمجھتے تھے۔ ان کے نزدیک ہندوستان کا سرا ملک حبش سے ملا ہوا تھا اور وہ دریائے سندھ کو دریائے نیل کا بالائی حصہ خیال کرتے تھے۔

اس بیڑے میں جو دریائے جہلم میں سکندر نے تیار کیا اسی جنگی جہاز اور بہت سے بار برداری سامان جنگ اور رسد کے جہاز تھے۔ سب جہازوں اور کشتیوں کی تعداد دو ہزار کے قریب خیال کیجاتی ہے اب سکندر کو یہ فکر ہوئی کہ کس شخص کو اس عظیم الشان بیڑے کا امیر البحر بنائے، سوچتے سوچتے اسے اپنے دوست نیارخس کی یاد آئی جو جنرل سلوکس کی فوج میں ایک پلٹن کا سردار اور ایشیائے کوچک میں ایک ولایت کا صوبیدار تھا۔ فوراً اسکی طلبی کے لئے ایک حکمنامہ روانہ کر دیا گیا۔ نیارخس نے اس حکم کو پاتے ہی تعمیل کی اور اپنے صوبہ کی حکومت ایک دوسرے افسر کے سپرد کر کے اور فنیقیہ ساحل شام، جزیرہ قریطش، جزیرۂ قبرص اور مصر کے کثیر التعداد دریا اور جہاز رانوں کو ساتھ لیکر سکندر کے سامنے ہندوستان میں حاضر ہو گیا۔

سنہ ۳۲۶ ق م۔ نومبر کا مہینہ اور طلوع آفتاب کا وقت تھا، باد شمال کے خوشگوار جھونکے روحوں کو تر و تازہ کر رہے تھے کہ دو ہزار جنگی جہازوں اور کشتیوں کا ایک عظیم الشان بیڑا دریائے جہلم کے صاف شفاف سینہ پر تیار ہوا۔ سکندر اعظم زرہ بکتر سے مسلح اور عجمی وضع کی خوش رنگ قبا پہنے شاہی جہاز کے عرشہ پر اپنے دوست آنیسقریطوس[1] کے پاس ہاتھ میں ایک طلائی جام شراب لئے کھڑا تھا۔ پہلے اس نے شراب کے قطرے دریا میں ٹپکائے اور مشہور یونانی بہادر ہرقلیس[2]، جنگی دیوتا آموں[3] وغیرہ کی پوجا کی۔ اس کے بعد نرسنگھے پھونکے گئے اور تمام بیڑے نے یکدم لنگر اٹھالیا۔

امیر البحر نیارخس اور سردار آنیسقریطوس دونوں نے اس اہم بحری سفر کے حالات قلمبند کئے تھے نیارخس ہی کے سفرنامہ سے جسے بہت معتبر سمجھا جاتا ہے کچھ حالات یونانی مورخ و مصنف ایریان[4] نے لئے تھے جنکی تصنیفات سے استفادہ کرتے ہوئے ہم اس بحری سیاحت کے بعض دلچسپ حالات ناظرین زمانہ کے نذر کر رہے ہیں۔

کہتے ہیں کہ جس وقت دو ہزار جہازوں اور کشتیوں کے اس عظیم الشان بیڑے نے لنگر اٹھایا تو ہزاروں کی تعداد میں ہندوستانی دریا کے کنارے کھڑے تماشا دیکھ رہے تھے، عجب پر جوش منظر تھا کچھ لوگ فرط مسرت سے ناچنے گانے لگے تھے۔ جہازوں کے طرح طرح کے جھنڈے اور آرائشی بیرقیں ہوا میں لہرا رہی تھیں۔ ایک کپتان نے اپنے جہاز کی آرائش و زیبائش میں دوسرے سے سبقت لیجانے کی کوشش کی تھی۔ امیر البحر نیارخس کے جہاز کا جھنڈا مشہور ملکہ قلوپطرہ[5] کے جہاز کا تھا جسمیں وہ اور جنرل انطونی[6] سوار ہو کر اکتیم کے بندرگاہ تک آئے تھے۔ اسی سے سکندر اعظم کے جہاز کی شوکت و عظمت کا اندازہ کیا جاسکتا ہے

---

[1] Onesicritus [2] Heracules [3] Ammon [4] Arrian [5] Cloopatra [6] Antony

غرض جہازوں کے گوناگوں جھنڈوں، بیرقوں، سپاہیوں کے بیار آئینوں اور تمام آلات جنگ پر طلوع ہونے والے آفتاب کی منور شعاعیں پڑ رہی تھیں۔ ہزاروں آدمیوں کی بھانت بھانت کی بولیاں، سپاہیوں کے ترانے، فوجی باجوں کے نغمے، گھوڑوں کے ہنہنانے اور کنارے والوں کے شوروغل سے کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی جس وقت ممالک بحیرۂ روم کے ملاح ایک خاص شان کے ساتھ دو طرفہ چپو چلاتے تھے تو دریا کا پانی اچھلکر عجب دلفریب کیفیت پیدا کرتا تھا۔ بیڑے کا ہر جہاز اور ہر کشتی ایک دوسرے سے مقررہ فاصلہ پر رواں تھی۔ اور کسی کی ترتیب میں بال برابر فرق نہ تھا۔

ان جہازوں میں سکندر اعظم کی کل آٹھ ہزار جرار فوج سوار تھی۔ باقی تمام لشکر مع بھیر و بنگاہ و سازو سامان دریا کے کنارے کنارے رواں تھا۔ داہنے کنارے کا سردار قراطیروس۔ بائیں کا جنرل ہیفیسٹیون اور عقب کا کمیدان فیلقوس تھا۔

جب یہ بیڑہ اس مقام پر پہونچا جہاں جہلم اور چناب کا سنگم ہے تو دریا کا پھاٹ تنگ ہونے کے باعث پانی کی روانی بہت تیز ہو گئی اور لہریں بلند ہو ہو کر تھپیڑے مارنے لگیں، دریا میں ایک تلاطم سا برپا ہو گیا جس سے ملاح بہت گھبرا گئے اور کشتی کھینا بھول گئے، چنانچہ بہت سے جہاز اور کشتیاں ڈانواڈول ہونے لگیں اور دو جنگی جہاز منجدھار میں ڈوب گئے۔ اس وقت شاہی جہاز بھی نہایت مخدوش حالت میں تھا۔ سکندر کے بہت سے ہمراہی اور افسر اس جہاز کی حالت مخدوش دیکھکر جان بچانیکی غرض سے پانی میں کود پڑے خود سکندر بھی دریا میں کودنے ہی والا تھا کہ اتنے میں اُسکے اقبال کا کرشمہ دیکھنے میں آیا۔ یعنی جہاز ریت کے ایک تودے پر جا ٹھہرا جو سطح آب کے نیچے تھا۔ اس وقت سکندر اور اس کے تمام ساتھیوں نے دیوتاؤں کی بھینٹ چڑھائی۔ اور اس مقام پر ایک الطار بھی بطور یادگار تعمیر کرائی۔ بہرنوع تمام بیڑہ از سر نو مرتب ہو کر آگے روانہ ہوا۔

جہلم اور راوی کے سنگم سے آگے بڑھکر سکندر کی آخری خونریز جنگ شروع ہوئی جس میں ہزارہا مخلوق کا بے ضرورت خون بہا۔ یہاں پر گوجروں اور جاٹوں کی بستیاں تھیں جو آزاد اور جنگجو تھے۔ چنانچہ ان لوگوں نے کناروں پر جمع ہو کر جہازوں پر ہزاروں تیر برسانے شروع کر دیے جس سے سکندر اور اُس کے ہمراہی بہت پریشان ہوئے، مجبوراً بیڑہ روک کر اور حملہ آوروں کا مقابلہ کر کے اُنھیں پسپا کر دیا۔ چنانچہ یہ لوگ فرار ہو کر ایک گڑھی میں پناہ گزین ہو گئے جس پر سکندر نے فوراً حملہ کرنیکا حکم دیا لیکن فوج کسی قدر ہچکچائی جس پر سکندر

Oxydracae ۔ Philiphos ۔ Hephaistion ۔ Craterus

Peucestas ۔ Leonnatus ۔ Malli

کے غیظ وغضب کی کوئی انتہا نہ رہی، اور وہ خود سیڑھی لگا کر قلعے کی فصیل پر چڑھ گیا۔ اس وقت اس کا ساتھ صرف لیونا توس اور پوسستاس نامی جانباز سپاہیوں نے دیا۔ سکندر کی جان خطرے میں دیکھکر ایک حولدار سیڑھی لگا کر فصیل پر چڑھ گیا، لیکن اسی اثنا میں دونوں سیڑھیاں ٹوٹ گئیں اور فصیل پر صرف سکندر اور اس کے یہی تین ساتھی کھڑے رہ گئے۔ مگر اس پر بھی سکندر نے ہمت نہ ہاری اور تلوار کھینچکر قلعہ کے اندر کود پڑا اور تن تنہا تیغ زنی کے جوہر دکھانے لگا، اسے دیکھکر تینوں اور ساتھی بھی بادشاہ کی مدد کے خیال سے کود پڑے جنمیں حولدار تو فوراً ہی قتل ہوگیا اور سکندر کے سینہ پر بھی ایک لمبا تیر لگا جو زرہ بکتر توڑتا ہوا سینہ میں پیوست ہوگیا۔ بقیہ ہر دو سردار اپنی جان ہتھیلی پر رکھکر سکندر کی حفاظت کرتے رہے کہ اتنے میں کل فوج قلعہ کا دروازہ توڑکر اندر گھس آئی اور اہل قلعہ کو گاجر مولی کی طرح کاٹکر پھینکنے لگی۔ سکندر کے بہت گہرا زخم لگا تھا جس کے صدمہ سے وہ بیہوش ہوگیا۔ اور اس قدر خون خارج ہوا کہ اسکا تمام جسم زرد پڑ گیا، اور یہی اس انجام کی ابتدا تھی جو بابل میں دیکھنے میں آیا۔

اس کے بعد جن مقامات کا سفرناموں میں ذکر کیا گیا ہے اُن کا آجکل کوئی پتہ نہیں چلتا۔ معلوم نہیں یہ مقامات امتداد زمانہ کے ہاتھوں مٹ گئے یا وقتاً فوقتاً دریاؤں کی دھار کا رخ بدل جانے سے کچھ کے کچھ ہوگئے۔

آخر ماہ جولائی ۳۲۵ ق.م میں سکندر کا بیڑہ پٹالہ پہونچا جو حیدرآباد سندھ کے قریب ہے اور جہاں سے دریائے سندھ کے دہانہ کا نشیبی علاقہ شروع ہوتا ہے اور اسکی دھار کئی شاخوں میں منقسم ہوجاتی ہے۔ سکندر کی آمد آمد سنکر پٹالہ کا راجہ فرار ہوگیا اور ملک کے باشندے بھی گھر چھوڑکر منتشر ہوگئے۔ یونانی مورخین نے اس راجہ کا نام موریس لکھا ہے۔

پٹالہ پہونچکر سکندر نے رعایا کے لئے معافی دینے کا اعلان کرادیا، جسکی وجہ سے اکثر لوگ اپنے گھروں کو واپس آگئے اور سکندر نے پٹالہ میں کشتیوں کا مال اور سواریاں اُتارنے چڑھانے کا گھاٹ تعمیر کیا اور بہت سے مندر اور کنوئیں وغیرہ بنوائے جن کا اب کہیں نام و نشان بھی باقی نہیں ہے۔ سکندر نے دریائے سندھ کی مغربی دھار کی پوری دیکھ بھال کرائی۔ اس زمانہ میں یہ دھار موجودہ دھار سے پچاس میل کے فاصلے پر بہتی تھی، سکندر نے یہاں ایک جزیرہ کی بھی سیر کی جس کا نام کلاوتہ لکھا ہے یہاں سکندر کے بہت سے جہاز جوار بھاٹے کی شدت اور طوفان کے باعث غرق ہوگئے۔ ابتک یونانیوں نے بحیرۂ روم کے سوائے جس میں جوار بھاٹہ نہیں آتا ہے اور کسی سمندر کو دیکھا ہی نہ تھا۔ بحیرۂ عرب میں انھیں ایک نئی مصیبت یعنی مد وجزر سے سامنا ہوا۔ جس سے بعض اوقات پانی دس دس فٹ اوپر چڑھ جاتا ہے۔ جہاز ران یہ

Killouta کلاوتہ ۔ Moeres موریس ۔ Corporala

کیفیت دیکھکر بہت گھبرائے۔ سکندر انھیں تسلی و تشفی دینے کی غرض سے ایک جہاز میں سوار ہوکر کھلے سمندر میں گیا اور وہاں اُس نے ساگر دیوتا کی پوجا کی اور اپنے بیڑے اور اسکے سردار کی سلامتی کی دعا مانگی۔ لکھا ہے کہ سکندر نے ایک سونے کے پیالے میں پانی بھر کر اور اس پر کچھ دم کرکے اُسے سمندر میں پھینکدیا۔

سکندر نے دریائے سندھ کی مشرقی دھار کی بھی جانچ پڑتال کرائی۔ اور سامرہ جھیل کے علاقے کے تمام حالات معلوم کئے، جب اُسے معلوم ہوا کہ مشرقی دھار مدوجزر کی مصیبت سے آزاد ہے تو اُس نے جھیل کے کنارے ایک بندرگاہ تعمیر کیا جہاں تمام بیڑے کی مرمت کراکے از سرِ نو ترتیب دی گئی اور نیارخس کو تمام سازوسامان اور اجناس سے معمور کرکے بیڑے کو برسات کے بعد سمندر کی طرف روانہ کرنے کا حکم دیا گیا۔ سکندر خشکی کے راستے سے ساحل بلوچستان و مکران کے برابر اپنا سفر شروع کیا اور اپنے بیڑے کی آرام و آسائش کے لئے جگہ جگہ بندرگاہیں تعمیر کراتا، کنوئیں کھدواتا اور سامان و رسد کے کھتے بھرواتا ہوا چلا گیا۔

سب سے پہلے سکندر اعظم دریائے پورالی کو عبور کرکے اُس علاقہ میں پہونچا جہاں آجکل ریاست لس بیلا ہے۔ یہاں کے باشندوں نے سکندر کی اطاعت منظور کرلی اور رسد کا سامان بہم پہونچایا۔ اس علاقہ کا سب سے بڑا قصبہ رام بکیا تھا سکندر نے اسے از سرِ نو تعمیر کرکے اسکا نام اپنے نام پر "اسکندریہ" رکھا۔ روانگی کے وقت سکندر نے اس علاقہ کا گورنر اپالوفانیس[۴] کو مقرر کیا اور لیوناتوس کی زیرِ کمان ایک بڑی فوج حفاظت کے لیے چھوڑی۔ اُس نے ساحل سمندر پر بمقام کوکالا[۵] ایک ڈپو قائم کیا تاکہ نیارخس کو راستے میں رسد کی تکلیف نہ ہو۔ لیکن سکندر کی روانگی کے بعد اس علاقہ کے باشندوں نے پھر سرکشی کرکے یونانیوں پر حملہ کردیا جسمیں اپالوفانیس قتل ہوا لیکن لیوناتوس نے باغیوں کو شکست فاش دیکر امن بحال کردیا۔

سکندر ساحل مکران پر پاسنی اور گوادر پہونچکر رفتہ رفتہ گلاش خرد تک پہونچگیا۔

یہاں پر بیجا نہ ہوگا اگر ہم اُن لوگوں کے مختصر حالات سے بھی جو اس بیڑے کے روح رواں تھے آگاہ کردیں۔ ان میں ممتاز ترین شخص امیر البحر نیارخس تھا جو جزیرہ کریٹ کا باشندہ تھا مگر مقدونیہ کے شہر امفی پولس میں آکر آباد ہوگیا تھا۔ رفتہ رفتہ اسے سکندر اعظم کے باپ فیلقوس کے دربار میں رسوخ حاصل ہوگیا اور فیلقوس نے اسے ایک اعلیٰ عہدہ پر ممتاز کردیا۔ لیکن جب سکندر نے اپنے باپ سے بغاوت کی تو نیارخس بھی اسکی پارٹی میں شامل ہوگیا۔ اسلئے بادشاہ نے اُسے اپنے ملک سے نکال دیا، لیکن جب سکندر تخت نشین ہوا تو اُس نے نیارخس کو بلاکر فوج کی ایک پلٹن کا سردار مقرر کردیا۔ ایشیائی مہموں

---

[۱] Poseidon [۲] Arabis [۳] یونانی میں ان لوگوں کو Oreitae لکھا ہے [۴] Apollophanes [۵] Cokala

میں نیارخس بھی سکندر کے ساتھ تھا۔ جب ایشیائے کوچک فتح ہوگیا تو سکندر نے اُسے کوہ طارس کے جنوب میں دو ولایتوں کا گورنر بنادیا۔ غرض نیارخس سکندر اعظم کے خاص دوستوں اور بڑے سرداروں میں شامل تھا۔

آنسیقریطوس جو شاہی جہاز کا کپتان اور تمام بیڑے کا اعلیٰ ترین سردار تھا سکندر اعظم کے منظور نظر مصاحبوں سے تھا لیکن وہ نیارخس سے چشمک رکھتا تھا اور سیاسی تجربات میں اُسے بڑا کمال حاصل تھا۔ چنانچہ جب سکندر نے باختر فتح کرنے کے بعد ہندوستان کی طرف حملہ کیا تھا تو اُسنے اسی افسر کو اپنا سفیر بنا کر ٹیکسلا بھیجا۔ اس نے پہونچتے ہی وہاں کے پنڈتوں کو اپنا طرفدار بنالیا جسکی وجہ سے وہاں کے راجہ نے سکندر کی اطاعت قبول کرلی، لیکن نیارخس سے اسکی ہمیشہ چشمک رہی

بیڑے کا تیسرا افسر طاسیوس کا رہنے والا ایندراستھنیز نامی نوجوان تھا، بیڑے کا پورا ایک حصہ اسکی کمان میں تھا اور سکندر نے ساحل بلوچستان، مکران و خلیج فارس کی مکمل پیمائش بھی اسکے سپرد کی تھی، اسکی ہدایت تھی کہ تمام گھاٹوں، کناروں، بندرگاہوں، جزیروں اور ساحلی شہروں، خلیجوں کی خوب جانچ کرکے اُن مقامات کی جہاں پانی سہولت کے ساتھ مل سکتا ہو ایک فہرست مرتب کی جائے جسمیں یہ بھی درج ہو کہ کونسا علاقہ زرخیز ہے اور کونسا بنجر۔ چنانچہ اس شخص نے اس بیڑے کا سفرنامہ لکھا تھا۔

بیڑے کا چوتھا افسر قصبہ پیلا کا رہنے والا ایک مقدونی جوان تھا اسکے کمان میں بھی بیڑے کا ایک پورا ڈویژن تھا۔ اسکا نام یونانی میں آرخیاس تھا۔

یہ بات تحقیق نہیں ہو سکی کہ نیارخس کے بیڑے میں کتنے جہاز تھے اور اُن میں کتنے آدمی تھے لیکن گمان غالب یہ ہے کہ تقریبًا ڈیڑھ سو جنگی جہاز اور بار بردار کشتیاں تھیں جنمیں پانچہزار کے قریب سپاہی اور جہاز راں سوار تھے۔ ان جہازوں پر بہت سی قلعہ شکن مشینیں اور آلات سنگ اندازی بھی موجود تھے کیونکہ آدمیوں کو شب گذاری اور تازہ پانی لینے کے لئے روزمرہ ساحل پر اُترنا پڑتا تھا۔

اس بحری سفر کا اصلی منشا تحقیقات یا پیمائش تھی۔ سکندر دریائے سندھ اور نہر فرات کے درمیان تری کی راہ سے باقاعدہ آمدورفت کا سلسلہ قائم کرنا چاہتا تھا۔ اسی لئے نیارخس کو جگہ جگہ اُتر کر جانچ پڑتال کرنی پڑتی تھی۔

سکندر اعظم کی روانگی کے بعد نیارخس سامرہ کی جھیل میں تقریبًا ایک مہینہ مقیم رہا جس کے بعد لب دریا کے ہندوستانی باشندوں کے حملے کے خوف سے اُس نے ماہ ستمبر ۳۲۵ ق م کے آخری ہفتہ

Archias of Pella & Androsthenes of Taurus Range

میں لنگر اُٹھا دیا، اور دریائے سندھ کی مشرقی شاخ میں آہستہ آہستہ سفر کرتا اور محفوظ کھاڑیوں میں قیام کرتا ہوا کوریاتیس پہونچا۔ یہاں یہ مشکل پیش آئی کہ دریا کا دہانہ ریت سے اس قدر اٹا ہوا تھا کہ اس میں جہازوں کا گذرنا محال تھا اس لئے یہاں دریا کی ریت کٹوا کر گہری نہر کھدوائی گئی جس سے نکلکر یہ بیڑہ اس مقام پر پہونچا جہاں آجکل کراچی ہے۔ اور چونکہ ابھی برسات کا زور ختم نہیں ہوا تھا اسلئے کراچی میں ایک مہینہ رکنا پڑا۔ یہ بندرگاہ اس قدر وسیع اور محفوظ تھا کہ نیارخس نے اسکا نام بندر اسکندری رکھدیا۔

معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں بھی کراچی میں اتنی ہی اچھی مچھلیاں ملتی تھیں جتنی کہ آجکل کیونکہ نیارخس کے آدمیوں نے مہینہ بھر تک مچھلیاں کھا کھا کر بسر کی۔ نومبر کے پہلے ہفتہ میں نیارخس نے یہاں سے بھی بیڑے کا لنگر اٹھا دیا، لیکن راستے میں اُسے ناموافق موسم اور سامان رسد کی کمی کی وجہ سے سخت تکلیفوں کا سامنا کرنا پڑا۔

فی زمانہ کراچی اور دریائے پورالی کے دہانہ کے درمیان ساحل کی حالت میں بہت کچھ تغیر و تبدل ہو گیا ہے لیکن بعض بعض مقامات کا پتہ جنکا نیارخس نے اپنے سفرنامہ میں ذکر کیا ہے ابتک چل سکتا ہے، البتہ ایک چیز کا جو سفرنامہ میں درج ہے کہیں پتہ نہیں ملتا۔ اور وہ یہ ہے کہ راس مونجے کے قریب بندرگاہ کے دروازے پر دو بڑی چٹانیں دو رویہ حائل تھیں جن کے باعث آبنائے اسقدر تنگ ہو گئی تھی کہ بڑے بڑے جہازوں کا داخل ہونا بہت مشکل ہو گیا تھا۔ اس بندرگاہ کا نام رانی بندر تھا کیونکہ اس پر ایک رانی حکمران تھی۔ بہرصورت نیارخس کا بیڑا ان دونوں خطرناک چٹانوں کے درمیان سے بہت مشکل کے ساتھ گذرا۔ اس آبنائے کی تنگی کا یہ حال تھا کہ دونوں طرف کے چپو خشکی سے لگ جاتے تھے۔

دریائے پورالی سے آگے بڑھنے کے بعد بیڑے کو ایک سخت طوفان نے آگھیرا۔ رسد کے سامان کا ایک جہاز اور دو جنگی جہاز غرق ہو گئے لیکن آدمی تیر کر ساحل تک پہونچ گئے۔ کوکالہ پہونچکر اُنھوں نے وہی سامان رسد اپنے جہازوں پر لادلیا جو لیونا توس جمع کر گیا تھا، اور چونکہ آدمی بہت خستہ اور جہاز مرمت طلب ہو گئے تھے اس لئے یہاں بیڑے کو کچھ دنوں لنگر انداز ہونا پڑا۔

کوکالہ سے چلکر یہ بیڑہ دریائے تنگل کے دہانہ پر پہونچا جہاں بہت گہرا پانی تھا۔ ہزاروں آدمی برچھیوں سے مسلح ہو کر اس بیڑے پر حملہ کرنے کیلئے ساحل پر جمع ہو گئے۔ نیارخس لکھتا ہے کہ یہ لوگ چھوٹی چھوٹی کوٹھریوں کے رہنے والے تھے، اُن کے چھالے لکڑی کے تھے جن کی آگ سے جلا کر تیز نوکیں نکال دی گئی تھیں۔ نیارخس نے ایک پرتاب تیر کے فاصلہ پر اپنے بیڑے کو لنگر انداز کیا۔ تھوڑی دیر کے بعد

سلہ یونانی زبان میں اس مقام کا نام Krokala لکھا ہے سلہ Cape Monze سلہ یونانی میں [illegible]

تیراک سپاہیوں کا ایک دستہ پانی میں تیر کر خشکی پر پہونچگیا، اور تین تین کی قطاروں میں صف باندھ کر کھڑا ہو گیا۔ سپاہیوں نے نعرۂ جنگ بلند کیا، ادھر جہاز والوں نے بھی شور و غل مچایا اور مجمع پر تیرباری شروع کر دی۔ یہ نیم برہنہ اور لاٹھیوں سے مسلح لوگ ان تجربہ کار جنگ آزما سپاہیوں کا کیا مقابلہ کر سکتے تھے۔ تاہم اُنھوں نے اس قدر دلیری کے ساتھ مقابلہ کیا کہ میدان سے قدم نہ ہٹایا، کچھ قتل ہو گئے کچھ مجروح ہو کر قید کر لئے گئے۔ ان کی نسبت لکھا ہے کہ ان کے سروں پر بڑے بڑے بال، انگلیوں پر بڑے بڑے ناخن تھے اور وہ جانوروں اور مچھلیوں کی کھالوں کا لباس پہنتے تھے۔

راس مالن سے آگے گذرنے کے بعد یہ بیڑہ "ماہی خوروں" کے ملک میں پہونچا جو راس جسک تک ویسیع تھا۔ ان لوگوں کا حال نیارخس نے اس طرح بیان کیا ہے:۔

"یہ ماہی خور لوگ مچھلیوں پر زندگی بسر کرتے تھے مگر لطف یہ کہ پیشے کے اعتبار سے بہت کم لوگ ماہی گیر ہیں، اکثر جوار جاٹے کے ساتھ سمندر کی مچھلیاں خشکی پر چڑھ جاتی ہیں اور جب پانی اترتا ہے تو کثیر التعداد مچھلیاں کنارے کے گڈھوں ہی میں رہ جاتی ہیں، جہاں سے یہ لوگ انھیں پکڑ لاتے ہیں۔ یہ لوگ اپنا جال ایک درخت کی چھال (غالباً سن یا ناریل) کے ریشوں سے بناتے ہیں۔ مچھلیاں عموماً بہت چھوٹی ہوتی ہیں اور اکثر وہ انھیں پکڑ کر کچا چبا جاتے ہیں۔ لیکن موٹی اور بڑی مچھلیوں کے ٹکڑے کر کے اور دھوپ میں سکھا کر اُن کو کوٹ کر چکی میں پیس لیتے ہیں اور اُن کے آٹے کی روٹیاں پکاتے ہیں، مویشیوں کو بھی دانے کی جگہ مچھلیاں کھلاتے ہیں۔ درحقیقت یہ ملک بالکل بنجر ہے اور گھاس کا تنکا تک یہاں نہیں ہوتا۔ مچھلیوں کے علاوہ یہ لوگ کیکڑے، جھینگے اور سیپیاں بھی خوب کھاتے ہیں، اور اکثر لوگ اپنے مکانوں میں لکڑی کے بجائے مچھلیوں اور وھیلوں کی ہڈیاں کام میں لاتے ہیں، بڑی اور چوڑی ہڈیوں سے کواڑوں کی جوڑیاں بھی بنائی جاتی ہیں۔ غریب غربا کے مکانوں میں بڑی مچھلیوں کے کانٹے استعمال ہوتے ہیں۔"

آجکل بھی اس علاقہ کے لوگوں کی غذا مچھلی ہی ہے، وہ انھیں پکڑ کر خشک کر لیتے ہیں اور پیسکر روٹیاں پکاتے ہیں یا آٹے میں کھجوریں ملا کر حریرہ کی طرح پکا کر کھاتے ہیں اور کتوں، مرغیوں اور دیگر پالو جانوروں کو بھی یہی کھلاتے ہیں

یہاں سے آگے بڑھکر نیارخس نے ایک مکرانی کی خدمات حاصل کیں جس نے بیڑے کی رہنمائی کر کے کرمان تک پہونچا دینے کا وعدہ کیا۔ پھر وہ ایسے علاقہ میں پہونچا جسکی سرزمین بمقابلہ ملک سابق کے زیادہ

له Ichthyophagi سے Gedrosian سے Carmania

شاداب وزرخیز تھی، اور یہاں کے باشندے بھی مقابلتاً زیادہ متمدن اور شائستہ تھے۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ جس نئے علاقے میں پہونچتے تھے وہاں کے کسی جہاز راں کو رہنمائی کیلئے ساتھ لیتے تھے۔

راس قباؔ کے قریب اور اس کے آگے بڑھکر خلیج گواتوؔر کے کنارے کو بھاسؔ سے بھی آگے انھیں ایک بڑا شہر نظر پڑا، چنانچہ نیارخسؔ نے اس شہر سے رسد حاصل کرنے کے لئے ایک ذلیل اور کمینہ چال چلی اپنے جہاز کے سوائے تمام بیڑے کو آگے بڑھنے کا حکم دیدیا اور خود اپنا جہاز لیکر شہر کی طرف روانہ ہوگیا۔ شہر والے خلیق اور مہمان نواز تھے، انھوں نے نیارخسؔ کا بڑی فراخ حوصلگی سے خیر مقدم کیا اور بہت سے تحائف پیش کئے جنھیں نیارخسؔ نے شکریہ کے ساتھ لے لیا اور شہر کی سیر کرنیکی اجازت مانگی جو فوراً منظور ہوگئی۔ نیارخسؔ کے شہر پناہ کے اندر داخل ہوتے ہی اُس کے سپاہیوں نے پھاٹک کے دربانوں کو گرفتار کرلیا اور فصیل پر چڑھکر تمام بیڑے کو جھنڈی دکھاکر تمام فوج کو شہر پر حملہ کرنے کے لئے اندر بلا لیا۔ شہر والوں کو جب اس دغابازی کا حال معلوم ہوا تو وہ لڑنے مرنے پر آمادہ ہوگئے۔ نیارخسؔ نے ایک ترجمان کی معرفت شہر والوں کو دھمکی دی کہ بیڑے کو رسد بہم پہونچاؤ ورنہ شہر کو لوٹ لیا جائیگا، مگر شہر والوں نے رسد دینے سے انکار کردیا، اور فصیل پر چڑھکر خود نیارخسؔ پر حملہ آور ہوئے۔ لیکن چونکہ نیارخسؔ کی فوج پہونچ گئی تھی اسلئے یونانی تبر اندازوں نے اِن حملہ آوروں کو پسپا کرکے شہر پر قبضہ کرلیا۔ جس پر شہر والوں کو مجبوراً بیڑے کو رسد دینا پڑی۔

نیارخسؔ نے اپنے سفرنامے میں لکھا ہے کہ جب وہ جزیرہ اسطولہؔ کے قریب پہونچا ہے تو اُس نے جگہ جگہ سمندر کا پانی بہت بلندی تک فواروں کی طرح اُچھلتے دیکھا، وہ اسے اس طرح بیان کرتا ہے:-

"سمندر کا پانی اس طرح اُچھلتا دیکھکر تمام آدمی گھبرا گئے۔ اور اُنھوں نے رہناؤں سے اسکی وجہ دریافت کی تو بتایا گیا کہ سمندر میں وھیل جانور کھیل رہے ہیں اور وہی ایسے فوارے چھوڑتے ہیں۔ لیکن پھر بھی ملاحوں کا خوف دور نہ ہوا چنانچہ بہت لوگوں کے ہاتھوں سے چپو چھوٹ کر سمندر میں گر پڑے جس پر نیارخسؔ نے ان کی دلجمعی کی، اور حکم دیا کہ اگلے جہازوں کے پہلو وھیلوں کی طرف کردیے جائیں اور تمام آدمی ملکر شوروغل مچائیں اور "الالہ" کی دہائی دیں چپوؤں کو پانی میں خوب زور سے ماریں۔ اس حکم کی تعمیل کیگئی اور فوج نے "الالہ" کے نعروں سے آسمان سر پر اُٹھالیا، نرسنگھے پھونکے گئے اور چپوؤں سے پانی پیٹا گیا اس شوروغل سے خائف ہوکر وھیلوں نے غوطہ مارا اور تھوڑی دیر بعد بیڑے کے عقب میں نمودار ہوئے

؎ اس جزیرہ کو اس زمانہ میں Nosala یا Karbine ؎ Kophas ؎ Gwattor یا Cape Cabba کہتے تھے ؎ یہ جنگ کی دیوی اور جنگ کے دیوتا مریخ کی بہن تھی۔

اور پھر حسب معمول ہوا سے جھوڑنے لگے اس طرح نجات پانے پر لوگوں نے دیوتاؤں کا شکریہ ادا کیا
اور نیارخس کی عقلمندی کا لوہا مان گئے

جس جزیرہ کا ذکر اوپر کیا گیا ہے اُسے لوگ سب کی آنکھ سمجھتے تھے اور اس کو سورج نراین کا استھان خیال کرتے تھے۔ ایک روایت یہ بھی مشہور تھی کہ یہاں ایک جل پری رہتی ہے جو شخص جزیرہ میں جاتا ہے وہ اس کے حسن و جمال کو دیکھ کر از خود رفتہ ہو جاتا ہے اور پری بھی اس سے محبت کرنے لگتی ہے لیکن کچھ دنوں کے بعد اس شخص کو جادو کے زور سے مچھلی بنا کر سمندر میں پھینک دیتی ہے اس خوف سے کوئی شخص اس جزیرہ کے قریب نہیں جاتا تھا۔ اتفاق سے نیارخس کے بیڑے کا ایک جہاز جس میں مصری سوار تھے اس کے قریب جا کر غائب ہو گیا۔ دوسرے ملاحوں سے دریافت کیا گیا تو انھوں نے بیان کیا کہ یہ لوگ جزیرہ پر اتر کر جل پری کا شکار ہو گئے ہونگے۔ نیارخس نے گمشدہ جہاز اور عملہ کی تلاش کے لیے ایک اور جنگی جہاز روانہ کیا جس نے جزیرہ مذکور کے چاروں طرف گھوم کر تلاش کی لیکن کچھ حال نہ معلوم ہوا۔

اس کے بعد نیارخس کا بیڑہ مغستان، کرمان اور لارستان کے ساحل کے برابر برابر چلتا رہا جو پچھلے ملکوں کے مقابلے میں زیادہ سرسبز، شاداب اور زرخیز تھے کچھ دنوں بعد دریائے مناب یا رود ابراہیم کے دہانہ تک پہونچا جو بندر عباس کے غرب میں واقع ہے۔ یہاں بیڑا لنگر انداز ہوا۔ اس علاقہ کو نیارخس نے "فردوس ایران" کا خطاب دیا ہے۔ کیونکہ یہاں ہر طرف سرسبز کشت زار اور پُربہار باغات نظر آئے جن میں نارنگی، سنترہ، سیب، شفتالو وغیرہ کے درخت اور انگوروں کی بیلیں کثرت سے تھیں۔ بیڑے کے لوگوں نے ساحل پر اتر کر خوب سیر کی اور آسودہ ہوئے۔

یہاں پر ملاحوں کو ایک شخص ملا جو لباس اور شباہت سے یونانی معلوم ہوتا تھا جب اس کو نیارخس کے سامنے پیش کیا گیا تو اس نے بتایا کہ وہ سکندر کی فوج سے بچھڑ گیا ہے جو یہاں سے قریب ہی خیمہ زن ہے۔ اس کے سنتے ہی نیارخس بہت خوش ہوا اور دس بارہ آدمیوں کو ساتھ لیکر اپنے آقا کی قدم بوسی حاصل کرنے کی غرض سے روانہ ہو گیا۔ چونکہ ان لوگوں کے بال اور داڑھیاں بہت بڑھ گئی تھیں اور مصائب سفر کی وجہ سے اُن کے حلیے بگڑ گئے تھے اسلئے یونانیوں کی جماعت انھیں شناخت نہ کر سکی بہرحال یہ لوگ اسکندر کے لشکر میں پہونچے جو اس وقت دریائے مناب کے کنارے گلاشگرد میں فروکش تھا۔

لہ یہ روایت ایک حد تک صحیح ہے ... ایک بڑی مچھلی پائی جاتی ہے جس کے ... اور ... میں انھیں ... کہتے ہیں

لہ اسے یونانی ... لکھا ہے

اس نے ان لوگوں کی بہت تواضع وتکریم کی۔ فوج سے سلامی دلائی اور جشن برپا کرنیکا حکم دے دیا دیوتاؤں کی بھینٹ چڑھائی گئی، سپاہیوں نے ورزشی اور فوجی کرتب دکھائے۔ رات کو محفل نشاط گرم ہوئی۔ دوسرے روز انکا ایک عظیم الشان جلوس نکالا گیا۔ دو چار روز اسی طرح عیش و مسرت اور آرام و راحت میں گذرے کہ سکندر نے لشکر کو کوچ کا حکم دیا اور نیارخس کو ہدایت کی کہ وہ خلیج فارس کے کنارے کنارے سیاحت کرتا ہوا شہر سوسہ میں آکر ملے۔

نیارخس نے بیڑے کو لنگر اٹھا کر آگے بڑھنے کا حکم دیا۔ اثنا سفر میں بہت سی مشکلات کا سامنا ہوا، متعدد لڑائیاں لڑنی پڑیں کہیں آؤبھگت ہوئی کہیں مزاحمت۔ ایک جگہ ساحل پر ایک وھیل کی لاش بھی ملی بہت سے دیگر عجیب واقعات پیش آئے۔ آخرکار نیارخس اور اُسکا بیڑہ خیر و عافیت کے ساتھ سوسہ پہونچ گیا یہاں لیوناتوس بھی کسی دوسرے راستہ سے آکر سکندر سے مل گیا تھا جب یہ سب لوگ جمع ہوگئے تو سکندرِ اعظم نے پھر ایک جشن کیا جسمیں نیارخس، لیوناتوس اور انسقریتوس کو سونے کے تاج پہنائے گئے۔ شہر سوسہ میں ایک عجیب وغریب واقعہ پیش آیا۔

ہندوستان سے واپسی پر تقریباً ایک اسّی برس کا بوڑھا ہندوستانی سادھو بھی سکندر کے ساتھ ہوگیا۔ یونانی زبان میں اسکا نام "کالانوس" لکھا ہے سوسہ پہونچکر یہ سادھو اتفاق سے بیمار ہوگیا اور اُس نے سکندر کو اطلاع دی کہ اب میں زیادہ زندہ رہنا نہیں چاہتا۔ اس لئے خود کو زندہ جلا دینا چاہتا ہوں۔ سکندر نے اس سادھو کو بہت کچھ سمجھایا مگر وہ اپنی بات پر اڑا رہا آخرکار ایک بہت بلند چتا بنائی گئی فوجی باجے بجنا شروع ہوئے اور سادھو خوشی خوشی چتا پر چڑھ گیا۔ لشکر کے تمام ہاتھیوں کو صف آرا کرکے سلامی دی گئی، نرسنگھے پھونکے گئے۔ اور وہ سادھو خاص اطمینان وخوشی کے ساتھ بھڑکتے ہوئے شعلوں میں بیٹھا رہا مگر مرنے سے قبل اس نے سکندرِ اعظم سے یہ الفاظ کہے۔

"گھبرائیے نہیں! آپ بابل میں مجھے مجائیں گے"

سکندرِ اعظم بابل پہونچکر بخار میں مبتلا ہوا اور ۱۳ جون ۳۲۳ ق م کو بتیس سال کی عمر میں اس جہان فانی سے راہیِ ملک جاودانی ہوگیا۔

لـہ یہ شہر ہر مدانیں ایران کا پایۂ تخت تھا جسے یونانی زبان میں ... لکھتے ہیں

تخفیفِ اسلحہ کا مسئلہ

(از مسٹر منوہر لال طالب چکوالی، بی۔اے، ایل ایل بی)

دنیا میں قیام امن کے لئے تخفیف اسلحہ کا مسئلہ کس قدر ضروری ہے اُس پر کسی مفصل بحث کی ضرورت نہیں مگر جیسا کہ ہم زمانہ میں ایک مضمون کے دوران میں اعداد و شمار کی بنا پر واضح کر چکے ہیں کہ جنگ عظیم کے بعد سے دنیا کی جنگی طاقت میں معتدبہ اضافہ ہو رہا ہے اور تخفیف اسلحہ کے بلند آہنگ دعووں کے باوجود گولہ بارود اور بحری بری اور ہوائی آلات حرب میں نمایاں ترقی ہو رہی ہے۔

لندن کی بحری کانفرنس جو اپریل ۱۹۳۰ء میں منعقد ہوئی تھی، برطانیہ، امریکہ اور جاپان کے مابین تھی، اس میں یہ طے پایا تھا کہ ان تین سلطنتوں کو دوسروں کو اطلاع دینے کے بعد اپنے اسلحہ میں اضافہ کرنے کا اس صورت میں اختیار ہے جب کسی اور طاقت کے فوجی پروگرام سے اُسکی ہستی کو کوئی خدشہ محسوس ہو۔

اس کے بعد کیا ہوا؟ انجمن اقوام کی کمیٹی بابت تخفیف اسلحہ کے اجلاس وقتاً فوقتاً ہوتے رہے، جنیوا میں بھی بین الاقوامی جلسے ہوئے، سر جان سائمن کی تقریریں بھی ہوئیں اور لوگ انھیں پڑھتے بھی رہے۔ یہ سب کچھ تو ہوتا رہا لیکن اسلحہ میں کوئی تخفیف نہ ہونا تھی نہ ہوئی۔ روسی نمایندے نے دول یورپ کی گندم نما جو فروش پالیسی کا بھانڈا پھوڑ دیا اور مکمل تخفیف اسلحہ کی تجویز پیش کر کے چھوڑ دیا۔ سرمایہ دار اور ملوکیت پسند حکومتوں کے نمایندے بغلیں جھانکنے لگے اور اس تجویز کو ناقابل عمل اور مضحکہ انگیز کہکر ٹال دیا۔ لیکن یہ کھیل بھی نہایت دلچسپ تھا اور رسوخ یافتہ ممبران انجمن اقوام کو یہ ڈھونگ جاری رکھنا منظور تھا اسلئے جاری رہا۔

ادھر جاپان زور و زر کے نشے میں چور منچوریا میں جارحانہ پیشقدمی پر بضد تھا، چین بیچارہ کچھ تلملایا، سٹپٹایا، لیکن قہر درویش برجان درویش، آخر بڑے طمطراق کے ساتھ انجمن اقوام کا دروازہ کھٹکھٹایا، ہانپتے کانپتے آواز دی۔ لیکن نقار خانے میں طوطی کی آواز کون سنتا ہے۔ آخر خدا خدا کر کے شنوائی ہوئی۔ پوچھا گیا کیا معاملہ ہے؟ روئداد ظلم بیان ہوئی، جسپر تحقیقات کا حکم ہوا لیکن کس قدر جلد یہ تحقیقات ہوئی موجودہ زمانہ کے طالب علموں سے پوشیدہ نہیں، کم و بیش دو سال کے بعد فیصلہ ہوا کہ جاپان کی زیادتی ہے مگر تا تریاق

از عراق آوردہ شود مار گزیدہ مردہ بود والی مثل صادق ہوئی، اب کیا ہو سکتا تھا، اور جاپان بھی کوئی کمزور ملک نہ تھا کہ انجمن اقوام اسکی کوئی پرواہ نہ کرتی، بہر حال وہی ہوا جس کا خوف تھا یعنی جاپان انجمن اقوام سے بالکل کنارہ کش ہو گیا۔

جرمنی معاہدۂ ورسیلز کی نامنصفانہ شرائط اور اُن کے نتائج سے پہلے ہی نالاں تھا مگر اب تک وہ بھی بادل ناخواستہ اس تخفیف اسلحہ کے ڈھونگ میں شامل رہا۔ لیکن جب اُس نے دیکھا کہ معاہدہ ورسیلز کے باوجود ان بڑی طاقتوں نے اپنے اسلحہ میں کوئی تخفیف نہیں کی اور جاپان نے موقعہ مناسب سے انجمن اقوام کو خیرباد کہدی تو اُسکا دل بھی ٹوٹ گیا۔ درحقیقت اتحادیوں کی روش اور رموز سلطنت کو اس سے بہتر کون سمجھ سکتا ہے، چنانچہ اسکو بھی اسی میں خیریت دکھائی دی کہ اس "انجمن تقسیم قبور" کو آخری سلام کہدے اور اپنے امکان بھر اپنی فوجی طاقت کو اپنی ملکی ضروریات کے مطابق مستحکم کرے چنانچہ ہر ہٹلر جو آجکل جرمنی کا حکمران ہے اس جبری فوجی کمزوری کو بُری طرح محسوس کر رہا ہے اور اُسے جلد از جلد دیگر دول یورپ کے پہلو بہ پہلو لانے کے لئے سرگرم کوشش ہے۔

برطانیہ میں ہر سال فوجی مصارف کے لئے تقریباً دس کروڑ دس لاکھ پونڈ سالانہ منظور کئے جاتے ہیں۔ مزدور پیشہ جماعت اس کو بنظر استحسان نہیں دیکھتی، چنانچہ حال میں ان کی سالانہ کانفرنس نے مقام ہیسٹنگز میں "اجتناب جنگ" کی قرارداد منظور کی ہے۔ لیکن برطانیہ میں ملوکیت پرستوں کا زور ہے اسلئے یہ قرارداد محض قرارداد ہی رہیگی اور بین الاقوامی پولیس کا مطالبہ کرنیوالوں کا بھی یہی حال ہوگا۔

فروری سنہ ۱۹۳۴ء کے پہلے ہفتے میں پارلیمنٹ برطانیہ کے دارالعوام میں تخفیف اسلحہ کا مسئلہ درپیش تھا۔ چنانچہ سر جان سائمن وزیر خارجہ اور اُن کے دست راست مسٹر انیتھنی ایڈن نے بڑے جوش کے ساتھ اس مسئلہ کے حق میں تقریریں کیں۔ لیکن لوگ اس کانفرنس کو بمصداق برعکس نہند نام زنگی کافور اسلحہ کانفرنس ہی سمجھتے رہے اور مشہور زمانہ ادیب و فلسفی برنارڈ شا بھی اس انجمن کو اسی نام سے یاد کرتے ہیں۔

ناظرین زمانہ اس امر سے آگاہ ہونگے کہ کس طرح ہسپانوی بحری بیڑے کے بھاری بھرکم کم رفتار جہازوں کی عظیم الشان جمعیت کو انگلستان کے چھوٹے چھوٹے تیز رفتار جنگی جہازوں نے تتر بتر کر دیا تھا۔ اس برزعم غنیم کو اس کے سامنے کیسی منہ کی کھانی پڑی تھی، وہی معاملہ آج بھی درپیش ہے۔ بھاری اور کم رفتار جنگی جہاز روز بروز غیر ضروری ہوتے جاتے ہیں۔ چنانچہ اسلحہ میں جو کچھ نمائشی تخفیف ہو رہی ہے وہ ان غیر ضروری آلات حرب میں ہو رہی ہے، اب ان کی جگہ تیز رفتار کروزر تیار ہو رہے ہیں جن پر اٹھارہ انچ قطر کی توپیں

ہوتی ہیں اور آبدوز کشتیاں بھی بکثرت بن رہی ہیں۔ چنانچہ حال ہی میں برطانیہ میں ایک قسم کی نئی آبدوز کشتی سیورن جسکو بحری عجوبہ کہا جاتا ہے تیار ہوئی ہے لیکن اسمیں بھی کلام نہیں کہ فی زمانہ بحری پروگرام کی طرف اتنی توجہ نہیں دیجاتی جتنی موجودہ صدی کے آغاز میں دیجاتی تھی، اسکی وجہ جنگ کے طریقوں میں تبدیلی ہے۔ جب کبھی آئندہ جنگ ہوگی اسمیں انسان پر مشین کی فوقیت صاف طور پر ثابت ہو جائیگی اور حجم پر رفتار کی فوقیت کا مظاہرہ ہوگا۔ تیز رفتار بحری کروزروں، مسلح موٹر کاروں اور بم گرانیوالے ہوائی جہازوں کی مدد سے جس قدر قتل و بربادی ایک مختصر فوج کر سکتی ہے اسکا عشر عشیر بھی ایک لشکر جرار جو ان آلات حرب سے عاری ہے نہیں کر سکتا۔ آئندہ جنگ کا فیصلہ ہوائی فوقیت پر ہوگا۔ یہ جنگ ہوا میں لڑی جائیگی جنگ کے حامی اس حقیقت سے پورے طور پر واقف ہیں۔ اس لئے ہر ملک میں ہوائی پروگرام خاص طور پر مد نظر ہے۔ ہر ایک ملک میں خاص خاص ڈیزائن کے ہوائی جہاز پوشیدہ رکھے جاتے ہیں اور ہر ملک اس لحاظ سے پسماندہ ہونے کا بہانہ کرتا ہے۔ چنانچہ برطانیہ جو بلحاظ تعداد پانچویں نمبر پر ہے لیکن آبادی اور حدود کا مناسب لحاظ کیا جائے تو اسکا دوسرا نمبر ہوتا ہے پہلا نمبر امریکہ کا ہے۔ برطانیہ نہایت اطمینان اور فضول شور و شر کے بغیر نئے نئے ہوائی جہاز تیار کرا رہا ہے۔ انکی رفتار دو ڈھائی سو میل فی گھنٹہ ہوگی، کہا جاتا ہے کہ ایسے چالیس ہوائی جہاز تیار ہو رہے ہیں جن کی لاگت پندرہ ہزار پونڈ فی جہاز ہوگی۔ یہ جہاز صرف دس منٹ میں زمین سے سیدھے اوپر کو اٹھکر بیس ہزار فٹ کی بلندی تک جا سکیں گے انکے لئے کسی میدان کی ضرورت نہ ہوگی، یہ کسی جنگل یا پہاڑ کی چوٹی سے پرندوں کی طرح آسانی سے اڑ سکیں گے بموں کے بوجھ کے باوجود بھی انکی رفتار ڈھائی سو میل فی گھنٹہ ہوگی اور یہ پانچ چھ ہزار میل ایک ہی پرواز میں جا سکیں گے۔

اوپر ذکر ہو چکا ہے کہ ہوائی طاقت اور دولت کے لحاظ سے امریکہ اول نمبر پر ہے اور اسکی کوشش ہے کہ جس طرح ممکن ہو وہ اپنی فوقیت قائم رکھے چنانچہ امریکہ نے بھی جو نئے انداز کے ہلاکت آفریں اور تیز رفتار ہوائی جہاز بنانے میں کسی سے پیچھے رہنا نہیں چاہتا۔ حال میں انکل سام کی نئے ڈیزائن کے ایکسو بیس جنگی ہوائی جہاز اور گیارہ سو چوراسی طیارے تیار کرنیکی تجویز منظور کی ہے۔

فرانس بھی اپنے ہمسایوں سے کسی طرح پیچھے نہیں رہنا چاہتا، اسکے لئے زندگی اور موت کا سوال ہے قومی اور ملکی ہستی کی بات ہے اور آزادی و غلامی کا مسئلہ ہے۔ چنانچہ فرزندان فرانس بھی پورے انہماک سے تیاریوں میں مشغول ہیں۔ انھوں نے چار سال کی عرقریزی و جانفشانی سے ایک ایسی آبدوز کشتی تیار کی ہے جس کا وزن پانی کے اندر بھی چار ہزار تین سو ٹن سے کم نہیں۔ یہ چار سو فٹ لمبی ہے۔ جس وقت یہ پانی کے نیچے

تو دو ہزار نو سو ٹن پانی کی جگہ گھیرتی ہے اسمیں ڈیڑھ سو اشخاص کے لئے جگہ ہے، افسروں کے لئے ایک کھیلنے کے لئے کمرہ ہے۔ ڈیک (تختۂ جہاز) پر ورزش وغیرہ کے لئے بھی کھلی جگہ ہے، اسکا امتحان کیا گیا ہے اور تجربہ کامیاب رہا ہے۔ تعجب کا مقام ہے کہ پانی کے اندر اور باہر بھی یہ نہایت آسانی اور تیز رفتاری کے ساتھ نقل و حرکت کرسکتی ہے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ آج تک ایسی مہیب اور عظیم الشان آبدوز کشتی کبھی تیار نہیں ہوئی۔

فرانس نے اپنی حدود کو نظر انداز کرکے اپنی شمالی مشرقی حد کو غیر معمولی طور پر مستحکم کرلیا ہے، زمین دوز استحکامات بنائے ہیں جو تین سو کلومیٹر کی لمبائی اور چالیس کلومیٹر کی گہرائی تک چلے گئے ہیں اور اس پر طرہ یہ کہ کسی کو کوئی شک بھی نہیں ہوسکتا کہ جس سرزمین پر ہم چل رہے ہیں اس کے نیچے اتنا گولہ بارود جمع ہے۔ ایک برقی شرارہ اس کو آتش فشاں پہاڑ کے لاتعداد دہانوں میں تبدیل کرسکتا ہے۔ بیشمار زمین دوز قلعے، سڑکیں، بجلی کی روشنی، ریلوے ٹرینیں اور سامان خور و نوش جس پر بھنوں فوجیں رہکر زبردست سے زبردست دشمن کا مقابلہ کرسکتی ہیں، غرض سبھی انتظامات مکمل کرلئے ہیں۔ فرش زمین بھی خاکی نہیں کنکریٹ اور لوہے کا ہے، زمین دوز نہریں بھی موجود ہیں۔ ان نہروں کی برکت سے یہ سب علاقہ اپنے سڑکوں، پلوں اور جملہ ساز و سامان کے ساتھ سیلاب زدہ اور تہ آب قطعۂ زمین میں تبدیل کیا جاسکتا ہے کیا یہ جنگی عجائب خانہ نہیں ہے۔ خیر جو کچھ ہو فرانس کی تیاری مکمل ہے۔

اِن باتوں سے یہی واضح ہوتا ہے کہ اس وقت کانفرنس تخفیف اسلحہ کی نیکدلانہ کوششوں کے باوجود دنیا کے مختلف ملکوں میں زور شور سے جنگ کے لئے تیاریاں ہورہی ہیں، 'منہ میں رام بغل میں اینٹ' رکھنے والے اقتصادی رقابت اور باہمی بداعتمادی کے ہاتھوں قتل و خونریزی کے تاریک غار میں ڈھکیلے جارہے ہیں۔ لیکن وبائی مصیبتوں میں ڈاکٹروں اور کفن فروشوں کی چاندی ہے بین الاقوامی بداعتمادی کے زمانہ میں یہی حال آلاتِ حرب بنانے والی کمپنیوں کا ہے یہ خوب نفع اٹھا رہے ہیں ان کا کاروبار دن دونی اور رات چوگنی ترقی کررہا ہے۔ ان کارخانوں کے مالک خدائے برتر سے دست بدعا ہیں کہ اس عالمگیر اقتصادی بدحالی اور کساد بازاری کے زمانے میں ان کے کاروبار میں برکت اور ترقی بخشنے والے خداوندان نعمت ابھی برائے چندے اور اپنی نگاہ التفات ادھر رکھیں، ان کی آئندہ دعا قبول ہوگی یا نہیں لیکن آلات جنگ کی موجودہ تجارت کا نقشہ قابل غور ہے۔

برطانیہ ۳۰٫۸　فرانس ۱۲٫۹　امریکہ ۱۱٫۷　بولشویک ۶٫۹　سویڈن ۸٫۰
اٹلی ۶٫۸　ہالینڈ ۵٫۴　بلجیم ۴٫۴　ڈنمارک ۱٫۹　جاپان ۱٫۹

اس نقشے کی رو سے پچپن (۵۵) فیصدی آلات جنگ برطانیہ، فرانس اور امریکہ کے لئے تیار ہوتے ہیں۔ آلات حرب بنانے والے کارخانوں کی خوشحالی سے ایک بات نمایاں طور پر ظاہر ہوتی ہے کہ تخفیف اسلحہ کانفرنس اپنے مقصد میں (اگر واقعی اس کا مقصد تخفیف اسلحہ ہی ہے) کس درجہ ناکام رہی ہے۔ سطور ذیل میں برطانوی آلات حرب بنانے والے کارخانوں کے متعلق کچھ روشنی ڈالنے کی کوشش کی گئی ہے:-

دور حاضرہ کے سائنسداں، سیاسی رہنماؤں کے ایما پر نت نئی اور مہلک ایجادات کرکے آئندہ جنگ کو ازحد خطرناک بنا رہے ہیں اور اسلحہ ساز کارخانے اس سے پورا پورا فائدہ اُٹھا رہے ہیں۔ "ایروپلین" جو ایک غیر سرکاری برطانوی اخبار ہے لکھتا ہے کہ "تخفیف اسلحہ کانفرنس کی ناکامیابی کے بعد ہوائی جہاز اور انجن بنانے والے کارخانے اور زیادہ منافعہ کی اُمید کر سکتے ہیں کیونکہ اس صورت میں گورنمنٹ کو فوجی پروگرام کی تکمیل کا کام ہاتھ میں لینا پڑیگا۔"

اہل برطانیہ اور برٹش گورنمنٹ کو بھی بجا طور پر خوش ہونے کا موقعہ ہے کیونکہ اس کی وجہ سے کارخانوں سے فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔

مسٹر ایچ۔ جے۔ ٹامس نے جو ہوائی جہاز بنانیوالے کارخانہ داروں کی انجمن کے صدر ہیں حال ہی میں فخریہ کہا تھا کہ تجارت برآمد کی ترقی کا موازنہ کرنے کا کوئی ذریعہ گورنمنٹ کی رپورٹوں کے بغیر نہیں ہے کیونکہ غیر ملکی حکومتیں اس شرط پر آرڈر دیتی ہیں کہ ان کے انتظامات پوشیدہ رکھے جائیں۔ لیکن اسمیں کلام نہیں کہ اس وقت اسلحہ کی تجارت خوب ترقی پر ہے جس کا ثبوت ان کمپنیوں کے منافعے اور ان کے حصوں کی قیمت میں اضافہ سے ملتا ہے۔ فیئرے ایوی ایشن کمپنی کے جو فوجی ہوائی جہاز بنانے کا مشہور کارخانہ ہے سالانہ منافعہ بابتہ ۱۹۳۳-۳۲ء میں ½۱۱ فیصدی کا اضافہ ہوا۔ ایچ۔ جی۔ ہاکر انجنیرنگ کمپنی نے سب سے زیادہ جنگی ہوائی جہاز فروخت کئے ہیں۔ اس کمپنی کے کاروبار کو اس درجہ ترقی ہوئی ہے کہ اُسے اپنے روز افزوں کاروبار کے لئے ایک نئی کمپنی "ہاکر ایر کرفٹ لمیٹڈ" نامی قایم کرنا پڑی ہے۔ اس کمپنی کے جنرل منیجر کا بیان ہے کہ گذشتہ سال اُنھوں نے اتنے ہوائی جہاز بنالئے اور فروخت کئے کہ جنگ عظیم کے بعد کے کئی سالوں کے ریکارڈ کو مات کر دیا۔ نئی ہاکر کمپنی کے پراسپکٹس میں درج ہے کہ "ہمارے ہوائی جہاز کینیڈا۔ نیوزیلینڈ۔ ڈنمارک۔ ناروے۔ استھونیا۔ یوگوسلویا۔ یونان۔ اور جاپان میں استعمال ہوتے ہیں۔ سویڈن اور ایران کی حکومتوں کے آرڈر ابھی آئے ہیں۔ سویڈن اور ڈنمارک میں بھی لائسنس کے ماتحت کئی طرح کے نئے نئے جہاز بنائے جارہے ہیں۔ ناروے۔ جاپان اور ایران نے کئی

قسم کے جہاز بنانے کے حقوق خریدلئے ہیں۔ برطانیہ نے بھی "ہارٹ" قسم کے ہوائی جہاز بنانے کے حقوق خریدے اور یہ جہاز بڑی بھاری تعداد میں وائکرس (ایوی ایشن) لمیٹڈ اور سر ڈبلیو جی۔ آرم سٹرانگ ایرکریفٹ لیمیٹڈ کے کارخانوں میں محکمۂ پرواز کے آرڈر کے مطابق بنائے جارہے ہیں

بہترین موٹر کار اور ہوائی جہازوں کے انجن بنانے والے کارخانے رولس رائیس لیمیٹڈ کے منافع بابت ۳۳-۱۹۳۲ء میں ۵½ فیصدی اضافہ ہوا ہے

دی ہیوی لینڈ ایرکریفٹ لیمیٹڈ کا بھی بیان ہے کہ "ہوائی جہازوں کی تجارت میں کافی سے زیادہ ترقی ہوئی ہے۔ کیونکہ تخفیف اسلحہ کانفرنس بالکل جاں بلب ہے۔ مسٹر شارٹ نے جو مشہور بحری ہوائی جہاز بنانیوالی کمپنی شارٹ برادرس کے مینجنگ ڈائرکٹر ہیں مندرجہ صدر رایوں کی ان الفاظ میں تائید کی ہے۔

"اس سال ہماری فرم کے کارخانے تجارتی اور جنگی ہوائی جہاز بنانے میں پوری قوت کے ساتھ مصروف و منہمک ہونگے۔ صلح کے بعد آئندہ سال (۱۹۳۴ء) کام کے لحاظ سے بہترین سال شمار کیا جاسکیگا۔"

امپیریل کیمیکل انڈسٹریز لیمیٹڈ (جو گولہ بارود کا مشہور و معروف برطانوی کارخانہ ہے) کے کاروبار میں بھی پچھلے سال نمایاں ترقی ہوئی ہے۔ مشرق بعید کی فوجی سرگرمیوں کا بھی اس کے کاروبار پر بہت اچھا اثر پڑا ہے۔ چنانچہ ۱۹۳۲ء میں اسکا منافع جو بتیس لاکھ آٹھ ہزار دو سو بانوے پونڈ سے بڑھکر سینتالیس لاکھ انتیس ہزار بہتر پونڈ ہوگیا گویا اس کے منافع میں انتالیس فیصدی کا اضافہ ہوا۔

اس عالمگیر کساد بازاری کے زمانے میں جب کاروبار تباہ ہوچکا ہے، بیکاری زوروں پر ہے، بندگان خدا روٹی کے لئے محتاج ہورہے ہیں۔ ان کمپنیوں کے منافعہ میں معتدبہ اضافہ ہورہا ہے۔ ایسی صورت میں تخفیف اسلحہ کی کانفرنس کو لوگ تماشا نہ سمجھیں تو کیا کریں

روس اور جاپان بھی جنگی تیاریاں کررہے ہیں۔ اٹلی میں فاسزم اور جرمنی میں ہٹلرزم زوروں پر ہے آسٹریا پر دونوں اپنا اپنا اقتدار قائم کرنا چاہتے ہیں۔

حال میں ایک یوروپین کارٹون بنانیوالے نے ایک کارٹون میں تخفیف اسلحہ کانفرنس کا نہایت خوبی کے ساتھ نقشہ کھینچا ہے۔ اس کارٹون کے نیچے "یورپ کا تخفیف اسلحہ شیونگ سیلون" لکھا ہے۔ ایک بھاری بھرکم انسان جو دراصل جنگ کا دیوتا "مارس" ہے ایک کرسی پر آرام کے ساتھ بیٹھا ہوا ہے۔ اسکی لمبی داڑھی سب طرف پھیلی ہوئی ہے اور اسپر جدید آلات حرب کی ترقی کے نشان ہویدا ہیں۔ سر پر بال ندارد ہیں مگر سر کے پچھلی طرف ننھے ننھے بال دکھائے گئے ہیں۔ ایک حجام جو قدوقامت سے بالشتیا معلوم ہوتا ہے تخفیف اسلحہ کا استرا لئے دریافت کرتا ہے "شیو۔ سر؟ Shave Sir (داڑھی بناؤں، حضور؟)" جواب ملتا ہے "نو۔ ہیرکٹ No, Hair cut (نہیں بال کاٹو) اس باکمال آرٹسٹ کا ہاتھ چوم لینے کو جی چاہتا ہے اس کارٹون میں کس خوبی اور وضاحت سے تخفیف اسلحہ کانفرنس اور

موسیٰ رام

از مسٹر غلام محمد خاں، بی۔اے (عثمانیہ)

دارالسلطنت حیدرآباد میں سنٹرل جیل سے تقریباً آدھ میل کے فاصلہ پر ٹھیک مشرقی سمت ایک پر فضا میدان ہے جہاں سطح زمین سے تخمیناً سو فٹ بلند ایک چھوٹی سی پہاڑی ہے جو موسیٰ رام کی ٹیکری کے نام سے مشہور ہے۔ اس پہاڑی پر ایک وسیع مستطیل چبوترہ ہر وقت اپنی قدامت کی یاد دلاتا رہتا ہے اس پر ایک پختہ چوکھنڈی عمارت بنی ہوئی ہے جسکے مقابل مشرق کی طرف پتھروں کا ایک نیم مخروطی شکل کا مینار ہے۔ اسکے چاروں طرف سیاہ رنگ کے چار مستطیل پتھر جڑے ہوئے ہیں تھوڑی دور پر ایک مربعہ پتھر پر J.R. کے حروف کندہ ہیں۔

اس وسیع چبوترے سے کچھ فاصلے پر شمال کی جانب ایک چھوٹا سا چبوترہ ہے جسپر ایک نیم مخروطی شکل کا گچ کا بنا ہوا ایک چھوٹا سا مینار ہے۔ اور مستطیل شکل کی دو قبریں بھی ہیں، ان میں سے بڑی قبر پر ایک سیاہ پتھر جڑا ہوا ہے جس پر "ANN JANE ELIZABETH JENKINS" نام کندہ ہے۔ اس خاتون کی تاریخ وفات ۲۶۔ نومبر ۱۸۰۱ء اور عمر ساڑھے اکیس سال کی اور موت کا سبب زچگی بتایا گیا ہے، معلوم نہیں یہ کس عورت کی قبر ہے۔

اس پہاڑی پر ہر سال مارچ کی پچیس تاریخ کو ایک میلہ لگتا ہے اور چراغاں کیا جاتا ہے جس سے یہ مقام بقعۂ نور معلوم ہوتا ہے۔ سرکار نظام کی فوج کے سیکڑوں سپاہی مرحوم کے اعزاز میں بندوقیں سر کر کے باقاعدہ سلامی اتارتے ہیں۔ آخر میں سپاہیوں کو مٹھائی تقسیم کی جاتی ہے اور موسیٰ رام کی بہادری اور فوجی کمالات کے قصے بیان کئے جاتے ہیں۔ غرض سال میں ایک مرتبہ چند گھنٹوں کے لئے یہاں جنگل میں منگل کا سماں پیدا ہو جاتا ہے۔ اور یہ سب کچھ موسیٰ رام کی جن کا اصلی نام موسیو مشل ژوا شین ماری ریمون (Monsieur Michael Jaoachine Marie Raymond.) تھا اور جو کسی وقت حضور نظام کی افواج کا سپہ سالار تھا یاد تازہ رکھنے کیلئے کیا جاتا ہے۔

ریمون سے پہلے سرکار نظام کی افواج کا سپہ سالار بوسی (Bussy) ایک دوسرا فرانسیسی تھا۔

بوسی بھی اپنے شجاعانہ کارناموں اور اپنے دوستانہ برتاؤ کے باعث فوج میں بہت ہر دلعزیز تھا ہر شخص اسکی محبت کا دم بھرتا تھا۔ اور اس کے مرنے کے بعد بھی عرصے تک دلوں سے اسکی مفارقت کا رنج دور نہیں ہوا تھا۔ بوسی کے انتقال کے بعد جب آصفی فوج کی سپہ سالاری ریمون کے سپرد ہوئی تو اس نے بھی چند ہی روز میں فوج کے ہر سپاہی کے دل میں اپنی جگہ پیدا کرلی۔ یہاں تک کہ اسکی محبت نے سپاہیوں کے دل سے بوسی کی یاد بھلادی۔ اس کے اخلاق حمیدہ اور اوصاف ستودہ ہی کی بدولت آج ڈیڑھ سو سال بعد بھی حیدرآباد کے سپاہی "موسیٰ رام" کا نام ادب و احترام کے ساتھ لیتے ہیں۔

فرانسوا دِ ریموں (Francois De Raymond) ۱۷۵۵ء میں سرینا ک Serignac کے قصبہ گاسکونی (Gascony) میں پیدا ہوا تھا۔ اس کو بچپن ہی سے فوج میں داخل ہونیکا شوق تھا چنانچہ اس غرض سے وہ کم سنی ہی میں ہندوستان چلا آیا اور جنوبی ہند میں جو اس وقت فرانسیسیوں کا مرکز تھا مقیم ہوگیا۔ ان دنوں حیدر علی شاہ میسور کی افواج کا سپہ سالار شولے دِ لاسے (Chevalier De Lasse) یا جیسا کہ مشہور ہے لالے (Lalle) تھا۔ ریموں نے آتے ہی لالے کے پاس رسائی پیدا کرلی اور ۱۷۷۵ء میں وہ ایک فوجی دستے کا سب لفٹنٹ بنا دیا گیا۔ اس کی مستعدی اور خوش اخلاقی کی بدولت جلد ہی فوجی افسروں کی توجہ اسکی طرف مبذول ہوگئی۔ چنانچہ ۱۷۸۳ء میں وہ فرانسیسی فوج کا کپتان مقرر ہوگیا۔ اس کے بعد بوسی کی وفات کے تین سال بعد ریموں نواب نظام علی خاں فرمانروائے حیدرآباد کی افواج میں ملازم ہوگیا اور اس حیثیت سے اُسے نواب موصوف کی ایک اہم خدمت انجام دینے کا موقعہ مل گیا۔ تین سو سلح فرانسیسیوں کی ایک جماعت جس کے اسلحہ کی بہم رسانی ایک فرانسیسی تاجر کے متعلق تھی فی سپاہی آٹھ آنہ معاوضہ کے حساب سے افواج آصفی میں منتقل کرلی گئی۔ گویا اس تاجر کو اس کے صلے میں حضور نظام کے خزانہ سے ڈیڑھ سو روپیہ ماہوار ملتا تھا۔

۱۷۹۱ء میں جب ٹیپو سلطان کے خلاف جنگ کا اعلان ہوا تو انگریزوں نے اس بات کی کوشش کی کہ مرہٹے اور نظام بھی اس جنگ میں اُن کے شریک رہیں چنانچہ اسی وجہ سے ریموں کی فوج میں چار سو فرانسیسی سپاہیوں کا اور اضافہ کردیا گیا، جس کی وجہ سے کل سات سو سپاہیوں کا ایک مسلح دستہ ریموں کے زیر کمان ہوگیا۔ ریموں نے اس جنگ میں کچھ ایسی بہادری اور جاں نثاری دکھلائی کہ نواب نظام نے فتح کے بعد اسکی فوج کی تعداد پانچ ہزار تک بڑھادی اور ریموں کے ماہانے میں بھی پانچ ہزار کا اضافہ کردیا۔

جنگ سے فرصت پانے کے بعد ریموں نے عساکر آصفی میں ایک نئی روح پھونک دی۔ اُس نے پوری فوج کو مغربی اصول پر باقاعدگی کے ساتھ تعلیم و تربیت دینا شروع کر دیا۔ اس محنت و جانفشانی کا پھل اُسے ۱۷۹۵ء میں مل گیا۔ یعنی کھڑکی کی جنگ میں وہ اڑتالیس کلدار اور چھیالیس ولیسی توپوں کے ساتھ دس ہزار آٹھ سو چالیس سپاہیوں کا سپہ سالار بنا دیا گیا۔

اس زمانہ میں فوجی اور دفتری سبھی ملازمین کو وقت پر تنخواہ نہ ملنے کی شکایت رہتی تھی، کئی کئی مہینوں تک تنخواہ نہ ملنے سے ملازم بددل ہو جاتے اور فوجی سپاہی بغاوت کر بیٹھتے تھے۔ اس سے متاثر ہو کر حکومت نظام نے سپاہیوں کی تنخواہیں پابندی وقت کے ساتھ تقسیم کرنا شروع کر دیا جس سے ریموں کی ہمت اور بھی بڑھ گئی اور اس نے ایسٹ انڈیا کمپنی کے سپاہیوں کو باقاعدہ تنخواہ ملنے کے وعدے سے آصفی فوج میں بھرتی کرنا شروع کر دیا۔ چنانچہ ایک عرصے تک وہ اس اصول پر کاربند رہا اور سرکار کمپنی کے ہزاروں سپاہی اپنی فوج میں بھرتی کر لئے۔ اس کارگزاری کے بعد ایک اور اہم خدمت اس کے سپرد ہوئی۔ نواب نظام علی خاں کے بیٹے عالیجاہ وارثِ تاج و تخت نے اپنے باپ کے خلاف علم بغاوت بلند کر رکھا تھا۔ نواب نے باغی بیٹے کی سرکوبی کے لئے ریموں ہی کو انتخاب کیا اور سختی کے ساتھ احکام جاری کر دیے کہ جس قدر جلد ممکن ہو یہ فتنہ و فساد دور کر دیا جائے۔ پہلے تو ریموں کو اس معرکے میں سخت مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ مگر اس نے ہمت نہ ہاری اور نہایت جوانمردی کے ساتھ ان تمام مصائب و مشکلات کا مقابلہ کرتا رہا۔ عالیجاہ کی فوج باقاعدہ طور پر مسلح تھی، اسلئے یہ معرکہ سخت تھا دورانِ جنگ میں ریموں کی فوج کے پاؤں اُکھڑتے نظر آئے مگر اُس نے پہلے ہی سے اس بات کا انتظام کر رکھا تھا کہ اسکا ماتحت باپٹسٹ (Baptiste) نامی مزید کمک لیکر وقت پر موقعہ جنگ پر پہونچ جائے، چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ اس امدادی فوج کے آتے ہی ریموں کے سپاہیوں کی ہمت بڑھ گئی اور وہ پوری طاقت کے ساتھ غنیم پر ٹوٹ پڑے۔ تھوڑی دیر کی گھمسان لڑائی کے بعد میدان ریموں کے ہاتھ رہا۔ عالیجاہ کی فوج شکست فاش کے بعد منتشر ہو گئی اور خود عالیجاہ گرفتار کر لیا گیا۔ لیکن اُس نے باپ کو صورت دکھانا گوارا نہ کیا۔ بلکہ زہر کھا کر خود اپنا خاتمہ کر لیا۔ اس خبر کے معلوم ہوتے ہی نواب کو سخت صدمہ پہونچا۔ بہرحال عالیجاہ کے انتقال کے بعد نواب ممدوح کے منجھلے فرزند سکندر جاہ کی ولیعہدی کا اعلان کر دیا گیا۔ اس خوشی میں سکندر جاہ نے جنرل ریموں کی بڑی قدردانی کی اور اس سے بیحد محبت سے پیش آنے لگا۔

کھڑکی کی فتح کے بعد سے سپہ سالار ریموں کی حریفیں نظریں کڑپہ کی طرف لگی ہوئی تھیں جسکی

اصل وجہ یہ تھی کہ کڑاپہ کے حکومت نظام میں شامل ہو جانے سے فرانسیسی قوم کو بہت کچھ فائدہ کی امید تھی اسمیں ایک بڑا راز یہ بھی تھا کہ کڑپہ پر قبضہ پانے کے بعد حکومت نظام کو تمام ساحل کارومنڈل پر اقتدار حاصل ہوتا تھا، جسکی وجہ سے تمام فرانسیسی فوجیں اس ساحل پر اتر کر بلا کسی مزاحمت کے حدود حیدرآباد میں داخل ہو کر حکومت نظام کو مدد دے سکتی تھیں۔

اس وقت تک جنرل ریموں کے تحت اس قدر سپاہی آگئے تھے کہ اُن کے اخراجات کے لئے باون لاکھ روپیہ سالانہ کے محاصل کا وسیع رقبہ اسکی نگرانی میں دیدیا گیا تھا۔ ریموں کو تنخواہ کے علاوہ ایک علیحدہ جاگیر انعام کے طور پر عطا ہوئی تھی جس کی سالانہ آمدنی پچاس ہزار روپیہ سے بھی زائد تھی۔ اس غیر معمولی آمدنی کے باعث اب ریموں نہایت متموّل اور آسودہ حال ہو گیا تھا اور اُسے اپنی روزمرّہ زندگی میں ہر قسم کا عیش و آرام نصیب تھا۔ یہاں تک کہ ریموں کی اس امیرانہ شان و شوکت پر خود اُس کے ہموطن رشک کرتے تھے کیونکہ پیرس کے دولتمند اشخاص کو بھی ریموں کا سا عیش و آرام نصیب نہ تھا۔

۱۷۹۶ء تک جنرل ریموں نے حکومت نظام کی فوج میں معتدبہ اضافہ کر دیا تھا، اس نے اس فوج کا نام جسکی تعداد چودہ ہزار سے زائد تھی حکومت نظام کی فرانسیسی امدادی فوج رکھا۔ اس کے ساتھ ایک مکمل توپخانہ بھی تھا جسکی تمام توپیں کلدار تھیں، اس توپخانہ پر دو یوروپین افسران مقرر تھے، اسکی اہمیت کے صحیح اندازہ کے لئے صرف اتنا کہدینا کافی ہے کہ اسکی باربرداری کے لئے تقریبًا پانچ ہزار بیل درکار ہوتے تھے۔ ریموں کی فوج پیدل سپاہیوں کی تھی لیکن وہ انکی امداد کے لئے ہمیشہ چھ سو مسلح سوار بھی رکھتا تھا۔ معرکۂ جنگ میں یہ سوار اور پورا توپخانہ جنرل ریموں کے داہنے طرف رہتا تھا تاکہ حکم پاتے ہی یہ بجلی کی طرح دشمن پر ٹوٹ پڑیں۔ بعض روایات کے مطابق اس بہادر سپہ سالار نے صرف تینتالیس[۴۳] سال کی عمر میں ۲۵۔ مارچ ۱۷۹۸ء کو زہر کھا کر خودکشی کر لی۔ مگر بعضوں کا خیال ہے کہ اسکو زہر دیکر مارا گیا اِن روایتوں کی صحت کے متعلق ابتک اختلاف رائے ہے۔ اصلی وجوہ ابھی تک تحقیق نہیں ہو سکے۔

سپہ سالار ریموں کے اخلاق و عادات کے متعلق مختلف مصنفین نے اپنے اپنے طور پر بہت کچھ لکھا ہے۔ میجر تھارن کا خیال ہے کہ ریموں ایک محنتی اور جفاکش افسر تھا اور اسکی معلومات بہت وسیع تھیں کالئی نے اپنی مشہور کتاب سوانح میلکم میں لکھا ہے کہ ریموں بڑا مستعد اور قابل افسر تھا اور ہر شخص اسکی دل سے عزت اور وقعت کرتا تھا۔ میلکم نے پیرون (Piron) اور ریموں کا مقابلہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ پیرون ان عادات و اطوار سے بالکل ناآشنا تھا جو اس کے پیرو موسیو ریموں میں موجود تھے۔

اِن روایتوں کے برعکس میجر کرک پیٹرک (جو ۱۷۹۷ء میں حیدرآباد دکن کے رزیڈنٹ تھے) کی رائے

یہ ہے کہ بظاہر تو ریموں کے بشرے سے کسی قسم کی قابلیت مترشح نہیں ہوتی تھی، اور نہ وہ کوئی خاص کیرکٹر کا آدمی معلوم ہوتا تھا بلکہ وہ بڑا حریص اور بخیل واقع ہوا تھا جس کی وجہ سے اس کے ماتحت اس کو عموماً نفرت و حقارت کی نظروں سے دیکھتے تھے۔ بجز اُن معدودے چند آدمیوں کے جن کے ساتھ وہ عنایت و مہربانی سے پیش آتا تھا۔ اسمیں اگر کوئی خوبی تھی تو یہ کہ وہ بڑا چالاک، مکار اور دغاباز واقع ہوا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فطرت نے اسکا دماغ اس وقت کے حالات کے عین مطابق بنایا تھا۔ اسکی بڑی خصوصیت یہ تھی کہ وہ باتوں ہی باتوں میں سننے والے کو اپنا بنا لیتا تھا۔ ایک دوسرے انگریز ریزیڈنٹ کپتان فریزر نے اپنی تصنیف "ہمارے یار وفادار حضور نظام" نامی میں اس رائے کی بڑے زوردار الفاظ میں تائید کی ہے چنانچہ وہ لکھتا ہے کہ "ریموں میں نہ کوئی بلند حوصلگی تھی اور نہ قوت فیصلہ" لیکن اس کے برعکس مولیسن (Mollison) نے جنرل موصوف کی تعریف کے پل باندھ دیئے ہیں۔ ان رایوں کے متعلق ہم خود کوئی فیصلہ نہیں کرنا چاہتے۔ تصویر کے دونوں رخ ناظرین کے سامنے پیش ہیں وہ جو نتیجہ چاہیں اخذ کر لیں۔

ریموں کی فوج کی تعداد کے متعلق مفصل حالات خود ریموں کے مختلف خطوں سے معلوم ہوتے ہیں اس کی فوج کے اخراجات کس طرح پورے ہوتے تھے اور اس کے پاس کتنے اسلحہ تھے ان کے متعلق صحیح اور مصدقہ حالات معلوم ہو سکتے ہیں کیونکہ میجر کرک پیٹرک ریزیڈنٹ حیدرآباد اور مارکوئس وِلزلی (گورنر جنرل ہند) کے درمیان اس کے متعلق خط و کتابت ہوئی تھی جسکا ماحصل مارکوئس وِلزلی نے رائٹ آنریبل ہنری ڈنڈاس صدر بورڈ آف کنٹرول لندن کو راس امیہ سے اپنے خط مورخہ ۲۳۔ فروری سنہ ۱۷۹۸ء میں لکھکر بھیجا تھا۔ اسکی پوری عبارت وِلزلی کے خطوط کے حصہ اول (الف) صفحات ۶۳۷-۶۴۳ پر درج ہے۔ اس کے علاوہ اس زمانہ کے فرانسیسی عہدہ داروں کے اخلاق و عادات کی دلچسپ کیفیت میلکم کی یادداشت (خطوط وِلزلی حصہ اول (الف) صفحات ۶۸۵-۶۸۶) میں بھی لکھی ہوئی ہے۔ یہ یادداشت میلکم نے ملازمت چھوڑنے کے بعد اُن حضرات کیلئے لکھی تھی جو اپنے پیشرووں کے حالات جاننے کے شائق تھے۔ ان تحریروں کے مطالعہ کے بعد میجر کرک پیٹرک کی رائے کچھ زیادہ وقیع نہیں معلوم ہوتی ہے۔

ریموں کی وفات کے ساتھ گویا فرانسیسی فوج ہی کا خاتمہ ہو گیا، اُن کے فوجی اسٹوروں سے بہت کم سامان برآمد ہوا، البتہ بہت سے پستول برآمد ہوئے۔ جنرل ریموں کے وقت میں فرانسیسی فوج کے متعلق تین زبردست بارود خانے تھے، اسکے علاوہ فوجی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے دو اور کارخانے بھی تھے دارالسلطنت حیدرآباد میں جو بارود خانہ قائم کیا گیا تھا اسمیں بارود اور ہر قسم کے جنگی ہتھیاروں کا بہت بڑا

ذخیرہ موجود تھا، دوسرے بارود خانے میں پیتل کی بنی ہوئی کئی زبردست توپیں رکھی ہوئی تھیں جنھیں دیکھکر اُس وقت کے انگریزی توپخانہ کے عہدہ داروں نے یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ "ایسی توپیں کبھی دیکھنے میں نہیں آئی ہیں۔ فرانسیسی کاریگروں نے ان توپوں کو دارالسلطنت ہی کے کارخانے میں تیار کیا تھا جہاں بہترین قسم کی بندوقیں پستول اور تلواریں وغیرہ بھی بکثرت تیار ہوتی تھیں۔ اس زمانہ کی فرانسیسی فوج کی وردی بھی نہایت نفیس اور خوشنما ہوتی تھی اور تنظیم میں بھی وہ دوسری فوجوں سے بڑھی ہوئی تھیں۔

اُس زمانہ کے فرانسیسی عہدہ داروں کی عام گفتگو سے ظاہر ہوتا تھا کہ انھوں نے بہت سے خیالی پلاؤ پکا رکھے تھے اور اُنکی نظریں بہت دُور تک پھیلی ہوئی تھیں، اور وہ دکن میں فرانس کا اقتدار قائم کرنے کی فکر میں تھے۔ بہرحال ریموں کے خطوط کا غائر مطالعہ کیا جائے (یہ خطوط روزنامہ "منشور" کے سالگرہ نمبر ۱۹۳۳ء حیدرآباد دکن میں شائع ہوچکے ہیں) تو اس زمانہ کے سیاسی حالات پر اچھی خاصی روشنی پڑتی ہے

ریاست حیدرآباد میں جنرل ریموں کی تلوار ابھی تک حفاظت سے رکھی ہوئی ہے، اسے مبارک خیال کیا جاتا ہے، چنانچہ ریموں کی وفات کے بہتّر سال بعد جب سر سالار جنگ نے ریاست کی باقاعدہ فوج کو ترتیب دینا شروع کیا اور اسمیں مختلف یوروپین عہدہ دار مقرر کئے تو اس کے سپہ سالار کو بطور یادگار جنرل ریموں کی تلوار دیگئی۔

بچوں کی کتاب

یہ ساڑھے چار جزو کی کتاب حامد علی صاحب بی۔اے۔ ایل ٹی نے بچوں کیلئے بطور "ریڈر" لکھی ہے جسمیں سلیس اور آسان زبان میں چھوٹی چھوٹی باتصویر کہانیاں نظم و نثر میں درج کی گئی ہیں۔ اسمیں مولانا محمد اسمٰعیل میرٹھی، مولانا آزاد، مہر دہلوی کی بھی بعض مشہور نظمیں درج ہیں، مثلاً

رب کا شکر ادا کر بھائی — جس نے ہماری گائے بنائی

مرغی کا گیت بھی بہت دلچسپ ہو جسکا پہلا شعر یہ ہے ؎

کوئی بتلائے نہیں پیدا ہوئے ہیں آج تک — ایسے موٹے تازے بچے کٹ کٹ کٹ کٹ کٹ

یہ کتاب بچوں کیلئے یقیناً مفید ثابت ہوگی ہم اسکی سفارش کرسکتے ہیں۔ لکھائی چھپائی روشن، کاغذ عمدہ۔ قیمت ۴؍

ملنے کا پتہ: مکتبہ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی۔

تاریخی مجلس

(از مرزا فدا علی صاحب خنجر لکھنوی)

انتزاع سلطنت کے ساتھ ہی اودھ کی تمام رونقیں کلکتے کی طرف منتقل ہونا شروع ہو گئیں۔ رحیم النفس بادشاہ نے راضی برضا ہو کر بیگناہوں کے خونِ ناحق کا خیال کرتے ہوئے حکومت کی عنان دوسرے ہاتھوں کو سونپ دی۔ رعایا، وطن اور ملک کو تڑپتے ہوئے دل اور لرزتی ہوئی آواز سے الوداع کہا اور سفر میں مفر کا جلوہ دیکھتے ہوئے کوچ در کوچ بنگال جا پہنچے۔ ہزارہا نمک خواران شاہی جوش رفاقت میں دامنِ دولت سے لپٹے ہوئے ہمراہ رکاب آئے اور "مٹیا برج" کو لکھنؤ کا چھوٹا سا ٹکڑا بنا دیا

منجملہ اور اور چیزوں کے ایک چیز عزائے حسین بھی تھی جو مومنین کے قلوب میں بیٹھکر یہاں پہنچی، اور انہوں نے بنگال کی زمین میں اس کی تخم ریزی کرتے ہوئے خونِ دل کے آنسوؤں سے سینچ سینچ کر کھیتی کو ہرا کیا چنانچہ آج کلکتے میں متعدد درگاہیں متعدد کربلائیں اور متعدد امام باڑے گزشتہ عہد کی یاد تازہ کرنے کو موجود ہیں جو ہر سال ایام عزا میں شمسوار دوش رسول و جگر پارۂ علی و بتول کے واقعۂ مصیبت کی تجدید کرتے رہتے ہیں۔

انھیں امام باڑوں میں سے ایک امام باڑہ "سبطین آباد" کے نام سے مشہور ہے جس کی تعمیر بادشاہ کی ایک چہیتی بیگم کے ایما اور صرف سے عمل میں آئی۔ اور اب اسی امام باڑے کے ایک مختصر حجرے میں اودھ کا مظلوم اور غریب الدیار سلطان خواب ابدی میں مصروف ہے۔ جب ہوائے مرگ نے اس کی آنکھوں کو بند، قلب کو ساکن اور زبان کو خاموش نہیں کیا تھا۔ جب بزم ہستی ایک بے تاج و نگیں تاجدار کے وجود سے نسبتہً زیادہ رونق پر تھی اُس وقت اس امام باڑے کی زیب و زینت اور عروج کا وہی عالم تھا جو کسی زمانے میں لکھنؤ کے بڑے امام باڑے (نواب آصف الدولہ کا امام باڑہ) حسین آباد اور شاہ نجف وغیرہ کو نصیب رہ چکا ہے۔ ادھر اُفق گردوں پہ ہلال محرم نے ظاہر ہو کر ماہِ فاطمہؑ کے جگر تشگان واقعۂ خسوف کی یاد تازہ کی اور مخدرات معلّٰی کا زیور بڑھنے لگا، زینتیں ترک ہوئیں۔ اسباب سرور برطرف کیا گیا، سیاہ پوشی اور سبز پوشی شروع ہو گئی۔ بال بچے، جوان بوڑھے، عورت مرد سب کے جسموں میں لباس عزا کی بہار نظر آنے لگی! گھریلو امام باڑوں کے دروازے عام پذیرائی کے واسطے کھول دیے گئے۔ علم کھڑے ہوئے، تابوت سجے گئے۔ دلدل

آراستہ ہوئے، ضریحوں اور تعزیوں سے تزئینِ عزا کیگئی، گھروں سے نوحہ و ماتم کی دلدوز صدائیں بلند ہوئیں ایک صبح سے دوسری صبح تک دَورے کی مجلسوں کا سلسلہ جاری ہوگیا، مومنین جملہ امور سے دست کش ہوکر فریضۂ تعزیت کی ادائیگی میں مصروف ہوگئے اور یہ تسلسل عشرۂ محرم تک کمال شد و مد اور اس کے بعد سے اربعین تک معتدل عنوان سے قائم رہا۔

عشرۂ محرم میں جہاں پناہ لباس عزا در بَر اعیانِ دولت کے جھرمٹ میں بنفس نفیس تشریف لاکر "سبطین آباد" کی شاہی مجلسوں میں شریک ہوتے اور ایصال ثواب کے بعد "سلطان خانے" میں مراجعت فرماتے۔ ان ایام میں ہر روز بیگمات کی طرف سے حضرت ظلِ سبحانی کو منّتیں اور کلاوے پہنائے جاتے، وہ شاہی مجلسوں کے علاوہ بیگموں، شہزادوں، شہزادیوں اور نمک خوارانِ دولت کی منعقد کی ہوئی مجلسوں میں کمال حسنِ عقیدت اور دلی ذوق و شوق سے شرکت کرتے۔

خداوند جل و علا نے جس طرح شاہ اختر کو اودھ کا ہر دلعزیز فرماں روا بنایا تھا، اسی صورت سے قلمروئے سخن کی حکمرانی بھی انھیں عطا فرمائی تھی۔ جب وہ برسرِ اقتدار تھے اُس وقت بھی امور مملکت اور دادِ دہش کے ساتھ ساتھ علمی و ادبی شوق عروج پذیر تھا۔ لٹریری ٹکسال میں فصاحت و بلاغت کے سکّے ڈھالا کرتے تھے، پھر جب خود غرض نا اہلوں کی غلط اندیشی کے خمیازے میں حکومت سے دست کشی کرنا پڑی تو یہ مشغلہ کچھ اور ترقی کر گیا۔ یہی سبب ہے کہ اس علم پرور صاحب تفضل و کمال بادشاہ نے اپنے بعد مختلف زبانوں میں تصانیف نظم و نثر کا اتنا کثیر ذخیرہ چھوڑا ہے جو عالم کے کسی بڑے سے بڑے مصنف سے کم نہیں کہا جاسکتا۔

علی الخصوص تصنیف کا وہ حصہ جس سے اس ہر دلعزیز بادشاہ کی مذہبی عقیدت کو گہرا تعلق ہے ایک ایسا نضارت بخش باغ ہے جس کا ایک ایک پھول۔ ایک ایک کلی۔ ایک ایک پتی پنجتن پاک و چہاردہ معصومین صلوٰۃ اللہ علیہم اجمعین کی بے انتہا مودّت و ارادت کی آئینہ داری کرتی ہے۔

سلطنت کی تباہی کے بارہ برس بعد تقریباً ۱۸۶۹ء میں اس تاجدار اقلیم سخنوری نے عظیم الشان مجمع کے سامنے اپنا نو تصنیف مرثیہ پڑھ کے بارگاہِ رسالت سے اجر ثواب حاصل کیا تھا۔ یوں تو ہمیشہ ولائے اہلبیت علیہم السلام عشرۂ محرم اور خاص خاص موقعوں پر ذاکری سید الشہداء کا مشورہ دیتی اور اکثر مجلسیں بلبلِ بوستانِ امامت کے مقدس زمزموں سے فردوس گوش بنا کرتی تھیں، اگرچہ اودھ کا یہ تاج و تخت سلطان لیکن درِ بوتراب کا ادنیٰ خادم دربار حسینی میں عقیدتمندانہ افکار کے جواہر پارے بطور نذر پیشکش کرنیکا عادی تھا مگر اس مجلس میں اس نے نہایت درد آگیں عنوان سے رجعتِ وطن اور واپسی ملک و اقبال کی التجا ظاہر کرکے سامعین کے دُکھے ہوئے دلوں کو بے انتہا متاثر کردیا جس کی بدولت اِس بزمِ عزا کو ایک تاریخی اہمیت حاصل ہوگئی ہے۔

غالباً محرم کی آٹھویں تاریخ تھی اور عباس علمبردار کی نذر کا دن تھا۔ دوپہر ڈھل رہی تھی۔ امام باڑے کا وسیع مربع صحن اور دالان سامعین سے کھچا کھچ بھرے تھے۔ مجمع کا یہ عالم کہ کہیں تل دھرنے کی جگہ نہیں ملتی اور شائقین کی وہ کثرت کہ آنیوالوں کا تار نہیں ٹوٹتا۔ شاہی ملازم اہتمام و انتظام میں ہمہ تن مصروف۔ جہاں پناہ کے انتظار میں تمام نگاہیں فرش پا انداز۔ یکایک عصا بردار نظر آئے، برقی لہر کی طرح اس سرے سے اس سرے تک سلطانی ورود کی خبر دوڑ گئی۔ دیدار آقا کی پذیرائی کو حاضرین سرو قد کھڑے ہو گئے۔ جانِ عالم معتقدانِ خاص کے حلقے میں مخصوص وقار کے ساتھ مجمع کے درمیان سے گذرتے ہوئے منبر کے قریب تشریف لائے۔ جسم مبارک میں ماتمی لباس تھا۔ پُرصورت چہرے سے وہی حُزن ٹپک رہا تھا جو ان دنوں میں مومنین کی صورتوں پر نورِ ایمان کی غازہ گری کرتا رہتا ہے اور جس کے سبب سے اُن کا راز ولا تاڑا جا سکتا ہے۔ جلو میں تمام شاہزادے اور مرشد زادے، اُن کے عقب میں ارکینِ دولت وزیر السلطان نواب امیر علی خاں آمیر، مہتاب الدولہ رخشاں، حامد الدولہ برتر، حمید الدولہ شوق، ضرغام الدولہ وغیرہ۔ شعرائے دربار میں قانع۔ ثاقب۔ شاذ ضیا۔ ہنر۔ بہار۔ تیخود عیش۔ شرف یاور وغیرہ وغیرہ۔

جب نظمِ مجلس ترتیب پا چکا تو حضرت ظلِ سبحانی اُٹھے، منبر کے زینے کو خلوص و ادب سے بوسہ دیا اور سورۂ فاتحہ کی تلاوت کے بعد سر منبر تشریف لائے۔ مجمع پر گہری خاموشی چھا گئی۔ کوئی لب ایسا نہ تھا جسے ذرا بھی حرکت ہوتی ہو اور کوئی گوش ایسا نہیں دیکھا گیا جو ذاکرِ امام ہمام کی آواز پر نہ لگا ہو۔ ساری مجلس ہمہ تن انتظار بن کے رہ گئی تھی۔ کہ لب سخن گو کو جنبش ہوئی۔ فضا میں رباعی کا پہلا مصرع گونجا۔ صاحبانِ علم و فن نے مصرعہ اُٹھایا اور بزم عزا محشرستان سخن بن گئی جو نہیں رباعی کے چاروں مصرعے تمام ہولئے۔ خاتمہ پہ داد کلام کا غلغلہ بلند ہوا۔ ہر چند شائقین کو سیری نہ ہوئی تھی لیکن طبع ہمایوں کی ناسازی کا خیال مزید تکلیف دہی سے روکے رہا اور بادشاہ نے چند رباعیوں کے بعد نو تصنیف سلام شروع کیا، وہو ہذا:-

ہوا نہ رن میں شہِ تشنہ کا کلام تمام — کیا جو حرملہ نے لختِ دل کا کام تمام
ہزار و نہ صد و پنجاہ زخم تھے تن پر — بھری تھی خون میں رہوار کی لجام تمام
اُٹھا نہ سکتے تھے لاشے کو گھوڑے پر شہِ دیں — یہ چور زخموں سے تھے اکبرِ کرام تمام
قلم بھی جھک گیا سجدے کو وہ ملی لذت — لکھے جو لوح پہ چودہ تنوں کے نام تمام
کسی میں ہوش نہ باقی تھا وقتِ قتلِ حسین — کلیجہ تھام کے روتے تھے خاص و عام تمام
حرم تھے اونٹوں پہ انبوہِ خلق اتنا تھا — بھرے ہوئے تھے تماشائیوں سے بام تمام

اگرچہ لاشے تھے ظاہر میں خاک پر لیکن | بزیرِ عرش بریں تھے وہ خوش مقام تمام
اگر سیاہی ہو دریا فلک بنے قرطاس | نہ ہو سکے یہ مگر حالِ غم مدام تمام

غضب کی شدتِ رقت ہے روحِ زہرا کو
بس اب رُلا چکے اختر کرو سلام تمام

سلام کے تہکی شعروں پر کہرام مچ گیا۔ شور و شیون سے کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی، جب وقت کا جوش تھما تو لفظ "فاتحہ" کے بعد مرثیہ کی ابتدا ہوئی سہ

(چہرہ)

خدا کرے کہ کسی کا جدا حبیب نہ ہو | یہ داغ وہ ہے کہ دشمن کو بھی نصیب نہ ہو
کبھی زمانۂ درد و الم قریب نہ ہو | غضب ہے، ہو مرضِ ہجر اور طبیب نہ ہو

غبارِ باد کو درکار آبِ باراں ہے
دوا مریض کی دیدِ بہارِ بستاں ہے

کسی پدر سے نہ چھوٹے پسر ضعیفی میں | نہ بے پسر کا ہو یا رب پدر ضعیفی میں
نہ رنج بازو سے ٹوٹے کمر ضعیفی میں | نہ گم ہو آگے سے نورِ نظر ضعیفی میں

چراغ لالہ سے اندھیر ہو نہ گلشن میں
نہ بدلے پھولوں کے کانٹے درآئیں دامن میں

کمالِ زخم کی لذت جگر سے پوچھو تو | فراقِ دردِ برادر کمر سے پوچھو تو
چھری کی تیزیاں مرغِ سحر سے پوچھو تو | جفا شکست کی فتح و ظفر سے پوچھو تو

یہ صدمے ابنِ علیِ ولی پہ گذرے ہیں
یہ رنج ابنِ وصیِ نبی پہ گذرے ہیں

(سراپا)

سوار گھوڑے پہ اس طرح سے ہیں شاہِ جہاں | کہ جیسے صفحۂ سادہ پہ آیۂ قرآں
ویا سر پہ سما پر شکوہِ ماہِ عیاں | فلک پہ جیسے ملک، لوح پر قلم کا نشاں

نظر میں راکب و مرکب ہے نور کا بکّا
شعاعِ روشنیِ کوہِ طور کا بکّا

ادب سے ترقوا گویا زبانِ جن و ملک | بندھا ہوا تھا تقِ غم سما سے تا بسمک

شعاعِ چہرۂ روشن زمیں سے تا بفلک سحابِ رخ میں روے قمر بہا کی چمک
وہ ابر ڈھالوں کا، نیزے کے پھل وہ برقِ تیغ
کماں سے کھنچا تھا ہر تیر چل، وہ برقِ تیغ
وہ فرقِ شاہ ہدا مخزنِ امامت تھا جمالِ آدم و حوّا مہِ کرامت تھا
جو نون کن کا وہ نقطہ دلِ نبوت تھا تو سر میں سر تھا سراسر یہ نیک صورت تھا
اگر وہ افسیر و لمائے دوجہاں سر تھا
فلک پہ نور، زمیں پر مہِ منوّر تھا
عذار صاف نمایاں ہیں یوں تہ مژگاں گھنے درختوں میں جس طرح پھول ہوں خنداں
حلب کے آئینے دو، نجم کہکشاں تاباں دھرے ہیں قطعۂ الماس، مہر و ماہ عیاں
وہ پارہ ہائے پر انوار رشکِ گوہر ہیں
قمر ہیں، گروہ مہتاب ہیں، منوّر ہیں
لبِ مبارک ابن علی ہیں گل کا ورق یہ لب تو طائرِ سدرہ کو دے رہے ہیں سبق
چبائے ہیں جو لبِ خشک بہر رنج و قلق تو دانت نکلے ہیں منہ میں موتیوں کا طبق
قیاس میں لبِ نازک ہیں نور مہر فلک
ہوا ہے پیاس سے رخ پہ ظہور مہر فلک
(نرغۂ اعدا)
پرے جمے ہوئے تھے جیش بر کے جنگل میں گھرا ہوا مہِ زہرا سیاہ بادل میں
نہ دم یمین و یسار اور نہ جا ہراول میں نمودِ شاہ تھی جس طرح آنکھ کاجل میں
کمانیں چھائی تھیں، تیروں کی بھی تھیں بوچھاریں
صدائیں دیتے تھے مظلوم کو حلو ماریں
(پسر سعد سے گفتگو)
اگر خصومتِ بیعت ہے، اس صغیر سے کیا مجھی سے دشمنی گر ہے جوان و پیر سے کیا
زمین سے ہے عداوت مہِ منیر سے کیا ہے ایک تن پہ جفا، لشکرِ کثیر سے کیا
عبث یہ کینۂ دیرینہ پُر ہے سینے میں
نہ چھوڑا ہم میں سے اک دم کو بھی مدینے میں

جنگ مغلوبہ (تلوار)

تڑپ تھی تیغِ مصفا کی یا شرر بجلی — عدم عذاب سقر نار قہر شر بجلی
تنور و دوزخ و آفت ستم خطر بجلی — قیامت و تعب و درد و خوف گر بجلی

ادھر سے آئی ادھر پھر گئی چھلاوا تھا
رخ زمین و زماں اسپ خوش کا کاوا تھا

تڑپ کے جاتی تھی گو مثل برق دریا پر — کڑک کے گرتی تھی آفت کی طرح صحرا پر
تزلزل ایک نمایاں تھا عرش اعلیٰ پر — ہوئی تھی مہر خموشی لب مسیحا پر

اڑے تھے پنبۂ حلاج کی طرح اشجار
ذبیحوں کو ملک الموت کر رہا تھا شمار

ہوا تھی، سانس تھی، اک بات تھی، تر ارا تھا — ظہورِ حشر تھی، بھونچال تھی کہ پارا تھا
ہر اک ہوس کو تہ خاک جس نے مارا تھا — جمالِ تیغ کا ماہی تلک گذارا تھا

ہوا تلاطم امواج بحر پر جو گری
فلک الٹ گئے جب بحر سے زمیں پہ پھری

جلال

غبارِ چہرۂ گردوں دلیل ماتم تھا — مصیبت دلِ عالم مہ محرم تھا
فدائے عارضِ روشن جمالِ عالم تھا — شہِ کریم کا دریائے غیظ برہم تھا

ادب سے تھا ملک الموت سر جھکائے ہوئے
پر اشک چشم شہ بحر و بر میں آئے ہوئے

سمجھتا تھا مصیبت سے شہ کو دشتِ بلا — فراقِ اکبرِ مظلوم تھا سحاب بقا
ضعیفی میں جو چھٹا اصغرِ خجستہ لقا — تو اس کا گرہ میں اپنی لئے ہوئے لاشا

ہر ایک سمت وہ ضیغم کی طرح دوڑتے تھے
خرام نیر اعظم کی طرح دوڑتے تھے

کبھی یسار و یمیں اور سامنے گاہے — بدن پہ زخم نمایاں حباب تیر سے تھے
عزیز و خویش و برادر سب ہر جگہ مردے — زمیں سے تا بفلک صاف آہ کے نالے
پلٹ کے دیکھا تو لشکر کو خاک پر دیکھا — دکھایا کشتوں نے لشتہ جدھر جدھر دیکھا

(شہادت کے وقت سیدۂ پاک کو ندائے غیب)

وہ دیکھ! تیر لگاتے ہیں جسم پر ناری　　وہ دیکھ! نوک بھی برچھی کی ایک نے ماری
وہ دیکھ! چھاتی بھی تیروں سے بھر گئی ساری　　وہ دیکھ! زخموں کی تن پر ہوئی ہے گلکاری

وہ دیکھ! لوٹتا ہے میرا دوست مقتل میں

وہ دیکھ! لیٹتا ہے تیرا شیر جنگل میں

وہ دیکھ! سسکیاں لیتا ہے دم ہے ہونٹوں پر　　وہ دیکھ! ہاتھوں سے چھوٹا ہے نعشۂ اصغر
وہ دیکھ! آئی ہے زینب بھی اب برہنہ سر　　وہ دیکھ! جلتا ہے شاہِ غریب کا بستر

وہ دیکھ! شمر طمانچے کہیں لگاتا ہے

گلا اسیروں کا رسی سے باندھا جاتا ہے

قہر الٰہی کو روکنے کے لئے جناب سیدہ کی التماس

کہا یہ حضرتِ زہرا نے اے کریم جہاں　　امان مانگتی ہوں دے اماں امان اماں
کیا جو فدیہ تری راہ میں یہ شہ نے زیاں　　عوض میں اس کے عطا کر سبھوں کو باغِ جناں

تحب جو اسکے ہوں شاداں رہیں زمانے میں

جو روئیں اس پہ وہ خنداں رہیں زمانے میں

میں اپنے بابا کی امت کی خود دعاگو ہوں　　نہ نکلے کلمۂ کفر یں جو ہوئے حال زبوں
بنائے گو فلکِ پیر زخموں سے گلگوں　　مگر نہیں ہے یہ ممکن دعائے بد میں کروں

مرے کریم! ترا رحم ہو غریبوں پر

یہ بار رہنے دے تو اُن کے دستگیروں پر

(شہادت اور خاتمۂ کلام)

عزیزو! روح قلم آگے لڑکھڑاتی ہے　　تو فکرِ شاعرِ غمخوار بیٹھی جاتی ہے
سوارِ دوشِ محمد کی آہ جاتی ہے　　کہ جس کو نکبتِ شمرِ لعیں دباتی ہے

کشیدِ خنجرِ آفت جو بارہ بار ہوئی

تو کشتی مذہبِ اثنا عشر کی پار ہوئی

ہوا سیاہ ہوئی زلزلہ ہوا طاری　　ہر اک رئیس کی آنکھوں سے اشک تھے جاری
شالِ بید لرزتے تھے خوف سے ناری　　ظفر کے کوس بجاتے تھے پر بنا جاری



سر راس مسعود صاحب وائس چانسلر علیگڑھ
مسلم یونیورسٹی



سر شیخ عبدالقادر، صدر انڈیا کونسل معہ لوڈی صاحب

مجتبیٰ! خاتمہ پنجتن ہوا ہے ہئے
خزاں رسیدہ جمالِ چمن ہوا ہے ہئے

(دعائے اختر)

خموش اختر غمگیں کہ اب یہ دل سے دعا | لٹا ہوا ہوں میں بارہ برس سے شاہ ہدا
دلیلِ شیعہ گری یہ ہے لے مرے مولا | ثبوت اس سے ہے اثنا عشر ہے دین مرا

بس اب یہ بارہ دری میری مجکو مل جائے
ہر اک امام مدد میرے گھر کی فرمائے

مجلس میں پٹّس پڑ گئی، شیون وشین کی آوازیں در و دیوار سے ٹکرانے لگیں۔ خود بدولت کو بھی رقت کا جوش تھا، دو مصاحبوں نے بازو تھام کے منبر سے اُتارا، ادھر حضرت بوچہ پر سوار ہو کر سلطان خانکو سدھارے ادھر مومنین کو تبرک تقسیم ہونے لگا۔

اُردو کمپوزیشن (دوسرا حصہ)

یہ کتاب مولوی محمد اظہر علی فاروقی صاحب لکچرار فارسی و اُردو اُودے پرتاب انٹرمیڈیٹ کالج بنارس نے ایجوکیشن بورڈ کے تجویز کردہ نصاب کے مطابق اسکول کے طالب علموں کے فائدے کی غرض سے انگریزی طرز میں تصنیف کی ہے۔ اس میں خطوط نویسی، مضمون نویسی اور افسانہ نویسی کے متعلق ہدایات، خاکے اور نمونے درج ہیں۔ تین قسم کے مضامین درج کئے گئے ہیں اور اسی لحاظ سے اس کتاب کو تین حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ (۱) افسانہ نویسی (۲) خطوط نویسی، اور (۳) مضمون نویسی۔ فاضل مصنف نے ان تینوں باتوں کو عام فہم الفاظ میں بہت دلنشین پیرایہ سے سکھایا ہے۔ کتاب طلبا کے لئے واقعی ایک تجربہ کار استاد کا کام دے گی۔

فاضل مصنف نے لکھنؤ پر جو مضمون لکھا ہے اسمیں اسکی وجہ تسمیہ یوں بیان کی ہے:-

"پُرانے زمانہ میں اسکا نام لکھنوتی تھا جو ایک ہندو لکھنا کے نام سے آباد تھا۔ کثرت استعمال کی وجہ سے لکھنؤ ہو گیا ہے۔"

مگر ہمیں اس وجہ تسمیہ کی صحت میں کلام ہے۔ اصلیت یہ ہے کہ یہ شہر لکشمن جی کے نام پر جنھیں لکھن بھی کہتے ہیں آباد ہوا تھا اور اس کا پرانا نام "لکھنا منو" تھا جو کثرت استعمال سے "لکھن منو" اور بعد ازاں لکھنؤ بن گیا ہے۔ لکھائی چھپائی کاغذ معمولی، صفحات چھوٹے سائز کے ۱۹۴ قیمت دس آنہ، ملنے کا پتہ: نند کشور اینڈ برادرس۔ کتب فروش بنارس۔

منشی ہرگوپال تفتہ

کا ایک خاص دیوان

(از ڈاکٹر محمد عبد الغفور بسمل۔ پیلی بھیت)

حکیم خلیل الرحمٰن صاحب خلیل پیلی بھیتی کے کتب خانہ میں منشی ہرگوپال صاحب تفتہ کے مطبوعہ فارسی دیوان کا وہ نسخہ موجود ہے جو تفتہ صاحب کے زیر مطالعہ رہتا تھا اور جس پر تفتہ صاحب نے اکثر جگہ اپنے قلم سے اپنی رباعیاں اور قطعے لکھکر چسپاں کردیے ہیں اور یہ رباعیات و قطعات اب تک غیر مطبوعہ ہیں۔

یہ دیوان مطبع کوہ نور لاہور میں سنہ ۱۸۵۷ء میں طبع ہوا ہے۔ تفتہ صاحب نے تاریخ طباعت خود کہی ہے جس سے واضح ہوتا ہے کہ ان کے فارسی کلام کا پہلا حصہ اس سے قبل مطبع اسعد الاخبار میں طبع ہوچکا ہے اور یہ نسخہ اُن کے فارسی کلام کا دوسرا حصہ ہے

دیدہ باشی اولیں دیوان، او گردیدہ طبع   پیش ازیں در اسعد الاخبار، اے صاحب شعور

گویم ار پُرسی تو سالِ طبع ایں دیوان ز من،   طبع ایں دیوان ہرگوپال شد، در کوہ نور۔

کتاب کے آخر میں مطبع کوہ نور اور دیوان کی تعریف میں ایک مثنوی بھی درج ہے، جس میں مصنف نے یہ ظاہر کیا ہے کہ وہ پینتالیس سال سے مشق سخن کر رہے ہیں، اور بیس سال سے مرزا اسد اللہ خاں غالب کی شاگردی کا فخر حاصل ہے۔

تفتہ صاحب کے غیر مطبوعہ کلام کا کچھ اقتباس یہاں پیش کیا جاتا ہے۔

مقصود ما بود صفتِ زلفِ دلبری   گر غیر ازو کنیم بود فعلِ ما شنیع

ماوائے ما بود ہمہ جائے کہ بگذریم   زلفِ سیاہ اوست چو ہندوستاں وسیع

جائے ہست آنکہ ذرہ نہ کم   بیش از بیش سیرہا دارد

رفتم و گفتم اے تماشا ایں راہ   رفتن از خویش سیرہا دارد

چیست پاسخ اگراز تو دمِ محشر پرسند — این کہ دل ہا ہمہ پیدا و نہاں می شکنی
عہد بستی و شکستی، نہ چناں ندرت بود — ندرت این ست کہ نابستہ چناں می شکنی

آنم کہ تمام عمر ماندم ناکام — آسودگیم نصیب نے شام نہ بام
تا وقتِ پسیں ندیدم و تا دمِ مرگ — در صلبِ پدر من آنچہ دیدم آرام
آمد و با ما پسِ دیوار خویش — ہرچہ می فرمود و نشنودیم ما
پشت بر دیوار، باز آنگہ نشست — کاشکے دیوار می بودیم ما
دوش رفتم در گلستان و شنیدم بلبلاں — قامت را سرو گفتم دیں عجب بیں قمریاں
آنچہ از سوزِ دلِ خود نغمۂ تر داشتند — حلقہ گردِ من زدند و شورہا بر داشتند
در بزمِ طرب چہ ابتریہا — ناگہ فلکِ بد اختر افگند
ساقی از کف پیالہ انداخت — مطرب از دست مزمر افگند

اس کتاب میں بدری کشن صاحب فروغ کا ایک خط بھی چسپاں ہے جو تفتہ صاحب کو لکھا گیا تھا اور جس کے حاشیہ پر تفتہ نے اپنے قلم سے "بہت خوب" لکھدیا ہے، وہ خط یہ ہے:-

"خداوند خدائگاں فیض بخش فیض رساں جناب تفتہ صاحب مدظلہ جلالہٗ

بعد تسلیمات و سرافگندگی عرض گزار ہے کہ اس وقت مطالعہ عودِ ہندی" میں صرف وقت کرتا تھا۔

ناگاہ یہ قطعہ حضرت غالب علیہ الرحمۃ نظر پڑا

کیستم من کہ جاوداں باشم — چوں نظیری نماند و طالب مرد
در بہ گویند در کدامی سال — مرد غالب، بگو کہ غالب مرد

اسمیں ۱۲۷۷ھ استخراج ہوتے ہیں، لیکن جناب مرزا صاحب علیہ الرحمۃ نے ۱۲۸۵ھ میں انتقال فرمایا ہے لہذا کمترین نے حرف کاف (کہ) کے بجائے لفظ "یہ" رکھدیا ہے اور اس مصرع کو اس طرح تحریر کیا ہے "مرد غالب بگو یہ غالب مرد" چونکہ یہ قطعہ خاص زبان شریف سے ورود ہوا ہے، کیا اچھی بات ہو گویا زبان شریف مرزا صاحب پر رضائے الٰہی نے وُرود ہوکر یہ آگاہی فرمائی کہنے کو جگہ ہوئی کہ حضرت ممدوح نے اپنے انتقال کا قطعہ خود تصنیف فرمایا امید کہ حضور والا بھی پسند فرمائیں گے۔ زیادہ بجز تسلیمات چہ گزارد۔ ۲۹-اکتوبر ۱۸۷۲ء۔ کمترین خاکپائے بدری کرشن [بدری فروغ]
امیدوار جواب۔ گر پاکفش سر بہ سجود می ساید

منوسمرتی

(از مسٹر مالک رام۔ ایم۔اے ایل ایل بی۔ لاہور)

ناظرین نے ماہ اپریل کے زمانہ میں اسی عنوان سے ایک مضمون دیکھا ہوگا جسمیں اندرونی و بیرونی شہادتوں سے یہ ثابت کیا گیا تھا کہ منوسمرتی دوسری صدی قبل مسیح کی تصنیف ہے، جب سنگا خاندان کی حکومت تھی۔ اس مضمون میں یہ بھی لکھا گیا تھا کہ عجب نہیں یہ اس خاندان کا سرکاری مجموعۂ قوانین ہو۔ آج ایک اور شہادت ایسی پیش کیجاتی ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ واقعی یہ کتاب اسی عہد میں لکھی گئی تھی۔

یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ کوٹلیہ ارتھ شاستر چوتھی صدی قبل مسیح میں لکھا گیا تھا جب موریا خاندان کا بانی چندرگپت پاٹلی پتر میں سریر آرائے سلطنت تھا۔ چنانچہ یہ کتاب موریا خاندان کے تمام بادشاہوں کے عہد میں حکومت کا مستند ضابطہ تھی۔ اس میں عملی قوانین کے علاوہ علم سیاست سے بھی بحث کی گئی ہے۔ بعض جگہ پرانے نظریے رد کر کے نئے نظریے قائم کئے گئے ہیں، اور بعض پرانے نظریوں کو نئی دلیلوں سے ثابت کیا گیا ہے۔

علم سیاست کی کتابوں میں بعض عام الفاظ خاص معنوں میں استعمال ہوئے ہیں، بالکل اسی طرح جیسے ہماری گفتگو کے عام لفظ منطق میں جا کر دوسرے معنوں کے حامل ہو جاتے ہیں اور ان کے سننے کے ساتھ ہی دماغ منطقی اصطلاحوں کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ مثلاً عرض۔ جوہر۔ حادث۔ قدیم وغیرہ الفاظ بعینہٖ کوٹلیہ نے بھی بعض خاص معنوں میں استعمال کئے ہیں۔ انھیں الفاظ میں سے ایک لفظ "پرکرتی" بھی ہے جس سے اس کا مدعا "ریاست" کے لوازمات سے ہے۔ کتاب ششم کے باب اول میں وہ ریاست کے مندرجہ ذیل سات اجزا قرار دیتا ہے:۔

بادشاہ ۔ وزیر ۔ ملک ۔ قلعہ ۔ خزانہ ۔ فوج اور حلیف

ان لوازمات میں وہ آٹھویں "حریف" کا بھی اضافہ کرتا ہے۔

[1] سلسلہ کیلئے ملاحظہ ہو رسالہ زمانہ بابتہ اپریل ۱۹۳۳ء

امر سنگھ نے بھی لوازمات گنائے ہیں، مگر اس نے ان میں اور اجزا میں کوئی فرق نہیں ظاہر کیا اس کے نزدیک ان کی تعداد سات ہی تھے۔ اس طرح گویا اجزا میں "حریف" کے اضافے اور لوازمات میں اس کے شامل کرنے میں اولیت کا سہرا کوٹلیہ کے سر ہے۔ پرکرتی کا استعمال ان معنوں میں سب سے پہلے کوٹلیہ نے کیا ہے، اس سے پہلے کسی مصنف نے "پرکرتی" میں حریف کو شامل نہیں کیا، اور کوٹلیہ کے بعد کے مصنفین نے اس کے اتباع میں ایسا کیا ہے۔ چنانچہ کامنڈک نے 'پرکرتی' میں دشمن یعنی حریف کو شامل کیا ہے۔[۲]

منوسمرتی میں یہی لفظ پرکرتی ساتویں ادھیائے میں استعمال ہوا ہے (۱۵۶) اور وہاں بھی اسمیں حریف شامل ہے جیساکہ اوپر لکھا جا چکا ہے۔ یہ لفظ ان معنوں میں کوٹلیہ کے ما بعد کے مصنفین نے ہی استعمال کیا ہے، اور اس سے پہلے اس لفظ کا استعمال اس معنی میں کہیں نہیں پایا جاتا۔ لہذا منوسمرتی ارتھ شاستر کے بعد کی تصنیف ہے۔ ارتھ شاستر کا زمانۂ تصنیف ہمیں معلوم ہے کہ ۳۰۰ قبل مسیح سے بعد کا ہے۔ اور یہ بھی بہت حد تک یقینی ہے کہ موریا عہد میں یہ کتاب مسلمہ حیثیت رکھتی تھی۔ اس لئے منوسمرتی جیسی کتاب جس میں ارتھ شاستر کے کئی نظریوں کی تردید ہے، اُس کے بعد سنگا خاندان کے عہد ہی میں لکھی جا سکتی تھی جو موریا خاندان کے اختتام پر حکمران ہوا۔

پس منوسمرتی ۱۵۰ قبل مسیح کے قریب کی تصنیف ہے۔

سلسلہ تجدید شباب

روسی ڈاکٹر وارونافؔ نے انسانی جسم میں بندروں کے غدود لگا کر بڈھوں کو جوان بنانے کا طریقہ ایجاد کیا تھا یہ نہ صرف خطرناک بلکہ مصارف کے لحاظ سے معمولی آدمی کی دسترس سے باہر ہے، لیکن اب لفٹننٹ کرنل ڈاکٹر محمد اشرف الحق صاحب ایم۔بی۔سی۔ایچ۔بی (اڈنبرا) ایم۔ڈبلیو۔ایل۔آر۔ایس (برلن) قلعہ گولکنڈہ حیدرآباد دکن نے اس اہم مسئلہ پر خاص توجہ دی ہے، چنانچہ آپ نے اس مبحث کے متعلق مختلف رسالے شائع کئے ہیں جن میں سے (۱) انڈوکرینالوجی یعنی درون افرازیات ۴؍ (۲) عمر گھٹنے کے اسباب ۸؍ (۳) تجدید شباب کے چند مغربی طریقے ۶؍ (۴) اعادۂ شباب کا ایک سہل طریقہ ۴؍ (۵) بڑھاپے سے مقابلہ ۴؍ (۶) اعادۂ شباب اور درازی عمر ۴؍ ہماری نظر سے بھی گذر چکے ہیں۔ یہ رسالے اپنے موضوع کے اعتبار سے بہت مفید اور دلچسپ ہیں، اور ڈاکٹر صاحب کی ہدایات بھی سہل اور قابل عمل ہیں شائقین ان رسالوں کو مصنف صاحب سے حاصل کر سکتے ہیں۔

---

[۱] امرکوش (۲: ۴: ۱۷۰) [۲] نیتی سار (۱: ۴، ۲۰، ۲۵)

سمادھی

(ایک قصہ)

(از منشی پیارے موہن لال صاحب سرلیواستو یہ حیدرآباد دکن)

مجھے ایک دفعہ کسی کام کے لئے سدھ پور جانا پڑا۔ شام کو کاروبار سے فارغ ہوکر تفریح کی غرض سے مغرب کی جانب ندی کے کنارے روانہ ہوا۔ آسمان پر اُودی اُودی گھٹائیں چھائی تھیں۔ شہر سے دو تین میل کے فاصلے پر ایک جھونپڑی دکھائی دی، جس کے پاس مولسری کے درخت کے تلے ایک سمادھی تھی، میں کچھ دیر کے لئے وہاں ٹھہر گیا۔ اتنے میں جھونپڑی سے ایک معمر شخص باہر نکلا جس نے مجھے دیکھ کر کہا

"بابو جی، آپ کھڑے کیوں ہیں" اندر چلے آئیے"۔

"اس سمادھی کو دیکھ رہا ہوں" میں نے جواب دیا۔

بوڑھے نے ایک آہ سرد بھری اور حسرت بھری نگاہوں سے سمادھی کی طرف دیکھنے لگا۔

میں نے پوچھا "آپ جانتے ہیں یہ کس کی سمادھ ہے، اور کیوں بنائی گئی ہے؟"

اُس نے کہا "جی ہاں معلوم کیوں نہیں ہے"

مجھے ایسی باتوں سے بڑی دلچسپی ہے اس لئے میں ایک پتھر پر بیٹھ گیا اور بوڑھا آدمی بھی زمین پر بیٹھ گیا اور بولا:۔

"اودھ بہاری سدھ پور کے مشہور و متمول وکیل تھے اور کنج بہاری انکا اکلوتا بیٹا تھا۔ جوانی دیوانی تو مشہور ہی ہے، بہاری بھی منچلا لڑکا تھا لیکن اس کا چال چلن بہت اچھا تھا، ایف۔ اے میں پڑھتا تھا اور سدھ پور کے کایستھ یونین کا ممبر بھی تھا۔ سدھ پور میں کایستھوں کی اچھی خاصی بستی تھی۔ ایک سال یہاں کایستھ یونین کا جلسہ بھی ہوا اور اسمیں مختلف فرقوں میں آپس میں شادی بیاہ کی تجویز پیش ہوئی موافق اور مخالف دھواں دھار تقریریں ہوئیں اور آخر میں یہ مسئلہ پاس ہوگیا۔ جہیز وغیرہ کے خلاف بھی تجویزیں پاس ہوئیں۔ کنج بہاری ان باتوں کا بڑا حامی ہوگیا اور اس نے عہد کر لیا کہ اپنی شادی بلا جہیز کرے گا۔

کنج بہاری کالج میں پڑھتا ہی تھا کہ ہر طرف سے اس کی شادی کے پیغام آنے لگے۔ اور لوگ وکیل صاحب پر اس کی شادی کرنے کے لئے زور ڈالنے لگے۔ خیر دُو سال تک تو وہ کسی طرح ٹلتے رہے۔ اسکے بعد جب کنج بہاری بی۔ اے پاس ہو گیا تو اس کی شادی کی فکریں ہونے لگیں اور باقاعدہ سودا ہونے لگا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کسی قیمتی چیز کا نیلام ہو رہا ہے۔ کسی نے دُو کسی نے چار اور کسی نے چھ ہزار نقد تک جہیز میں دینے کا وعدہ کیا، اودھ بہاری پورے دس ہزار مانگتے تھے۔

(۲)

اودھ بہاری کے پڑوس میں ایک شخص رمتا رام سکسینہ نامی رہتے تھے۔ یہ نہایت روشن خیال اور رحمدل آدمی تھے۔ جب کبھی پردہ پر بحث چھڑتی تو کہتے "چہرہ پر سے نقاب اُٹھا تو کیا، دل سے شرم وحیا کا پردہ نہ اٹھنا چاہیئے"۔ انھوں نے اپنے بڑے لڑکے کی شادی اپنے فرقے سے باہر بھٹناگر صاحب کی لڑکی سے کی تھی جس کی وجہ سے سکسینہ کانستھوں نے انھیں برادری سے خارج کر دیا تھا، لیکن اسکی انھوں نے کوئی پرواہ نہ کی۔ بات یہ ہے کہ ان کو نمود و نمایش اور ارزاں ہر دلعزیزی حاصل کرنے سے نفرت تھی، وہ جس کام کو صحیح سمجھ لیتے پھر دوسروں کی مخالفت کی انھیں کوئی پرواہ نہ رہتی۔

کنج بہاری اکثر بابو رمتا رام کے پاس آیا جایا کرتا تھا۔ رمتا رام کی بیٹی نرملا بڑی حسین، نیک مزاج اور سلیقہ شعار تھی، اور اس کی تعلیم و تربیت پر بھی رمتا رام نے توجہ سے کام لیا تھا۔ جب کبھی نرملا اور کنج بہاری میں کسی مسئلہ پر بحث ہوتی تو رمتا رام اس کے ثالث ہوتے تھے۔ مگر ان مباحثوں میں نرملا جس قابلیت کے ساتھ حصہ لیتی اُس نے رفتہ رفتہ کنج بہاری کو اس کا گرویدہ بنا دیا اور معمولی تبادلۂ خیالات نے رفتہ رفتہ عشق و محبت کی صورت اختیار کر لی۔

(۳)

اسی اثنا میں کنج بہاری نے وکالت کا امتحان بھی پاس کر لیا اور اب ان کی شادی میں تاخیر کرنے کی کوئی وجہ باقی نہ رہی۔ بزرگوں نے بھی جلد شادی کرنے کی رائے دی مگر کنج بہاری نے اپنی والدہ سے صاف کہدیا کہ میں شادی کرونگا تو اپنی مرضی کے مطابق کرونگا، بلکہ رفتہ رفتہ اس نے یہ بھی صاف کہہ دیا کہ "میں اپنے لئے لڑکی تلاش کر چکا ہوں"۔

ماں نے کہا "ارے بھیا، یہ کیسی بے شرمی کی بات ہے، کیا انگریزی تعلیم نے تجھے بالکل بے حیا و بے شرم بنا دیا ہے۔ لیکن مجھے بھی تو بتلا کہ تیری نگاہ کس پر پڑی ہے"۔

کنج بہاری نے آنکھیں نیچی کئے ہوئے جواب دیا "ماتا جی، آپ خفا ہوں میں نے رمتا رام

کی لڑکی نرملا کو.....

ابھی جملہ ختم بھی نہ ہونے پایا تھا کہ اودھ بہاری بھی آ پہونچے۔ وہ پاس ہی کھڑے ہوئے ماں بیٹے کی گفتگو سُن رہے تھے۔

اُنھوں نے آتے ہی بلند آواز میں کہا "تیرے لئے تمام خاندان برادری سے خارج ہونے سے رہا، رستارام برادری سے خارج کر دیا گیا ہے، اُس کی لڑکی سے تمہاری شادی ناممکن ہے، تم کو اگر ہم لوگوں کے ساتھ رہنا ہے تو بزرگوں کا کہنا ماننا ہوگا"

کنج بہاری نے اس گفتگو کو نہایت ناخوشی سے سنا، مگر اُسے باپ کے دلشکن فقرے سُنکر بڑا صدمہ ہوا، آنکھوں میں آنسو بھر آئے لیکن اودھ بہاری کا فیصلہ اٹل تھا۔

اُسی رات کو کنج بہاری بلا کہے سنے کہیں چلدیا۔

(۴)

بوڑھا تھوڑی دیر تک تو خاموش رہا، چاروں طرف سکوت کا عالم طاری تھا، اور اس کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے، ندی کے کنارے ایک ببول کے درخت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اُس نے کہا، "دو دن بعد کنج بہاری اور نرملا اُس کے نیچے تیرتے ہوئے ملے"

اُس نے ایک میلا سا لفافہ بھی میرے ہاتھ میں دیتے ہوئے کہا کہ "کنج بہاری نے یہ خط بھی لکھا تھا"

میں نے چراغ کی ٹمٹماتی ہوئی روشنی میں اس کو پڑھا۔ لکھا تھا:-

"پوجیہ پتا جی نمسکار۔

خودکشی ایک گناہ عظیم ہے، لیکن اس ظالم سوسائٹی اور بے دلیل و بے رحم برادری سے بچنے کی اور کوئی تدبیر نظر نہیں آتی ہے آپ کو خبر نہ تھی لیکن حقیقت یہ ہے کہ میں نرملا سے اپنی شادی کر چکا تھا مگر اس مبارک تقریب پر نہ تو برادری کو مدعو کیا گیا اور نہ کسی اوہتی کی دعوت ہوئی بلکہ ہم دونوں نے نہایت پاکیزہ اور سادہ طریقہ پر ایک دوسرے سے عہد و پیمان کر لیا تھا۔ نرملا کی خوبیوں نے مجھے اپنا شیدا بنا لیا تھا بہت غور و فکر کے بعد میں اس نتیجے پر پہونچا کہ نرملا میں وہ تمام خوبیاں موجود ہیں جن کا کہ ایک شریف اور با غرت بیوی میں ہونا لازمی ہے۔ چنانچہ میرے دل نے نرملا کے دل سے کہا کہ "اب میں تمہارا ہوں" اور اُس کی طرف سے بھی یہی جواب ملا۔ جب نرملا کو آپ کی مخالفت کی اطلاع ہوئی تو اُس نے مجھ سے یہی کہا کہ آپ پریشان نہ ہوں اور جہاں چاہیں شادی کریں۔ لیکن میرے دل نے گوارا نہ کیا کہ میں ہیرے کو ٹھکرا کر پتھر کے ٹکڑے کو لے لوں۔ اور واقعی میرا دل نرملا کا ہو چکا تھا کسی دوسری لڑکی

کو بیاہ کر کے اسکی زندگی تباہ و برباد کرنا مجھے کسی طرح پسند نہ تھا۔ نرملا مجھ سے یہی کہتی رہی کہ تم مجھے میرے حال پر چھوڑ دو اور اپنا فرض ادا کرو مگر میں اسے گوارا نہ کر سکا کہ میں دنیا کے لطف اٹھاؤں اور نرملا کڑھے۔ پیارے پتا جی، آپ بھی رنج نہ کیجئے۔ میں کسی طرح نرملا سے بے وفائی نہ کر سکتا تھا۔ میرے تنبر نے میرے درد کی یہی دوا بتائی کہ میں اس دنیا میں رہ کر آپ کی تکلیف رسانی کا باعث نہ ہوں ڈھائی سال ہوئے ہم دونوں نے اپنی محبت کی یادگار میں ندی کے کنارے مولسری کا درخت لگایا تھا اب میری یہی آخری تمنا ہے کہ اسی کے نیچے ہم دونوں کا داہ سنسکار ہو۔

ایشور ہماری برادری کو جلد ہی خواب غفلت سے بیدار کرے تاکہ دوسرے نوجوانوں کی زندگیاں برباد نہ ہوں۔ ایشور سب کو فضول رسموں اور قدیم رواجوں کی بیخکنی کی توفیق دے"

بدنصیب کنج بہاری

بوڑھے کی آنکھوں سے آنسوؤں کا دریا بہنے لگا، میرا بھی یہی حال تھا۔ وہ بولا:
"انھیں دونوں کی خاک پاک اس سمادھی میں دفن ہے" یہ کہکر وہ کسی خیال میں غرق ہو گیا۔
میں نے اس مہر سکوت کو توڑتے ہوئے پوچھا "رتنارام وغیرہ کا پتہ بتائیے، میں اُن سے ملاقات کرنا چاہتا ہوں"۔

بوڑھے نے سسکیاں بھرتے ہوئے کہنا شروع کیا کہ "کچھ عرصے کے بعد معلوم نہیں رتنارام بھی کہیں چل دیئے اور کنج بہاری کی والدہ بھی اکلوتے بیٹے کی موت کا صدمہ نہ اٹھا سکی، سال کے اندر ہی گھل گھل کر مر گئی"۔

اس پر میں نے پوچھا کہ "اودھ بہاری لال کا کیا حشر ہوا؟"
بوڑھے نے سر جھکا کر پست آواز میں کہا کہ "وہ بدنصیب میں ہی ہوں"۔

زندگی امرتسر

یہ مین خبر کا رسالہ سیوا دھاری سنیاسی صاحب اڈیٹر اور مسٹر روشن لال بی۔ اے جائنٹ اڈیٹر کی ادارت میں امرتسر سے نکلنا شروع ہوا ہے، ابتک اسکے پانچ نمبر ہماری نظر سے گذرے ہیں۔ اس رسالہ میں مضامین نظم و نثر کی کافی تعداد ہوتی ہے مضامین اگرچہ ٹھوس نہیں ہوتے مگر دلچسپ اور مختصر ضرور ہوتے ہیں۔ علاوہ ازیں تنوع کا بھی کافی خیال رکھا جاتا ہے۔ نظم کا معیار اگر زیادہ بلند کر دیا جائے تو بہتر ہے۔ رسالہ کا ٹائیٹل اچھا مگر اندر کا غذ کم قیمت ہے۔

چندہ سالانہ ایکروپیہ آٹھ آنہ، فی پرچہ دو آنہ کچھ زیادہ نہیں ہے

تنقید کتب

رموز العارفین[1]

یہ اُردو کے مشہور شاعر میر حسن دہلوی کی مثنوی ہے جسے سید احمد اللہ قادری صاحب اڈیٹر "تاریخ" نے نہایت خوش اسلوبی سے ایڈٹ کرکے ایک طولانی مقدمے کے ساتھ شائع کیا ہے۔ سید احمد اللہ قادری صاحب کے عالمانہ و محققانہ مضامین زمانہ میں شائع ہوتے رہتے ہیں اسلئے آپ کا نام نامی تعریف و تعارف سے مستغنی ہے۔ اصل یہ ہے کہ واقعات کے تحقیق و تدقیق میں آپ کو کمال حاصل ہے اور میر حسن دہلوی سے آپ کو دلچسپی نہیں بلکہ عشق ہے۔ چنانچہ اس سے قبل بھی میر حسن کے سوانح حیات پر ایک نہایت مبسوط و قابل قدر مضمون ۱۹۳۱ء کے "زمانہ" کے جنوری۔ فروری اور اگست کے پرچوں میں شائع ہو چکا ہے۔ جس سے بہتر مضمون اس موضوع پر اُردو میں شاید ہی شائع ہوا ہو۔

میر حسن کی مشہور و معروف مثنوی "سحر البیان" سے تو دنیا واقف ہے۔ لیکن اُن کی یہ مثنوی "رموز العاشقین" گوشہ گمنامی میں پڑی ہوئی تھی حتیٰ کہ بعض تذکرہ نویسوں نے بھی میر حسن کے حالات میں اسکا ذکر نہیں کیا۔ قادری صاحب نے اس کو موجودہ صورت میں پیش کرکے ادب اُردو پر بہت بڑا احسان کیا ہے۔

میر حسن کی یہ سب سے پہلی مثنوی ہے جو ۱۱۷۸ھ میں مثنوی مولانا روم کی بحر اور طرز میں لکھی گئی تھی۔ اس کا تخیل اور انداز بیان بالکل مثنوی مولانا روم کے طرز پر ہے۔ اس میں ابراہیم ادہم شاہ بلخ کا تخت و تاج سے دست بردار ہو کر فقیری لینے کا حال نہایت مؤثر اور دردناک انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ موقعہ موقعہ مثنوی مولانا روم کے اشعار کی تضمین کی گئی ہے جس سے مثنوی اور بھی زیادہ پُر اثر ہو گئی ہے۔ مصنف نے بزرگوں کے اقوال و حکایات بھی تمثیلاً بیان کرکے لطیف

[1] ملنے کا پتہ: سید احمد اللہ قادری اڈیٹر "تاریخ" عثمان شاہی حیدرآباد دکن۔ قیمت دو روپیہ عکر

نکتے بیان کئے ہیں۔ مثلاً دستور عام کے مطابق مثنوی حمد سے شروع ہوتی ہے، چنانچہ لکھتے ہیں:

ہے سزاوار ثنا وہ کردگار — جس نے کی وحدت سے کثرت آشکار
ایک دانہ سے عیاں خرمن کیا — ایک شعلہ سے جہاں روشن کیا
ہے اُسی کے نور کی ہر سمت سیر — کیا چراغ کعبہ وُ کیا شمع دیر
چوں چراغ نور شمع را کشید — ہر کہ دید آں را یقیں آں شمع دید
ہمچنیں تا صد چراغ از عقل شد — دید آں آخر لقائے اصل شد

آگے چلکر دیکھئے کس ڈھنگ سے دعا مانگتے ہیں اور کیا کیا طلب کرتے ہیں:۔

فکر و غم کی قید سے آزاد رکھ — دین و دنیا میں الٰہی شاد رکھ
مشکلیں سب خود بخود آسان کر — فکر میں روزی کی مت حیران کر
دے فراغت اتنی اس دنیا میں تو — ہو سکے عقبیٰ کی جس سے جستجو
عارفوں کے رمز سے آگاہ کر — ملک درویشی کا مجھ کو شاہ کر
دے بصارت حق شناسی کی مجھے — جس طرف دیکھوں تو میں دیکھوں تجھے

ان اشعار کو ہر مذہب و ملت کا آدمی عبادت کے وقت پڑھ سکتا ہے۔

"آنچہ بر خود نہ پسندی بدیگران مپسند" کا ترجمہ کس خوش اسلوبی سے کیا ہے:۔

آپ پر جو چیز ہووے ناپسند — غیر پر بھی اس کو مت رکھنا پسند

کتاب کے شروع میں لائق مؤلف نے تیس صفحات کا ایک تنقیدی و تاریخی مقدمہ لکھکر پوری تحقیق اور کاوش کے ساتھ میر حسن کے سوانح حیات درج کئے ہیں اور خود میر حسن کی خود نوشت سوانحعمری بھی لکھی ہے۔ اور دیگر مختلف تذکرہ نگاروں نے جو حالات میر حسن کے لکھے ہیں انھیں بھی اقتباساً درج کر دیا ہے۔ اسی سلسلہ میں میر حسن کا شجرۂ نسب درج کرکے میر نفیس کے اس مصرعہ کی تصدیق کی گئی ہے کہ "شمشیر فصاحت یہ ہے یہ ساتواں صیقل" اِسی سلسلے میں میر حسن دہلوی کی مختلف تصانیف پر بھی محققانہ تبصرہ کیا گیا ہے۔ مقدمہ میں ایک نایاب چیز کا اضافہ کیا گیا ہے، یعنی منشی شیر علی افسوس کا وہ دیباچہ جو ۱۸۰۳ء میں ڈاکٹر جان گلکرسٹ کی فرمایش سے مثنوی سحرالبیان پر لکھا گیا تھا، جس میں مثنوی سحرالبیان کی تعریف کے علاوہ میر حسن کی مفصل اور صحیح سوانحعمری بھی درج ہے۔ مثنوی سحرالبیان کی اِن الفاظ میں تعریف لکھی گئی ہے:۔

"دادا اس عالی قدر (میر حسن) کا، سنتے ہیں کہ حاجی و فاضل تھا لیکن باپ کو فضیلت نہ تھی۔

طالب علمی میں شرح مُلّا تک پڑھا تھا۔ پر زبان فارسی میں استعداد اچھی تھی بلکہ شعر بھی متین و رنگین گاہے گاہے اس زبان میں کہتا تھا قصیدہ بھی ایک آدھ اس سخنور کا رتبہ وار دیکھا ہے لیکن ہزل پر از بسکہ مزاج مرغوب تھا۔ غزل کہنی ترک کی تھی، قیامت کا ٹھٹھول تھا، تخلص اس کا اس پر دال ہے، پر ظاہر نہایت ثقہ اور متشرع، اکثر عمامہ عربی سبز سر پر بندھا رہتا تھا اور جامہ کم گھیر اُٹل پیتے کا گلے میں، داڑھی متوسط، لبیں لی ہوئی، قد میانہ، گندم گوں، لیکن میر حسن داڑھی منڈواتے تھے، پر جامہ نیمہ ان کا بھی ویسا ہی تھا۔ اور پگڑی کی بندش قدیم ہندوستان زادوں کی سی، قد لنبا تھا اور رنگ گندمی، ہر چند وضع تو ایسی تھی، پر شوخ مزاج و لطیفہ گو وے بھی تھے نہ ہزال نہ فحاش"

اس عبارت میں بہت سے الفاظ اور محاورے ایسے ہیں جو آجکل مروج نہیں ہیں۔

اصل مثنوی اکتالیس صفحوں میں ختم ہوئی ہے۔ یہ کتاب نجی کتب خانوں اور پبلک لائبریریوں میں رکھنے کے قابل ہے اور ہم اس کی اشاعت پر اپنے مکرم دوست سید احمد اللہ قادری صاحب کو تہِ دل سے مبارکباد دیتے ہیں۔

ارمغانِ عزیز (جلد دوم)[1]

یہ نواب عزیز یار جنگ بہادر کا دوسرا دیوان ہے جو عمدہ کتابت، اعلیٰ طباعت اور قیمتی آرٹ پیپر پر آب و تاب کے ساتھ شائع کیا گیا ہے۔ شروع میں قابل مصنف کی تصویر بھی ہے۔ کتاب کی جلد پارچہ انگریزی وضع کی ہے۔

نواب عزیز یار جنگ ایک پختہ مشق سخنور ہیں۔ کلام میں صفائی، ترکیبوں میں چستی، الفاظ میں روانی اور زبان میں سلاست بخوبی پائی جاتی ہے۔ چند اشعار نمونتہً درج کئے جاتے ہیں:۔

"محبت تیری کیا تیری وفا کیا ذرا پھر تو کہو تم نے کہا کیا
گئی گذری ہوئی باتوں سے حاصل اب انکا شکوہ کیا ان کا گلا کیا
شبِ غم اشک میرے تھم گئے کیوں یہ ہے آخر الٰہی ماجرا کیا
یونہیں کہتا رہوں میں قصۂ غم یونہیں کہتے رہیں گے آپ کیا کیا
اُنھیں سے کر رہا ہوں اُن کے شکوے الٰہی خیر ہو مجھکو ہوا کیا

[1] جلد قیمت ۱۰ روپیہ۔ ملنے کا پتہ اعظم اسٹیم پریس حیدرآباد دکن۔

یہ تجھ سے چوک ہوئی اُن کے روبرو قاصد ہمارا ذکر ذرا بیچ دار کرنا تھا

اپنی اپنی غرض میں ہیں مشغول کوئی اپنا نظر نہیں آتا
کیا تماشا ہے، طور پر اب کیوں وہ تماشا نظر نہیں آتا
وہی اندھے ہیں عقل کے جن کو عیب اپنا نظر نہیں آتا

دیدۂ شوق نے ترا جلوہ ہر جگہ ہر مکان میں دیکھا
نہ ملا، تجھ سا دوسرا نہ ملا ہم نے دونوں جہان میں دیکھا

وہی ہے جام، وہی مے، وہی سبو لیکن بدل گئی ہیں زمانے کی نیتیں کیا کیا
لٹایا مجھکو بھی، ساقی کو بھی، رقیب کو بھی دکھائیں بنتِ عنب نے کرامتیں کیا کیا
اُٹھے تو ابر کی صورت گرے تو برق کی طرح ہیں بھی ضعف میں حال میں قوتیں کیا کیا

وصل سے کم نہیں امیدِ وصال ناامیدی فراق ہے گویا
شاعری کا مذاق تھا پہلے شاعری اب مذاق ہے گویا

کہیں کہیں دوسروں کا مضمون بھی اُڑایا ہے۔ مثلاً کسی اُستاد کا شعر ہے ؎

سر مرا کاٹ کے پچھتایئے گا جھوٹی پھر کس کی قسم کھایئے گا

اسی مضمون کو عزیز صاحب نے اس طرح ادا کیا ہے ؎

جھوٹے وعدوں پر بھلا کھاؤگے پھر کسکی قسم تم بہت پچھتاؤگے دیکھو مرا سر کاٹ کر

یا کسی کا شعر ہے:۔

پس مردن بنائے جائینگے ساغر ہمی گل کے لبِ جاں بخش کے بوسے ملینگے خاک میں مل کے

یہی مضمون عزیز صاحب نے اس طرح ادا کیا ہے:۔

اگر ٹوٹا کوئی ساغر تو ساقی بنے گا میکشوں کی خاک سے پھر

بہرحال دیوان بہت مرصع ہے، اور کلام بعض بعض جگہ سلاست اور محاورہ کی وجہ سے سہل ممتنع کی حد تک پہونچ گیا ہے۔

دیوانِ طباطبائی یعنی صوتِ تغزل

نواب حیدر یار جنگ علامہ سید علی حیدر نظم طباطبائی مرحوم کے اس مجموعۂ کلام کا تاریخی نام صوتِ تغزّل تجویز کیا گیا ہے جس سے سنہ طبع ۱۹۲۳ء نکلتا ہے۔ یہ دیوان بھی انجمن امداد باہمی مکتبۂ ابراہیمیہ حیدرآباد دکن کے اہتمام سے شائع ہوا ہے۔ انجمن موصوف نے بہت سی ادبی کتابیں شائع کرکے اُردو پر احسان عظیم کیا ہے۔ چنانچہ اس دیوان کی لکھائی چھپائی اور کاغذ بہت عمدہ ہے اور مصنف کا فوٹو بھی شامل کردیا گیا ہے جس سے اس کی دلچسپی میں خاصہ اضافہ ہوگیا ہے۔

علامہ علی حیدر نظم طباطبائی کی ہستی ادبی دنیا میں کسی تعریف وتعارف کی محتاج نہیں۔ آپکی خود نوشت سوانحعمری زمانہ میں شائع ہوچکی ہے۔ آپ ان ماہرفن ادیبوں میں تھے جن کا جانشین ہندوستان میں مشکل سے پیدا ہوگا۔ آپکے فیضِ صحبت سے صدہا اشخاص فاضل اور ادیب بنگئے ہیں۔ اور ریاست حیدرآباد اور دیگر مقامات میں اچھے اچھے عہدوں پر ممتاز ہیں۔ اور یہ تحریک ہورہی ہے کہ علّامۂ مرحوم کے شایانِ شان کوئی یادگار قائم کی جائے جو فیضِ جاری کی صورت میں آئندہ آنیوالی نسلوں کو فیض پہونچاتی رہے۔

علامہ مرحوم کے ذوقِ سخن اور مہارتِ فن کا اندازہ اسی واقعہ سے کیا جاسکتا ہے کہ حاؔلی کی "یادگار غالب" کے بعد جس شخص نے ہندوستان میں سب سے پہلے غاؔلب اور دیوانِ غاؔلب پر قلم اٹھایا وہ مرحوم ہی تھے۔ غاؔلب کے اشعار کی تشریح وتوضیح میں علامہ مرحوم نے وہ وہ موشگافیاں کی ہیں کہ انسان دیکھکر حیران رہ جاتا ہے۔ سب سے پہلے آپ ہی غاؔلب کی ادبی اور فنّی غلطیاں منظرِ عام پر لائے۔

علامہ مرحوم پرُانی وضع کے لکھنوی بزرگ تھے۔ اس لئے کلام میں بھی لکھنویت کا رنگ غالب ہے۔ چنانچہ اس مجموعۂ کلام میں دوسو اکتیس غزلیں، ایک دعائیہ تضمین، ایک فارسی قصیدہ ایک فارسی ترانہ، بیس رباعیات، ایک سہرا اور بارہ قطعات تاریخ ہیں۔ شروع میں بعض غزلوں کی تقطیع بھی لکھدی ہے جس سے مطالعہ کرنیوالے حضرات کو فنِ عروض میں بھی کافی درس حاصل ہوسکتا ہے۔ شروع میں "غزل" کے عنوان سے ایک فاضلانہ مضمون ہے جسے پڑھتے ہی طبیعت شگفتہ ہوجاتی ہے اور منھ سے بیساختہ واہ وا نکل جاتی ہے۔ ذیل میں علامہ مرحوم کے کلام بلاغت نظام

قیمت دو روپیہ انجمن امداد باہمی مکتبۂ ابراہیمیہ حیدرآباد دکن سے منگایئے۔

کا سرسری انتخاب درج ہے:-

ہوا میں اُن کے ذرّے ہوں تو ہوں جو نامور گذرے　　پتہ روئے زمیں پر تو نہیں ملتا مزاروں کا
بہانہ ڈھونڈھتی ہے اس کی رحمت تو یہ کیا جانے　　گنہ ہے گردنِ مینا پہ واعظ بادہ خواروں کا
کھلا دیتی ہے کیا سرمہ نگاہِ سُرمگیں تیری　　کہ اُف کرتا نہیں مارا ہوا تیرے اشاروں کا

مجھے دوڑا رہا ہے شوق منزل کا یہ کہہ کہہ کر　　کہ گرنا بار بار اچھا ہے، اُٹھنا دم بدم اچھا
رہے گبر و مسلماں منزلِ مقصد سے بیگانہ　　ملا اس راہ میں ہنگامۂ دیر و حرم اچھا
نہ کھوئی اپنی عزت کاسہ لیسِ اغنیا ہو کر　　کبھی جام سفالیں سے نہ سمجھے جامِ جم اچھا

بڑے معرکے سے ہے آیا ہوا　　لہو میں ہے آنسو نہایا ہوا
وہ عیار نظروں سے اوجھل بھی ہے　　پھر آنکھوں میں بھی ہے سمایا ہوا
سزاوارِ رحمت ہوں میں اے کریم　　کہ آیا ہوں تیرا بُلایا ہوا

مٹتا ہے احتیاج کا داغ التجا سے کب　　او ہرزہ کار آگ بجھی ہے ہوا سے کب
سختی کو جھیل جا تو سعادت شکار ہے　　خالی ہے اس پہاڑ کی چوٹی ہما سے کب

کرتا ہے ظلم و جور یہ چرخِ کہن بہت　　مل مل گئے ہیں خاک میں گل پیرہن بہت
نقشہ چمن میں غفلتِ اہلِ جہاں کا ہے　　اترا رہے ہیں پھول پہن کر کفن بہت

مجھ کو یارب تو عطا کر دلِ نالاں دو چار　　دل ہوں دو چار تو ہر دل میں ہوں ارماں دو چار
اے جنوں مجھکو دکھا عالمِ امکاں دو چار　　شش جہت کیسی سمجھتا ہوں بیاباں دو چار

شباب و پیری کا آنا جانا غضب کا پر درد ہے فسانہ　　یہ رہ گئی بن کے گرد حسرت وہ اُڑ گیا رخ سے رنگ ہو کر
جو راز دل سے زباں تک آیا تو اسکو قابو میں پھر نہ پایا　　زباں سے نکلا کلام تنکر کماں سے چھوٹا خدنگ ہو کر

نہ آن بان طبیعت میں ہو تو انساں کیا — کہ جس میں بل نہ ہو رسی وہ استوار نہیں
سنبھالے کون کسے، کون لے کسے کی خبر — تمام بزم میں کوئی بھی ہوشیار نہیں

اعمال کے سبب سے گرانبار ہو گئے — جو مرحلے تھے سہل وہ دشوار ہو گئے
اس رہگذر میں دام نہاں زیر دام تھا — آزاد بھی ہوئے کہ گرفتار ہو گئے
عبرت سے دیکھ گور غریباں کے ڈھیر کو — کتنے ہی قصر تن تھے جو مسمار ہو گئے
ساقی کی چشم مست کا رندوں سے حال پوچھ — ملتے ہی آنکھ واقف اسرار ہو گئے

الغرض علامہ مرحوم کا کل دیوان شروع سے آخر تک ہر قسم کے صنائع و بدائع شاعری سے مرصع ہے۔ بلیغ سے بلیغ مضمون، سلیس سے سلیس زبان، رفیع سے رفیع تخیل اور فصیح سے فصیح محاورات اس میں موجود ہیں۔ لکھنؤ کے ثقات کی زبان ہے۔ اس دیوان کا مطالعہ اگر شاعری کے لحاظ سے نہ سہی تو زباندانی کے خیال سے بہت مفید ہوگا۔ پورے دیوان میں ایک لفظ بھی سوقیانہ نہیں ملتا۔ معاملہ بندی بھی ہے مگر عریانیت سے خالی۔ دیوان لائبریریوں کے قابل ہے۔

درِ مضامین (حصہ اول)

مولوی جان محمد صاحب آنرز اردو ٹیچر کرائسٹ چرچ ہائی اسکول کانپور نے چھوٹی جماعتوں کے طلبار کو مضمون نویسی سکھانے کے لئے یہ چھ جزو کا چھوٹا سا رسالہ تصنیف کیا ہے۔ جس میں تیس مختلف عنوانات پر سادہ اور عام فہم زبان میں مضامین لکھے گئے ہیں۔ عنوانات عام اور مفید ہیں مثلاً کتب بینی، تحصیل علم، کفایت شعاری، کھیتی، ورزش، تجارت وغیرہ۔ اس کتاب سے اسکولوں کے طلبا بھی بہت کچھ فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ شروع میں مضمون نویسی کے متعلق ضروری ہدایات درج ہیں۔ چند الفاظ میں ٹیچروں کو بھی مشورہ دیا گیا ہے۔ اور آخر میں اٹھارہ مضامین کا خاکہ بھی درج ہے۔ لکھائی چھپائی اچھی کاغذ معمولی۔ قیمت پانچ آنہ مصنف سے طلب کی جائے۔

گلدستۂ شرافت

مسٹر لے بسی بہتا صاحب وکیل گورکھپور نے اس نام سے ایک جزو کا رسالہ تصنیف فرمایا ہے جس میں بچوں کو اخلاق کا سبق دیا گیا ہے۔ مدرسوں کی درسی کتابوں کے ساتھ اس قسم کی کتاب کا داخل کورس ہونا مفید ہوگا۔ قیمت دو آنہ مصنف صاحب سے مل سکتا ہے۔

عالمِ نسواں

مئی ۱۹۳۳ء کے پرچہ میں ازدواجی زندگی کو خوشگوار بنانے کے لئے وہ دس اصول درج کئے گئے تھے جو شکاگو کے جج مسٹر جوزف نے مرتب کئے ہیں۔ آج ہم ایک درجن اصول اور پیش کرتے ہیں جن پر عمل کرنے سے خاتونیں اپنی زندگی اور اپنے گھروں کو خوشگوار بنا سکتی ہیں اور جو اقتصادی لحاظ اور حفظانِ صحت کی رو سے بھی بہت مفید ہیں۔

(۱) ہمیشہ خوش و خرم رہو اور بشاش رکھنے والی باتیں کرو۔ خود اپنا لباس، اپنا کمرہ بلکہ تمام گھر کو صاف ستھرا رکھو تاکہ درو دیوار سے مسرت و شادمانی مترشح ہو۔

(۲) اپنے شوہر کے عزیز و اقارب اور مہمانوں سے ہمیشہ شگفتہ پیشانی اور خوش اخلاقی سے پیش آؤ۔

(۳) شوہر سے بات چیت میں پاس ادب مدنظر رہنا چاہیئے۔ اگر اس میں کوئی کمزوری ہے تو نرمی کے ساتھ اور خوش آیند طریقہ سے گفتگو کرنا چاہیئے تاکہ وہ نادم ہو کر اُسے چھوڑ دے۔

(۴) کھانا بہت احتیاط سے وقت مقررہ پر اور لذیذ تیار کرو۔

(۵) گھر کے اخراجات میں کفایت شعاری سے کام لو۔

(۶) روزمرہ کے لباس میں سلامت روی یعنی اعتدال اختیار کرو نہ بہت بیش قیمت ہو اور نہ تمہاری پوزیشن سے گرا ہوا ہو۔

(۷) اپنے شوہر کی غمخوار یعنی رفیقۂ حیات بننے کی کوشش کرو۔

(۸) شوہر پر کبھی کسی قسم کا بہتان نہ لگاؤ بلکہ اسکے رنج و راحت کی شریک رہو۔

(۹) بچوں کو صاف و ستھرا رکھو، ان کی غور و پرداخت خوش انتظامی اور سلیقہ شعاری سے کرو وہ شور و غوغا بھی نہ کرنے پائیں اور گندہ بھی نہ رہیں۔

(۱۰) ہمسائیوں سے حسب مراتب عزیزوں کی طرح برتاؤ کرو، اگر تم ان سے ہمدردی و مروت سے پیش آؤ گی تو وہ بھی تمہارے رنج و راحت کی شریک ہونگی۔

(۱۱) ملازموں سے نرمی اور رحمدلی کا برتاؤ کرو، اُنھیں کھانے پینے کی تکلیف نہ دو، کیونکہ

یہی لوگ بدنام یا نیکنام کرتے ہیں، نئے نوکروں کی ہوشیاری کے ساتھ نگرانی رکھو۔
(۱۲) گھر میں کھانے پینے کی ضروری چیزیں اور وقت پر کام دینے والی دوائیں موجود رکھو تاکہ کسی وقت پریشانی نہ ہو۔

یہ سب روزمرہ کی معمولی باتیں ہیں لیکن انھیں معمولی باتوں پر زندگی کی خوشی و کامیابی کا دارومدار ہے۔

زنانہ یونیورسٹی بمبئی کے پچھلے کانووکیشن میں مسز سروجنی نائیڈو صاحبہ نے ایک دلنشین تقریر کی جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ابتک ہندوستانی عورتوں کی زندگی کا انتہائی مقصد شادی کرنا اور گھرستی کا انتظام کرنا رہا ہے لیکن اب ہماری تعلیم یافتہ خاتونوں کو ہندوستان کی جدید تعمیر و ترقی میں پورا حصہ لینے کی ضرورت ہے۔ اسی خیال سے محبانِ وطن نے جاپان کے طریقۂ تعلیم کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ زنانہ یونیورسٹی قائم کی ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ عورتوں کو ان کی ذمہ داریوں کا احساس کرا دیا جائے اور انھیں قدرتی طریقے پر تعلیم و تربیت دی جائے۔ اس یونیورسٹی کا یہ نقطۂ خیال نہیں ہے کہ جس طرح موجودہ سوسائٹی میں عورتوں کی دنیا ہی الگ ہے اسی طرح آئندہ بھی قائم رہے۔ یونیورسٹی ہندو مسلمان کی بھی کوئی تفریق نہیں برتنا چاہتی اور نہ محض کتابی علم ہی سے دماغ کو زیر بار کرنا چاہتی ہے۔ وہ صحیح اصولوں پر تعلیم دیتی ہے۔ اور مادری زبان ذریعہ تعلیم ہو تو اس سے بہرہ ور ہو کر لڑکیاں صحیح آزادی حاصل کر لیں گی۔ آپ نے فرمایا کہ آزادی مانگنے سے نہیں ملتی بلکہ اسے ہمارے اندر پیدا ہونا چاہئیے۔

لاہور کی چند ہندو مسلم خاتونوں کی جن میں لیڈی عبد القادر، مسز سوندھی، مسز رلیارام، مس تھاپر، مسز سونی، بیگم بشیر احمد، مسز سنگھ، کماری دلیپ سنگھ وغیرہ شامل ہیں ایک کمیٹی بدقسمت عورتوں اور لڑکیوں کے واسطے بلا امتیاز مذہب و ملت ایک جائے پناہ قائم کرنے کیلئے مرتب ہوئی ہے۔

افسوس صد افسوس کہ پولینڈ کی مشہور و معروف ماہر سائنس خاتون میڈم میری کیوری جنھوں نے اپنے شوہر کی امداد سے ریڈیم کا عنصر دریافت کیا تھا ۴ جولائی کو سرسٹھ سال کی عمر میں اس عالم فانی سے راہیِ ملک جاودانی ہو گئیں۔ مرحومہ ایسی زبردست ماہر علوم خاتون تھیں کہ ۱۹۱۱ء

میں جب اُن کے نامور شوہر موسیو کیوری کا انتقال ہوا تو ان کی جگہ وہی ساربون کالج میں کیمسٹری کی پروفیسر مقرر ہوئی تھیں۔ آپ شہر وارسا ملک پولینڈ میں ۱۸۶۷ء میں پیدا ہوئی تھیں۔ ساربون کے ایک کیمیکل انسٹیٹیوٹ کے دارالتجربہ میں ایک ادنیٰ ملازم کی حیثیت سے نوکر ہوئیں، لیکن اپنی فطری قابلیت اور روشن دماغی کی بدولت موسیو پیری کیوری ڈائرکٹر کی اسسٹنٹ بن گئیں اور بعد میں دونوں کی شادی ہوگئی۔ دسمبر ۱۸۹۸ء میں ان دونوں نے ملکر ریڈیم کو دریافت کیا جو مرض سرطان کے علاج میں اکسیر ثابت ہوا ہے۔ دونوں میاں بیوی عرصہ دراز تک سائنٹفک تحقیق و تدقیق میں مصروف رہے۔ بالآخر ان کی ان تھک محنتوں کی قدردانی میں ۱۹۰۳ء میں انھیں کیمسٹری کا نوبل پرائز ملا۔ اور ۱۹۰۶ء میں اپنے نامور شوہر کے مرنے کے بعد میڈم موصوفہ ریڈیم انسٹی ٹیوٹ کی افسر اعلیٰ اور سائنس کی پروفیسر مقرر ہوئیں اور ۱۹۱۰ء میں برطانیہ عظمیٰ کی رائل سوسائٹی نے آپ کو البرٹ میڈل عطا کیا اور ۱۹۱۱ء میں اُنھیں دوسری بار کیمسٹری کا نوبل پرائز ملا۔ آپ کی وفات سے سائنس کی تحقیقاتی دنیا میں جو کمی ہوگئی ہے اسکی تلافی ناممکن ہے۔

ملک کی صنعت وحرفت میں عورتیں بہت سی دستکاریوں میں حصہ لے سکتی ہیں جسکی بدولت اُنھیں مالی حیثیت سے دوسروں کی محتاجی سے آزادی حاصل ہوسکتی ہے، لیکن اس کے لئے اُنھیں باقاعدہ تعلیم حاصل کرنا ہوگی۔ خوشی کی بات ہے کہ حال میں لکھنؤ میں لڑکیوں کو مشینوں کے ذریعہ نٹنگ کی دستکاری سکھانے کا یونیورسل نٹنگ ہاؤس کے نام سے ایک کارخانہ قایم ہوا ہے جسمیں فی الحال بیس لڑکیوں کی تعلیم کا انتظام ہے۔ اسی طرح امرتسر میں ڈاکٹر سیف الدین کچلو کی بیگم صاحبہ نے بھی دستکاری کا ایک اسکول کھولا ہے جسمیں فی الحال بارہ لڑکیاں داخل ہوئی ہیں۔ کیا اچھا ہو اگر ایسے اسکول ہر شہر میں کھل سکیں تاکہ ملک کی بہت سی لڑکیاں جن کے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کا موقع نہیں ہے عملی حیثیت سے کوئی نہ کوئی دستکاری سیکھ کر حسب ضرورت اپنی پرورش کا خود انتظام کرسکیں۔

۹۔ جولائی سے بنارس ہندو یونیورسٹی کا زنانہ کالج کھل گیا ہے۔ یونیورسٹی نے اس سال سے لڑکوں اور لڑکیوں کی تعلیم کا انتظام بالکل علیحدہ علیحدہ کردیا ہے۔ زنانہ کالج کی تعلیم اور نگرانی وغیرہ بالکل عورتوں کے ہاتھ میں رہیگی۔ امید ہے کہ نیا انتظام کامیاب اور ہر دلعزیز ثابت ہوگا۔

امسال صوبہ متحدہ کے امتحان انٹرمیڈیٹ میں اکانوے لڑکیاں اور امتحان ہائی اسکول میں ایکسو پینتیس ۱۳۵ لڑکیاں پاس ہوئیں۔ بالکا ودیالیہ لکھنؤ سے چھ لڑکیوں نے ہائی اسکول کا امتحان دیا تھا اور سب پاس ہوگئیں۔ جولائی ۳۲ء سے یہ ہائی اسکول انٹرمیڈیٹ کالج بنا دیا گیا ہے۔

معلوم ہوا ہے کہ بیگم شاہنواز اور بیگم ڈاکٹر محمد عالم لاہور و امرتسر کے مسلم حلقہ سے اسمبلی کی ممبری کی امیدوار ہیں۔

پچھلے دنوں بیگم پیٹھ حیدرآباد دکن کے کینیا گوروکل کی چوتھی سالگرہ کے موقعہ پر جو کھیل کود ہوئے ان میں ایک مقابلہ کی دوڑ حسین ساگر تالاب کے گرد بھی ہوئی جس کا پھیر چھ میل کا ہے۔ چنانچہ گوروکل کی لیڈی پرنسپل کی گیارہ سالہ صاحبزادی کماری سوشیلا دیوی اس مقابلے میں اول آئی، جس کے صلے میں اسے بہت سے انعامات ملے۔

اس سال ڈاکٹر لے۔ آر شرما کی صاحبزادی کماری تمبھاوتی شرما بی۔ اے نے پنجاب یونیورسٹی سے بی۔ ٹی کا امتحان پاس کیا ہے۔ سارسوت برہمنوں میں آپ پہلی خاتون ہیں جنھوں نے یہ ڈگری حاصل کی۔ آپ آریہ گرلس اسکول شملہ کی ہیڈ مسٹرس مقرر ہوئی ہیں

ہمارے صوبہ آگرہ و اودھ میں بھی اس سال کئی لڑکیاں ٹریننگ کالجوں میں تعلیم حاصل کرنے کے لئے منتخب ہوئی ہیں۔

رانی لکشمی بائی راجواڑے گوالیاری کو گورنمنٹ آف انڈیا نے تین سال کے لئے انڈین ہسٹاریکل ریکارڈس کمیشن کا ممبر منتخب کیا ہے۔

ہز اکسیلنسی گورنر صوبہ نے ہر ہائینس رانی للت کماری صاحبہ ریاست منڈی کو لکھنؤ یونیورسٹی کورٹ کا ممبر نامزد فرمایا ہے۔

شریمتی کوشلیا دیوی جدید سرسوتی ودیالیہ لکھنؤ کی آنریری پرنسپل مقرر ہوئی ہیں۔

ساون کے مہینے

(از حضرت جوش ملیح آبادی)

فردوس بنائے مرے ساون کے مہینے
اک گلرخ و نسرین بدن و سرو سہی نے

ماتھے پہ ادھر کاکلِ شبرنگ کی لہریں
گلشن پہ اُدھر ابرِ خراماں کے سفینے

شاخوں پہ طیور، اپنے جھٹکتے ہوئے شہپر
لہروں پہ بطیں، اپنے اُبھارے ہوئے سینے

گیتی سے اُبلتے تھے تمنا کے سلیقے
گردوں سے برستے تھے لگاوٹ کے قرینے

شیشوں پہ کھنکتی ہوئی بوندوں کی صدائیں
پُروائی کے دھارے پہ ملاروں کے سفینے

اللہ رے طوفانِ خرامِ لبِ ساحل
رنگین تھے تالاب کے ترشے ہوئے زینے

مینہ جتنا برستا تھا سرِ دامنِ کہسار
اُتنے ہی زمیں اپنے اُگلتی تھی دفینے

بدلی تھی فلک پر، کہ سیہ مست جوانی
بوندیں تھیں زمیں پر کہ انگوٹھی کے نگینے

کیا سحر چٹکتی ہوئی کلیوں میں بھرا تھا
اِک محشرِ گفتار کی شیریں سخنی نے

کیا رقص پہ کونین کو مجبور کیا تھا
سبزے پہ مچلتی ہوئی ساون کی جھڑی نے

بھر دی تھی ہر اک خار میں روحِ گل و نسریں
اِک غنچۂ نورس کی مسیحا نفسی نے

تھا، یا تو یہ ارشاد، کہ اس مست ہوا میں
ہم مُنہ سے نہ بولیں گے اگر پی نہ کسی نے

یا، شکوہ پیہم تھا، نزاکت کے لبوں پر
طوفان اُٹھائے تھے، مری بادہ کشی نے

اللہ رے وہ لب، جب لبِ گلرنگ کے آگے
ڈالی تھی سپر رنگِ عقیقِ یمنی نے

بارش تھی لگاتار، تو یوں گرد تھی مفقود
جس طرح مے ناب سے دھل جاتے ہیں کینے

وہ زینتِ آغوش تھا جس کے لئے برسوں
مانگی تھیں دعائیں مرے آغوشِ تہی نے

دم بھر کو بھی تھمتی تھیں اگر مست ہوائیں
آتے تھے جوانی کو پسینے پہ پسینے

اس فصل میں اس درجہ رہا بیخود و سرشار
میخانے سے باہر مجھے دیکھا نہ کسی نے

کیا لمحۂ فانی تھا، کہ مُڑ کر بھی نہ دیکھا
دی کتنی ہی آواز حیاتِ ابدی نے

اے جوش! ہر اک سانس تھی اِک عمرِ گرامی
جنت میں بھی یاد آئیں گے یہ چند مہینے

برسات کی رات

(از مولوی محمد زبیر صاحب روحی)

یہ رات بھیانک ساون کی   اور بادل ہر سو چھائے ہیں
کچھ سدھ نہیں اپنے تن من کی   کیوں پیتم گھر نہیں آئے ہیں

میں ٹھنڈی سانسیں بھرتی ہوں   بیکس ہوں اور تنہائی ہے
اس اندھیاری سے ڈرتی ہوں   گھنگھور گھٹا کیا چھائی ہے

جب بجلی آہ چمکتی ہے   اور بوندیں تن پر پڑتی ہیں
تو دل میں آگ دہکتی ہے   اور غم کی پھانسیں گڑتی ہیں

کیا جھونکے ہوا کے آتے ہیں   کیا چین سے دنیا سوتی ہے
جب نالے شور مچاتے ہیں   اس دل میں دھڑکن ہوتی ہے

میں اُن کے ہجر میں مرتی ہوں   ہر سمت اُنھیں میں تکتی ہوں
دل ہی سے باتیں کرتی ہوں   معلوم نہیں کیا بکتی ہوں

میں اُن کی یاد میں روتی ہوں   اور بجلی مجھ پر ہنستی ہے
اب نیند کہاں کب سوتی ہوں   یہ سونی دل کی بستی ہے

آ، سُن تو بات پپیہے، آ!   کیا تو ہم قسمت میرا ہے؟
کچھ اپنے دل کی بات بتا   بے تاب جگر کیوں تیرا ہے؟

اب چاند نے بھی منہ پھیرا ہے   اور تارے بھی سب غائب ہیں
رنج اور الم نے گھیرا ہے   اِک دل ہے لاکھ مصائب ہیں

ہاں! رات میں ظالم کوئل جب   اِک پُر غم کوک لگاتی ہے
پھر ہوش مجھے رہتا ہے کب   اِس جان پہ آفت بن جاتی ہے

بیدرد انھیں کس منہ سے کہوں　　یہ آہ مجھے کب زیبا ہے
میں دکھ میں رہوں یا سکھ میں رہوں　　دل اُن کو دعائیں دیتا ہے
ہاں، اتنا کوئی جا اُن سے کہے　　اب بیکل آپ کی داسی ہے
وہ کب تک برہ کی آگ سہے　　درشن کی تمہاری پیاسی ہے
برسات کی یہ اندھیاری ہے　　اور سونی آہ اُٹاری ہے
وہ بیوگن غم کی ماری ہے　　اور آنکھ سے دریا جاری ہے
روحی یہ عورت، عورت ہے　　ہاں! یہ الفت کی دیوی ہے
پتی ورتا ہے، باعصمت ہے　　یہ بھارت ورت کی دیوی ہے

برکھا رُت

(از جناب بسمل الہ آبادی)

برسات کا موسم آگیا پھر　　رنگ اُکھڑا ہوا جما گیا پھر
گھنگھور گھٹا فلک پہ چھائی　　دیتے نہیں تارے اب دکھائی
بادل کے ہیں ٹکڑے نیلے پیلے　　گالے ہیں روئی کے گیلے گیلے
پانی کی جو آبرو تھی پانی　　برکھا کی برس پڑی جوانی
بھر جائیں گے ندی اور نالے　　خوش ہوں گے چمن کے رہنے والے
جو خشک تھے پودے تر ہوئے ہیں　　پیدا نئے بال و پر ہوئے ہیں
ہر شاخ بہت ہری بھری ہے　　آرائش و حسن میں پری ہے
کھیتوں میں بھی خوب دھان ہوگا　　یہ دیکھ کے خوش کسان ہوگا

بسمل کی دعا قبول ہو جائے
اِک اِک کلی کھل کے پھول ہو جائے

کوئل

(از جناب پرنسپل رام پرشاد کھوسلہ ایم۔ اے بھاگلپور)

کوئل تری اس کوک میں کیا درد بھرا ہے
آوازِ جگر سوز سے اک فتنہ بپا ہے

روتی ہے کسی کھوئے ہوئے کی تو فرقت میں
عالم یہ سمجھتا ہے کہ تو نغمہ سرا ہے

فریاد سناتی ہے کسے درد بھری اپنی
وہ کون ہے دنیا میں جو دمساز ترا ہے

ہے دور ابھی تجھ سے محبت کا نظارہ
تجھ سا ہمیں دم لوٹنے کیوں تیر لگا ہے

پھٹتا ہے جگر سن کے تری آہ و فغاں کو
نغمہ ہے ترا یا کسی بسمل کی صدا ہے

دل چاک ہوا جاتا ہے اس کوک سے تیری
تو کشتۂ الفت ہے تو مظلوم وفا ہے

مٹ جائے تو اس عشق کے آزار سے چھوٹے
یہ درد وہ ہے آپ ہی جو اپنی دوا ہے

وارفتہ ہوئی پی کے مئے الفتِ جاناں
اک جستجوئے شوق تجھے صبح و مسا ہے

عاشق کے لئے دہر میں رونا کبھی ٹلتا
ناشاد یہی جرم محبت کی سزا ہے

رباعیات

از حضرت فرحت کانپوری

ہر جفا کو وفا سمجھتے ہیں
ہر سزا میں جزا سمجھتے ہیں
روح کو خوف کچھ نہیں فرحت
خود فنا کو بقا سمجھتے ہیں

فرقت کو تری بلا سمجھتے ہیں ہم
قربت کو تری بقا سمجھتے ہیں ہم
ہم شائق ہیں فکر عاقبت میں فرحت
دنیا کو تو بے مزا سمجھتے ہیں ہم

علمی خبریں اور نوٹ

لندن سے جس قدر اخبار نکلتے ہیں اس قدر دنیا کے کسی دوسرے شہر سے شائع نہیں ہوتے، اشاعت میں بھی دنیا کا کوئی اخبار لندن کے اخبارات کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔ مشہور و مؤقر "لنڈن ٹائمس" سنہ ۱۷۸۵ء میں قائم ہوا تھا اور آجکل اسکی اشاعت ڈھائی لاکھ ہے، ہر روز اس کے تین اڈیشن شائع ہوتے ہیں اور ہاتھوں ہاتھ فروخت ہوجاتے ہیں۔ اس کے دفتر کی ایک شاخ پیرس میں بھی ہے۔ فرانس و انگلستان کے مختلف مقامات میں وہ ہوائی جہازوں کے ذریعہ بھیجا جاتا ہے۔ ہزارہا آدمی اس کے دفتر میں ملازم ہیں اور کئی درجن اڈیٹر ہیں۔ اسکی تیاری میں کروروں روپیہ صرف ہوتا ہے۔ تمام دنیا میں اس کی رائیں برٹش گورنمنٹ کی رائیں مانی جاتی ہیں۔ لیکن اشاعت کے لحاظ سے اس سے کئی اخبار بدرجہا بڑھے ہوئے ہیں، مثلاً ڈیلی ہیرلڈ کی اشاعت بیس لاکھ سے زائد ہے۔

جہاں تک ہم کو معلوم ہے ہندوستان میں ابھی تک کسی اخبار کی اشاعت لاکھ تک نہیں پہونچی۔ غیر معمولی افلاس کے علاوہ ہندوستان کے عوام بھی تعلیم یافتہ نہیں ہیں اور جب تک تمام ملک میں ابتدائی تعلیم جبری نہ ہوجائے اُس وقت تک کسی پرچہ کی چند ہزار سے زائد اشاعت ہونا مشکل ہے۔ انگریزی کے بعض اخبارات و رسائل کی حالت ضرور قابل اطمینان ہے۔ مثلاً بقول معصر "ریاست" دہلی مدراس کے مشہور انگریزی روزانہ "ہندو" کو بیس ہزار روپیہ ماہوار کی بچت ہے اور "ٹائمس آف انڈیا" کے مالکوں کو ہر سال بارہ لاکھ روپیہ کا منافع ہوتا ہے۔ یہی حال "اسٹیٹسمین" کلکتہ کا ہے۔ اخبار "ریاست" دہلی کو بھی کسی زمانہ میں اشتہارات سے ساٹھ ہزار روپیہ سالانہ کی آمدنی تھی۔

لندن میں ہر پیشہ کے لوگوں نے اپنے اخبار جاری کر رکھے ہیں، چنانچہ قصابوں کے اخبار میٹ ٹریڈرس جرنل کی اشاعت بیالیس ہزار ہے۔ پنساریوں کا اخبار "گروسرس گزٹ" ستر ہزار چھپتا ہے۔ شکر اور مسالوں کے سوداگروں کا اخبار بھی خاص ہے جو ساٹھ ہزار چھپتا ہے۔ اشتہار والوں کا اخبار بھی جدا ہے اور یہ تین لاکھ شائع ہوتا ہے۔ یہاں پر یہ معلوم کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ دنیا کے تمام ممالک میں کب سے اخبارات شائع ہونا شروع ہوئے۔ مثلاً روس میں سب سے پہلا اخبار سنہ ۱۷۰۳ء میں جاری ہوا۔ جرمنی میں سب سے پہلا اخبار سنہ ۱۶۰۹ء میں نکلا۔ اطالیہ کا سب سے پہلا اخبار سنہ ۱۶۲۰ء میں شائع ہوا۔ فرانس کا سب سے پہلا اخبار سنہ ۱۶۲۱ء

میں جاری ہوا۔ اسی طرح انگلستان میں سب سے پہلا اخبار ۱۶۲۲ء میں اور ہسپانیہ کا سب سے پہلا اخبار ۱۶۶۱ء میں جاری ہوا۔ کہتے ہیں کہ چین کا سب سے پہلا اخبار حضرت عیسیٰ کی پیدائش سے بھی کئی سو برس پیشتر جاری ہوا تھا۔ جاپان اخبار نویسی کے اعتبار سے بھی دنیا کے بہترین ترقی یافتہ ممالک سے سبقت لے گیا ہے۔ جاپان کے بعض اخبارات بیس بیس لاکھ چھپتے ہیں۔ ان کی اولوالعزمیوں کا یہ حال ہے کہ ہزارہا میل کے واقعات کی تصویریں دوسرے ہی دن جاپان میں شائع ہو جاتی ہیں۔ بعض اخباروں کے پاس ایک ایک درجن ہوائی جہاز بھی ہیں۔ گھنٹوں کے اندر اندر لاکھوں آدمیوں تک تمام ضروری خبریں پہونچ جاتی ہیں۔

پچھلے دو سال سے صوبہ متحدہ کے امتحانات ہائی اسکول اور انٹرمیڈیٹ کلاس کے نتیجے شائع کرنے میں ہمارے صوبہ کے دو انگریزی روزانہ اخبارات ایک دوسرے سے سبقت لیجانے کی انتہائی کوشش کرتے ہیں چنانچہ امسال "پاینیر" لکھنؤ اور "لیڈر" الہ آباد دونوں نے خاص ہوائی جہازوں کے ذریعہ نتیجہ منگایا، جس کی بدولت دونوں اخبارات نے نینی تال میں اعلان کے چند ہی گھنٹوں بعد پورا نتیجہ شائع کر دیا۔ یہ اولوالعزمی قابلِ داد ہے۔

اس وقت دنیا کا سب سے بڑا کتب خانہ لینن گراڈ (روس) کا بیان کیا جاتا ہے جس میں اڑتالیس لاکھ بتیس ہزار نو سو اڑتالیس کتابیں موجود ہیں، دوسرا نمبر پیرس کی ببلیوتھک نیشنل لائبریری کا بتلایا جاتا ہے جس میں تینتالیس لاکھ کتابیں ہیں اور مخطوطات ان کے علاوہ ہیں، تیسرا نمبر ماسکو کی لینن لائبریری کا ہے جس میں اڑتالیس لاکھ کتابیں ہیں۔ برٹش میوزیم کی مطبوعہ کتابوں کی تعداد بتیس لاکھ ہے اور ترپن ہزار چھ سو پچاس قلمی نسخے ہیں، اس میں مشرقی ممالک کی چھپی ہوئی ایک لاکھ میں ہزار کتب اور سولہ ہزار چار سو قلمی نسخے بھی شامل ہیں۔ برلن لائبریری میں بائیس لاکھ ستاسی ہزار اٹھ سو اکیس کتابیں ہیں، اور میونخ کے کتب خانہ میں سولہ لاکھ سترہ ہزار کتابیں ہیں

شاہنامہ کے زندہ جاوید مصنف فردوسی کے مقبرہ کی مرمت کے بعد حکومت ایران نے عمر خیام کا مقبرہ بھی درست کرا دیا ہے۔ ان دونوں مقبروں کی مرمت اور اصلاح پر گورنمنٹ ایران کے چھپن ہزار اٹھ سو چالیس ریال صرف ہوئے۔ حکومت نے ان دونوں مقبروں پر ہمیشہ پھولوں کی چادریں پڑی رہنے کا بھی انتظام کر دیا ہے آئندہ سال فردوسی کی ہزار سالہ جوبلی ہونے والی ہے۔ چنانچہ ایران کے ادیبوں نے اس کو ایک وسیع پیمانے پر منانے کے لئے سرگرمی سے کام کرنا شروع کر دیا ہے۔ "انجمن آثار ملیہ ایران" نے اس تقریب کے لئے ساٹھ ہزار

پونڈ صرف کرنے کی منظوری دیدی ہے۔ جس طرح ہر سال اسٹرٹیفورڈ ایون میں جو شیکسپیر کا وطن و مولد ہے اس نامور ملک الشعراء انگلستان کی برسی بڑی دھوم دھام سے منائی جاتی ہے۔ اسی طرح ایرانیوں نے بھی اپنے سب سے بڑے قومی شاعر فردوسی کے اعزاز میں ہر سال ایک یوم فردوسی منانا طے کیا ہے گورنمنٹ روس نے بھی فردوسی کی تصانیف کے چند نسخے جو گرجستانی زبان میں ہیں آئندہ سال کی تقریب پر بغرض نمایش ارسال کرنے کا وعدہ کیا ہے۔

لکھنؤ میں میر انیس کے مزار کی تعمیر کی ایک عرصہ سے تحریک جاری تھی۔ شکر ہے کہ نوجوان مہاراجہ صاحب محمود آباد نے اس کے تمام مصارف اپنے ذمہ لیکر عمارت کے نقشہ کے ساتھ میونسپل بورڈ لکھنؤ میں اجازت تعمیر کی درخواست دیدی ہے۔ ہم جواں بخت مہاراجہ بہادر کی خدمت میں ان کی اس دریا دلی پر مبارکباد دیتے ہیں۔

حیدرآباد دکن میں نواب حیدر یار جنگ علامہ سید علی حیدر نظم طباطبائی مرحوم کی یادگار قائم کرنے کے لئے ایک کمیٹی قائم ہوئی ہے۔ پچھلے دنوں اس کمیٹی نے جس میں نواب مصاحب جنگ بہادر، سید یوسف علی صاحب ایچ۔ سی۔ ایس مہر علی فاضل صاحب، راجہ کرشن پرشاد صاحب، اور ظہیر احمد صاحب ایچ سی۔ ایس شامل ہیں مجوزہ یادگار کی نوعیت پر غور کیا۔ چنانچہ تجویز ہوا کہ مستقل یادگار کی حیثیت سے حیدر علی ہال یا حیدر علی لائبریری تعمیر کیجائے۔ اور فیض جاری کی حیثیت سے حیدر علی اسکالرشپ قایم کیا جائے مولانا مرحوم کے ہزارہا شاگرد ہیں۔ کیونکہ ان کی تعلیم و تدریس کے چشمہ سے سیکڑوں کیا ہزارہا حضرات مستفیض ہو چکے ہیں۔ ہمکو امید ہے کہ سبھی معززین ان کی یادگار قائم کرنے میں دامے درمے حصہ لیں گے۔

رابندرا ناتھ ٹیگور کی تصانیف کے گہرے مطالعہ کی ترغیب دلانے کی غرض سے دہلی کے بنگالی کلب نے ہر سال ایک طلائی تمغہ دینے کا اعلان کیا ہے جو تصانیف ٹیگور کے متعلق کلب کے مقررہ موضوع پر بنگالی زبان میں لکھے ہوئے بہترین مضمون کے صلے میں دیا جائیگا۔ اس سال ٹیگور کی تصانیف میں "دیہاتی زندگی" پر مضامین طلب کئے گئے ہیں۔

"رہوڈس ٹرسٹ" کی طرف سے لارڈ لوتھین نے سر محمد اقبال کو آئندہ موسم گرما میں آکسفورڈ یونیورسٹی

میں تین لکچر دینے کی غرض سے مدعو کیا ہے۔ یہ سب سے بڑا علمی اعزاز ہے جو آکسفورڈ یونیورسٹی کی طرف سے کسی اہل علم کی خدمت میں پیش کیا جا سکتا ہے۔

مصطفیٰ کمال پاشا کی سرپرستی میں ترکی زبان سے عربی فارسی الفاظ خارج کرنے کی تحریک زور شور سے جاری ہے۔ ابتک دو ہزار دو سو میں الفاظ خارج کرکے ان کی جگہ خالص ترکی الفاظ تجویز کئے گئے ہیں۔ دو سو (۲۰۰) کے قریب فرانسیسی اور اطالوی الفاظ بھی جو ترکی زبان میں مخلوط ہو گئے تھے نکال دیئے گئے ہیں۔

بھنڈارکر انسٹی ٹیوٹ پونا نے چھ لاکھ روپیہ کی لاگت سے مہابھارت کا ایک نہایت شاندار تنقیدی و تشریحی ایڈیشن شائع کرنا تجویز کیا ہے جس میں دس دس ہزار صفحات کی بارہ جلدیں ہونگی۔ اب تک دو لاکھ روپیہ کا چندہ جمع ہو چکا ہے جسمیں ایک لاکھ روپیہ مہاراجہ صاحب اوندھ نے عطا فرمایا ہے۔

حال میں سابق شاہ افغانستان امان اللہ خاں نے ایک خود نوشت سوانحعمری لکھی ہے جسمیں افغانستان کے متعلق اہم انکشافات کئے ہیں اور بتایا گیا ہے کہ افغانستان سے آپ کو نکالنے کے لئے کیا کیا تدابیر اختیار کی گئی اور نادر خاں نے بھی کس طرح آپ کو دھوکا دیا۔

صوبۂ متحدہ کی تجارتی ڈائرکٹری

صوبۂ متحدہ آگرہ و اودھ میں تجارت کی نئی نئی راہیں تو کھل رہی ہیں لیکن ابھی تک اسکی کوئی باقاعدہ ڈائرکٹری شائع نہیں ہوئی اور نہ کوئی دوسری کتاب یا ذریعہ موجود ہے جس سے ایک نظر میں صوبے کی صنعت و حرفت کی کیفیت واضح ہو جائے۔ مگر اب اس کمی کے پورے ہونیکا انتظام ہو رہا ہے اور سنٹرل پبلسٹی کمپنی، مال روڈ کانپور کے زیر اہتمام اور محکمہ صنعت صوبہ کی زیر ہدایت پانچسو صفحات کی ایک ضخیم ٹریڈ اینڈ انڈسٹری ڈائرکٹری بابت ۱۹۳۵ء مرتب ہو رہی ہے کتاب مجلد ہوگی اور عمدہ دبیز کاغذ پر شائع ہوگی قیمت صرف تین روپیہ تجویز کی گئی ہے۔

ہمکو امید ہے کہ اہل صوبہ اس ڈائرکٹری سے پورا فائدہ اٹھائیں گے۔ تجارت پیشہ لوگوں کیلئے اپنی تجارت کو فروغ دینے کا یہ ایک بہترین ذریعہ ہے اور اسمیں اشتہارات دینا خاص طور پر مفید ہونا چاہیئے۔ دیگر حالات کے لئے منیجر صاحب سنٹرل پبلسٹی کمپنی مال روڈ کانپور سے خط و کتابت کیجائے۔



مەلەم ئارسلان دەتتەنىڭ ، ردوم

زمانہ

جلد ۶۳ اگست ۱۹۳۴ء نمبر ۲

"رازِ دہر"

از کرنل بھولاناتھ - آئی - ایم - ایس (ریٹائرڈ)

گر عاقلے[1] حدیث تو کم کنمے راہِ سرِ گفتگوے محکم کنمے
دل سوختۂ چند فراہم کنمے بر گفتہ بگریے و ماتم کنمے

دنیا ایک معمّا ہے، کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ ہستی کی علت غائی کیا ہے، اس کا آغاز کیونکر ہوا اور اسکا انجام کیا ہوگا۔ اِن باتوں پر جتنا غور و خوض کیا جاتا ہے "رازِ دہر" کے اسرار کی تنگ و تاریک گہرائیوں میں گھسنے اور تفتیش کرنے کی جتنی کوشش کیجاتی ہے اتنا ہی اسکی مسلسل پیچیدگیوں، اس کی عظمت و شان اور بے پایانی کا یقین ہوتا جاتا ہے۔

یہ نئے سوالات نہیں ہیں بلکہ آغازِ عالم سے چلے آرہے ہیں، کم از کم اُس زمانہ سے جب سے انسان نے ہوش سنبھالا ہے، یہ اہم سوالات اسکی عقل و فکر کو حیرت کے گرداب میں ڈالے ہوئے ہیں۔

آغاز[2] دواں گردن ایں زرّیں طاس انجام! خرابی چنیں نیک اساس
پیمودہ نمی شود بمعیار عقول سنجیدہ نمی شود بمقیاسِ قیاس (خیام)

---

[1] اگر میں عقلمند ہوں تو تیرے بارہ میں بہت کم گفتگو کرونگا بلکہ بولنا ہی بند کردونگا اور چند دل جلوں یعنی عارفان حقیقت کو جمع کرکے صفِ ماتم بچھاؤنگا اور جو کچھ میں نے ابتک تیری نسبت کہا ہے اُسپر گریہ وزاری کرونگا۔

[2] دنیا کی ابتدا کیسے ہوئی، اس سنہرے طباق یعنی آفتاب کے حرکت میں آنے سے، اور خاتمہ کیسے ہوگا؟ اسی عمدہ بنیاد کی تباہی سے یہ اسرار اس قسم کے ہیں جنکی کنہ یا تہ تک نہ کوئی عقل کے ذریعہ سے پہونچ سکتا ہے نہ قیاس سکے۔

[redacted]

جب کوئی ضعیف یا حقیر قوم ایک زبردست قوم کے ساتھ مقابلہ کرنے کھڑی ہو جاتی ہے، یا ایک کمزور آدمی خم ٹھونک کر کسی زبردست پہلوان کے ساتھ کشتی لڑنے کو تیار ہو جاتا ہے تو ہمیں اس پر رحم بھی آتا ہے اور افسوس و تعجب بھی ہوتا ہے۔

رحم و افسوس اس لئے کہ کمزور فریق کو شکست کھا کر ندامت اٹھانا پڑے گی، مگر اس کے ساتھ جب ہم اس کی ہمت اور حوصلہ کا خیال کرتے ہیں کہ باوجود مار کھانے اور خاک میں ملائے جانے کے وہ مقابلہ کرنے سے باز نہیں آتا تو ہمارا رحم اور افسوس تعجب اور تحسین میں بدل جاتا ہے۔

رازِ دہر کے لاینحل مسائل کے مقابل حضرت انسان کی یہی مثال ہے۔ منجم اور ہیئت داں ہمیں بتاتے ہیں کہ کرۂ ارض نظامِ شمسی کا ایک نہایت ادنیٰ جزو ہے۔ اور دوسرے نظامہائے شمسی کے آگے ہمارے نظامِ شمسی کی کچھ حقیقت نہیں، بلکہ یہ ایک نہایت ذلیل اور خفیف جزو ہے۔ اِس قسم کے لاکھوں کروڑوں نظام کائنات میں موجود ہیں۔

یکے[1] دریا نہ اورا بُن پدید و نے کراں پیدا درو اندیشہ حیراں، وہم سرگرداں، خرد شیدا

صدفہا اندرو مکنوں، گہرہا یہ مشحوں یکے زانہا بود گردوں جواہر اختر تسعا

ہمیں تعجب آتا ہے کہ ایک ذرۂ خاک انسان نے اس مشت خاک کرۂ ارض پر بیٹھے بیٹھے کس حکمت کے ساتھ تنات الافلاک کے اوپر خیال اور قیاس کی ٹانگیں پھیلائی ہیں۔

قیاس کی بیساکھی اور خیال کی کمیال کے ساتھ یہیں پر بیٹھا بیٹھا لامکان کو ناپتا ہے اور اجرام سماوات کی ضخامت، وزن، بُعد و ترکیب کی خبریں دیتا ہے۔ اور کنہ اشیاء، حدوث و قدم، ابتدا اور انتہا، علت و معلول پر رائے زنی کرتا ہے، اور واہی تباہی خیالات کے تکّے چلاتا ہے۔

جزوِ ضعیف محرمِ اسرارِ کُل ہوا

انسانی خلقت کا یہ عجیب خاصّہ ہے کہ جو باتیں آدمی کی سمجھ میں نہیں آتیں وہی باتیں اسکو زیادہ مرغوب اور دلآویز معلوم ہوتی ہیں اور انھیں کے سمجھنے کو اس کا جی للچاتا ہے۔ "رازِ دہر" کے سمجھنے کے لئے قدیم الایام سے بادپیمائی ہوتی چلی آئی ہے۔ چنانچہ انسان کے بہت زیادہ بیش بہا اوقات انھیں الجھنوں کے سلجھانے میں صرف ہوئے ہیں اور دنیا کے بڑے بڑے عقلمند لوگوں نے اپنی عمریں انھیں بیہودہ مساعی میں بسر کی ہیں۔ ان مساعی کو کبھی تو حکمت و فلسفہ کہا جاتا ہے اور کبھی دینیات اور الٰہیات کے نام

---

[1] ایک دریائے ذخار ہے جس کی نہ تہہ کا پتہ چلتا ہے نہ کنارہ کا۔ اس کام میں انسان کی فکر حیران ہے وہم پریشان ہے اور عقل گم۔ اس دریا کے اندر بیشمار بیش بہا گوہر بھرے ہوئے ہیں جنمیں تو ستاروں کا جو، سر ہمارا آسمان ہے۔

سے موسوم کیا جاتا ہے

مگر خلاصہ اس ہذیان کا یہ ہے کہ حکمت، سائینس، علوم، فنون، الٰہیات اور دینیات اُن بے سود کوششوں کے نام ہیں جو حضرت انسان نے وقتاً فوقتاً "راز دہر" کی عقدہ کشائی میں صرف کی ہیں۔

کس مشکل اسرار ازل را نکشاد کس یک قدم از نہاد بیروں نہ نہاد

من می نگرم ز مبتدی تا استاد عجز است بدست ہر کہ از مادر زاد (خیام)

انسان خلقتاً اس طرح سے بنایا گیا ہے کہ اس کی معلومات کو اس کے محسوسات کے دائرہ کے اندر محدود کیا گیا ہے یعنی جن چیزوں کو انسان محسوس نہیں کر سکتا اُن چیزوں کا علم اُس کو نہیں ہو سکتا۔ انسان کے حواس خمسہ نامکمل ہیں اور بغیر خارجی اور مصنوعی امداد کے محسوسات کا دائرہ بہت ہی تنگ ہے۔

آج کل کے زمانہ میں بہت سے آلات وادوات دوربین، خوردبین، اسپکٹراسکوپ، مقیاس، کیمیاوی اعمال، وغیرہ اختراع کئے گئے ہیں جن کی بدولت ہمارے مشاہدہ کا منظر بہت وسیع ہو گیا ہے مگر اس دائرہ کا احاطہ جتنا زیادہ بڑھتا اور وسیع ہوتا جاتا ہے اتنا ہی ہم پر ثابت ہوتا جاتا ہے اور ہم کو یقین آتا جاتا ہے کہ ہماری معلومات محدود ہیں اور ہمیشہ محدود رہینگی۔

ہمارے معلومات کی حدبندی اور محدودیت سے ہمیں یقین ہو جاتا ہے کہ اس احاطہ سے باہر بھی کوئی چیز ہے۔ اگرچہ یہ بیان کسی قدر بے معنی ہے مگر اسمیں شک نہیں کہ علم کے محدود ہونے سے ہمیں غیر محدود کے امکان کا احساس ہوتا ہے۔ گو اس کو علم نہیں کہہ سکتے اس لئے کہ وہ معلومات کے دائرہ سے باہر واقع ہے۔

فضائے کائنات کو خواہ ہم آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھیں، خواہ خوردبین اور دوربینیں لگا کر دیکھیں اور خواہ ضیاء نور کی رفتار اور زاویہ کو ناپ ناپ کر دیکھیں، کائنات کی نہ تو ہمیں کوئی ابتدا دکھائی دیتی ہے نہ انتہا۔

تو اس پہلو سے جو ہماری نظر کی انتہا ہے وہ ہمارے معلومات کا محیط ہے جو کائنات کی غیر محدود عظمت وشان، لاانتہا بزرگی اور بے غایت فراخی کی طرف رخ کئے ہوئے ہے اور ہمیں یقین دلا رہی ہے کہ دائرہ کے باہر اور بالا اور ماوراء اور دوسری وسعتیں اور بزرگیاں ہیں جو انسان

---

[1] کوئی شخص اسرار ازل کے معمہ کو نہ کھول سکا اور کوئی شخص اپنی بساط سے باہر قدم نہ نکال سکا۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ شاگرد سے لیکر استاد تک ہر شخص جو ماں کے پیٹ سے پیدا ہوا وہ اس بارہ میں عاجز ہے۔

کی چشم بینا سے مستور ہیں، اور رہیں گی علیٰ ہذا القیاس جب ہم چھوٹی چھوٹی اشیاء کو دیکھتے ہیں تو اس طرف بھی جاتے جاتے ہم رک جاتے ہیں اور باوجود زبردست خوردبینوں کی امداد کے اس جانب بھی معلومات کی حد بندی نظر آتی ہے اور ہمیں یقین ہو جاتا ہے کہ ہماری خوردبینوں کی حد نظر سے ماورا ایسے چھوٹے چھوٹے اجسام اور اجرام موجود ہیں جو ہماری نظروں سے ہمیشہ باہر رہیں گے۔

اس طرح سے دونوں طرف سے معلومات کی حد بندی ہو جاتی ہے۔ جو اشیاء ان حدود کے باہر واقع ہیں وہ غیر معلوم اور غیر معقول ہیں۔ ان کے اوپر رائے زنی اور قیاس دوڑانا عقل سے تعلق نہیں رکھتا اس سے ظاہر ہے کہ ہمارے معلومات کا دائرہ ایک بہت ہی چھوٹا اور حقیر جزیرہ ہے جو ایک بے کراں اور بے پایاں دریا کے اندر واقع ہے۔

اب ہم دیکھنا چاہتے ہیں کہ جو اشیاء اس دائرہ کے اندر واقع ہیں اُن کا علم درحقیقت ہمیں کہاں تک ہے۔۔

ایک میوہ ہے جسے ہم نارنگی کہتے ہیں، اور نارنگی اسکا نام اس لئے ہے کہ وہ گول ہے، زرد رنگ کی ہے اور اس میں ایک خاص قسم کی خوشبو، ذائقہ اور وزن موجود ہے۔

مگر ذائقہ، خوشبو، رنگ وغیرہ فقط کیفیات کے نام ہیں، اب سوال یہ ہے کہ آیا انھیں کیفیات کا مجموعہ نارنگی ہے یا ان کے علاوہ یا خارج از کیفیات نارنگی کوئی چیز ہے؟

اگر کیفیات کو نارنگی کہا جائے تو کیفیات فقط ہماری محسوسات سے پیدا ہوتی ہیں اور اس صورت میں خارج از محسوسات نارنگی کی کوئی ہستی اور حقیقت نہیں رہتی۔ اور اگر یہ کہا جائے کہ خارج از کیفیات اور کیفیات سے علیحدہ نارنگی کوئی چیز ہے تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ اسکا علم ہمیں کیونکر ہوا؟ اور اگر یہ کہا جائے کہ ہمارے محسوسات ان کیفیات سے متاثر ہوتے ہیں تو لامحالہ ماننا پڑے گا کہ نارنگی خارج از حواس بھی کوئی چیز ہے۔ اس لئے کہ یہ کیفیت کسی چیز کی کیفیت ہونا چاہئیے۔ بذات خود کیفیت قائم نہیں رہ سکتی، تو وہ کیا چیز ہے جس کی ہستی کے ساتھ یہ کیفیات وابستہ ہیں؟ اگر کسی چیز کی ہستی کو اس قسم کے دل بہلانے والے دلائل سے مان بھی لیا جائے تو کیا اس ماننے کو اس چیز کا علم کہا جا سکتا ہے؟

نارنگی کی حقیقت اور ماہیت ہماری نظر سے مستور ہے اور مستور رہے گی۔ اس کا نام کنہ اشیاء ہے اور یہی رازِ دہر ہے۔

اس قسم کے غوض و فکر سے ثابت ہوتا ہے کہ معلومات کے احاطۂ تصرف کے اندر بھی دلیل کا حکم اور

تسلط خام اور نا تمام ہے اور ہمیں مادّی اجسام کی حقیقت اور ماہیت معلوم نہیں۔

کائنات کو اگر سرسری نگاہ سے دیکھا جائے تو اس کی ترکیب میں مجمل طور پر دو اجزا پائے جاتے ہیں ایک جزو ان میں سے مادّی ہے اور دوسرا غیر مادّی

مادّہ کی نسبت ہم دیکھ چکے ہیں کہ مادّہ ہمارے محسوسات کے دائرہ سے باہر ہے۔ ہمیں اس بات کا علم نہیں کہ مادہ کیا چیز ہے اور اسکی ماہیت اور حقیقت کیا ہے۔ بلکہ جب تک مادّی اجسام پر کسی غیر مادّی چیز کا عمل ہو کر ان میں کیفیات اور امتزاج پیدا کر کے تباین صَور و ہیاکل ظاہر نہیں ہو جاتا تب تک مادّی اجسام کی ہستی ہمارے ادراک کے ماورا رہتی ہے۔ گویا انھیں معنوں میں مادّی اجسام کا پردۂ غیب سے احاطۂ علم کے اندر آجانا اور انکا غائب سے ظاہر ہو جانا ہمیں عدم سے موجود ہونے کا ثبوت دیتا ہے۔

کائنات کے غیر مادّی جزو کا نام قویٰ ہے۔

قویٰ کی حقیقت اور کنہ بھی ہمارے ادراک اور سمجھ سے باہر ہے۔ مادّی اجسام کی وساطت کے بغیر قویٰ کا ہمارے احاطۂ علم کے اندر آنا ممکن نہیں۔ مثلاً قوت برقی کی کیفیات اور صفات سے ہم واقف ہیں کہ اس سے حرارت، روشنی اور حرکت پیدا ہو سکتی ہے مگر اس بات کا ہمیں علم نہیں کہ برقی قوت ہے کیا چیز۔ بلکہ قویٰ کی ہستی کا اظہار اور علم ہمیں فقط اسی وقت ہوتا ہے جس وقت قویٰ کا کسی مادّی آلہ کے اوپر عمل ہو کر اسمیں کیفیات پیدا کر دیتا ہے۔

تو اس نقطۂ خیال سے مادّہ اور قویٰ ہمارے علم کے لحاظ سے ایک دوسرے کے ساتھ وابستہ اور لازم وملزوم ہیں۔ یہاں تک کہ ان میں سے ایک کا اکیلا بغیر دوسرے کے سہارے کے موجود ہونا ہماری سمجھ میں نہیں آسکتا۔

اسی التزام کی بنا پر بعض فلاسفر یہ رائے لگاتے ہیں کہ وجود درحقیقت واحد ہے اور مادّہ اور قویٰ وجود واحد کے دو پہلو ہیں۔ اسی قبیل سے جس طرح پانی ایک ہی چیز ہے اور سیال یا کثیف صورت میں وہ تگرگ و ژالہ بنکر ہمیں دکھائی دیتا ہے اور وہی پانی بخاری اور لطیف صورت اختیار کر کے ہماری نظر سے غائب اور مستتر ہو جاتا ہے۔ تو وحدت الوجود ماننے والے فلاسفروں کے خیال میں وجود واحد منجمد یا محسوس ہیئت میں مادّی اجسام بن جاتا ہے اور لطیف اور غیر محسوس حالت میں قویٰ بنکر ہمارے محسوسات کے باہر چلا جاتا ہے۔

غرضکہ مادّہ اور قویٰ کو خواہ دو علیحدہ وجود مانا جائے یا ایک ہی وجود کے دو پہلو تصور کئے جائیں اسکی ذات اور کنہ کا ہمیں علم نہیں اور نہ ہونا ممکن ہے اور جو کچھ علم ہمیں ہے وہ مادّہ اور قویٰ

کیفیات کا علم ہے اور وہ بھی جزوی اور ناکمل "وَمَا اُتِیۡنَاھُمۡ مِنَ الۡعِلۡمِ اِلَّا قَلِیۡل"

تا بُوَد دلم بعشق محروم نشد[1] کم بود ز اسرار کہ مفہوم نشد
اکنوں کہ ہمیں بنگرم از روئے خرد معلوم شد کہ ہیچ معلوم نشد

مگر اسمیں شک نہیں ہو سکتا کہ کسی چیز کا نیست سے ہست اور ہست سے نیست ہونے کا ثبوت علمی تحقیقات سے ہمیں نہیں مل سکتا، اور ہمیں ماننا پڑتا ہے کہ کائنات کا سلسلہ جہاں تک کہ نظر تحقیق اس کا سراغ لگا سکتی ہے لا ابد اور لایزال ہے یعنی ہمیشہ سے چلا آرہا ہے اور چلا جائے گا۔ البتہ اس کے بارہ میں علمی دلائل پیش کئے جا سکتے ہیں کہ یہ نظم و انتظام جو ہم آج دیکھ رہے ہیں اس کے لئے آغاز ضرور ہوگا یعنی اس قسم کا زمانہ ہماری سمجھ میں آسکتا ہے کہ جس وقت کل مادی اجسام یک جنس و یک ہیئت تھے۔ اور ان میں آپس میں کسی قسم کی تفریق اور تمیز نہ تھی۔ اسی مفروض ابتدائی حالت کا نام "مادۃ الہیولیٰ" یا "مادۃ الابتدا" یا Cosmos ہے۔ مرورِ زماں سے جب مادہ کے اوپر قویٰ کا عمل ہوا تو اس کے فعل انفعال سے مادی اجزا میں تخلخل[2] و تکاثف[3]، تکثر[4] و تقصر[5] پیدا ہو کر پہلے مفرد اجسام نمودار ہوئے جن کا نام عناصر ہے۔ فی زمانہ عناصر کے امتزاج اور ترکیب سے مرکبات اور مرکبات سے نیرنگی و بوقلمونی موجودات ظہور میں آئی۔

اب اگر مادہ کے بارہ میں اور اس قسم کے نظم و نسق کی نسبت اس قسم کا ارتقا اور مدارج تغیر و تبائن قیاس کیا جا سکتا ہے تو قویٰ کی نسبت بھی اس قسم کا قیاس دوڑا لینا کچھ مشکل نہیں۔

غالباً ابتدا میں قویٰ بھی صورتِ واحد اور ایک کیفیت ہوگا پھر جیسا جیسا قویٰ کے عمل سے مادی اجسام کے اندر اختلاف اور تفریق پیدا ہوتی گئی اسی طور پر قویٰ کا اظہار بھی مختلف صور اور کیفیات لئے ہوتا گیا اور اس کے نام بھی علٰحدہ علٰحدہ ہوتے گئے۔ چنانچہ قویٰ جس حالت میں اجرام سماوات کی تدویر[6] و حرکات کا فاعل ہوتا ہے تو اُسے جرِ ثقیل کہتے ہیں۔ جمادی اجسام کے اندر اسی قویٰ کا نام برق نور اور نار ہو جاتا ہے۔ نباتات میں تغذیہ، نامیہ اور بقائے نوع کی صورت اختیار کر کے وہی اپنی قوت روح طبعی کہلاتی ہے۔ حتیٰ کہ حیوان اور انسان کے اندر جب اس کے عمل سے حس و حرکات پیدا ہوتے ہیں تو ان کے امتزاج اور ترکیب سے ادراک، تمیز، تخیل، تصور اور حافظ کا اظہار ہو کر وہی قوت

---

[1] جبتک میرا دل عشق (حقیقی) میں چور رہا وہ کسی بات سے محروم نہ رہا اور کائنات کا کوئی راز ایسا نہ تھا جو میں نے سمجھ نہ لیا مگر اب جب میں ہوش میں آکر تمام باتوں پر عقل کی روشنی میں غور کرتا ہوں تو مجھے اتنا معلوم ہوا کہ مجھے کچھ بھی معلوم نہیں ع
کہ کس نکشود و نکشاید بحکمت ایں معمّا را

[2] [3] [4] [5] ہلکا بھاری، زیادہ و کم ہونا۔ [6] گردش۔

روح حیوانی اور انسانی بنجاتی ہے۔

ہر دم از کتم عدم خیمہ بصحرائے وجود | در جمادی و نباتی سفرے کردم و رفت
بعد از انم کنہش نفس بحیوانم برد | چوں رسیدم بوے از وے گذرے کردم و رفت
بعدازاں در صدفِ سینۂ انساں بصفا | قطرۂ ہستیِ خود را گہرے کردم و رفت

مندرجہ بالا خیالات علمی تحقیقات پر مبنی ہیں جن کی تائید مشاہدہ اور علمی دلائل سے کیجا سکتی ہے مثلاً موالید ثلاثہ کے مادی اجسام جل جلا کر اور مر مرا کر متعدد کیمیاوی اجزا بن جاتے ہیں۔ اسی طرح مختلف اقسام کے قوی، برق مقناطیس۔ نور۔ نار بھی ردّ و بدل ہو کر اپنی طبعی صورت تموج و اہتزاز میں تحویل کیئے جا سکتے ہیں۔ ان معنوں میں کائنات کو بہ ہیئت مجموعی اگر ایک مجسمہ تصور کر لیا جائے تو قوائے بہ ہیئت مجموعی اس کا فاعل یا حرکت دینے والا ہے جس کے عمل سے یہ عالیشان مشین چلتی اور حرکت کرتی ہے۔

حق جانِ جہان است و جہاں جملہ بدن | اصنافِ ملائکہ حواسِ ایں تن
افلاک عناصر و موالید اعضا | توحید ہمیں است و دگرہا ہمہ فن

اگر انسان کو اس عالمِ اکبر کا ایک ادنیٰ و حقیر جزو سمجھ لیا جاوے تو اس عالمِ اصغر کے اندر قوت کا وہ حصہ جو حضرتِ انسان کے اندر مائی و منی کا بکھیڑا پیدا کرتا ہے وہ ہی فاعلِ اکبر کا ایک ادنیٰ جزو قرار پاتا ہے

تا نفخت فیہ من روحی شنیدم شد یقیں | بہر من ایں معنی کہ ما ازاں ویم وے زان ماست

اب جو غور سے دیکھا جائے تو مختلف مذہبوں میں بھی اسی قسم کے اعتقادات موجود ہیں اور دینی مسائل اور علمی دلائل میں چنداں اختلاف نہیں

فرق صرف اتنا ہے کہ جس چیز کو حکما اور فلاسفر قوی کہتے ہیں، علمائے دین اسکی جگہ پر روح کو مانتے ہیں اور روح کی نسبت چند خصوصیتیں اہل دین ایسی بیان کرتے ہیں جنکو حکما قوی کے ساتھ منسوب نہیں کرتے، ورنہ کنہہ اور حقیقتِ روح کے بارہ میں علمائے دین ویسے ہی صمٌ بکمٌ ہیں جیساکہ حکما قوائے کے بارے میں۔

---

[1] ان اشعار میں منازلِ ارتقا کو اس طرح سمجھایا گیا ہے کہ پہلے میں عدم کے پوشیدہ خیمہ سے نکلکر صحرائے وجود میں آیا اول اول جلوات یعنی غیرذی روح اشیاء کی صورت اختیار کی پھر نباتات بنا، اس کے بعد میں نے حیوان کا جسم اختیار کیا اور اس منزل سے بھی گذر گیا۔ بالآخر مختلف منازل طے کرتے کرتے انسان کی صورت نصیب ہوئی۔ جہاں میں نے تزکیۂ نفس کے ذریعہ سے اپنی روح پاک کو بالیدگی دی اور اس صورت سے بھی گذر گیا۔ [2] ایک مرکز پر قائم رہکر جنبش۔

[3] تمام جہان جسم ہے اور حق اسکی جان ہے، جتنی قسم کے فرشتے ہیں وہ گویا اس تن کے حواس ہیں۔ تمام آسمان۔ عناصر اور جلوات، نباتات و حیوانات اسکے اعضا ہیں۔ پس اصلی توحید یہی ہے اس کے علاوہ ڈھونگ ہے۔

ویسئلونك عن الروح ۔ قل الروح من امر ربی

چونکہ حقیقت اشیاء ادراک انسان کے ماوراء ہے اس لئے جو کچھ کہ اس کے بارہ میں پیش کیا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے اس کی کسی ڈھنگ سے نہ تو تردید کی جا سکتی ہے نہ تائید۔ اور بنجواے "تکلمو الناس علی قدر عقولھم" سیکڑوں قسم کے مذہب اور ہزاروں قسم کے دین مخترع اور مروج ہوگئے ہیں۔

بقول مولانا روم:۔

پیل اندر خانۂ تاریک بود	عرضہ را آوردہ بودندش ہنود
دیدنش با چشم چوں ممکن نبود	اندراں تاریکیش کف می بسود
آں یکے را کف بخرطوم او فتاد	گفت ہمچوں ناودانستش نہاد
آں یکے را دست بر گوشش رسید	آں برو چوں بادبیزن شد پدید
آں یکے را دست بر پایش بسود	گفت شکل پیل دیدم چوں عمود
آں یکے بر پشت او بنہاد دست	گفت خود ایں پیل چوں تختے بدست
ہمچنیں ہر یک بجزوے چوں رسید	فہم آں می کرد ہر جا می شنید
چشم حس ہمچوں کفِ دست است و بس	نیست کف را بر ہمہ آں دسترس
چشم دریا دیگر است و کف دگر	کف بہل وز دیدۂ دریا نگر

عیسیٰ و موسیٰ کجا بُد کافتاب
کشت موجودات را می داد آب

---

[1] تجھ سے روح کے متعلق سوال کیا جاتا ہے۔ کہدے کہ روح میرے رب کا حکم ہے

[2] لوگوں کے ساتھ ان کی عقل اور سمجھ کے مطابق گفتگو کرو۔

[3] کچھ ہندو لوگوں کے دکھانے کو ایک ہاتھی لائے جسے ایک تاریک مکان میں رکھا گیا، بہت سے آدمی ہاتھی دیکھنے آئے لیکن چونکہ تاریکی کے باعث آنکھوں سے دیکھنا ممکن نہ تھا اس لئے ہر شخص نے ہتھیلی سے ٹٹولا۔ ایک شخص کی ہتھیلی سونڈ پر پڑی تو وہ بولا کہ ہاتھی تو بالکل پرنالہ کی طرح ہے۔ دوسرے کا ہاتھ کان پر گیا تو اس نے ہاتھی کو پنکھا سمجھا۔ تیسرے کا ہاتھ پاؤں کو لگا تو اس نے ہاتھی کو ستون جانا اور چوتھے کا ہاتھ ہاتھی کی پیٹھ کو لگا تو اس نے کہا کہ ہاتھی تو تخت کے مانند ہے۔ اسی طرح ہر شخص نے ہاتھی کے جس جس حصہ کو ٹٹولکر دیکھا اُسے ویسا ہی سمجھ لیا۔ حاصل اس حکایت کا یہ ہے کہ ہمارے قوی اس قدر محدود ہیں کہ ہم ہر شے کی کنہ کو نہیں پہونچ سکتے۔ چشم دریا ہیں اور چیز ہے اور ہاتھ کی ہتھیلی دوسری۔ اس لئے ہتھیلی کو چھوڑ اور آنکھوں سے دریا کو دیکھ۔ جب سے آفتاب موجودات کی کھیتی کو شاداب کر رہا ہے یعنی نشوونما دے رہا ہے اس وقت کوئی عیسیٰ تھا نہ کوئی موسیٰ۔

ظفر

(از جناب مولوی محمد یحییٰ صاحب تنہا غازی آباد)

ابوظفر سراج الدین بہادر شاہ، اکبر شاہ ثانی کے بیٹے اور شاہ عالم کے پوتے تھے۔ اور ظفر تخلص کرتے تھے۔ ہندوستان کی سلطنت دادا کے زمانہ میں قطعی طور پر ہاتھ سے نکل گئی تھی، محض ایک وظیفہ خوار کی حیثیت سے برائے نام بادشاہ رہے، یہ حالت بھی ۱۸۵۷ء کے فتنہ کے بعد بدل گئی اور جوان جوان بیٹے اور پوتے آنکھوں کے سامنے گولی مار دیے گئے، خود بدولت کو رنگون بھیجدیا گیا جہاں چند سال بیکسی و بے بسی کے ساتھ بسر کر کے ۱۲۷۹ھ ہجری میں پیوند خاک ہو گئے۔

آپ نے ابتدا میں شاہ نصیر سے اصلاح لی تھی جیسا کہ خود فرماتے ہیں:۔

آفریں تجھکو ظفر، ہو کیوں نہ شاگرد نصیر — اس غزل کو جاکے پڑھو ہر ایک دانشور کے پاس

بعد ازاں شیخ ابراہیم ذوق سے مشورۂ سخن کرنے لگے، اور اُن کے بعد یہ خدمت مرزا غالب کے سپرد ہو گئی

بعض آزاد خیال حضرات کا قول ہے کہ وہ تمام اشعار جو ظفر کے نام سے مشہور ہیں، ذوق نے کہے ہیں لیکن کلام کے دیکھنے سے یہ رائے صحیح نہیں معلوم ہوتی کیونکہ ذوق اور ظفر کے کلام میں بیحد فرق ہے۔ اگر کہیں مشابہت بھی ہے تو صرف اس قدر جس قدر کہ ایک شاگرد اور استاد کے کلام میں ہوتی ہے۔ ظفر کے چار ضخیم دیوان ہیں جن میں تیس ہزار سے زائد اشعار ہونگے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ اتنا کچھ ذوق نے اپنے بادشاہ کے لئے کہدیا ہو۔ اور ہر غزل میں ایک آدھ مصرع یا ایک آدھ شعر ظفر کا ہو۔

کلام پر تبصرہ | ظفر کو سلاستِ زبان سے بیحد دلچسپی تھی مگر مضامینِ نَو سے کوئی دلبستگی نہ تھی۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کے کلام میں محاورات تو بکثرت ہیں اور روزمرہ مختلف صورتوں میں جلوہ گر نظر آتا ہے لیکن مضمون کچھ نہیں ہوتا۔ آپ کے یہاں بہت ہی معمولی عاشقانہ مضامین دیکھنے میں آتے ہیں جو کوئی خاص کشش نہیں رکھتے۔ ممکن ہے اُس زمانہ میں لوگوں کو صاف صاف اور معمولی معمولی باتیں کچھ دلفریب معلوم ہوتی ہوں لیکن آجکل تو نو آموز بھی اس قسم کے مضامین باندھنے میں تامل کریگا۔

گلشنِ بیخار میں نواب شیفتہ نے آپ کے کلام کی نسبت کوئی رائے ظاہر نہیں فرمائی، صرف "افکار الیشاں درست و ہموار" کہکر آپ کا حال ختم کر دیا ہے۔ ملاحظہ ہو: "ظفر تخلص مرشد زادۂ آفاق مرزا

ابو ظفر بہادر ولیعہد سلطان زماں حضرت محمد اکبر شاہ ادام اللہ تعالیٰ ظلالہٗ بہ اکثر صفات موصوف و بہ محامد مکارم معروف۔ در اکثر خطوط دستگاہے شائستہ دارد۔ بایں فن بسیار مالوف است۔ شیخ ابراہیم ذوق از مائدۂ نعمتش ذلہ ربا و وظیفہ خوار است و افکار ایشاں بحک و اصلاح او درست و ہموار۔"

ظفر کے کلام میں سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ بہت سے ایسے الفاظ استعمال ہوئے ہیں جو عام طور پر دیگر شعرا کے یہاں نہیں پائے جاتے۔ لغت نویسوں کے لئے کلامِ ظفر کا مطالعہ ازبس مفید ہے اور اس قسم کے الفاظ کے لئے صحت و عدم صحت کا معیار بن سکتا ہے۔

آپ کے یہاں زیادہ تر غزلیں ہیں جن میں مستزاد بھی شامل ہیں، لمبی لمبی بحریں بھی کافی تعداد میں ہیں۔ غزلوں کے بعد مخمسات کا نمبر ہے۔ قطعات۔ مسدس۔ مثلث اور سلام بھی کہے ہیں، مضمون آفرینی کا کہیں پتہ نہیں البتہ زبان کی صفائی اور سادگی ہر جگہ موجود ہے۔

بعض بعض جگہ آپ نے نئی تشبیہات سے کام لیا ہے۔ مثلاً

انبوہِ خال و خط سے ترا صفحۂ عذار
گویا کہ فالنامہ ہے یہ دانیال کا

لاغری سے حال اپنا کیا کہوں کیا ہوگیا
میں زمیں پر نقشِ پائے مور گویا ہوگیا

شام و شفق دکھاتے نہیں جان کیا سبب
ل کر مسی جو کھاتے نہیں پان کیا سبب

دل پر داغ گیا چشم پر رو کے قریب
چیتا پہنچا ہے عجب گھات سے آہو کے قریب

یادِ قامت میں تری میں ہوں جہاں سے غافل
سچ ہے یہ بات کہ سولی پہ بھی آجاتی ہے خواب

زیرِ محراب دو ابرو ہیں وہ آنکھیں بدمست
آئے مسجد میں ہیں کیوں پیچھے یہ میخوار شراب

آنکھیں جو اُسکی عکس فگن آئینہ میں ہیں
دو کشتیاں ہیں دیکھتے بالائے آب ہم

محاورات ملاحظہ ہوں:-

ہم سے ہر بات پہ اُکھڑے ہے تو یوں او ظالم
نہیں معلوم تجھے غیر نے کیوں کر گانٹھا

تم کنارا جو لگے کرنے تو معلوم ہوا
اب کنارے ہی مجھے گور کے پہنچائیگا

اشک آستیں پہ میری مژگاں سے جھڑ کے پہنچا
اس طفل نے تو پکڑا انگلی پکڑ کے پہنچا

مرے خط کو جو اُس نے بن پڑھے پُرزے کئے قاصد
کسی نے میری جانب سے پڑھایا کچھ نہ کچھ ہوگا

تو بلاتا ہے غیر کو گھر میں
ایسی باتوں سے گھر نہ جائیگا؟

دل دیکے ظفر ہم نے کہا کچھ بھی نہ اُس سے
سو فیل وہ لاتا جو کوئی اور سا ہوتا

ظفر دل لے گیا مجھکو گلی میں اُس پریوش کی
وگرنہ اب تلک تو واں فرشتہ بھی نہ پہنچا تھا

جو کچھ کہنا تھا وہ کہدیا ظفر اُس سے — بھڑا اس دل کی وہاں ساری ہیں نکال آیا
کیا ہی لوآلا لاطہ غزل یہ تونے لکھی ہے واہ ظفر — ہوتے ہیں آہ رقم کم سنگ و آتش آہن آپ
گو نہ جاوگی سواری آپ کی غیروں کے گھر — گھوڑے کاغذکے یہیں سے بیٹھے دوڑائینگے آپ
مزا چکھایا ہے کوہکن کو یہ عشق آیا جو امتحاں پر — کہ لایا تو جوئے شیر لیکن چھٹی کا دودھ آگیا زباں پر

آپ کے یہاں رعایت لفظی کی مثالیں بھی کچھ کم نہیں ہیں، ذوق کو بھی اس کا چسکا تھا۔ آپ نے بھی اپنے اُستاد کی پیروی کو فخر سمجھا۔ چنانچہ فرماتے ہیں:۔

ڈال مت اشکوں کا پردہ دیکھ تو بیش نظر — یار عین وصل میں اے چشم تر چھپ جائیگا
کان پر سے زلف اُسکی اب سرکتی کیوں نہیں — یا کہیں یہ سانپ اُس بانبی سے ہے کیلا ہوا
دہن تنگ جو یاد آیا مجھے — تنگ کیا کیا دلِ ناشاد آیا
بات سیدھی کا ظفر دیتے ہیں اُلٹا وہ جواب — راستی یوں ہے زمانہ ہوا بالکل اُلٹا

بعض فارسی تراکیب بھی جو صاف اور رواں ہیں قابلِ تعریف ہیں، مثلاً، خجالت کش، خضر خجستہ پے۔ روکش۔ خود کام وغیرہ

آپ کے یہاں شاعرانہ تعلّی کے بھی اکثر اشعار پائے جاتے ہیں۔ کہتے ہیں:۔

طرز سخن کا اپنی ظفر بادشاہ ہے — اس کے سخن سے یاں نہ کسی کا سخن لگا
ظفر لکھوں غزل وہ اور تبدیلِ قوافی میں — کرتا ہو جائے اب بازار ارباب سخن ٹھنڈا
تیرے شعر تر میں ہے وہ آبداری لے ظفر — اُس سے روکش ہوسکے کیا منہ دُر خوش آب کا
ظفر بھی شعروسخن میں ہے ایک ہی اُستاد — تم اپنے وقت کا یارو اسے کہو سودا

تعجب ہے کہ آپ نے بعض غلط الفاظ بھی استعمال فرمائے ہیں، ذوق کا شاگرد اور غلط الفاظ استعمال کرے۔ ممکن ہے شاہ نصیر کے زمانہ کی یہ غزل ہو اور جس طرح شاہ صاحب نے تظلّم کو بمعنی ظلم باندھ دیا تھا آپ نے بھی کالنقش فی الحجر کو نقش کالحجر باندھ دیا ہے۔ فرماتے ہیں:۔

کتابوں میں دھرا کیا ہے بہت لکھ لکھکے دھوڈالیں — ہمارے دل پہ نقش کالحجر ہے تیرا فرمانا

آپ نے اکثر جگہ ترکیب اضافی بھی غلط باندھی ہے، مثلاً:۔

ناوک انگن تری الفت نے دکھائی آنکھیں — روزن اک اور ہوا روزنِ سینے کے قریب

یہاں سینے۔ نگینے اور پسینے ہم قافیہ الفاظ ہیں۔ اگر روزنِ سینہ ہوتا تو جائز تھا مگر روزنِ سینے کی ترکیب اضافی غلط ہے۔

بعض بعض مقام پر اُستادوں کے مضامین کو اپنی طرز سے باندھا ہے لیکن کوئی خوبی نہیں پیدا کر سکے، مثلاً آتشؔ کا شعر ہے:۔

کیا ہنسی آتی ہے مجھ کو حضرتِ انسان پر ... فعلِ بد تو ان سے ہو لعنت کریں شیطان پر

آپ فرماتے ہیں:۔

شیطنت سے کرے انسان تو سب کام خراب ... کیا تماشا ہے کہ شیطان کا ہو نام خراب

متروکات کی فہرست آپ کے یہاں بھی لمبی چوڑی ہے۔ ذیل میں چند متروکات بطور نمونہ لکھتا ہوں
سدا بمعنی ہمیشہ۔ اوندھا بجائے الٹا۔ لیک بجائے لیکن۔ بعینہ بجائے بعینہ۔ شعر

نہ دیکھوں نرگسِ شہلا کا گل کیونکر کہ ہے نقشہ ... بعینہ چشمِ دلبر کا سیہ ایسا سفید ایسا

مت بجائے نہ۔ تلک بجائے تک۔ تو ہو بجائے ہو۔ نہووے بجائے نہو۔ ہوجیو بجائے ہو۔ چاہیئے ہے بجائے چاہیئے۔ ہووےگا بجائے ہوگا۔ پلنگ بچھیگا بجائے پلنگ بچھے گا۔ مصرع

جو غیر کا ترے گھر میں پلنگ بچھے گا

بن پڑھے بجائے بغیر پڑھے۔ ڈالا بگاڑ ڈالا بجائے بگاڑ ڈالا۔ تلے بجائے نیچے۔ لینے کا نہیں بجائے نہیں لیگا

آپ کے یہاں اگرچہ مضامین بلند نہیں ہیں اور معمولی باتیں ہیں تاہم متانت موجود ہے، کہیں کہیں رکاکت بھی پیدا ہو گئی ہے، مثلاً

کئی بوسے مقرر گر کئے دینے مجھے تم نے ... تو کیا صاحب حسابِ دوستاں در دل نہووےگا

دوڑ کے ہاتھ چھاتی پہ ہم اُنکی یوں پھرے ... جیسے کوئی چرا کے ہو نارنج لے چلا

شمع کی مانند جو آنسو بہاتے ہو ظفر ... سارقِ سیمیں کسی کی دیکھی رات کو تھی صاف صاف

انتخاب کلام۔ ذیل میں آپ کے کلام کا انتخاب درج کیا جاتا ہے:۔

مقدور کس کو حمدِ خدائے جلیل کا ... اس جا کہ بے زباں ہے دہن قال و قیل کا

پھرتا ہے اُس کے حکم سے گردوں یہ رات دن ... چلتا ہے یاں عمل کوئی جبر ثقیل کا

گلشن ہو خلد کا کہ چمن ہو نعیم کا ... کب دل لگے ہے تیری گلی کے مقیم کا

آتی ہیں یاد ہجر کی ہم کو اذیتیں ... واعظ سے ذکر سُن کے عذابِ الیم کا

کھلکھلا کے ہنسے گلشن میں ہزاروں غنچے ... دل ہمارا خوش و خرم نہوا پر نہ ہوا

اے ظفر دیکھیئے عقبیٰ میں ہو کیا حال اپنا ... چین دنیا میں تو اک دم نہ ہوا پر نہ ہوا

ہم نے دنیا میں آکے کیا دیکھا ... دیکھا جو کچھ سو خواب سا دیکھا

صورت سے بتوں کی عجب اللہ کی قدرت — ہر جلوہ میں اک اور ہی جلوہ نظر آیا

بلبل بھی تھی جاں باختہ پروانہ بھی جاں باز — پر میری طرح جان نہ کھوتا کوئی ہوتا

نہ درویشوں کا خرقہ چاہیئے نہ تاج شاہانہ — مجھے تو ہوش دے اتنا رہوں میں تجھ پہ دیوانہ

یہ ساری آمد و شد ہے نفس کی آمد و شد پر — اسی تک آنا جانا ہے نہ پھر جانا نہ پھر آنا

ظفر اس سے چھوٹ کے جو بست کی تو یہ جانا ہم نے کہ واقعی
فقط ایک قید خودی کی تھی نہ قفس تھا کوئی نہ جال تھا

نہ تھی حال کی جب ہمیں اپنے خبر رہے دیکھتے اوروں کے عیب و ہنر
پڑی اپنی برائیوں پر جو نظر تو نگاہ میں کوئی برا نہ رہا

ظفر آدمی اس کو نہ جانئے گا وہ ہو کیسا ہی صاحب فہم و ذکا
جسے عیش میں یاد خدا نہ رہی جسے طیش میں خوف خدا نہ رہا

محبت جیتے جی کی ہے وگرنہ بعد مرنے کے — نہیں کوئی کسی کی قبر پر بھی آن کر پھرتا

یا مجھے افسر شاہانہ بنایا ہوتا — یا مرا تاج گدایانہ بنایا ہوتا

اپنا دیوانہ بنایا مجھے ہوتا تو نے — کیوں خرد مند بنایا نہ بنایا ہوتا

وہ مقام عیش ہے دنیا کہ یاں سے جیتے جی — کون جاتا ہے اگر جائے گا مر کر جائے گا

جوں شرار سنگ ہم کو عشق کی گرمی نے آہ — دفعتاً پیدا کیا پھر دفعتاً پنہاں کیا

دیکھ غافل صانع قدرت کی تو صنعت گری — ایک مشت خاک کو کیا صورت انساں کیا

چرخ و ارکان میں کیا انس و جن و جاں میں کیا — سب میں ہے تو ہی سوا تیرے ہے اعیاں میں کیا

ہوتا ہے چودھویں کو ہمیشہ خسوف ماہ — جو دن کمال کا ہے وہی ہے زوال کا

کوئے عدم کو جا کر کوئی پھرا نہ ہرگز — دشوار ہے نہایت شاید وہاں سے آنا

ایک شب وہ ماہوش آیا نہ مہماں میرے گھر — واہ اتنا بھی نہ تجھ سے گردش گردوں ہوا

جو کہ ہے قسمت میں ہونا ہوگا آخر کو وہی — اے ظفر کیا شکوہ اسکا یوں ہوا یا یوں ہوا

گیا موسم گردش ساغر مے — نہ وہ دور رہا نہ وہ زمانہ رہا

اقتدار صبر و طاقت خاک میں رکھوں ظفر — فوج ہندوستان نے کب ساتھ ٹیپو کا دیا

ضبط فریاد کروں گریہ کو روکوں لیکن — دل بیتاب کو تھاموں یہ نہیں ہو سکتا

وہ کھا گئے سو بار مرے آگے قسم جھوٹ — اور پھر ہے یہ دعویٰ کہ نہیں بولتے ہم جھوٹ

اُس ستمگر نے مجھے جرمِ وفا پہ مارا
کوئی لینے کا نہیں نامِ وفا میرے بعد

یا تو وہ رکھتے تھے سرگوشی ہمیں سے اس قدر
یا لگی ہونے سخن پوشی ہمیں سے اس قدر

ہمیشہ باندھتے ہیں شاعر شراب کو آتش
بڑے ہی جھوٹے ہیں کہتے ہیں آب کو آتش

عجب طرح کا زمانہ یہ آگیا ہے ظفرؔ
کسی کے ساتھ کسی کو نہیں ذرا اخلاص

یوں ہیں جہاں سے مردم گوشہ نشیں الگ تھلگ
جیسے صدف میں سیپ ہے دُرِّ ثمیں الگ تھلگ

جو ہے منظور کہیں یا نہ کہیں
اُن کی نظروں ہی سے پا جائیں گے ہم

ہم سے زمانہ آج اگر پھر گیا تو کیا
لاکھوں ہی اس کے دیکھ چکے انقلاب ہم

چمنِ دہر سے لے جائیں گے کیا
جوں صبا خاک اُڑا جائیں گے ہم

کر چکے ہیں امتحاں جس بے وفا کا لاکھ بار
اُس سے اُمیدِ وفا کیا اے ظفرؔ رکھیں گے ہم

جو کہیں خفا نہیں ہم اُدھر سے وہ اِدھر سے ہم
نہ ہونے دیں محبت کم اُدھر سے وہ اِدھر سے ہم

ڈسے ایسے لگا کر ہاتھ تیری زلف کو کافر
سمجھتے آستیں کے تار مارِ آستیں ہم ہیں

مری مژگاں سے آنسو اس طرح برسوں برستے ہیں
کہ جو برسات کے موسم میں مینہ چھاجوں برستے ہیں

لاکھ چاہت کو چھپائے کوئی پر چھپتی نہیں
پیار کی آنکھ اور الفت کی نظر چھپتی نہیں

ہمارے آگے ہے ذکر اگلے دستاروں کا
پرانے مُردوں کی وہ ہڈیاں اُکھاڑتے ہیں

اب بھی وہ آنکھ تری آئینہ رو ہے کہ نہیں
لگے طوطوں پہ خدا جانئے تو ہے کہ نہیں

دل دیکے اُن کو ایسی اذیت ہوئی ہمیں
اب دل کبھی نہ دیں گے نصیحت ہوئی ہمیں

برسوں گزرے کہ ہوئی خاک ہماری برباد
اب تو اس کوچے میں اے بادِ سحر خاک نہیں

پی لاکھ بار صہبا، کی لاکھ بار توبہ،
اب کر چکا میں توبہ، توبہ ہزار توبہ

تیس دن چاند کے وعدے پہ پھراتا ہے مجھے
جب ہوا چاند تو غرہ ہی بتاتا ہے مجھے

جنوں میں کیا مرے پیوند پیرہن کو لگے
کہ ایک تار بھی چھوڑا ہو تو کفن کو لگے

قاصدِ اشک چلا رکے جو دل کا پیام
کیا ظفرؔ اس سے ملاقات کی پھر ٹھہرائی

ے نعل شکلِ مہِ نو جب ترے توسن کو لگے
چار چاند اور فلک پر مہِ روشن کو لگے

پڑھ لیتے پسِ صفحہ سے مضموں ترے خط کا
کاغذ میں سیاہی دمِ تحریر نہ چھوڑی

جفا کی آپ کی باعث وفا ہماری ہے
خطا تمہاری نہیں ہے خطا ہماری ہے

رہا تھا کیا وہ مجھ سے چھین کر لیتے تو کیا لیتے
دل و دیں لے چکے تھے اب اگر لیتے تو کیا لیتے

خدا کے واسطے زاہد اُٹھا پردہ نہ کعبہ کا
کہیں ایسا نہو یاں بھی وہی کافر صنم نکلے

اُسے کیا کام تھا وہ بے خبر کیوں پوچھتا پھرتا
دل گم گشتہ کی اپنے خبر لیتے تو ہم لیتے

خدا بچائے ظفر دوستی سے اِس دل کی
جو ہو یہ دوست تو حاجت نہیں عدو کی مجھے

نہ پہنچا کر کہ اپنے پاس پہنچا جبکہ وقت اپنا
اجل کو آفریں ہے، وقت پر پہونچی تو یہ پہنچی

وقت پر جو کام آئے دوست اُسکو جانیئے
ورنہ رہتا ہے ظفر یاں کام کس کا بند ہے

اُسی کو دوست سمجھتے ہیں وہ جو کچھ نہ کہے
کرے جو اُن سے سوال و جواب دشمن ہے

یہ کیا ستم ہے ہم کہیں رو رو کے حال اپنا
منہ اپنا پھیر پھیر کے وہ بے وفا ہنسے

میں جو کہتا ہوں بے وفا ہے رقیب
وہ مجھے کہتے ہیں کہ تو کیا ہے

خدا جانے صنم میں میرے صورت کسکی ملتی ہے
وگرنہ ایسے کافر سے طبیعت کس کی ملتی ہے

مزا ہے جو محبت میں نہیں ہے وہ کسی شے میں
کسی کو کیا بتاؤں اسمیں لذت کسکی ملتی ہے

بتو نکو کچھ زباں لے دل نہیں آسان دینی ہے
جو کہنا ہو تو سچ کہنا خدا کو جان دینی ہے

چاہیئے حد سے زیادہ نہ بستر چل نکلے
چلئے چال ایسی کہ کچھ کام ظفر چل نکلے

قدر داں جبکہ ہنر کا نہ جہاں میں دیکھا
بے ہنر رہ گئے اور اہل ہنر چل نکلے

جو کیا سوائے ظفر ہم نے بھرا
کیا کہیں دنیا میں ہم کیا کر چلے

ہم یہ تو نہیں کہتے کہ غم کہہ نہیں سکتے
پر جو سبب غم ہے وہ ہم کہہ نہیں سکتے

نظر سے جب نظر لڑا کر نظر بندی لگی ہونے
صف مژگاں میں انکھوں کی کمربندی لگی ہونے

مرے احوال سے وہ بیخبر اب تک نہیں واقف
کوئی بات اُسکے کانوں تک ظفر پہنچا تو دی ہوتی

اے ظفر کھاتے ہیں ہم زخم پہ زخم تازہ
گل نیا روز محبت ہے کھلاتی جاتی

اصلاح دیہات اور اسکا پروگرام

(از شیخ سعید الدین احمد، محکمہ کوآپریشن پنجاب)

متمدن ممالک کی حالت کو اگر بنظر غائر دیکھا جائے تو یہ بات صاف طور پر نظر آئیگی۔ کہ ان کی خوشحالی اور فارغ البالی کا پورا انحصار ان کی صنعت وحرفت اور تجارت پر ہے انگلستان پنجاب سے بھی چھوٹا ملک ہے مگر اس کی دولت و ثروت تمام ہندوستان بلکہ ایشیا سے بھی زیادہ ہے۔ اس کی وجہ صرف یہی ہے کہ اس کے ہاتھ میں تجارت ہے اور وہ ایک صنعتی ملک ہے۔ جاپان نقشۂ عالم پر ایک پرنالہ ٹیڑھی ترچھی لائن سی نظر آتا ہے مگر اس وقت وہ اپنی تجارت کی وجہ سے دنیا کی ممتاز ترین سلطنتوں میں شمار ہوتا ہے امریکہ اپنی صنعت کی بدولت مالی حیثیت میں تمام دنیا کا سرتاج ہے۔ علی ہذا القیاس جس ملک کے قبضہ میں کوئی نہ کوئی صنعت ہے اس کا نام عزت سے لیا جاتا ہے۔ ایران اپنے قالینوں کی وجہ سے تمام دنیا میں مشہور ہے۔ چین اپنی نقاشی اور ظروف کی صنعت کی وجہ سے وقعت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ اسکیمو اپنی سمور کی وجہ سے مشہور ہیں، یہاں تک کہ آغا اپنی ہینگ کی وجہ سے ہندوستان کے چپہ چپہ میں مشہور ہیں اور علامہ اقبال نے بانگ درا میں ان کا ذکر یوں کیا ہے۔

آغا بھی لے کے آتے ہیں اپنے وطن سے ہینگ

مگر واہ رے ہندوستان تیرا نام ہی مٹ گیا.

ہندوستان ایک زراعتی ملک ہے اور اس کی خوش حالی کا دارومدار زیادہ تر فصل کی کامیابی پر منحصر ہے۔ اگر فصل کامیاب ہو گئی تو پورا سال آرام سے گزر گیا ورنہ فاقہ کشی بھوک اور مفلسی کا سامنا رہتا ہے بارانی رقبوں میں ایسی تکالیف پیش آتی ہیں کہ الامان والحفیظ۔ بیچارے باشندے اچھی فصل اور اچھے ایام کی امید میں فصل پر فصل اور سال پر سال گذار دیتے ہیں۔ بعض دفعہ کئی کئی برس کے انتظار کے بعد بھی ناامیدی کا منہ دیکھنا پڑتا ہے۔ اور اس عرصہ میں بیچارے زمینداروں کے زیورات مال مویشی برتن وغیرہ تمام قیمتی

لے سلسلے کیلئے ملاحظہ ہو زمانہ بابتہ جون سنہ ۱۹۳۴ء

سامان بک جاتا ہے، مکان پر ساہوکار قبضہ کر لیتا ہے، گھر میں اناج کھانے کو پہلے ہی نہیں ہوتا فصل کی کوئی خاص امید نہیں ہوتی، بدن ڈھانپنے کو چیتھڑا بھی نصیب نہیں ہوتا، پیٹ بھرنے کو اناج نہیں ملتا غرض ایسی مصیبت کا سامنا کرنا پڑتا ہے کہ خدا دشمن کو بھی نہ دکھائے۔ بعض دفعہ فصل تیار ہو جاتی ہر امید کا نورانی چہرہ اپنی پوری آب و تاب سے دکھائی دیتا ہے مگر قدرت کے ادنیٰ ترین اشارے سے بنا بنایا کھیل بگڑ جاتا ہے، ذرا بارش زیادہ ہو گئی تو فصل تباہ ہو گئی، ژالہ باری سے نقصان ہو گیا، وقت پر دو بوندیں نہ پڑیں تو ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا، غرض فصل کی کامیابی اور ناکامی کے متعلق وثوق سے کبھی کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ اس کا علم صرف اس عالم الغیب کو ہوتا ہے جو زمین و آسمان پر حکمرانی کرتا ہے۔

جن ایام میں خداوند تعالیٰ کی طرف سے فصل کی ناکامی کی صورت میں عذاب نازل ہوتا ہے۔ بچارے زمیندار کی حالت ناگفتہ بہ ہوتی ہے۔ زمیندار کا تعلق تمام دنیا سے اس طرح کا ہے جیسے روح اور جسم۔ اگر زمیندار کی فصل ناکامیاب ہوتی ہے۔ تو ہمارے ملک کی مالی حالت پر اس کا بہت ہی بڑا اثر پڑتا ہے؛ اگر زمیندار کی فصل ہی اچھی نہ ہوئی تو گاؤں کے تمام پیشہ وروں کے گھروں میں اناج کا دانہ نظر نہ آئے گا۔ اور ساہوکاروں کی دکانوں پر روپے کی جھنکار سنائی نہ دیگی۔ بازار میں بزازوں کی دکانوں پر، بنیوں کے ہاں اور تمام دوسری منڈیوں میں وہ چہل پہل نظر نہ آئیگی۔ اور جب بازاروں میں رونق نہ ہوئی تو مہاجنوں، ساہوکاروں، اور دوسرے پیشہ وروں کو مالی مشکلات کا سامنا کرنا پڑے گا۔ جب زمیندار کی حالت خراب ہو گی تو وہ گورنمنٹ کے مطالبات کو پورا نہ کر سکے گا۔ اور جب گورنمنٹ کا مطالبہ لیا نہ ہوگا تو خزانہ میں روپیہ کہاں سے آئیگا۔ اور جب خزانہ میں روپیہ نہ ہوگا تو نظام سلطنت کس طرح قائم رہیگا۔ غرض تمام ملک کی خوشحالی اور بربادی کا انحصار زمیندار کی ذات پر ہے۔ اس لئے ہمیں سوچنا چاہئے کہ خدانخواستہ ہمارے زمیندار پر برا وقت آ پڑے۔ تو ہمارے پاس کون سے وسائل ہیں جن کے طفیل ہم اپنا پیٹ پال سکتے ہیں۔

یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ جس ملک کا دارومدار صرف زراعت پر ہو اس کی مالی حالت عام طور پر مستحکم نہیں ہوتی۔ یورپ اور امریکہ کی مالی حالت میں جو استحکام ہے وہ صرف ان کی صنعت و حرفت کی وجہ سے ہے۔ ان کی موٹریں اور کپڑا ان کی مشینری اور دیگر قسم قسم کی دوسری چیزیں ان کی مالی حالت کے مضبوطی کی ذمہ دار ہیں۔ آسٹریلیا کی مالداری اس کی سونے کی کانوں کے طفیل ہے بہر حال جس ملک میں کوئی نہ کوئی صنعت ہوگی وہ مالدار ہوگا۔ مگر ہمارے ملک کا یہ حال ہے کہ بمبئی کی بندرگاہ سے دو لاکھ ٹن چنے غیر ممالک کو بھیجے گئے۔ کراچی سے بیس لاکھ ٹن پنجابی گندم یورپ کو روانہ کیا گیا

مدارس سے دس ہزار ٹن چاول دساور کو ارسال کئے گئے، غرض ادھر سے کپاس ادھر سے تمباکو، یہاں سے چمڑا وہاں سے اون روانہ کیا گیا۔ اور باہر سے کیا آیا؟ کئی لاکھ موٹریں، کروروں گھڑیاں (جن کی قیمت تمام ارسال شدہ مال سے زیادہ ہوگی) اور کئی کپڑوں کے جہاز اور اسی قسم کی دیگر چیزیں، کچی چیزیں ہمارے ملک سے جاتی ہیں اور انھیں پر پالش ہوکر اور توڑ موڑ کر ہمیں واپس کردیجاتی ہیں اور ہمارے ملک کی باقی ماندہ دولت پر مہذب طریقہ سے ڈاکہ ڈالا جاتا ہے۔ اگر ہمارے ملک کو صنعت وحرفت کا شوق ہوتو باہر سے یہ چیزیں کیوں آئیں؟ اور تو اور ہمارے پہننے کے کپڑے لنکا شائر سے آتے ہیں، بچوں کے کھلونے جاپان تیار کرتا ہے۔ بوٹ اور جرابیں بھی غیر ممالک سے آتی ہیں۔ اسطرح ادنیٰ سے ادنیٰ اور حقیر سے حقیر ضرورت کے لیے ہم دوسروں کے دست نگر ہیں۔ بچہ پیدا ہو تو اس کا لباس جاپانی ہوگا، مردے کا کفن لنکا شائر کا ہوگا۔ میت کا کافور بھی "میڈان انگلینڈ" (Made in England) ہوگا

افسوس اور صد ہزار افسوس کہ ہمارا مرنا جینا، ہماری خوشی، غمی، شادی بیاہ اور ہر ایک فعل دوسرے ممالک کے لئے منفعت بخش ہوتا ہے۔ شہری آبادی کے کھانے کے بسکٹ ولایت سے، پینے کی وسکی اور دوسری قسم کی شراب اسکاٹ لینڈ اور روم سے، سگریٹ مصر او انگلستان سے، تیل صابون بھی یورپ سے، بدن ڈھانکنے کو کپڑا مانچسٹر اور لنکا شائر سے، غرض ہر چیز سمندر پار سے آتی ہے۔ ہمارے عیش وعشرت کا سامان بھی تمام تر غیر ممالک سے آتا ہے یہ تو نفس خرچی کا بیان ہے۔ لیکن یہ ایک امر واقعہ ہے کہ ہماری زندگی کے ہر ایک شعبہ میں غیر ملکی چیزوں کا دخل ہے۔ غیر ممالک بھی ہر وقت ہماری ضروریات کو پورا کرنے کے لئے نئی نئی چیزیں اور ہر قسم کا سامان بنانے میں مصروف رہتے ہیں۔ انھیں اناج پیدا کرنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوتی۔ اگر ایک شہر سے ایک سو موٹر کاریں تیار ہوکر چلی جائیں تو اُن کی قیمت سے تمام شہر کی خورد ونوش کا سامان مہیا ہوسکتا ہے۔ اور اُن کی یہ آمدنی ہمارے تمام سال کی کلیمانی اور فصل کی نگہداشت سے بدرجہا زیادہ ہوتی ہے۔ ہمارا حال یہ ہے کہ لوگ تمام رات جاگ کر فصلوں کو پانی دیتے ہیں لیکن جب فصل تیار ہوتی ہے تو اس کی آمدنی بھی غیروں کے پاس چلی جاتی ہے۔ اس لئے اس بات کی اشد ضرورت ہے کہ ہم اپنی تمام توجہ صنعت کی طرف مبذول کریں، اور پہلے چھوٹی چھوٹی ضروریات کو ہم پہونچانے کی کوشش کریں اور اپنے لئے اپنے ملک میں کپڑا تیار کریں، اپنے بھائیوں کے لئے جوتے بنائیں، ہل جوتنے کی مشینری تیار کریں غرض اسی قسم کی وہ تمام چیزیں تیار کریں جو ہماری روزانہ زندگی کے لئے ضروری ہیں۔ اگر بازار سے صابن خریدنے کی ضرورت ہو تو دکاندار ہمیں "سنلائٹ" "لکس" اور "پام آلیو" نہ دکھلائے بلکہ ہمارے اپنے بنائے ہوئے

صابن دے، جو اچھے اور سستے ہوں، حجامت کے استرے خریدنا ہوں تو ہمیں جیلٹ، پنامہ، صفاچٹ، برکو بیسٹ کا دست نگر نہ ہونا پڑے۔ بلکہ اپنے ملک کے تیار کردہ استرے ملیں۔

یہاں پر یہ اعتراض ہو سکتا ہے۔ کہ یہ کام شروع کس طرح کیا جائے۔ ملک میں روپیہ نہیں اور اگر کوئی کام شروع کیا جائے تو اس میں کامیابی نصیب نہیں ہوتی۔ ان تمام باتوں کا جواب یہ ہے کہ یورپ اور امریکہ کی تجارتی کامیابی کی محض یہ وجہ ہے کہ ان ممالک کے باشندے متحدہ طور پر اور مل جلکر تجارت شروع کرتے ہیں، اور وہ اپنی تجارت اور صنعت کو فروغ دینے کے لئے لمیٹڈ کمپنیاں بنا لیتے ہیں، چھوٹے چھوٹے حصے رکھتے ہیں اور اُن کی فروخت سے جو روپیہ جمع ہوتا ہے وہ کمپنی کا سرمایہ قرار پاتا ہے، اور اس سے وہ لوگ اپنا کام چلاتے ہیں، ادھر مال تیار ہوتا ہے ادھر کمپنی اسے فروخت کر دیتی ہے اس طرح انھیں مالی مشکلات کا سامنا نہیں کرنا پڑتا۔ مگر ہمارے ملک میں جو کام شروع کیا جاتا ہے یا کسی صنعت کو ہاتھ میں لیا جاتا ہے تو اس کی بنیاد انفرادیت پر مبنی ہوتی ہے، اور اگر اس کام میں نقصان ہوتا ہے تو اس کا اثر ایک ذات واحد پر ہوتا ہے، اگر فائدہ ہوتا ہے تو اس کا نفع صرف ایک شخص کی ذات تک محدود رہتا ہے نقصان کی حالت میں وہ شخص ضرور اس کام کو بند کر دے گا اور اس طرح ملک کی تجارت اور صنعت مضمحل کی مضمحل ہی رہیگی۔ فائدہ کی حالت میں صرف وہی مالدار اور سرمایہ دار ہوگا۔

اب یہ دیکھنا چاہیئے کہ آخر ہماری ملکی صنعتوں کا کیا حشر ہوتا ہے۔ سب سے پہلے کپڑے ہی کی صنعت کو لیجئے، عام طور پر غریب اور نادار باشندے تمام دن اپنے دقیانوسی کرگھوں پر بیٹھے "کھڈی کھٹ پٹ" کی گردانیں کیا کرتے ہیں، اور ان کی مستورات دنیا اور مافیہا سے غافل ہو کر دھاگے کے تاروں کو جوڑتی نظر آتی ہیں۔ مگر جب بیچاروں کا دس بیس گز کپڑا تیار ہو جاتا ہے تو ان کے پاس کوئی ذریعہ نہیں ہوتا جس کی وساطت سے وہ اسے اچھے داموں پر فروخت کر سکیں۔ لہٰذا وہ بیچارے اپنے کپڑے کو بغل میں دبا اور کسی قصبے میں جاکر اسے کوڑیوں کے مول بیچ آتے ہیں۔ اس آمدنی سے بعض اوقات انکا خرچ بھی پورا نہیں ہوتا، بیچارے کیا کھائے اور کیا بچائے۔ بزاز کو اسی کپڑے سے جو نفع حاصل ہوتا ہے اس سے جولاہے کا کوئی واسطہ نہیں۔

دوسری چمڑے کی صنعت کو لیجئے۔ ہمارے غریب موچی تمام دن جوتے بنانے میں مصروف رہتے ہیں شام کو بیچارے جوتا بغل میں دبا کسی بوٹ مرچنٹ کے پاس جاتے ہیں پہلے تو وہ ان جوتوں کی خرید میں لیت و لعل کرتا ہے اور خریدتا بھی ہے تو دس بارہ آنے سے زیادہ نہیں دیتا۔ مگر اسی جوڑے کو وہ خود ڈیڑھ دو روپیہ سے کم پر نہیں بیچتا۔ اس کے بعد ظروف سازی کی صنعت کی طرف دیکھئے، بیچارے ٹھٹھیرے (برتن ساز) دن اور رات تانبا اور پیتل کوٹتے ہیں جس سے اُن کی کیا تمام محلہ والوں کی نیند حرام ہوتی ہے مگر جب برتن

تیار ہوتے ہیں تو دکانوں کی آرائش و زیبائش کا باعث ہوتے ہیں اور برتن ساز تھوڑی سی قیمت لیکر خوش ہو جاتا ہے بعد کو یہ خوب قیمت لیکر فروخت ہوتا ہے۔ غرض ہماری جو تجارت ہے اسمیں معمولی اہل ملک کو موجودہ نظام کے ماتحت کوئی خاص فائدہ نہیں ہوتا البتہ سرمایہ دار ضرور نفع میں رہتے ہیں۔ بیچارے کاریگر عسرت سے وقت گذاری کرتے رہتے ہیں۔

مرادآباد اپنی برتن سازی کی وجہ سے دور دور تک مشہور ہے، مگر یہ امر واقعہ ہے کہ وہاں کے کاریگر روزانہ مزدوروں سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے۔ تمام دن محنت اور جانفشانی سے کام کرتے ہیں، کوئی نقاشی میں مصروف ہے تو مانی اور بہزاد کو مات کر رہا ہے، کوئی برتنوں کو صیقل دے رہا ہے تو اس صیقل کے سامنے آئینہ حلبی شرماتا ہے مگر شام کو جب مزدوری ملتی ہے تو ان بیچاروں کو سوا دس، دس اور بارہ بارہ آنوں سے پائی زیادہ نہیں ملتی اس حالت کے ہم خود ہی ذمہ دار ہیں۔

میں چاہتا ہوں کہ ہمارے پیارے ملک کی صنعت بھی اپنے معراج کمال کو پہنچے، اور اسکا ہر ایک باشندہ اپنی زندگی اچھی طرح گذار کر پیٹ بھر روٹی کھائے۔ اچھے سے اچھا کپڑا زیب تن کرے اور عزت و آرام سے زندگی بسر کرے۔ اسے اپنی ضروریات کے لئے کسی کا محتاج نہ ہونا پڑے، کمائے اور نفع اٹھائے، بنائے اور بیچے، کھائے اور پیئے، دنیا میں عزت سے جیئے اور فارغ البالی سے بسر اوقات کرے۔ اور تفکرات و ترددات، پژمردگی اور تذبذب اہل ملک کے پاس نہ پھٹکنے پائے۔ اس کے لئے فی زمانہ یہ بات اشد ضروری ہے کہ تجارت، صنعت و حرفت کے متعلق جو کام شروع کیا جائے وہ مل جل کر باہمی امداد و اعانت سے کیا جائے۔ جو کاروبار شروع کیا جائے وہ منظم طریقہ پر کیا جائے، اگر اسمیں نفع ہو تو اس سے زیادہ سے زیادہ اشخاص فائدہ اٹھائیں، اسیطرح اگر نقصان ہو تو اس کا اثر کسی شخص واحد پر نہ پڑے بلکہ اس نقصان کو بہت سے آدمی برداشت کریں۔ اس طرح لوگوں کو زیادہ مالی مشکلات کا سامنا نہ کرنا پڑیگا۔

کام کو اس طریقہ سے شروع کرنے کے لئے متمدن ممالک میں "لمیٹڈ کمپنیاں" اور مشترکہ سرمایہ کی دکانیں اور کارخانے کھولے جاتے ہیں۔ مثلاً اگر ہم کپڑے کا ایک بڑا کارخانہ کھولنا چاہتے ہیں جس کے لئے بیس لاکھ روپیہ کا سرمایہ درکار ہے تو ہزار ہزار روپیے کے حصے مقرر کر لئے جائیں، اور دو ہزار اشخاص کی امداد سے یہ سرمایہ فراہم کیا جائے۔ اس طرح اس کمپنی کے دو ہزار ممبر ہونگے، جس کے معنی یہ ہوئے کہ اس کارخانے کے دو ہزار مالک ہوئے۔ اور اس کا نفع دو ہزار آدمیوں پر تقسیم کر دیا جائیگا اور اگر نقصان ہوا تو اس میں بھی دو ہزار آدمی شریک رہیں گے۔ اس طرح کام میں بھی کوئی خرابی واقع نہ ہوگی اور کارخانہ بھی جاری رہیگا اسی طریقے سے ہم بڑے بڑے کام جاری کر سکتے ہیں جس کا انتظام محکمہ کوآپریشن نے پہلے ہی سے کر دیا ہے

اس طرح کی تجارت جائنٹ اسٹاک کمپنیوں کے قواعد کی رو سے بخوبی ہوسکتی ہے۔

گورنمنٹ عالیہ نے انجمنہائے امداد باہمی کا محکمہ قائم کرکے ملک پر احسان عظیم کیا ہے۔ ہماری معاشرتی تمدنی، اقتصادی، زراعتی اور دوسری تمام مشکلات کا حل اور زندگی کے ہر ایک شعبہ کی تکالیف کی دوا اس محکمہ سے مل سکتی ہے۔ ملکی صنعت و حرفت کو بھی اس کی امداد سے ترقی دیجا سکتی ہے۔

صنعتی انجمنہائے امداد باہمی قائم کرکے ترقی دینے کا انتظام کیا ہے۔ اور پیشہ ور جماعتیں اپنے اپنے گاؤں اور شہروں میں محکمہ کو درخواست دیکر اس قسم کی انجمنیں قائم کراسکتے ہیں اور انجمنوں کے بعد محکمہ کی منظوری سے Industrial Banks (صنعتی بنکوں) سے قرضے مل جاتے ہیں۔ اور ان کے ممبروں کو مہاجنوں اور ساہوکاروں کی منت وسماجت سے بھی نجات ملجاتی ہے۔ اور ممبران اس سرمایہ سے اپنا سامان تیار کرلیتے ہیں اور اسے فروخت کرکے قرضہ ادا کردیتے ہیں۔ نہ ساہوکاروں کا تقاضا نہ دکانداروں کی خوشامد، کاریگر تمام سامان تیار کرنے کے بعد اکٹھا کرکے دوسرے شہروں کو روانہ کردیتے ہیں اور وہ خاصے منافع پر بک جاتا ہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ ہمارے تمام پیشہ ور بھائی اپنے اپنے گاؤں قصبوں اور شہروں میں صنعتی انجمن جاری کراکے اپنی مشکلات آسان کرالیں اور جس سال فصل اچھی نہ ہو وہ اپنے زمیندار بھائیوں کی بھی کچھ نہ کچھ مدد کرسکیں گے۔ ورنہ کم سے کم اپنا پیٹ تو پال ہی سکیں گے۔ اگر دیہاتی آبادی کو ان صنعتی انجمنوں سے کوئی خاص فائدہ نہ بھی ہو تو شہری آبادی اس سے پوری طرح فیض یاب ہوسکتی ہے۔ شہر میں چیزیں بک جائیں گی۔ اپنے ملک کی صنعت میں ترقی ہوگی، بیکاری کم ہوگی، لوگوں کو تھوڑی بہت روٹی کھانے کو ملنے لگے گی۔ غرض عام تکلیف اور افلاس میں ضرور بالضرور کمی واقع ہوگی۔

پنجاب کے بڑے بڑے شہروں میں بہت سی انجمنیں پائی جاتی ہیں، مثلاً گوجرانوالہ میں برتن سازی کی انجمنیں، جالندھر میں فرنیچر والوں کی سوسائٹیاں، لدھیانہ میں کپڑے بننے والوں کی انجمنیں، انبالہ میں دریوں کی، ملتان میں کھیس اور بسترون کی۔ غرض ہر جگہ انجمنیں ہیں۔ حالانکہ ابھی لوگ ان سے پوری طرح مستفید نہیں ہوتے۔ صوبہ متحدہ کی فضا اس قسم کی انجمنوں کے لئے بہت ہی موافق ہوگی، اور میرے خیال میں آگرہ واودھ کے بڑے بڑے شہروں میں ایسی انجمنوں کی اشد ضرورت ہے۔ باشندگان صوبہ متحدہ کو چاہیئے کہ پنجاب کی طرح اپنے صوبہ میں بھی بہت جلد صنعتی انجمنیں جاری کرائیں اور اپنے صوبہ کے محکمہ انجمن ہائے امداد باہمی سے اس معاملہ میں ہر طرح سے امداد واعانت حاصل کریں۔

یہ زمانہ بہت نازک ہے اور سبھی قوموں کی زندگی کا دارومدار تجارت اور صنعت پر ہے جس ملک کے ہاتھ میں صنعت اور تجارت ہوگی وہ تہذیب و ترقی میں سب سے آگے رہیگی، اس لئے اس بات کی سخت ضرورت ہے کہ ہم بھی اپنی صنعت کو بڑھائیں، تجارت کو ترقی دیں، فصل کے انتظار میں وقت گنوانا بے سود ہے۔ فصل بونے کے بعد جو وقت باقی بچ رہے اُس میں کاشتکاروں کو کوئی نہ کوئی کام ضرور کرنا چاہیئے، خواہ مرغی خانہ کھول لیا جائے، رسیاں بنائی جائیں یا نواڑ تیار کی جائے، بہرحال کچھ نہ کچھ کام ضرور ہونا چاہیئے، حقہ پینے اور سونے میں وقت ضائع کرنا مناسب نہیں ہے۔ ہندوستانی دہقان کو مصری کسان سے سبق لینا چاہیئے۔ مصر میں زمیندار عام طور پر مرغیاں، بطخیں اور کبوتر پالکر اپنی مالی حالت درست کرتے ہیں۔ ہمارے پیشہ وروں کو یورپ امریکہ اور جاپان کے کاریگروں سے سبق حاصل کرنا چاہیئے، کام کریں اور کمائیں، خود بھی کھائیں اور دوسروں کو بھی کھلائیں۔ محکمہ انجمنہائے امداد باہمی سے مدد حاصل کریں۔ اس محکمہ سے پورا فائدہ اُٹھایا جائے تو اس سے ہر قسم کی تجارت میں مدد مل سکتی ہے۔ اس طرح برادران وطن چین سے زندگی بسر کرسکتے ہیں ورنہ کف افسوس ملتے رہ جائیں گے۔

دل کی رانی

یہ ایک ہریجن لڑکی کی دردناک کہانی ہے جو ایک ہی ہفتہ میں ماں، باپ اور چچا چچی کے سایہ سے محروم ہوگئی تھی۔ کہانی کا پلاٹ بہت دلچسپ ہے۔ نفس مطلب اچھوت اُدھار، خورد و نوش باہمی اور انتر بواہ یعنی ازدواج باہمی ہے۔ آج کل اس قسم کے اصلاحی فسانوں اور رسالوں کی ضرورت ہے۔ جیبی تقطیع کے ڈھائی جزو قیمت ۴ر ملنے کا پتہ: سید فرید جعفری مچھلی شہری ۱۴۱ دریبہ پان۔ الہ آباد

اسلامی تاریخ کی سچی کہانیاں[1] (حصہ اول و دوم)

ان رسائل میں مسلمان لڑکوں اور لڑکیوں کی اخلاقی تعلیم کے لئے بہت دلچسپ مفید اور مؤثر تاریخی کہانیاں جمع کی گئی ہیں اور آخر میں نتیجہ نکالکر اخلاقی سبق بھی دیا گیا ہے۔ رسالے واقعی اچھے ہیں اور ہم ان کی خریداری کی سفارش کرتے ہیں۔

---

[1] مرتبہ مولوی محمد حسین صاحب محوی لکھنوی۔ حصہ اول ۷۰ صفحات قیمت ۳ر حصہ دوم صفحات ۸۰ قیمت ۴ر ملنے کا پتہ:۔ مکتبہ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی۔

قاتلانِ محمد بن سام

(از سید امداد اللہ قادری ایڈیٹر "تاریخ")

قاتلان محمد بن سام کی نسبت مورخین نے جو کچھ لکھا ہے اُنھیں ذیل میں بجنسہٖ نقل کیا جاتا ہے۔

تاریخ طبقات ناصری قاضی منہاج الدین جوزجانی ۶۵۸ھ جلد ۱ ص۱۲۳

"و دراں وقت جماعتِ متمردان از کھوکھراں و قبائل کوہ جود عصیاں آوردہ بودند و سلطان دراں زمستاں بہندوستان آمد و آں طائفہ متمردان را بدوزخ فرستاد، چوں مراجعت بغزنیں کرد بدست فدائی ملاحدہ در منزل الیک در شہور سنہ اثنین وستمائۃ شہادت یافت۔"

مرآۃ الجنان امام عبداللہ الیافعی ۷۶۸ھ جلد ۴ ص۴

"وفیہا توفی السلطان ابو المظفر محمد شہاب الدین الغوری صاحب غزنہ قتلتہ اسماعیلیہ۔"

تاریخ گزیدہ حمد اللہ مستوفی ۷۳۰ھ جلد ۱ ص۴۰۰

"در سنہ اثنیٰ وست مائۃ بغزاء ہندوستان رفت، بسیار مواضع مسخر گردانید، پس از انتقام در راہ ملاتان (ملتان) ہندوان کوکری درحالت نماز کردن اورا شہید کردند۔"

المختصر فی اخبار البشر ابوالفدا۔ ۷۳۲ھ جلد سوم ص۱۰۱

"اول لیلۃ من شعبان قتل شہاب الدین ابو المظفر محمد بن سام بن الحسین الغوری ملک غزنہ وبعض خراسان بعد عودہ من لہاور بمنزل بخیال لہ دمیل قبل صلاۃ العشاء وشب علیہ جماعۃ ہو بحرکانہ وقد تفرق الناس عنہ لاماکنہم فقتلوہ بالسکاکین قیل انہم من الکوکیر وہم طائفۃ من اہل الجبال مفسدون کان شہاب الدین قد فتک فیہم وقیل الا انہم من الاسماعیلیہ فان شہاب الدین ایضاً کان کثیر الفتک فیہم واجتمع حرس شہاب الدین فقتلوا ولئک الذین قتلوا شہاب الدین عن آخرہم۔"

دول الاسلام شمس الدین ذہبی ۷۴۶ھ جلد دوم ص۸۱

مات سلطان غزنه والهند شهاب الدين محمد بن سام الغوری قتلة الاسماعيليه بجفيه قتلوا ولابعض الحرس فوقع الصياح وثاء اليه الحرس من مرانحوهم واخلوها فنجهت الاسماعيليه على السلطان فرضعوه فى محصنة وسار دوا وكتموا موته"۔

تاریخ مبارک شاہی طایحیٰی بن احمد بن عبداللہ سرہندی ۸۳۸ھ صہ۱۱

"سلطان مرحوم در دار الملک غزنیں مراجعت فرمود۔ وملک قطب الدین را وداع وادہ سمت دہلی فرستاد۔ چوں در قصبۂ دمیک رسید فدائی ملاحدہ یکایک میان سراپردہ در آمد و بر سلطان مرحوم زخم انداخت۔ چنانچہ سلطان مرحوم سعید شہید غازی بہمراں زخم شہادت یافت"۔

روضۃ الصفا میر خوند بلخی ۹۰۳ھ جلد چہارم صہ۱۸۲

"درایں اثنا نہیاں بعرض او رسانیدند کہ طائفہ از ساکنان کوہ جود اظہار عصیاں کردہ اند سلطان عزیمت دیار ترک موقوف داشتہ بداں طرف رفت وجمعی از ایشاں کشتہ واسیر گرفتہ عنان مراجعت بجانب غزنین منعطف ساخت ودر اثنار راہ بمنزل دمیک فدائیاں اورا شہید گردانیدند"۔

حبیب السیر غیاث الدین خوند میر ۹۳۵ھ جلد دوم صہ۱۵۶

ودراں اثنا ستعنود کہ طائفہ از ساکنانِ کوہ جود مسالک طریق معصیان گشتہ اند۔ دفع ایشاں را اہم واولیٰ دانستہ بداں طرف شتافتہ وبسیارے از دشمناں را بہ تیغ انتقام گزانید ودر وقت مراجعت بمنزل دمیک بزخم خنجر کی از فدائیان ملاحدہ شہادت یافت"۔

لب التواریخ یحیٰی بن عبداللطیف ۹۴۰ھ ضمیمہ تاریخ ایلیٹ صہ۳۴

"بعد ازاں در وقت نماز کردن فدائیان ہندی اورا شہید کردند"۔

جہاں آرا احمد بن محمد غفاری ۹۷۰ھ ضمیمہ تاریخ ایلیٹ صہ۳۶

"آخر بہ تسخیر ہند توجہ نمود، بعد از ضبط بغلامان معتمد سپرد ودر وقت مراجعت مرز لھاور در منزل دمیک واول شعبان سنہ اثنی وست مائہ بدست فدائیان کوکری کشتہ شد"۔

طبقات اکبری ملا نظام الدین احمد ہروی ۱۰۰۲ھ جلد اول صہ۱۹

"دریں وقت طایفہ کوکھرانی در نواحی لاہور عصیاں ظاہر کردند سلطان برسر کھوکراں لشکر کشید وقطب الدین ایبک نیز از دہلی بخدمت رسید کھوکھراں را مالش دادہ باز بغزنیں مراجعت نمود۔ درحین مراجعت در دیلک نام دہی از توابع غزنیں از دست فدائی کھوکھراں شہید شد"۔

منتخب التواریخ ملا عبدالقادر بدایونی ۱۰۰۴ھ طبع لکھنؤ صہ۱۵

ذریں و لاطایفہ کھوکھراں در نواحی لاہور اظہار عصیان کردند، سلطان بر سر ایشاں لشکر کشید و قطب الدین ایبک را نیز از دہلی طلبیدہ کھوکھراں را تنبیہ خوب دادہ بغزنیں معاودت فرمود و ہنگام مراجعت در دمیک کہ نام دہی ست از توابع غزنیں از دست فدائی کھوکھرہ شہید شد۔

ذکر الملوک شیخ عبدالحق محدث دہلوی ۱۰۰۵ھ

"چوں شنید کہ جماعت متمردان در ہندوستاں از کھوکھراں وغیرہ ہم بنیاد تمرد نہادند و باز بہندوستاں آمد و طوائف متمردان را بدوزخ فرستاد و در وقت مراجعت بغزنیں بردست یکے از فدائیان ملاحدہ در منزل دمیک شہادت یافت۔"

تاریخ فرشتہ۔ ملا حکیم محمد قاسم فرشتہ ۱۰۱۵ھ طبع لکھنؤ

"شانزدہم رجب سنہ اثنی وست مائۃ از بلدہ لاہور متوجہ غزنیں شد و فرمان باسم بہاء الدین سلیم والی باسیان اصدار یافت کہ چوں در خاطر ہمایون ماغزاے کفار ترکستان مرکوز گشتہ است باید کہ بمجرد وصول فرمان لشکر آں حدود راجمع آوردہ بر کنار آب جیحوں نزول نماید و پل مہیا دارد تا سپاہ اسلام در وقت عبور آزار نکشند و چوں سلطان بتاریخ دوم شعبان سال مذکور بکنار آب نیلاب رسید و در منزلیکہ بر مہیک اشتہار داشت فرود آمد قضارا دراں چند روز بست نفر از کفار ککھراں کہ اکثر خویشاں واوتاد و اقربا و فرزندان ایشاں در جنگ سلطان شہاب الدین کشتہ شدہ بودند ہم عہد و ہم سوگند شدہ و کشتہ شدن بر خود قرار دادہ در باب کشتن سلطان شہاب الدین تدبیر ہا جستند و در وقت کوچ کہ فراشاں سراپردہا فرود می آوردند خرگاہ خاصہ سلطان شہاب الدین مضجع و مسکن او کما حقہ بخاطر آوردند، و شب سوم ماہ مذکور یکے از ککھراں پیش آمد و دربان سلطان را زخم کارد زدہ بگریخت چوں غوغا شد جمیع مردم حتی خدمتگاران نزدیک سلطان بروے جمع آمدند دراں وقت آں جماعت فرصت یافتہ یک شقی سراپردہ را بکارد شگافتند و داخل شدہ بکاردہا و دشنہاے برہنہ بخرگاہ درآمدند دو سہ غلام ترک خدمتگار کہ حاضر بودند از کمال حیرت مانند چوب خشک بے حس و حرکت گشتند و ککھراں بخاطر جمع در اثناے تیاری خفتن آں شاہ عالی جاہ را بیست و دو کارد زدہ بدرجۂ شہادت رسانیدند۔"

اوپر جو اقتباس نقل کئے ہیں اُن سے سلطان کے قاتلوں کی نسبت حسب ذیل نتائج اخذ ہوتے ہیں:۔

حسب تحریر صاحب تاج المآثر	ملاحدہ

حسب تحریر	امام ذہبی و امام یافعی	اسماعیلیہ
"	صاحب طبقات ناصری و حبیب السیر و ذکر الملوک	فدائیان ملاحدہ
"	صاحب روضۃ الصفا	فدائیان
"	صاحب لُبّ التواریخ	فدائیان ہندی
"	صاحب طبقات اکبری و منتخب التواریخ و جہاں آرا	فدائیان کھوکری
"	صاحب تاریخ گزیدہ و تاریخ فرشتہ	ہندوان کھوکری

ابو الفدا نے لکھا ہے کہ بعض اسماعیلیہ اور کھوکھری کو سلطان کا قاتل بتاتے ہیں۔

ان اختلافات پر غور و خوض کرنے سے پہلے واقعاتِ ذیل کو پیشِ نظر رکھنا ضروری ہے:۔

محمد بن قاسم کی فتوحات کے باعث بلاد سندھ اسلامی ممالک میں شامل ہو گئے تھے، اور عباسیوں کے ظہور تک عراق و عرب کے سینکڑوں قبائل نے سندھ میں آکر سکونت اختیار کر لی تھی، اور سو سال کے اندر اندر اس علاقہ میں اسلامی تہذیب و تمدن کو اس درجہ رواج ہو گیا تھا کہ وہ شام و عراق کا نمونہ بن گیا، اور بلاد اسلام میں اسکا شمار ہونے لگا۔

عباسیوں کے عہد میں عراق اور یمن سے جو قبائل سندھ میں آکر آباد ہوئے تھے اُن میں اکثر اسماعیلی اور قرمطی مذہب کے پابند تھے۔

اسماعیلیہ شیعہ مذہب کا ایک فرقہ ہے۔ اس کی بہت سی شاخیں ہیں، منجملہ اُن کے مشہور یہ ہیں:۔

(۱)۔ اسمٰعیلیہ، اس کا بانی عبید اللہ مہدی ہے جس سے خلفائے فاطمیہ کی بنیا پڑی ہے اس کا مرکز مصر تھا۔

(۲) باطنیہ، اس کا بانی حسن بن صباح اسمٰعیلیان مصر کا داعی الدعاۃ تھا، اور قہستان کا قلعہ الموت ان کا مرکز تھا[۱]۔

(۳) قرامطہ۔ اس کی بنا ابو سعید جنابی نے ڈالی تھی، یمن اس کا مرکز تھا۔

ایرانی مورخین بالعموم باطنیہ کو ملاحدہ کہا کرتے تھے، بعض وقت اس کا اطلاق اسمٰعیلیہ مذہب کے تمام فرقوں پر بھی ہوا کرتا تھا۔

اسمٰعیلیہ مذہب کے دعاۃ میں ایک قسم فدائیوں کی تھی، یہ لوگ داعی الدعاۃ (صدر مجلس) کے ایما سے ان سلاطین، امرا و علماء کو قتل کیا کرتے تھے جو مذہب اسمٰعیلیہ کی اشاعت میں مانع و

---

[۱] اسی کو شیخ الجبال" اور انگریزی میں "Old Man of the Mountain" کہتے ہیں۔

مزاحم ہوا کرتے تھے۔

چوتھی صدی کے اخیر میں اسماعیلی مذہب کو سندھ میں خوب زور ہو گیا تھا۔ مشہور سیاح بشاری جب ۳۷۵ھ میں سندھ میں آیا تو اس نے ملتان میں اسماعیلیت کا بڑا زور پایا[1]۔ اس کا بیان ہے کہ اس وقت ملتان میں خلفائے بنی فاطمیہ کا خطبہ پڑھا جاتا تھا، کوئی حکم فاطمی خلفا کی منظوری کے بغیر یہاں جاری نہیں ہوتا تھا، اور یہاں اس قدر اثر ان خلفا کا تھا کہ بغیر اجازت خلیفہ کے کوئی شخص تخت پر بھی نہیں بیٹھ سکتا تھا[1]۔

سلطان محمود غزنوی نے ۳۹۶ھ میں جب ملتان کی تسخیر کا ارادہ کیا تو سندھ اور ملتان اسمٰعیلیہ اور قرامطہ سے بھرا ہوا تھا، اور یہ لوگ تمام ملک میں پھیلے ہوئے تھے۔ محمود نے جب ملتان پر حملہ کیا تو وہاں کے فرمانروا ابو الفتح داؤد نے جو قرمطی تھا سلطان کی اطاعت قبول کر لی[2] لیکن ان لوگوں کا ملک سے استیصال نہیں ہوا۔ کیونکہ ۵۷۱ھ میں سلطان محمد بن سام نے جب ملتان پر حملہ کیا تو اس میں رافضی لوگوں کی حکومت تھی[3]۔ کتب تواریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے بعد بھی تقریباً پچاس سال تک قرامطہ نہ صرف سندھ میں موجود تھے بلکہ پنجاب اور گجرات میں بھی ان کی کثرت ہو گئی تھی۔ اور ان کا اس قدر زور ہو گیا تھا کہ انھوں نے دہلی میں آکر جامع مسجد میں مسلمانوں کا قتل عام کیا تھا۔ قاضی منہاج سراج کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ سلطان شمس الدین التمش کے زمانہ میں قرامطہ اور ملاحدہ سندھ گجرات اور دہلی کے اطراف گنگا جمنا کے دوآبہ میں پھیلے ہوئے تھے ایک شخص نور ترک کے اغوا سے یہ لوگ دار الملک دہلی میں جمع ہوئے اور ۶۔ رجب ۶۳[illegible]ھ کو بروز جمعہ ایک جماعت نے جس میں چھ ہزار آدمی شامل تھے جامع دہلی میں گھس کر مسلمانوں کو قتل کرنا شروع کیا، اور جب یہ خبر عام ہوئی تو مسلمانوں نے جمع ہو کر ان سب کو قتل کر دیا اور ان میں سے ایک بھی سلامت نہیں بچا[4]۔

سلطان محمود کے زمانہ میں اور اس کے بعد عرصہ دراز تک ایک قوم سومرہ نام سندھ میں حکمراں تھی۔ ملتان اس کا دار الحکومت تھا، اور اسکی عملداری منصورہ سے شروع ہو کر شرق میں جہلم اور چدی تک پھیلی ہوئی تھی۔ اس قوم کا ایک سردار شیخ نصیر امیر سبکتگین کا معاصر تھا۔ اس کے بیٹے ابو الفتح داؤد کے زمانہ میں سلطان محمود نے سندھ پر یورش کی تھی[5]۔

---

[1] احسن التقاسیم ص ۴۸۶ و ص ۴۸۵۔ [2] کتاب الہند البیرونی ص ۵۶ تاریخ فرشتہ ج ۲ ص [illegible]۔ [3] طبقات ناصری ص ۱۱۶
[4] طبقات ناصری ص ۱۸۹۔ [5] ترجمہ یمینی ص [illegible] میں اس کا نام ابو الفتوح لکھا ہے۔

[redacted]

محمد تغلق کے زمانہ تک یہ قوم سندھ میں حکمران تھی، لیکن اخیر زمانہ میں انکی حکومت کو ضعف ہو گیا تھا اور سندھ کے بعض شہروں میں کلان ترکی حیثیت سے ان کی حکومت باقی رہ گئی تھی[۵۱]۔ میر معصوم نے لکھا ہے کہ سلطان عبدالرشید کے زمانہ میں سندھ میں سومرہ قوم نے بغاوت کی تھی[۵۲]۔ ابن بطوطہ جب سندھ میں وارد ہوا تو اُس نے بھی سومرہ قوم کے ایک سردار کو شہر سیوستان میں حکمران پایا تھا[۵۲]۔ ضیاء الدین برنی کا بیان ہے کہ محمد بن تغلق نے ۷۵۱ھ میں سندھ کی جانب یورش کی تو اُسے سومرہ قوم سے بھی دو چار ہونا پڑا تھا[۵۳]۔

یہ قوم خلفا کے زمانہ میں عرب سے آکر سندھ میں آباد ہوئی تھی اور اُوسی زمانہ میں اُس نے مذہب اسمٰعیلیہ قبول کر لیا تھا۔ اسمٰعیلیہ مذہب کی مشہور کتاب الدروز میں ایک خط ہے جو ۴۲۳ھ میں سندھ اور ہندوستان کے اسماعیلی باشندوں کے نام لکھا گیا ہے اسمیں سومر کا نام بھی موجود ہے اور اُسے سردار موحدان ہندوستان کی حیثیت سے یاد کیا ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ اس زمانہ میں ہندوستان میں اسمٰعیلیہ مذہب پھیل گیا تھا، اور اُس کے پیرو ہندوستان میں کثرت سے آباد تھے اور ابوالفتح سومرہ ان کا سردار سمجھا جاتا تھا۔

گھوکر (گکھر) پنجاب کے شمال مغربی علاقہ کی ایک مشہور قوم ہے۔ اس کی سکونت نیلاب (سندھ) کے نیچے کوہ جودی کے دامن میں تھی جسے آجکل نمک کے پہاڑ (Salt Range) کہتے ہیں۔ اور سندھ کی سرحد سے ہمالیہ کے دامن تک یہ لوگ پھیلے ہوئے تھے۔ ان کو مورخین نے ہندی الاصل سمجھا ہے لیکن یہ غلطی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کا مرز بوم خراسان تھا، اور وہاں سے ترک وطن کر کے جناب مسیح سے صدیوں پہلے یہ لوگ یہاں آکر آباد ہو گئے تھے۔ یہاں آنے کے بعد انھوں نے بدھ مذہب اختیار کر لیا تھا۔ ان کا ذکر تاریخ اسلام میں سب سے پہلے سلطان ابراہیم غزنوی کے عہد میں آتا ہے۔ اس کے بعد محمد بن سام کے زمانہ میں یہ قوم پھر صفحۂ تاریخ پر نمودار ہوتی ہے ۶۰۲ھ میں ان کی بغاوت کو سلطان نے فرو کیا تھا۔

گھوکروں نے سلطان محمود کی آمد سے پہلے اسلام قبول کر لیا تھا۔ اور سلاطین ملتان کے داعیوں کی بدولت ان میں مذہب اسمٰعیلیہ کی اشاعت ہو گئی تھی۔ اور تور ترک جس کے اغوا سے شمس الدین التمش کے عہد میں دہلی میں بلوہ ہوا تھا، گھوکروں کا سردار تھا۔ شمالی ہندوستان میں جب اسمٰعیلیہ اور قرامطہ

---

۵۱ سید معصوم کی تاریخ سندھ
۵۲ سفرنامہ ابن بطوطہ جلد دوم صہ ۹
۵۳ تاریخ فیروز شاہی صہ ۵۲۴

کا استیصال ہوگیا تو انھوں نے شیعیت اختیار کرلی جس کا رواج ان میں اب سے تقریباً سو سال پہلے تک رہا۔ اس کے بعد انھوں نے شیعیت کو چھوڑ کر سنی مذہب قبول کیا اور اب نہایت سختی کے ساتھ اس پر عمل پیرا ہیں۔

اوپر کے بیانات سے ظاہر ہوتا ہے کہ سلطان محمد بن سام کے زمانہ میں سندھ اور شمالی ہندوستان میں اسماعیلی مذہب زور پر تھا اور پنجاب کے گھوکروں میں بھی اس کی اشاعت ہوگئی تھی۔ اس نتیجہ کے حاصل ہونے کے بعد مورخین کے بیانات کو باہم تطبیق دینے کے لئے کوئی وقت باقی نہیں رہتی ہے۔ جن لوگوں نے سلطان کے قاتلوں کو گھوکر لکھا ہے اونھوں نے قومیت ظاہر کی ہے جن لوگوں نے ملاحدہ اور اسمٰعیلیہ لکھا ہے اونھوں نے مذہب کی جانب اشارہ کیا ہے۔ جن مورخین نے فدائیان ہندی اور فدائیان کھوکری لکھا ہے، اس سے وہ لوگ اسماعیلی گھوکروں کے فدائیوں کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ اور اس لحاظ سے اوپر کے اقتباسات میں جو اختلاف نظر آرہا ہے۔ وہ حقیقت میں اختلاف نہیں ہے بلکہ اون سے ایک ہی قوم مراد ہے جو قوماً گھوکر اور مذہباً اسماعیلی تھی۔

تجدید عمل

مصنفہ مرزا عسکری علی خاں صاحب حجازی۔ چھوٹی تقطیع۔ چھ جزو ضخامت، لکھائی چھپائی کاغذ معمولی قیمت ۸/ آنہ ملنے کا پتہ شیخ مبارک علی تاجر کتب لوہاری دروازہ۔ لاہور

یہ چھوٹی سی کتاب تین حصوں میں منقسم ہے۔ پہلے حصہ میں ایک جزو پر مشتمل امور ابتدائی اور مقدمہ ہے اس کے بعد پہلی کتاب تین جزو پر اور دوسری کتاب ایک جزو پر ختم ہوتی ہے۔ اس چھوٹی سی کتاب میں فاضل مصنف نے عقلیت کے نقطۂ نظر سے مذاہب کی ابتدا اور ان کی افراط و تفریط پر بحث کرنے کے بعد یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے کہ مذہب جذبۂ قومیت کی ترقی میں سد راہ ہے اور پھر اپنی طرف سے وہ تدابیر پیش کی ہیں جس سے موجودہ مذاہب اور سوسائٹی کے کھنڈر پر ایک متحدہ قوم یعنی ہندوستان کی تعمیر کیجاسکتی ہے۔ سلسلۂ بحث میں فاضل مصنف نے تعزیہ پرستی۔ قبر پرستی، پیر پرستی اور کرامات، گاؤکشی پر بھی اظہار خیال کیا ہے۔ کتاب پڑھنے کے قابل ہے مگر اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ ہم فاضل مصنف کے خیالات سے متفق ہیں۔

کلامِ حسرت

دورِ اولین

(از مسٹر ایم۔ اے۔ جیواد میرٹھی)

(موجودہ مضمون نہ کلام حسرت پر تنقید ہے نہ تقریظ، اسمیں حسرت کے دورِ اولین کے اشعار کا انتخاب ہے تاکہ تھوڑے سے وقت میں ناظرینِ زمانہ اس صاحبِ کمال سخنور کے بہترین اشعار سے لطف اندوز ہو سکیں ۔ ناظم)

حسرت نے خود کہا ہے :-

شعر دراصل ہے وہی حسرت　　سنتے ہی دل میں جو اُتر جائے

حق یہ ہے کہ یہی حسرت کے اشعار کی خصوصیت ہے، حسرت کی شاعری جذبات کی شاعری ہے، وہ غزل کا ماسٹر ہے۔ وہ عشق کے تمام پہلوؤں سے واقف ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عشق کے جذبات اور وجدان کی ہر کیفیت اس کی روح کی عمیق گہرائیوں میں مرتعش ہے سچ یہ ہے کہ دل میں اُتر جانے والی بات چوٹ کھائے ہوئے دل ہی سے نکلتی ہے۔ حسرت کا کلام اس بات کا صاف آئینہ دار ہے کہ ہر واردات قلب اس پر خود گزری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اُس کے اشعار اثر میں ڈوبے ہوئے ہیں اور نشتر کی طرح دل میں اُترتے چلے جاتے ہیں۔ دراصل یہ کہنا غیر صحیح نہ ہوگا کہ موجودہ زمانے میں غزل حسرت کے لئے ہے اور حسرت غزل کے لئے۔

حسرت خود بھی اپنی قدر و قیمت اور قوتِ غزل گوئی سے خوب واقف ہے، چنانچہ بار بار کہتا ہے

حسرت یہ وہ غزل ہے جسے سُن کے سب کہیں　　مومن سے اپنے رنگ کو تو نے ملا دیا

ہے زبانِ لکھنؤ میں رنگِ دہلی کی نمود　　تجھ سے حسرت نام روشن شاعری کا ہو گیا

تو نے حسرت کی عیاں تہذیبِ رسمِ عاشقی　　اس سے پہلے اعتبارِ شانِ رسوائی نہ تھا

حسرت تری اس پختہ کلامی کی ہو کیا بات　　پایا ہے کسی اور سخنور نے یہ کب رنگ

حسرت تری شگفتہ کلامی پہ آفریں　　یاد آ گئیں تسنیم کی رنگیں بیانیاں

قائم ہے ترے دم سے رنگ سخن قائم　　پھر ورنہ کہاں حسرت یہ رنگ غزل خوانی

لیکن جہاں حسرت کو تسنیم، قائم اور مومن سے دعوی ہمسری ہے، وہاں خدائے سخن کے آگے اعتراف ہیچمدانی بھی موجود ہے۔

شعر میرے بھی ہیں پردرد ولیکن حسرت　　میر کا شیوۂ گفتار کہاں سے لاؤں

گذرے بہت استاد، مگر رنگ اثر میں　　بے مثل ہے حسرت سخن میر ابھی تک

اب آئیے اور حسرت کے چند اشعار سے لطف اندوز ہو جیئے۔

حسرت کس سادگی سے شکوہ کرتا ہے:۔

بڑھ گئیں تم سے تو مل کر اور بھی بے تابیاں　　ہم یہ سمجھے تھے کہ اب دل کو شکیبا کر دیا

پانی کا ایک چھینٹا آگ کے شعلوں کو اور بھی برانگیختہ کر دیتا ہے۔

ہم رہے یاں تک تری خدمت میں سرگرم نیاز　　تجھ کو آخر آشنائے ناز بے جا کر دیا

دوسرا رنگ ملاحظہ ہو:۔

اثر حسن یار سے آخر　　آ گئی عشق میں بھی رعنائی

وہ ظاہر میں عبث دلدادۂ بیگانہ خوئی ہے　　کہیں دل سے خیال الفت باہم نکلتا ہے

دل مضطر کی سادگی دیکھو　　پھر انہیں سے سوال کرتا ہے

اک ٹھوکر ہی سہی اے شوخ بے پروا خرام　　رہ گزر میں ہے تری اک آرزو والا پڑا

"شوخ بے پروا خرام" سے حسرت جیسے آرزو والے کو ایک ٹھوکر کی تمنا ہے، اس سے بھی کم کیا آرزو ہو گی۔

حسرت کس سادگی سے حسنِ معصوم کی تصویر کھینچتا ہے، حسن و عشق کی پہلی ملاقات کس قدر دلکش ہے :-

یاد کر وہ دن کہ تیرا کوئی سودائی نہ تھا　　باوجودِ حسن تو آگاہِ رعنائی نہ تھا
عشق روز افزوں پہ اپنے مجھکو حیرانی نہ تھی　　جلوۂ رنگیں پہ تجھکو نازِ یکتائی نہ تھا
دید کے قابل تھی میرے عشق کی بھی سادگی　　جب کہ تیرا حسن سرگرمِ خودآرائی نہ تھا
کیا ہوئے وہ دن کہ محوِ آرزو تھے حسن و عشق　　ربط تھا دونوں میں گو ربطِ شناسائی نہ تھا
تونے حسرت کی عیاں تہذیبِ رسمِ عاشقی　　اس سے پہلے اعتبارِ شانِ رسوائی نہ تھا

حسرت کس انجان پن سے دریافت کرتا ہے :-

دیکھو جسے ہے راہِ فنا کی طرف رواں　　تیری محل سرا کا یہی راستہ ہے کیا؟
ہم کیا کریں نہ تیری اگر آرزو کریں　　دنیا میں اور بھی کوئی تیرے سوا ہے کیا؟
نہ پوچھیئے کہ ہوئی حسن کی عجب حالت　　سنی جو پہلے پہل عشقِ ناصبور کی بات
روشن جمالِ یار سے ہے انجمن تمام　　دہکا ہوا ہے آتشِ گل سے چمن تمام
اللہ رے جسمِ یار کی خوبی کہ خود بخود　　رنگینیوں میں ڈوب گیا پیرہن تمام

معشوق کے دل چرانے کے سب شاکی ہیں مگر حسرت

اتنی سی شے کا تم سے تقاضا کریگا کون　　دل لے کے ہم سے آنکھ چرانا نہ چاہیئے

تقاضا کرنے کے بھی متحمل نہیں ہو سکتے۔

آہ اس نگاہِ مست کی شوخی جو بے خبر　　خوبی پہ روئے یار کی پہلے پہل گئی
جوں ہی سے اٹھ جائے نقابِ رخِ زیبا　　کیا شوق کی اتنی بھی رعایت نہیں تم کو
جلوۂ حسن سے رنگیں ہیں جو آنکھیں انکی　　سرخ نکلے ہیں اسی رنگ کے مارے آنسو

سرخ آنسو کی کیا نادر تاویل ہے۔

ہے وہاں شانِ تغافل کو جفا سے بھی گریز　　التفاتِ نگہِ یار کہاں سے لاؤں؟

جواب دیجئے!

یہ ہیں حسرت کے ابتدائی دور کے چند شعر۔ جوں جوں عمر بڑھتی جاتی ہے حسرت کی شاعری عشقِ مجازی سے شروع ہو کر اس کے تمام اخلاقی پہلوؤں پر حاوی ہو کر حسن کے تخیلی پیکر کی تلاش میں آخر روحانیت، رضاجوئی حق عشقِ ملت اور جب قوم پر ختم ہوتی ہے۔

پوشیدہ محبت

(از مسٹر ترلوک ناتھ کوہلی)

میں دوپہر کو واپس آیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ شیاما برآمدے میں بیٹھی ہوئی گود میں موم کی گڑیا لئے اس سے میٹھی میٹھی باتیں کر رہی ہے۔ کبھی کبھی اُسے چوم بھی لیتی ہے، میں نے قریب جاکر کہا "کیا کر رہی ہو؟" شیاما نے میری طرف دیکھے بغیر جواب دیا کہ "کیا آپ دیکھ نہیں رہے ہیں، میں اپنے بوے کو کھلا رہی ہوں"۔ میں اُس کے پاس پلنگ پر بیٹھ گیا اور اُس کی گود سے گڑیا لیکر بولا "اچھا تھوڑی دیر کے لئے اسے مجھکو دیدو۔ مجھے پیاس لگی ہے، اندر سے ایک گلاس پانی لے آؤ"۔

شیاما۔ "نہیں، نہیں میری گڑیا نہ لو" کہکر شور مچانے لگی۔

"اچھا یہ لو" کہکر میں نے اُس کی گڑیا اُسے واپس دیدی، اور کہا اچھا اب تو پانی لادو۔ شیاما نے زور کا قہقہہ لگایا اور وہیں بیٹھ گئی۔ اب میں نے دوسری ترکیب سوچی اور کہا "کیا تم شادی نہ کراؤگی؟" اتنا سنتے ہی شیاما اُٹھ کھڑی ہوئی اور ذرا منہ سکوڑ کر اندر چلی گئی۔

شیاما کو جب کوئی شخص رنجیدہ کرنا چاہتا تو اُس کو صرف اتنا کہدیتا کہ کیا تم شادی نہ کراؤگی؟ پھر چوزنگ وہ لاتی وہ قابل دید ہوتا۔ اگرچہ وہ ابھی صرف نو برس کی بچّی تھی لیکن اُسے اِس بات کا علم تھا کہ شادی ہوجانے کے بعد لڑکیوں کو اپنے والدین کو خیرباد کہنا پڑتا ہے۔ جب اُس کی بڑی بہن سسرال جانے لگی تھی تو اُس کی ماں فرط غم سے کئی دن تک روتی رہی اور کھانا پینا بھی ترک کردیا تھا۔ اسلئے جب کوئی شخص شیاما سے اُس کی شادی کے متعلق ذکر کرتا تو اُس کی آنکھوں کے سامنے اُسکی ماں کے رنج وغم کی تصویر کھنچ جاتی تھی کہ بڑی بہن کے بعد اگر وہ بھی گھر سے چلی گئی تو اُسکی ماں کے غم کا ٹھکانا نہ رہے گا۔ اس وجہ سے وہ اپنی ماں کو تنہا چھوڑنا نہ چاہتی تھی اور بیاہ کا نام سنتے ہی بگڑ جاتی تھی۔ جن لوگوں کو اس بات کا علم تھا اُنھیں اُسے چڑانے میں ایک خاص لطف آتا تھا۔

اس واقعہ کو پانچ برس گذر چکے ہیں، میں اُس وقت اسکول کے ایک معمولی درجہ میں پڑھتا تھا۔

لیکن اس اثنا میں مٹریکیولیشن کا امتحان پاس کر کے پٹنہ کالج میں داخل ہوگیا تھا۔ اُس وقت میرے لئے بڑا اہم سوال یہ تھا کہ ہوسٹل میں رہوں یا کسی اور جگہ۔ میں تو ہوسٹل ہی میں رہنے کا خواہاں تھا لیکن والد نے رامو بابو کے ہاں ٹھہرنے کا انتظام کیا تھا۔ رامو بابو شیاما کے والد تھے، وہ میرے کوئی خاص رشتہ دار نہ تھے ہاں میرے والد کے دوست ضرور تھے، دونوں نے اسکول میں ایک ساتھ تعلیم پائی تھی، اُن دونوں میں سگے بھائیوں سے بھی زیادہ محبت تھی۔ جب کبھی میرا یہاں آنے کا اتفاق ہوتا تو انھیں کے ہاں ٹھہرتا تھا۔ رامو بابو نے بھی میرے والد کو خط لکھا تھا کہ اگر میں کالج میں داخل ہونے کے لئے پٹنہ آؤں تو اُنھیں کے ہاں قیام کروں۔ آخر میں بھی اُنھیں کے یہاں رہنے پر راضی ہوگیا۔

شیاما اب مجھ سے پردہ کرنے لگی تھی، میں یہ دیکھکر حیران تھا، لیکن رامو بابو مجھے خود اپنے ساتھ اندر لے گئے اور شیاما سے کہا کہ یہ تو تیرے بڑے بھائی ہیں تو ان سے پردہ کیوں کرتی ہے، آج سے انھیں پرمو بھیا کہا کر۔ شیاما نے کچھ جواب نہ دیا، البتہ سر نیچا کئے ہوئے ترچھی نگاہ سے میری جانب دیکھا۔ اُس کے ہونٹوں پر ایک ہلکا سا تبسم تھا۔

دوسرے دن صبح کے وقت جب میں اپنے کمرہ میں میز کے پاس بیٹھا ہوا ایک کتاب پڑھ رہا تھا شیاما میرے پاس آکھڑی ہوئی اور دھیمی آواز میں کہا، "ناشتہ کرنے چلئے، ماں جی بُلاتی ہیں۔" اُسکی پیشانی پر اب تک ہنسی کے آثار نمایاں تھے۔ اُس وقت تو میں اُس کے چہرے کو غور سے دیکھ نہ سکا۔ لیکن ایک ماہ کے بعد ہم دونوں ایک دوسرے سے کچھ اس طرح ہل مل گئے تھے گویا ایک ہی گود کے پلے ہوئے تھے۔ رامو بابو کچھ زیادہ دقیانوسی خیال کے آدمی نہ تھے۔ اُنھوں نے اپنی بیٹی کی تعلیم کا گھر پر ہی انتظام کیا تھا اور ہندی کے علاوہ انگریزی کی بھی تعلیم دی تھی، اُنھیں موسیقی کا بھی شوق تھا اس لئے شیاما کو گانے کی بھی مشق کرائی تھی، مجھے یہ بات شیاما ہی سے معلوم ہوئی۔

ایک دن میں نے ہنستے ہوئے کہا "شیاما مجھے کوئی گیت سناؤ دیکھیں کیسا گاتی ہو؟" اتنا کہنا تھا کہ وہ جھٹ گانے کے لئے تیار ہوگئی، دوڑ کر ہارمونیم اُٹھالائی اور سُر ملا کر گانا شروع کیا۔ میں اپنی زندگی میں کبھی ایسا لطف اندوز نہ ہوا تھا، تھوڑی دیر کے لئے محویت طاری ہوگئی۔ اُسکی رسیلی آواز، سریلی الاپ اُس کا حُسن اور چلبلاہٹ دیکھکر کون شخص ہے جو دل سے اُسکا گرویدہ نہ ہو جاتا۔ میں کہنی کے بل جھک گیا اور اپنا ہاتھ اُس کے ہاتھ پر رکھکر بولا "شیاما!" وہ تصویر حیرت بنی بیٹھی رہی۔ ایک لمحے کے لئے ہم دونوں ایک دوسرے کی جانب دیکھتے رہے۔ شیاما اُٹھکر چلی گئی۔ کام دیو کا تیر کارگر ہوگیا۔

کسی طرح سے دو سال اور گذر گئے۔ اب شیاما کی شادی کے متعلق بات چیت ہونے لگی اور

اس کے لئے بر ڈھونڈا جانے لگا۔ یہ معلوم ہوتے ہی میں گھبرا گیا، پھر پڑا اداسی سی چھا گئی اور مجھے بخار آ گیا جب قدرے افاقہ ہوا تو اپنے گھر کو روانہ ہو گیا۔

شیاما کی شادی ہو گئی، میں اُس کی شادی میں شریک بھی نہ ہو سکا جب میں پھر پٹنہ آیا تو رامو بابو کے ہاں نہ ٹھہرا۔ میں نے اپنے بابوجی سے کہدیا کہ رامو بابو کے یہاں میرا جی نہیں لگتا، پڑھنے میں خلل ہوتا ہے اس لئے مجھے ہوسٹل میں داخل ہونے کی اجازت دیجئے۔ اس دفعہ بابوجی بھی راضی ہو گئے۔ کچھ دنوں بعد شیاما سسرال سے میکے واپس آئی اور میں اُس سے ملنے گیا۔ وہ میرے نزدیک شرماتی ہوئی آئی لیکن میں نے فوراً ہی پوچھا "کیا شادی نہ کراؤ گی" اُس نے مسکرا کر سر جھکا لیا۔ کئی سال گذر گئے، اب میں بھی بی۔اے کا امتحان پاس کر کے برسر کار ہو کر اطمینان سے زندگی بسر کر رہا تھا کہ ایک دن مجھے خبر ملی کہ شیاما اپنے خاوند کے ساتھ میکے آئی ہوئی ہے۔ شیاما سے ملاقات کے خیال سے میں بڑا خوش ہوا اور پختہ ارادہ کر کے چلا کہ اس مرتبہ پھر اُس سے شادی والا سوال پوچھوں گا، لیکن رامو بابو کے گھر پہونچا تو دیکھا کہ وہ بستر پر پڑی کراہ رہی ہے۔ شیاما اب وہ شیاما نہ تھی اُسکا بدن سوکھ کر کانٹا ہو گیا تھا۔ اُس کی یہ حالت دیکھکر میرا خون سوکھ گیا۔ مجھے خواب میں بھی خیال نہ تھا کہ شیاما اس حالت میں ہوگی۔

ڈاکٹر روزانہ آتا تھا لیکن کوئی دوا کارگر نہ ہوتی تھی، وہ دن بدن لاغر ہوتی جاتی تھی۔ میں نے ڈاکٹر صاحب سے تنہائی میں پوچھا کہ آخر مرض کا بھی کوئی پتہ چلا۔ ڈاکٹر صاحب نے گاڑی میں بیٹھتے ہوئے کہا کہ اس کے بچنے کی کوئی امید نہیں ہے۔

صبح کا وقت ہے، آج شیاما کی حالت از حد تشویشناک ہے، گھر کے سب لوگ اُس کے چاروں طرف بیٹھے ہوئے ہیں، اُس کی ماں کی آنکھوں سے آنسو جاری ہیں، شیاما آنکھیں بند کئے پڑی ہے، اُس کے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے پڑ گئے ہیں، آخر ش اُس نے آنکھیں کھولیں اور بولی "پانی!" میں پانی لیکر دوڑا۔ اُس نے دو تین گھونٹ پانی پیکر اپنا سر ایک جانب گرا دیا اور روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی۔

میں پاگل سا ہو گیا، مجھ میں سوچنے کی طاقت نہ رہی، لیکن ہاں اتنا سمجھتا تھا کہ کوئی بیش بہا چیز کھو گئی ہے۔ جس کے سہارے ہی میں ابتک جی رہا تھا لیکن اس کے چلے جانے کے بعد دنیا تاریک معلوم ہونے لگی۔ میں پاگلوں کی طرح دن بھر سرگرداں رہا۔ گنگا کے کنارے گیا مگر اُسوقت

وہاں کوئی نہ تھا۔ میں پچھاڑ کھا کر گر پڑا۔ خیالات کا ایک بحر بیکراں میرے دل میں موجزن تھا۔
لیکن آرام کسی پہلو نہ تھا اور عجیب ہی کیفیت تھی۔

جل رہا ہوں کل نہیں پڑتی کسی پہلو مجھے
ہاں ڈبو دے اے محیطِ آبِ گنگا تو مجھے

ندی کی طرف سے ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی، مجھے نیند آ گئی اور خواب میں مجھے شیاما نظر آئی میں نے اُس سے کہا کہ "شیاما کیا شادی نہ کراؤ گی؟" اور اُسے گلے لگانا چاہا کہ میری آنکھ کھل گئی اور میں نے دیکھا کہ تاریکی مجھے کاٹ کھانے کو دوڑ رہی ہے۔

تعلیمی کھیل

مولانا محمد عبد الغفار مدھولی صاحب نگراں ابتدائی تعلیم جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کو بچوں کی ابتدائی تعلیم سے خاص دلچسپی ہے۔ آپ ان کے لئے وقتاً فوقتاً چھوٹی چھوٹی کتابیں تصنیف فرماتے رہتے ہیں۔ یہ کتاب بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے جو کنڈر گارٹن کے اصول پر لکھی گئی ہے۔ اسمیں جماعت اول تا نہایت ششم کے طلبا کے لئے مختلف قسم کے تعلیمی کھیل لکھے ہیں: مثلاً:۔

جماعت اول۔ حرف پہچاننے کا کھیل، حروف شناسی کا تاش، خاموش پڑھکر عمل کرنا۔ لفظ پہچانکر لکھنا۔ ہندسے پہچاننے کا کھیل وغیرہ۔

جماعت دوم۔ چیزوں کے نام بورڈ پر لکھنا، ہاتھ پھیر کر لفظ بتانا، چٹھی رساں کا کھیل سیح صحیح کرنا

جماعت سوم و چہارم۔ جملوں کو پورا کرنا۔ دیے ہوئے لفظوں سے زیادہ جملے بنانا۔ پہاڑوں کی شطرنج وغیرہ

جماعت پنجم و ششم۔ تیز پڑھنا۔ ایکٹنگ کے ساتھ پڑھنا۔ بہترین شعروں کا انتخاب۔ انگریزی کے لفظوں کی پہچان۔ وغیرہ۔

آخر میں جمع کرنے کے چند آسان قاعدے اور پہاڑے کی مدد کے بغیر ضرب دینا بھی لکھا ہے بچوں کے لئے یہ کتاب واقعی مفید ہے۔ باتوں باتوں میں سبق سیکھ جاتے ہیں۔ لکھائی چھپائی کاغذ وغیرہ سب عمدہ۔ ضخامت تین جزو، ٹائیٹل انگریزی وضع کا دیدہ زیب۔ قیمت چھ آنہ ۶ر
ملنے کا پتہ: مکتبہ جامعہ ملیہ اسلامیہ۔ دہلی۔

تنقید

تیھارتھ پرکاش حصہ اول و دوم

(از منشی اقبال ورما سحر ہتگامی)

یہ کتاب رادھا سوامی مت یا سنت مت کے موجودہ گرو یعنی پرم گرو صاحب جی مہاراج آنند سروپ صاحب بانی دیال باغ آگرہ کی تصنیف ہے۔ جس میں اس مت کا نہایت صراحت و وضاحت کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے اور موازنہ میں وید شاستر، پران و سمرتی اور دیگر مذہبی کتابوں کے حوالے بھی پیش کئے گئے ہیں اور سوال و جواب کے ذریعہ "شنکا سمادھان" (رفع شکوک) کی بھی کوشش کی گئی ہے۔ غرض مجموعی حیثیت سے یہ کتاب اپنی نوعیت کی پہلی کتاب ہے۔

رادھا سوامی مت کی بنیاد پرم گرو سوامی جی مہاراج نے (جنھیں چرن سیوک رادھا سوامی دیال کا اوتار مانتے ہیں) جنوری سنہ ۱۸۶۱ء میں قائم کی تھی۔ ان کا اصلی نام لالہ شیو دیال سنگھ تھا اور ان کی عمر اس وقت تینتالیس سال کی تھی، ساٹھ سال کی عمر میں سنہ ۱۸۷۸ء میں ان کا انتقال ہوا۔ سار بچن (نظم و نثر) نامی کتاب اُن کی تصنیف ہے۔ جس کے بعد رائے سالگرام صاحب دوسرے گورو ہوئے، وہ صوبۂ متحدہ میں محکمۂ ڈاک کے پوسٹ ماسٹر جنرل تھے۔ اور سچ پوچھئے تو انھیں کے ذاتی اعزاز وقار، رسوخ اور اثر کی بدولت اس جماعت کی روز افزوں ترقی ہوئی۔ اُنھوں نے بھی ہندی میں پریم بانی اور انگریزی میں رادھا سوامی مت پرکاش وغیرہ کئی کتابیں لکھیں۔

دسمبر سنہ ۱۸۹۸ء میں جماعت کے تیسرے گورو ہونے کا اعزاز پنڈت برہمہ شنکر جی مصر کو ملا جن کی وفات سنہ ۱۹۰۷ء میں ہوئی۔ اُنھوں نے بھی Discourse on Radha Swami Faiths. نامی ایک کتاب انگریزی میں تصنیف کی۔ چوتھے گورو سرکار صاحب تھے اور موجودہ گورو صاحب دسمبر سنہ ۱۹۱۳ء سے اس پد پر قائم ہیں۔ انھیں کے مساعی جمیلہ کا نتیجہ ہے کہ دیال باغ علوم و فنون، صنعت و حرفت کا ایک قابل قدر نمونہ بن گیا ہے۔ جس میں انٹرمیڈیٹ کالج مع ہائی اسکول، زنانہ ہائی اسکول، ٹکنیکل اسکول

لیدر اسکول، ڈیری، یتیم خانہ، شفاخانہ وغیرہ سبھی کچھ موجود ہے۔ وہاں کے سالانہ مصارف کا تخمینہ آٹھ نو لاکھ روپیہ ہے۔ آپ ہی کی رہنمائی میں رادھا سوامی جماعت ایک باقاعدہ رجسٹرڈ سوسائٹی ہوگئی ہے۔ نو ممبروں کی ایک کارکن کمیٹی ہے۔ تمام ملک میں اُس کی دوسو بانوے شاخیں ہیں اور کل ممبروں کی تعداد ایک لاکھ سے زیادہ ہے۔ اس سوسائٹی کے ممبروں میں عموماً اپنے گورو کے لئے ترک و ایثار کا مادہ ہوتا ہے غرض پوری امید ہے کہ دیال باغ کی بدولت ملک کی صنعتی ترقی اور مالی فارغ البالی میں بڑی مدد ملے گی۔ یہ سب باتیں بہت حوصلہ افزا اور اطمینان بخش ہیں۔

دُنیوی اُمور سے قطع نظر مذہبی باتوں پر غور کیا جائے تو مختصراً اس مت کا عقیدہ یہ ہے کہ رادھا سوامی مالکِ کل کا نام ہے اور وہ ایشور، برہما، وشنو، مہیش وغیرہ سب دیوتاؤں سے بڑا ہے اور اسکا مقام ست لوک ہے (جس میں نرمل چیتن دیش یا دیال دیش بھی شامل ہے) جبکہ دیوتا اُس سے نیچے کے لوک کے مالک ہیں، رشیوں مُنیوں کی رسائی ست دیش کے نیچے تک ہے۔ وجہ یہ بتلائی گئی ہے کہ اونھوں نے ست دیش کا کہیں ذکر نہیں کیا، مگر ہم تو ایک سیدھی سی بات یہ جانتے ہیں کہ ایشور کی رچنا میں بیشمار لوک اور دیش ہیں اور ہم کو اختیار ہے جسکا جو نام چاہیں رکھ لیں۔ اور پھر اُس نام کے لحاظ سے کسی لوک کا درجہ ادنیٰ یا اعلیٰ قرار دیں۔

کتاب کے صفحہ ۳۶ پر یہ بھی درج ہے کہ "چونکہ نرمل چیتن دیش میں پرلے و مہا پرلے کا گذر نہیں اسلئے اس کے سب لوک لافانی یعنی ابناشی ہیں۔ گویا یہاں کی رچنا کا آدی انت نہیں۔ اس دیش کے کسی مقام تک پہونچ جانے پر روح کو ابدی نجات حاصل ہوتی ہے"۔ اِس کے متعلق صرف اسی قدر کہنا کافی ہونا چاہیے کہ آغاز و انجام لازم و ملزوم ہیں اور ہر بناؤ میں بگاڑ بھی ہے۔

رچنا یعنی آفرینش عالم کے متعلق سار بچن کا پد ہے:

آپ ہی آپ نہ دوسر کوئی اوٹھی موج پرگھٹ ست سوئی

جس کی تشریح اس کتاب کے صفحہ ۲۱۴ پر یہ درج ہے کہ "کل مالک میں ایک لہر اوٹھی جس نے اس کے اندر سے رچنا کے موجودہ سب سامان کا مسالہ پرگٹ کیا۔ ...... اور چونکہ سوائے مالک کے اور کوئی چیتن نہ تھا اس لئے ابتدائے آفرینش میں خود اُس کے اندر لہر اوٹھی، یہ چیتن لہر تھی"۔ اگر "کل مالک" کو ہم ایشور کو مان لیں تو یہ امر مسلمہ ہے کہ اُسکا وجود مادیت سے پاک ہے۔ ایسی صورت میں اُس کے اندر سے کسی "مسالہ" کا پیدا ہونا سمجھ میں نہیں آتا، پھر اُس مسالہ کا چیتن (ذی حس) ہونا تو اور بھی سمجھ میں نہیں آتا جبکہ مادہ صریحاً بیجان ہے۔ ہم کو تو اس میں ویدانت مت کی جھلک نظر آتی ہے مگر سار بچن ذرّہ کا

کہنا ہے کہ سنتوں کے مت میں مالک اور جیو کا اَنش اکنی بھاؤ مانا جاتا ہے اور ویدانتی کیول برہم ہی مانتے ہیں۔ جیو کو کچھ نہیں گنتے۔ کتاب زیر ریویو کے صفحہ پر بھی لکھا ہے کہ "کل مالک اور سُرت (روح) میں اَنش انشی کا بھاؤ ہے" لیکن غور کرنے پر کوئی نمایاں فرق نظر نہیں آتا۔ یہ ایک علٰحدہ بحث ہے کہ برہم ہی سب کچھ ہو سکتا ہے یا نہیں اور اُس کے اجزار (انش) ہو سکتے ہیں یا نہیں۔

معلوم ہوتا ہے کہ وہی "اَنٓر آتم دھاما" ہے جسکا نام رادھا ہے اور جو سوامی مرکز سے نکلتی ہے، سوامی کا ارتھ مالک سمجھا جائے تو یہ لفظ ناموزوں نہیں معلوم ہوتا، مگر یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ دھارا کو رادھا کیوں کہا گیا جبکہ اس طرح اصلی لفظ کا مفہوم ہی جاتا رہتا ہے۔ فاضل مصنف نے جو تشریح صہ۲۹ پر کی ہے وہ تسلی بخش نہیں۔ ہمارا تو یہی خیال ہے کہ یہ نام پہلے گورو صاحب کی اہلیہ محترمہ سے منسوب ہے جنکا نام رادھاجی تھا جیسا کہ مصنف صاحب نے بھی صہ۲۱ پر تسلیم کیا ہے۔

وہی آہر یا دھارا شبد (آواز) کی صورت میں تکوین کا سبب بنتی ہے۔ سار بچن (نظم) کے پد بھی ہیں:-

شبد نے رچی ترلوکی ساری۔ شبد سے پھیلی مایا بھاری

شبد نے جیو اور برہم کیا ری۔ شبد سے چاند اور سُور بھیا ری وغیرہ صہ۱۰۱

غرضکہ اس مت میں شبد کے مہا کا بہت بکھان ہے، اور کان آنکھ بند کر کے اوسی کو سُنتے ہوئے ابھیاس (مشق) کرنے کی ہدایت کی گئی ہے۔ اگرچہ بقول مصنف "وہ اصلی یعنی روحانی آوازیں نہیں ہیں" (صہ۲۹۳) یہ علٰحدہ سوال ہے کہ صرف شبد سے تخلیق و تکوین کیونکر ہو سکتی ہے پھر بھی اسمیں شک نہیں کہ شبد بحیثیت مجموعی ایک خاص اہمیت رکھتا ہے۔ لیکن ہمارے نزدیک اُسکی واحد تلقین کے سہارے پرانایام (حبس دم) وغیرہ کے قدیم اور مستند طریقوں کو ممنوع قرار دینا مناسب نہیں۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ ہر فرقہ اور مذہب کی کوئی خصوصیت ہونا ضروری ہے، اور سب دیوتا اور اوتاروں، رشیوں منیوں اور شاستر وغیرہ کی ہستی ادنیٰ قرار دینے کے بعد اُن کے بتلائے ہوئے صحت و نجات (مکتی) کے وسائل کس طرح قابل تقلید قرار دیے جا سکتے تھے۔

ابھیاس کے متعلق کتاب کا ایک خاص حصہ گورو (مرشد) کی تعریف کیلئے وقف ہے اُسے ایشور یا خدا کے برابر مانا گیا ہے، اُسی کے نام اور روپ کے دھیان کی ہدایت کی گئی ہے (صہ۱۱۱) اُسکی سیوا (خدمت) کا ذکر کرتے ہوئے سار بچن میں مرید کے لئے یہاں تک کہا گیا ہے کہ ؎

پیکدان لے پیک کراوے پھر سب پیک آپ پی جاوے

کتاب کے ۱۳۱ اور ۱۳۲ صفحوں پر جو تشریح درج ہے وہ کافی نہیں گو ایسا نہ کیا جاتا ہو مگر اس سے

یہ ضرور ثابت ہوتا ہے کہ اس مت کے پیرووں کے لئے گورو کی خدمت کی کس درجہ تک تلقین کیگئی ہے ہمارا خیال ہے کہ اس حد تک کسی شخص کا کسی بڑی سے بڑی ہستی کا بھی احترام کرنا مناسب ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کوئی مرید اس حد تک جانا گوارا نہ کرے گا اور بفرض محال اگر کوئی گوارا بھی کرے تو خود گورو اس کی اس ذلت کو گوارا نہ کرے گا۔ فاضل مصنف کا یہ کہنا ضرور ٹھیک ہے کہ سیوا کے اصلی مطلب پر نگاہ رکھنا چاہیئے

گورو کے تعلق سے صـ۱۵۵ و صـ۱۵۶ پر یوگ درشن کا ایک سوتر درج ہے جسکا ارتھ بھی ہے کہ "جو شخص اپنے میں ستیہ کو بہ تشخصت (قائم) کرلیتا ہے اُسکی وانی (بات) میں یہ سامرتھ آجاتا ہے کہ وہ جو کچھ کہتا ہے پورا ہو جاتا ہے"۔ اسے قابل مصنف نے "سادھ بچن پلٹے نہیں پلٹ جائے برہمنڈ" کی تائید میں پیش کیا ہے مگر فی زمانہ ایسے مہاتما ناپید معلوم ہوتے ہیں۔

مریادہ پرشوتم رام اور بھگوان کرشن کے متعلق سار بچن کے ۔

رادھا سوامی کہہ سمجھا دیں رام کرشن دونوں تج ڈار

پد کی جو مختصر تشریح ۲۵۲-۲۵۳-۲۵۴ صفحوں پر کی گئی ہے وہ بھی تسکین بخش نہیں ہے۔ معلوم نہیں کہ انھیں دو برگزیدہ ہستیوں سے تشبیہ دیکر انھیں "تج ڈارنے" (چھوڑ دینے) کے اپدیش دینے کی کیا خاص ضرورت تھی؛

اسی طرح اس کتاب سے بہت سی شنکاؤں کا سمادھان نہیں ہوتا ہے، تاہم کتاب بہت مفصل اور جامع ہے اور بحیثیت مجموعی دلچسپ ہے۔ پیروان رادھا سوامی کیلئے یہ خاص طور پر مفید و کارآمد ہے۔ اسکی عبارت بھی صاف اور سلیس ہے اور بہت سی مذہبی جدت طرازیوں سے مملو۔ اور قدامت پرستی سے معرا ہے گو اسکے موجد راہ پور کے تلسی صاحب بیان کئے گئے ہیں جنھوں نے سمبت ۱۸۱۶ بکرمی میں گھٹ رامائن لکھکر "سرت شبد یوگ" کا ذکر کیا تھا، انکا ایک پد ہے ۔

کوئی سادہ سنت گت پائی جن کی سُرت شبد سمائی

کتاب کے صـ۲۶۱ پر بھی سار بچن نظم کے یہ پد درج ہیں:-

صاحب کبیر اور تلسی صاحب دیال متا ان آن چلائی
رادھا سوامی کھول سنائی میں بھی ان سنگ میل ملائی

اس کتاب کی لکھائی چھپائی بہت صاف ہے۔ کاغذ موٹا چکنا سفید، قیمت ۱۲ جو کسی طرح زیادہ نہیں، دیال باغ آگرہ سے مل سکتی ہے۔

داستان رانی کیتکی[1]

یہ سید انشاء اللہ خاں انشار کی تصنیف کردہ ایک دلچسپ کہانی ہے جس میں رانی کیتکی اور کنور اودے بھان کے حسن وعشق، آلام ومصائب، فراق ووصال کے دلچسپ مناظر پیش کئے گئے ہیں۔ انشا کے متعلق شمس العلماء آزاد دہلوی نے لکھا ہے کہ "ہندوستان کی زبانیں ان کی گھر کی لونڈی تھیں"۔ اس دلچسپ کہانی میں مصنف نے یہ کمال دکھایا ہے کہ عربی فارسی کا ایک لفظ اسمیں استعمال نہیں کیا بلکہ ساری کہانی شروع سے آخر تک ٹھیٹھ ہندوستانی زبان میں لکھی گئی ہے نہ اسمیں سنسکرت اور پراکرت کے ٹھوس اور ثقیل الفاظ استعمال کئے گئے ہیں اور نہ عربی فارسی کے غیر مانوس الفاظ کی بھرتی ہوئی ہے۔ اگرچہ امتداد زمانہ سے اس کے بہت سے الفاظ متروک ہوگئے ہیں لیکن اسکی عبارت اس قدر سلیس ہے کہ زبان ابتک چٹخارے بھرتی ہے۔ مثلاً آغاز داستان میں تحریر فرماتے ہیں:۔

"دہنا ہاتھ منہ پر پھیر کر آپ کو جتاتا ہوں، جو میرے داتا نے چاہا تو وہ تاؤ بھاؤ اور آؤ جاؤ اور کود پھاند اور لپٹ جھپٹ دکھاؤں جو دیکھتے ہی آپ کے دھیان کا گھوڑا، جو بجلی سے بھی بہت چنچل اچپلاہٹ میں ہرنوں کے روپ میں ہے، اپنی چوکڑی بھول جائے:۔

گھوڑے پہ اپنے چڑھ کے آتا ہوں میں — کرتب جو ہیں سو سب دکھاتا ہوں میں
اُس چاہنے والے نے جو چاہا تو ابھی — کہتا جو کچھ ہوں کر دکھاتا ہوں میں

اسی معمولی زبان میں بعض بعض جگہ حکمت ومعرفت کے موتی بھی پروتے جاتے ہیں۔ مثلاً

"مٹی کے باسن کو اتنی سکت کہاں جو اپنے کمہار کے کرتب کچھ بتا سکے؟"

واقعہ یہ ہے کہ پرانی ہندستانی زبان کے بہت سے الفاظ ہیں جو آجکل متروک سمجھے جاتے ہیں لیکن آجتک ان کا نعم البدل پیدا نہ ہوسکا۔ باغ وبہار اور "رانی کیتکی کی کہانی" میں ایسے الفاظ بکثرت موجود ہیں۔ مثلاً:۔

امرلی۔ آم کے درختوں کا جھنڈ	گوئیاں۔ سہیلی
شبھ گھڑی۔ ساعت سعید	بگھمبر۔ شیر کی کھال
بروگ۔ جدائی، ہجر، فراق۔	اور نہ ٹھور۔ بے ٹھکانے۔
پہاڑتلی۔ دامن کوہ	کرچال مارنا۔ چوکڑیاں بھرنا۔

[1] ملنے کا پتہ: انجمن ترقی اُردو اورنگ آباد دکن۔ قیمت ۱۲؍

کھنڈسال - شکرسازی کا کارخانہ   بھونرہ - تہہ خانہ

اس کتاب کے بعض محاورے اور ضرب الامثال ایسے بھی ہیں جو رواج باہر ہونے سے معمولی طور پر سمجھ میں نہیں آتے ہیں مثلاً ایک موقعہ پر "بہشتی سپاری او د بولتے پکھروٹے" کی ضرب المثل کا مفہوم عام فہم نہیں ہے۔ بہتر ہوتا کہ فاضل مؤلف اس قسم کے الفاظ اور محاوروں کی فرہنگ لکھدیتے بہر حال مولوی عبدالحق صاحب سکریٹری انجمن ترقی اُردو نے اس نایاب کتاب کو بڑی تلاش و تحقیق اور تصحیح و ریسرچ کے بعد شائع کرکے قدردانان ادب پر احسان عظیم کیا ہے۔

ایک جگہ اس کہانی میں "بھگوڑے" کا لفظ آیا ہے

فاضل اڈیٹر نے اس کے معنی بھاگا ہوا یا ناگزیں لکھے ہیں لیکن ہماری رائے میں اس لفظ کے معنی "ہرکارہ" ہونا چاہیئے۔

مرأت مصطفےٰ آباد[1]

اس کتاب میں شیخ غلام محمد ابن عابد میاں صاحب سابق سپرنٹنڈنٹ یتیم خانہ جوناگڈھ نے ریاست جوناگڈھ کے "تاریخی وجغرافیائی حالات نہایت تفصیل وتحقیق سے لکھے ہیں اور مزید دلچسپی کے لحاظ سے جوناگڈھ کے رئیسوں اور مشہور تاریخی مقامات کی نشر سے زیادہ رنگین وسادہ تصویریں اور ریاست کا ایک بڑا نقشہ بھی دیدیا ہے۔

کتاب دو حصوں میں تقسیم کی گئی ہے۔ پہلے حصہ میں جزیرہ نمائے کاٹھیاواڑ کا جغرافیہ، زمانۂ قدیم کی تاریخ نہایت تحقیق وتدقیق کے ساتھ درج ہے۔ اور اسمیں بہت سے حاشیے اور حوالے بھی دیے گئے ہیں۔ دوسرے حصہ میں حملۂ غزنوی سے لیکر موجودہ زمانہ تک کی جوناگڈھ، نیز علاقۂ کاٹھیاواڑ کی مفصل تاریخ دی گئی ہے۔ ضمنی طور پر سلطنت دہلی، عہد مغلیہ اور دولت انگلشیہ کے حالات بھی آگئے ہیں۔ اسی سلسلہ میں فاضل مصنف نے مختلف تاریخی کتابوں پر بھی جن کا کاٹھیاواڑ سے تعلق ہے ایک عالمانہ تنقیدی نظر ڈالی ہے اور جو غلط واقعات ان میں درج ہیں ان کی تردید یا تصحیح کردی ہے بہر حال یہ کتاب کاٹھیاواڑ اور ریاست جوناگڈھ کی اس قدر مبسوط تاریخ ہے کہ اس کے مضامین کی فہرست ہی تینتیس صفحوں پر آئی ہے، زبان بھی سلیس اور عام فہم ہے۔ ہمارے نزدیک یہ کتاب کاٹھیاواڑ کی قابل دید تاریخ ہے۔ شائقین تاریخ اسے ضرور ملاحظہ فرمائیں۔

[1] ملنے کا پتہ:- جے۔ اے گراسیہ کالج جوناگڈھ کاٹھیاواڑ۔ قیمت آٹھ روپیہ۔

سمندر کا عجائب خانہ[1] (جلد اول)

اُردو میں یہ اپنے طرز کی پہلی کتاب ہے جسے سید محمد عسکری جعفری نے بچوں کے لئے تصنیف کی ہے۔ اس کا طرز بیان بھی سلیس اور عام فہم ہے۔ لائق مصنف نے اس میں سمندر کی وسعت، اسکی گہرائی اور آبی جانوروں کے حالات نہایت دلپذیر پیرائے میں بیان کردئے ہیں۔ غرض شروع سے آخر تک کتاب نہایت دلچسپ ہے اور ادب اُردو میں اس سے اضافہ ہوتا ہے۔ ہم کو امید ہے کہ اس کا دوسرا حصہ بھی جلد شائع ہوگا۔ سائز چھوٹا اور سرورق رنگین ہے جسمیں سمندر کے اندر کا ایک منظر پیش کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ اور بھی متعدد تصویریں ہیں

سیّاح کی ڈائری

لالہ بالکشن تبرہ آبی۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی وکیل ملتان و اڈیٹر اخبار اقبال ملتان کی سیر و سیاحت کا مختصر روزنامچہ ہے جو موصوف نے ہندوستان کے مختلف شہروں کی سیر و سیاحت کے سلسلہ میں لکھا ہے۔ اسمیں دہلی۔ لکھنو۔ آگرہ۔ الہ آباد۔ کلکتہ۔ گوالیار۔ بمبئی۔ پونہ۔ بڑودہ۔ اودے پور۔ چتوڑ۔ جے پور۔ کوئٹہ۔ کراچی۔ کشمیر اور شملہ وغیرہ کے مختصر مگر دلچسپ حالات درج ہیں۔ غرض اس کے پڑھنے سے سرسری نظر میں تقریبًا تمام ہندوستان کی سیر ہو جاتی ہے۔ مختلف مقامات کے فوٹو بھی دیئے گئے ہیں۔ حجم ڈیڑھ سو صفحات۔ قیمت ڈیڑھ روپیہ۔ مصنف صاحب سے طلب کی جائے۔

ارکانِ اسلام

جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی نے بچوں کے لئے دینیات کی کتابوں کا ایک سلسلہ شائع کرنا شروع کیا ہے جس کی یہ پونے تین جزو کا چھوٹا سا رسالہ چوتھی کڑی ہے۔ اس میں (۱) کلمۂ طیب (۲) نماز پنجگانہ (۳) زکوٰۃ (۴) روزہ، اور (۵) حج پر سادہ زبان میں بحث کرکے ان کے متعلق جملہ ضروری باتیں سمجھادی گئی ہیں۔ مسلمان بچوں کے لئے بہت مفید رسالہ ہے۔ لکھائی چھپائی کاغذ بہت عمدہ۔ قیمت اڑھائی آنہ ۲؍۰ مکتبۂ جامعۂ ملیہ اسلامیہ دہلی سے طلب کیجا سکتی ہے۔

---

[1] ملنے کا پتہ۔ کلکتہ آرٹ پریس۔ دہلی۔

فیلڈ مارشل ہنڈنبرگ

جمہوریہ جرمنی کے ہردلعزیز پریسیڈنٹ فیلڈ مارشل پال فان بینکنڈارف ہنڈنبرگ جن کا ستاسی برس کی عمر میں ۲. اگست ۱۹۳۴ء کو انتقال ہوا ہے، ریاست پروشیا کے ایک قدیم و شریف خاندان جنکر سے تعلق رکھتے تھے۔ آپ ۲۔ اکتوبر ۱۸۴۷ء میں بمقام پوسین پیدا ہوئے تھے۔ گروس گلوگین کے پبلک اسکول میں تعلیم حاصل کر کے اول واہلسٹاٹ بعدازاں برلن ملٹری کالجوں میں بھرتی ہوئے اور فنونِ جنگ کی تکمیل کر کے ۱۸۶۵ء میں سرکاری فوج میں داخل ہوئے۔ اور ایک سال بعد گارڈس کی تیسری رجمنٹ کے لفٹننٹ مقرر کئے گئے۔ اسی اثنا میں آسٹریا کے ساتھ جنگ چھڑ گئی جس میں آپ نے بھی اپنی سپہ گری کے جوہر دکھائے، اور کونگراٹز کی لڑائی میں زخمی بھی ہوئے تھے۔ اس کے بعد جب ۱۸۷۰ء میں فرانس سے جرمنی کی جنگ چھڑی تو ہنڈنبرگ نے بھی حصہ لیا، اور گرلولاٹ، سینٹ پرائویٹ اور سیڈان کی جنگوں میں خوب خوب دادِ شجاعت دی۔ آپ محاصرہ پیرس میں بھی شریک تھے چنانچہ پیرس میں جو جرمن فوج سب سے پہلے داخل ہوئی اس کے آپ ہی کمانڈر تھے۔ ۱۸۷۸ء میں کپتان کے عہدہ پر ترقی پائی اور جنرل اسٹاف میں داخل کر لئے گئے۔ ۱۸۸۵ء میں میجر ہوئے، ۱۸۸۷ء میں آٹھویں سپاہ کے چیف آف اسٹاف مقرر کئے گئے۔ ۱۸۹۱ء میں لفٹننٹ کرنل اور ۱۸۹۴ء میں کرنل ہو گئے۔ اسی طرح مسلسل ترقی پاتے ہوئے ۱۹۰۳ء میں چوتھے آرمی کور کی کمان آپ کے سپرد ہوئی اور ۱۹۰۵ء میں پورے جنرل ہو کر ۱۹۱۱ء میں فوج سے ریٹائر ہو گئے۔ اور گو آپ نے فوجی ملازمت کے تمام مدارج طے کر لئے تاہم ملک میں کوئی خاص شہرت حاصل نہیں ہوئی۔ یہ طرۂ امتیاز سڑسٹھ برس کی عمر میں نصیب ہوا۔ اس کی داستان بہت دلچسپ ہے اس سال قیصر ولیم نے آپ کو خاص طور پر طلب کر کے اور مشرقی پروشیا کی تیسری سپاہ کا کمانڈر بنا کر مشرقی روس اور سرحدوں کے متعلق مفصل رائے دینے کی درخواست کی۔ آپ نے موقعہ پر جا کر کل سرحد کا خود سے معائنہ کیا۔ اسی اثنا میں قیصر نے ایک مصنوعی جنگ کی مگر ہنڈنبرگ نے قیصر کی مجوزہ چالوں پر اعتراض کیا اور اُن کے بجائے نئی چالیں بتائیں، جو قیصر کی ناخوشی کا باعث ہوا اور آپ اپنے عہدہ سے

سبکدوش ہو کر پھر گوشہ نشین ہو گئے۔

(کچھ دنوں بعد ۱۹۱۴ء میں جنگ عظیم چھڑ گئی، اور روس کے لشکر جرار نے جرمنی کے مشرقی حدود پر ایسا زبردست حملہ کیا کہ جرمنی کی فوج اس کی مزاحمت نہ کر سکی اور روس سڑک کوٹنے والے انجن کی طرح کچلتا اور پامال کرتا مشرقی پروشیا میں گھس آیا۔

یہ حالت دیکھکر قیصر جرمنی کو سخت تشویش ہوئی، معاً اس کا خیال ہنڈنبرگ کی طرف گیا چنانچہ اُس نے فوراً جنرل موصوف کو طلب کر کے امداد طلب کی۔ قوم اور وطن کے ننگ و ناموس کو خطرے میں دیکھکر اس آزمودہ کار و جاں نثار جنرل کا دل پسیج گیا چنانچہ وہ اسلحۂ جنگ سے آراستہ ہو کر اپنے گوشۂ عافیت سے نکلا۔ قیصر نے فیلڈ مارشل کا خطاب دیکر اسے مشرقی سپاہ کا کمانڈر انچیف بنا دیا۔ اس مہم میں جنرل لیو ونڈارف اور ہاف مین ہنڈنبرگ کے دست و بازو تھے۔

ہنڈنبرگ پہلے ہی سے اس علاقہ سے واقف تھے۔ بلکہ اس علاقہ کے متعلق ان کی رائے کا قیصر اور جرمنی کے بڑے بڑے سرداروں نے مضحکہ اڑایا تھا۔ اس علاقے میں بہت سے جھیلیں اور دلدل ہیں جنھیں ماسوری دلدلیں کہتے ہیں، اور قیصر کی ہدایت پر ان دلدلوں اور جھیلوں کا پانی خشک کر کے اس رقبہ کو قابل کاشت بنانے کی ایک اسکیم تیار کی گئی تھی جس کی جنرل ہنڈنبرگ نے سخت مخالفت کی تھی، کیونکہ ان کا خیال تھا کہ اگر کبھی روس نے پروشیا پر حملہ کیا تو یہی دلدل اور جھیلیں جرمنی کی آزادی کی محافظ ہونگی۔ اس وقت اس رائے کا سبھوں نے مذاق اُڑایا تھا۔ اور ہنڈنبرگ کا "کیچڑ یا جرنیل" نام رکھا تھا۔ لیکن جب جنگ یورپ میں یہ قول صحیح ثابت ہوا تو قیصر نے ہنڈنبرگ کو یاد کیا۔ ہنڈنبرگ نے مشرقی محاذ پر پہونچتے ہی تمام صورت حال پر غور کیا اور جنرل لیوڈانڈارف اور ہاف مین کی امداد سے ایسی عمدہ چال چلی کہ چند ہی روز میں جرمن فوج نے حملہ آور روسی فوج کو چاروں طرف سے اس طرح گھیر لیا کہ روسی سپاہ کو ماسوری دلدلوں کے سوا اور کہیں فرار کی جگہ نہ ملی۔ بہر حال ٹینن برگ کے معرکۂ عظیم میں جنرل ہنڈنبرگ نے روسی فوج کا صفایا کر دیا۔ لاکھوں سپاہی اور باربرداری کے جانور جھیلوں اور دلدلوں میں پھنسکر ضائع ہو گئے۔ اس شکست سے روس پر ایسی ضرب شدید پڑی کہ اس کے تمام منصوبے خاک میں مل گئے اور جنرل ہنڈنبرگ کی شہرت کا سکہ تمام دنیا میں بیٹھ گیا۔ اور خود جرمنی میں تو اس کے نام کا وظیفہ پڑھا جانے لگا۔)

اس جنگ عظیم کے بعد پولینڈ کا حملہ شروع ہوا۔ لوڈز کے قریب جنگ میں روسیوں کو شکست فاش ہوئی اور ان کی فوجیں پیچھے ہٹکر دریائے رسٹکہ کے کنارے مورچہ بند ہو گئیں اور جرمن فوج مقابلے

میں آگے بڑھکر بالمقابل خندقیں کھود کر ڈٹ گئیں۔ بہرحال اس خونریز جنگ کے بعد روسی فوج کا ایک سپاہی بھی جرمنی میں نظر نہ آیا۔

جرمنی سے روسیوں کو اس طرح پاک کرکے جنرل ہنڈنبرگ کا مشہور کورلینڈ کا دھاوا" (Ride to Courland) شروع ہوا۔ مئی ۱۹۱۵ء تک جرمن فوج نے روسی علاقے میں پیشقدمی کی۔ جب جرمن سپاہ دریائے ڈوینا کے کنارے پہونچی تو روسیوں نے مزاحمت کی اور ساحل بالٹک کی طرف سے بھی حملہ کیا۔ لیکن ہنڈنبرگ نے ان سب حملوں کو مسترد کرکے روسیوں کی کمر توڑ دی اور برو سیلوف کی مشہور چڑھائی شروع کردی۔

۱۹۱۶ء میں مغربی محاذ پر اتحادیوں کو فتوحات حاصل ہونے لگیں تو قیصر نے جنرل فالکنہین کو ہٹا کر جنرل ہنڈنبرگ کو چیف آف دی جنرل اسٹاف بنایا اور ان کی مدد کے لئے ان کے پرانے رفیق جنرل لیوڈنڈارف کو کوارٹر ماسٹر جنرل مقرر کیا۔ جس کی وجہ سے جرمن فوج میں تازہ روح پڑ گئی اور انھوں نے اتحادیوں کا خوب جگر مقابلہ کیا۔

۱۹۱۸ء میں جنرل ہنڈنبرگ نے جرمنی کی بچی کھچی فوج کو مجتمع کرکے پھر ایک جان توڑ حملہ کیا لیکن جب کامیابی نہ ہوئی تو جنرل لیوڈنڈارف اور جنرل ہنڈنبرگ نے قیصر سے صاف صاف کہہ دیا کہ اب جرمن فوج کی کامیابی ناممکن ہے اور وہ اتحادیوں کی اس سے زیادہ مزاحمت نہیں کرسکتے۔ اس کے بعد جو حالات رونما ہوئے وہ سب کو معلوم ہیں، اتحادیوں کی فتح ہوئی، جرمنی میں انقلاب ہوگیا، شاہی کے بجائے جمہوری حکومت قائم ہوئی، اور قیصر ولیم بھاگ کر ہالینڈ میں پناہ گزین ہوئے۔

اس وقت بھی ہنڈنبرگ نے جمہوری حکومت کو اپنی خدمات پیش کرکے بچی کھچی جرمن فوج کی اس خوش اسلوبی سے رہنمائی کی کہ اتحادیوں کے پنجہ سے سلامت نکال لے گئے۔

جون ۱۹۱۹ء میں ہنڈنبرگ اپنے عہدہ سے سبکدوش ہوکر ہنوور میں اپنی سوانحعمری لکھنے میں مصروف ہوئے۔ یہ کتاب ۱۹۲۰ء میں شائع ہوئی۔ ان دنوں اتحادی طاقتیں قیصر ولیم پر مقدمہ چلانے کا مطالبہ کررہی تھیں۔ ہنڈنبرگ کا کوئی درمیان نہ تھا لیکن ان کا جوہر شرافت اور جذبۂ وفاداری دیکھئے کہ انھوں نے اپنے سابق بادشاہ کو زحمت و پریشانی سے بچانے کے لئے خود کو قیصر کے بجائے پیش کرکے اتحادیوں سے کہا کہ مجھ پر مقدمہ چلایا جائے۔ مگر بالآخر اتحادیوں کو اس دھمکی پر عمل کرنے کی ہمت نہ ہوئی۔

۱۹۲۵ء میں جب جمہوریہ جرمنی کے پہلے پریسیڈنٹ ایبرٹ کا انتقال ہوا تو ملک میں دو سیاسی جماعتیں تھیں، ایک کا مقصد جرمنی میں شاہی حکومت قائم کرنا تھا، دوسری جمہوریت کی طرفدار تھی چنانچہ

شاہنشاہ کے حامیوں نے جارلیس کو اور جمہوریوں نے مارکس کو اپنی اپنی پارٹیوں کی طرف سے صدارت کا امیدوار نامزد کیا لیکن جب شہنشاہ پسندوں نے دیکھا کہ ان کا امیدوار کامیاب نہ ہو سکے گا تو انھوں نے اس کے بجائے ہنڈنبرگ کو کھڑا کر دیا چنانچہ ہنڈنبرگ آسانی سے پریسیڈنٹ منتخب ہو گئے۔

اس عہدہ کا حلف وفاداری لیتے ہوئے آپ نے آئین مملکت کا احترام کرنے کا اعلان کیا۔ اگرچہ کبھی کبھی آپ کے افعال سے ملوکیت پرستی کی طرف رجحان مترشح ہوتا تھا۔ لیکن آپ نے اپنے قول کو آخر دم تک نبھا دیا۔ اور رجعت پسندوں کی ناخوشی و ناراضگی کی کچھ پروا نہ کی۔ اور جب مرحوم نے میثاق لوکارنو پر دستخط کر دیے تو اُن کے پُرانے دوست جنرل لیوڈنڈارف نے کھلم کھلا اُن پر قیصر سے غداری کا الزام لگایا۔

۲ اپریل ۱۹۲۶ء کو ہنڈنبرگ کی فوجی ملازمت کو ساٹھواں سال شروع ہوا تو ان کی پرانی رجمنٹ کی ایک کمپنی درباری لباس میں ملبوس ہو کر قصر صدارت میں سلام کرنے گئی۔ اس وقت جنرل مرحوم خود بھی فیلڈ مارشل کی زرق برق وردی پہنے اور عصا (Baton) ہاتھ میں لئے نمودار ہوئے۔ آپ کے سینہ پر اپنی تمغے اور نشانات نصب تھے۔

آپ اپنی قیصر پرستانہ ذہنیت کے لئے مشہور تھے۔ جون ۱۹۲۶ء میں جب خاندان شاہی کی جائدادیں ضبط کر لینے کا سوال اُٹھایا گیا تو شاہ پسند پارٹی کے لیڈر کی تحریک پر ہنڈنبرگ نے ایک پرائیوٹ خط لکھکر ضبطی جائداد کی مخالفت کی۔ چنانچہ لوگوں نے اس خط کو جرمنی کے سب اخباروں میں شائع کرا کے کروروں کی تعداد میں مشتہر کیا اور اُسی کی وجہ سے جرمن پارلیمنٹ میں بھی بڑا شور و غل ہوا۔ لیکن ہنڈنبرگ نے اس کی کوئی پروا نہ کی۔

جنوری ۱۹۲۷ء میں چانسلر مارکس نے نیشنلسٹ پارٹی کے علاوہ اور سیاسی پارٹیوں کی مخلوط وزارت مرتب کرنا چاہی لیکن اسمیں ناکامی ہوئی، تو جنرل ہنڈنبرگ نے چانسلر کو نیشنلسٹ پارٹی کو بھی وزارت میں شامل کرنے کا مشورہ دیا۔ اس پر مرکزی پارٹی نے اعتراض کیا۔ جمہوری پارٹی کے تمام اخباروں نے پریسیڈنٹ کے خلاف مضامین لکھے کیونکہ وہ نیشنلسٹ جماعت کو حکومت میں داخل کرنا پسند نہ کرتے تھے، مگر بالآخر چانسلر کو پریسیڈنٹ ہی کے مشورے کے بموجب عمل کرنا پڑا۔

جب ہنڈنبرگ اسّی سال کے ہوئے تو اہل جرمنی نے ان کے اعزاز میں "ہنڈنبرگ فنڈ" کے نام سے کشتگان جنگ کے پسماندگان کی امداد کی خاطر ایک فنڈ کھولا جس میں پانچ لاکھ پونڈ جمع ہو گئے جو مستحقین میں تقسیم کر دیے گئے۔ یہ رقم جنرل مرحوم کی ہر دلعزیزی کا ایک ادنیٰ ثبوت ہے۔

ہنڈنبرگ مسلمہ طور پر شاہ پسند تھے اور لوگ تو یہاں تک کہتے ہیں کہ جب سالانہ پریڈ کے موقعہ

پر فوجیں سلامی اُتارتی تھیں تو ہنڈنبرگ قیصر کو یاد کر لیا کرتے تھے، لیکن ان کو آئین وضابطہ کا اس درجہ احترام ملحوظ رہتا تھا کہ جب شاہ پسند جماعت اسٹالہم کی سرگرمیاں جمہوریت پسندوں کے خلاف حد سے زیادہ بڑھ گئیں تو فروری ۱۹۲۹ء میں ہنڈنبرگ نے انھیں استعفےٰ کی دھمکی دیکر حد مناسب سے متجاوز نہیں ہونے دیا۔ اس کے ساتھ ہی جب جولائی ۱۹۳۰ء میں وادی رہائن میں استقلال جمہوریت کا جشن منایا گیا تو ہنڈنبرگ نے اس میں شریک ہونے سے انکار کر دیا تاوقتیکہ اسٹالہم پر جو قیود اور پابندیاں عائد کی گئی تھیں وہ تمام وکمال دُور نہ کر دی جائیں۔ چنانچہ اس کی فوراً تعمیل ہوئی اور پریسیڈنٹ شریک جشن ہوئے۔

اسی زمانہ میں جبکہ بروننگ کی وزارت کا دور دورہ تھا، حکومت اپنا بجٹ پورا نہ کر سکی۔ پریسیڈنٹ ہنڈنبرگ نے وزرائے جرمنی کی اس طرح مدد کی کہ اپنے خاص اختیارات سے فنانس بل کو پاس کر دیا لیکن اس نفاذ کے لئے یہ شرط لازمی قرار دیدی کہ حکومت مجوزہ بجٹ کو ریشتاغ کی دو تہائی کثرت رائے سے پاس کرائے۔ نیشنلسٹ پارٹی نے ان مسودات قانون کو کالعدم کرنے کے لئے یہ چال چلی کہ وہ سوشلسٹ پارٹی سے مل گئے اور اپنی مشترکہ ومتفقہ طاقت سے بجٹ کو مسترد کر دیا جس کی وجہ سے جرمن پارلیمنٹ کو منتشر کرنا پڑا۔

۱۹۳۲ء کا زمانہ بھی جرمنی کے لئے نہایت نازک زمانہ تھا۔ مالی واقتصادی مشکلات کی وجہ سے ملک میں ناداری اور بے چینی کا دور دورہ تھا۔ اتحادی تاوان جنگ کے سخت تقاضے کر رہے تھے۔ پارلیمنٹ ٹوٹ چکی تھی اور انتخابات عامّہ سر پر تھے۔ ایک طرف ہٹلر پارٹی غیر معمولی قوت پکڑ چکی تھی، دوسری طرف کمیونسٹوں نے اودھم مچا رکھا تھا، جگہ جگہ ہنگامے اور بلوے ہو رہے تھے۔ تیسری طرف شاہ پسندوں کی جماعت بھی آنکھیں دکھا رہی تھی۔ ہر شخص کا خیال تھا کہ یہ تمام قوتیں ملکر ہنڈنبرگ کو کچل ڈالیں گی لیکن بڈھے جنرل نے مخالف قوتوں کی کوئی پروا نہ کرکے فروری ۱۹۳۲ء میں چوراسی برس کی عمر میں پریسیڈنٹی کے عہدہ کی دوبارہ امیدواری کا اعلان کر دیا اور قوم کے نام یہ پیغام بھیجا کہ:۔

"اگر میں منتخب کر لیا گیا تو پورے خلوص و وفاداری سے مادرِ وطن کی خدمت کرونگا۔ اگر منتخب نہ ہو سکا تو مجھ پر یہ الزام عائد نہ ہو سکے گا کہ عین ضرورت کے وقت میں اپنے وطن کی خدمت سے کنارہ کش ہو گیا ہوں۔"

۲۷۔ فروری ۱۹۳۲ء کو ہر ہٹلر نے صدارت کے لئے جنرل ہنڈنبرگ سے مقابلہ کرنے کا اعلان کیا تو تمام ملک میں ہیجان پیدا ہو گیا۔ نیشنلسٹوں اور فولادی خود والوں کی جماعت نے اپنی طرف سے لفٹنٹ کرنل دستربرگ کو امیدوار کھڑا کیا۔ بہرحال ۲۳۔ فروری کو ان تینوں امیدواروں نے برلن میں اپنے اپنے

اعلانات شائع کئے۔

بالآخر ۱۳ مارچ ۱۹۳۲ء کا آفتاب طلوع ہوا، یہ صدارت کے نتائج کا آخری دن تھا، ووٹ شماری کی گئی تو نتائج حسب ذیل نکلے:۔

اِس معرکہ میں ہنڈنبرگ کو ۱۸۶۶۱۷۳۶ ووٹ ملے، اور ہٹلر کو ۱۱۳۲۸۵۷۱، بقیہ امیدواروں میں تھلمان کو ۴۹۷۱۰۷۹ ووٹ، ڈسٹربرگ کو ۲۵۱۷۰۰۶، اور ونٹر کو ۱۰۹۲۹۲ ووٹ ملے۔ کثرت رائے کے باوجود ہنڈنبرگ کے موافق ووٹوں کی تعداد مخالف ووٹوں کی مجموعی تعداد سے زیادہ نہ تھی اسلئے آخری فیصلہ کے لئے دوبارہ الکشن ہوا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہنڈنبرگ کو ۱۹۳۵۹۶۴۲ (۲) ہٹلر کو ۱۳۴۱۷۴۶۰ اور (۳) تھلمان کو ۳۷۰۶۳۸۸ ووٹ ملے۔ بقیہ دو امیدوار بیٹھ گئے تھے۔ غرض ہنڈنبرگ کو چھ لاکھ ووٹوں کی اکثریت سے فتح حاصل ہوئی اور وہ دوبارہ پریسیڈنٹ ہوگئے۔

مارچ ۱۹۳۲ء کے آخر میں برونِنگ کی وزارت مستعفی ہوگئی جس سے جرمنی بھر میں سنسنی پھیل گئی کیونکہ ۱۶۔جون ۱۹۳۲ء کو لوزان میں ایک بین الاقوامی کانفرنس مسئلہ تاوان کا فیصلہ کرنے کے لئے منعقد ہونیوالی تھی۔ اور برونِنگ کی وزارت کے شکست ہوجانے سے تمام بڑی بڑی سلطنتوں میں سخت تشویش پیدا ہوگئی۔ خود جرمنی میں لوگوں کو یہ اندیشہ ہوگیا کہ اب ہر ہٹلر چانسلر ہوجائیگا۔

یکم جون ۱۹۳۲ء کو ہر فان پاپن چانسلر مقرر کئے گئے اور ۲۔جون کو ہنڈنبرگ نے ریشتاغ کو توڑ دینے کا فیصلہ کرلیا۔ اور آئندہ الکشن کے لئے مئی کا مہینہ مقرر کردیا۔

اس وقت ہٹلر کی نازی پارٹی حکومت کے زیر عتاب تھی اور اس کے خلاف بعض احکام جاری ہوچکے تھے لیکن ۱۵۔جون کو ہنڈنبرگ نے نازی جماعت کی سرخ فوج سے تمام قیود اُٹھا لینے کا حکم نافذ کردیا۔

اگرچہ ۱۶۔جون کو لوزان کانفرنس میں جو مسٹر ریمسے میکڈانلڈ وزیر اعظم برطانیہ کی صدارت میں منعقد ہوئی تھی قرضہ و تاوان جنگ کی ادائگی کی مہلت میں توسیع کردی گئی لیکن اس وقت جرمنی کی اندرونی حالت ناگفتہ بہ تھی۔ مختلف سیاسی پارٹیاں ایک دوسرے کے خلاف مظاہرے کرتی تھیں، گلی کوچوں میں ان کے تصادم سے ہنگامے برپا ہوتے تھے، کوئی دن ایسا نہ جاتا تھا کہ دس بیس آدمیوں کے سر نہ پھوٹتے ہوں، اور پولیس سے جھگڑا نہ ہوتا ہو۔ اس لئے گورنمنٹ کو مجبوراً مارشل لا جاری کرنا پڑا۔

۹۔جولائی ۱۹۳۲ء کو مدبرین یورپ نے معاہدہ لوزان پر دستخط کردیے جس کی رو سے جرمنی کو تاوان جنگ معاف کردیا گیا۔ اور اس کے بعد ہی جرمنی میں آئندہ انتخاب کی ہنگامہ آرائیاں شروع

ہوگئیں۔اور چونکہ اس سلسلے میں کئی جگہ سخت بلوے ہوگئے اس لئے گورنمنٹ نے کھلے جلسوں اور جلوسوں کی مانعت کردی۔بہرحال ہالوں یا عمارتوں میں بھی جو جلسے ہوتے تھے اُن میں بھی ٹکٹ کے ذریعہ داخلہ ہوتا تھا مگر اس پر بھی امن وامان قائم نہ ہوا تو گورنمنٹ نے ۲۰۔جولائی کو مجبوراً برلن میں مارشل لا نافذ کرکے معمولی آئین کو معطل کردیا۔اس وقت ہر فان پاپن ریاست پروشیا کا ڈکٹیٹر بن گیا اُس نے پریسیڈنٹ کی رائے سے مرکزی سوشلسٹ جماعت کے ممتاز ممبروں سے وزارت کے مختلف عہدوں سے مستعفی ہوجانے کا مطالبہ کیا۔

بااینہمہ ۳۱۔جولائی کو جو ریشتاغ کا الکشن ہوا اس میں ہر ہٹلر کی پارٹی کے نمایندوں کی تعداد سب سے زیادہ ہوگئی۔اگست کے مہینہ میں بھی جب دنگہ فساد کا سلسلہ جاری رہا تو ہنڈنبرگ نے مجبوراً ایک فرمان جاری کیا جس میں سیاسی جرائم کے مرتکبین کو سخت سزاؤں کی دھمکی دی گئی وسط ماہ اگست میں ہر ہٹلر نازی جماعت کا لیڈر بڑے زور وشور کے ساتھ اُٹھا اور چانسلری کا طلبگار ہوا۔فان پاپن نے اس کو وائس چانسلری اور پروشیا کی وزارت عظمیٰ پیش کی مگر ہٹلر نے اس پیشکش کو حقارت سے مسترد کردیا۔اس کے بعد ہٹلر نے پریسیڈنٹ ہنڈنبرگ سے ملاقات کرکے اپنے مطالبات پیش کئے۔مگر اُنھوں نے بھی فان پاپن کی ماتحتی ہی میں عہدہ دینا منظور کیا۔غرض اس مرتبہ ہر ہٹلر کو دومرتبہ نیچا دیکھنا پڑا۔یعنی نہ وہ پریسیڈنٹ ہوسکا نہ چانسلر۔

۴۔ستمبر کو برلن میں فولادی خود والی جماعت کے ڈیڑھ لاکھ ممبروں نے ایک فوجی پریڈ کی جس میں سابق ولیعہد جرمنی کو سلامی دی گئی۔جنگ کے بعد جرمنی میں ایسی شاندار فوجی پریڈ اس سے پہلے نہیں ہوئی تھی۔خود فان پاپن اور ان کے بڑے بڑے فوجی لیڈر بھی اس موقع پر موجود تھے۔اس فوجی مظاہرے سے ظاہر ہوگیا کہ جرمنی کی موجودہ وزارت قیصر کی طرفدار ہے اور وہ مخالفوں کے خلاف اپنی طاقت سے کام لینے میں بھی دریغ نہ کرے گی۔

۱۲۔ستمبر کو ریشتاغ میں فان پاپن کی حکومت کے خلاف بے اعتمادی کا ووٹ پاس ہونے والا تھا لیکن اُنھوں نے اجلاس سے پہلے پریسیڈنٹ ہنڈنبرگ کا فرمان حاصل کرکے پارلیمنٹ مذکور کو شکست کردیا جس کے بعد پریسیڈنٹ ہنڈنبرگ جرمنی کے مطلق العنان حکمران ہوگئے۔مگر دو ماہ بعد ہی نومبر ۱۹۳۲ء میں فان پاپن کی گورنمنٹ کو مستعفی ہونا پڑا۔اب پریسیڈنٹ ہنڈنبرگ نے ہر ہٹلر کو چانسلری کا عہدہ پیش کیا مگر اُس نے قبول کرنے سے انکار کردیا۔مجبوراً فان شلیچر کو چانسلر بنایا گیا لیکن جنوری ۱۹۳۳ء میں فان شلیچر نے پریسیڈنٹ سے پارلیمنٹ کو ایک مرتبہ اور توڑ دینے کی درخواست کی لیکن اس بار

پریسیڈنٹ نے اس درخواست کو منظور نہیں کیا اور وزرار کو استعفے کے سوا کوئی چارہ کار نہ رہا چنانچہ ۳۰۔ جنوری ۱۹۳۳ء کو پریسیڈنٹ نے ہر ہٹلر کو چانسلر مقرر کر دیا۔ بس اسی دن سے جرمنی کی قسمت نے پلٹا کھایا۔ اب پریسیڈنٹ کی وفات کے بعد ہر ہٹلر چانسلری اور صدارت دونوں عہدوں پر قابض ہوگیا ہے۔ آئندہ دیکھئے کیا ہوتا ہے۔

۶۔ اگست ۱۹۳۴ء کو پریسیڈنٹ ہنڈنبرگ کا جنازہ سرکاری اعزاز کے ساتھ اُٹھایا گیا لاکھوں آدمی ساتھ تھے۔ ستاسی ۸۶ سال کی مسلسل جدوجہد کے بعد بوڑھا محب وطن جرنیل گوشۂ قبر میں آرام کر رہا ہے۔

ہندوستان کی مختلف یونیورسٹیوں کی بیس لڑکیاں مسز رانا دت کی سرکردگی میں برطانیہ اور یورپ کی سیر و سیاحت اور وہاں کے دارالعلوم کے متعلق معلومات حاصل کرنے کی غرض سے گئی ہیں مسز دت جنیوا کی بین الاقوامی اسٹوڈنیٹس سروس میں تھیں اس لئے وہ یوروپین ممالک سے بخوبی واقف ہیں۔ اس جماعت کا روما دارالحکومت اطالیہ میں مسولینی نے نہایت تپاک سے استقبال کیا اور کہا کہ انہیں ہندوستان کے فنون لطیفہ، فلسفہ اور شائستگی سے خاص دلچسپی ہے۔ مسولینی نے اس جماعت کے ساتھ اپنا فوٹو بھی کھنچوایا مسولینی کے علاوہ ان لڑکیوں کو پوپ اعظم سے بھی ملاقات کا شرف حاصل ہوا۔ پوپ نے اطالوی زبان میں ان لڑکیوں سے دیر تک گفتگو کی اور ہر لڑکی کو اپنی نشانی عطا فرمائی۔ اس جماعت نے پارلیمنٹ وغیرہ کی سیر اور دارالعوام کے مباحثے بھی سنے۔ اب یہ جماعت پیرس کی بین الاقوامی طالباتی کانفرنس میں شرکت کرنے فرانس گئی ہے۔

درحقیقت نیک کردار وہی ہے جو مصائب میں صابر رہے اور خطا سے درگذر کرے۔
دشمنی بھائیوں کو بھی جدا کر دیتی ہے مگر محبت غیروں کو بھی دوست بنا دیتی ہے۔
انسانی جسم خدا کی امانت ہے، اسے کمزور نہ ہونے دو۔
بڑھاپے میں خوش رہنا چاہتے ہو تو جوانی میں کفایت شعاری سیکھو۔
ناامیدی سے بڑھکر دنیا میں کوئی چیز نہیں ہے، یہ موت کا دوسرا نام ہے۔
محروم آدمی چند دن اپنی طبیعت کے موافق جو چاہتا ہے کر گذرتا ہے، مگر آخری انجام انکا ہمیشہ خراب ہوتا ہے۔

حضرت ریاض مرحوم

(از سید مظہر حسین صاحب اختر امیر ٹھی)

حضرت ریاض جن کی اتفاقیہ موت سے اُردو علم ادب اور خصوصاً شاعری کو ناقابل تلافی نقصان پہونچا ہے، خیر آباد کے رہنے والے اور اسیر و امیر مرحوم کے شاگرد تھے۔ ابتدا ہی سے شعر و شاعری کا شوق تھا۔ شروع شروع میں گلکدۂ ریاض کے نام سے شعر و سخن کا ایک پرچہ نکالا تھا اُس کے بعد گورکھپور سے ریاض الاخبار نکالتے رہے۔ گورکھپور سے فتنہ و عطر فتنہ بھی کچھ دنوں جاری رہا۔

اُن کی شاعری میں داغ کا رنگ زیادہ ہے۔ اور شاگردانِ امیر میں داغ کے پایہ کا شاعر اگر کسی کو کہا جاسکتا ہے تو وہ ریاض ہی ہیں۔ اگرچہ وہ خود اس کو نہیں مانتے اور اُن کا بیان تھا کہ "مجھے تو اس حرف کا بھی درجہ حاصل نہیں ہے جو داغ کے قلم سے سہواً نکل گیا ہو داغ کا حریف یا ہمسر ہونا تو بڑی بات ہے۔"

لکھنؤ کے شعرا کی طرح اُن کے کلام میں شوخی او بیباکی، جوش و سرمستی اور رندی و آزادی نظر آتی ہے۔ اور گو نیچر کی تصویر ذرا دھندلی ہے لیکن زبان کی فصاحت اور روزمرہ نے اس کو ثابت کردیا ہے کہ قدرت نے اُنھیں شاعر پیدا کیا ہے۔

ہر شخص فطرتاً ایک خاص ذوق رکھتا ہے اور اُس کے جذبات و خیالات اسی سلسلہ میں ترقی کرتے رہتے ہیں۔ خصوصاً شاعری میں اگر فردوسی رزمیہ شاعری کا ناخدا ہے تو انوری قصائد کا بادشاہ، اور سعدی پند و نصائح کا علم۔ اسی طرح اُردو میں میر کو ریختہ کا استاد مانا گیا ہے تو غالب فلسفیانہ تغزل میں فرد ہیں، اور اگر مومن کو نازک بیانی پر ناز ہے تو انیس کو مرثیوں و سلام پر۔

ریاض کی شاعری اکثر رندانہ ہے اور اُس میں ضروری حد تک شوخی اور نیچرینی بھی کافی پائی جاتی ہے۔ لیکن کبھی کبھی انھوں نے اپنے اس مخصوص رنگ سے ہٹکر بعض شعر ایسے کہے ہیں جو اسلوبِ بیان کی جدت و دل آویزی کے لحاظ سے اُن کی شگفتگیِ زبان اور قادر الکلامی کا پتہ دیتے ہیں۔

شعر کی تعریف صرف یہی نہیں کہ کلام موزوں ہو، اس کا ردیف و قافیہ درست ہو اور اصولِ شاعری

کے اعتبار سے کوئی غلطی نہ ہو، بلکہ شاعری ایک مصوری ہے قدرت کی نیرنگیوں اور شاعر کے جذبات و احساسات کی، اُس میں تخیلات کے دریا بہتے ہیں، حقیقت کے پھول کھلتے ہیں، کیفیات کی ہوائیں چلتی ہیں، یہاں تک کہ شاعر اُس میں محو اور خود رفتہ ہو جاتا ہے، اور اُس کے اثرات دوسروں پر بھی اپنا اثر ڈالے بغیر نہیں رہتے۔

ہم اس موقع پر ریاض کے رندانہ کلام میں سے چند اشعار پیش کرینگے، جن سے آپ اُن کی رندانہ حسن پرستی، ذوقِ مے نوشی، اور بدمستی و بےخودی کی تصویریں خود اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں گے۔

مے پرستی، مفلسی اور قرضداری میں کچھ اور ہی مزا دیتی ہے۔ بادہ کشوں کا میخانہ میں جماؤ، مے فروش کا غرور اور تمکنت، بادۂ ارغوانی کی لپٹیں، بادلوں کا آنا، بجلی کا چمکنا، ہلکی ہلکی بارش ہونا، پینے والوں کا جی چاہتا ہے کہ ساغر پر ساغر چڑھائے چلے جائیں۔ گرہ میں پیسہ نہیں، پیر مغانہ قرض کے نام سے کانوں پر ہاتھ رکھتا ہے، بڑے اصرار و خوشامد سے ایک دو جام ملے۔ اِس لطف و مراعات اور فکر و تردد کو ریاض نے کس خوبصورتی سے ادا کیا ہے:-

ہم جانتے ہیں لطفِ تقاضائے مے فروش   وہ نقد میں کہاں جو مزا ہے اُدھار میں

نیچی داڑھی نے آبرو رکھ لی   قرض پی آئے اِک دُکان سے آج

مے چھین کر کسی سے جو پیتے تو تھی خطا   جب دام دے کے پی تو گنہ کیا کسی کا تھا
یہ وضع اپنی اور یہ دشنام مے فروش   سُنکر جو پی گئے یہ مزا مفلسی کا تھا

کرینگے کیا نہ کریں گے جو مے سے ہم توبہ   کہ اب دوکان سے ملتی اُدھار بھی تو نہیں

اے شیخ تو چرا کے پیئے جب کبھی پیئے   تیری طرح کسی کی نہ نیت خراب ہو

ایک شعر میں دُزدِ مے بنکر کس قدر فخر کرتے ہیں، فرماتے ہیں:-

مے چرانے میں ہمیں ہے ید طولےٰ کیسا   ہم اُڑا لائے سُبو آج اچھوتا کیسا

کس قیامت کے شعر ہیں:-

جُن چُن کے آج شیخ نے انگور کھالئے   اب کیا کھچے گی تاک (انگور) کا حاصل نکل گیا

جنابِ شیخ نے جب پی تو منہ بنا کے کہا مزہ بھی تلخ ہے کچھ بو بھی خوشگوار نہیں

بوتل کا کاگ زور میں تو یہ کو لے اُڑا ہم گل چلوں کے ہاتھ کی گوئی کری نہیں

کھلیں : قبر میں جنت کی کھڑکیاں رند دماغ میں جو بسی ہے اُسی کی بُو آئے

ہماری نظر حشر میں شیخ پر تھی وہ سر پہ لئے حوضِ کوثر نہ نکلے

پاک طینت رند پیکر مجھکو پہونچائیں ثواب میری پونجی نیک کاموں میں الٰہی صرف ہو

چمن کو بادِ خزاں اس طرح نہ کر پامال کوئی تو پھول سرِ شاخسار رہنے دے

عیش و نشاط کی گذری ہوئی صحبتوں کی یاد رندانہ رنگ میں دیکھیے :۔

بھرے خم ہم کیا کرتے تھے خالی اب وہی ہم ہیں بھری محفل میں خالی ہوکے ہم تک جام آتا ہے

کلام کی بڑی خصوصیت شگفتگی اور روانی ہے۔ لیکن موجودہ تعلیم نے جن لوگوں کو اُردو علم وادب سے بیگانہ رکھا ہے وہ کہتے ہیں کہ اُردو شاعری تقلید ہے، فطری نہیں۔ وہ ان غیر فطری خیالات کو ملاحظہ فرمائیں :۔

غبار آلودہ آنکھوں پہ ہزاروں میکدے قرباں وہ کافر بے پیے بھی رات دن مخمور رہتا ہے

جھجک جھجک کے لیا ہوگا ہاتھ میں ساغر جو پی بھی ہوگی تو ڈر ڈر کے ہم نے پی ہوگی

جوش مے اور سبزہ زاروں میں گھٹا چھائی ہوئی بات ایسی ہے کہ توبہ بھی ہے للچائی ہوئی
اُسے وہ دن ہم سے یوں زاہد لب کوثر کہے پیجیے تو کس تکلف کی ہے کھچوائی ہوئی

ہوا پہ ہے مزاج ابرِ کرم کا پیو رندو وہ برسے یا نہ برسے

ہم کو ریاض کے کلام کا موازنہ عمر خیام کی خمریات یا غالب و مومن کے تغزل سے نہیں بلکہ یہ عرض

کرنا مقصود ہے کہ وہ اپنے مخصوص رنگ میں جو کچھ لکھتے تھے خوب لکھتے تھے اور فی زمانہ اپنا جواب نہیں رکھتے تھے۔

اس موقعہ پر ہم اُن کے مخصوص رنگ سے علاوہ چند اشعار پیش کرتے ہیں جو خاص طور پر قابل ملاحظہ ہیں۔ ذیل کے مطلعے ملاحظہ ہوں:۔

دل کی ہے قدر تو کچھ حسن کی سرکاروں میں یہ وہ سودا نہیں بکجائے جو بازاروں میں

ہنگام نزع گریۂ عجب بے کسی کا تھا تم ہنس دیئے، یہ وقت بھلا کیا ہنسی کا تھا

مرے دل کے ارمان مرکر نہ نکلے جو دل میں چُبھے تھے وہ نشتر نہ نکلے

حشر کی دھوم سرِ رہگذرِ یار نہ ہو دو قدم آگے اگر فتنۂ رفتار نہ ہو

حنا یہ کہتی ہے لو یے زبان پا کے مجھے جب آپ آئینگے چوریاں لگا کے مجھے

اِس رنگ کے چند اشعار بھی قابل توجہ ہیں۔

گلہ بھی کیا کسی کا تھا کوئی راز کہ آکر رہ گیا میری زباں تک

نہ اُٹھے پردہ جو آپس میں نگاہیں نہ ملیں دل کی دل میں ہی رہے آنکھ اگر چار نہ ہو

کب سے کشتی ہے بھنور میں مری لے موج بلا ڈوب ہی جائے یہ کم بخت اگر پار نہ ہو

میں سنے تم سے جو بتو آنکھ چرائی ہو کبھی حشر کے روز خدا کا مجھے دیدار نہ ہو

ابھی چُپ ہوں محشر میں انشا کروں گا حسینوں کے رازِ نہاں کیسے کیسے

کئی برس ہوئے ریاض مرحوم نے لکھنؤ میں اپنی ایک غزل کے چند شعر اپنی زبان سے سُنائے تھے۔ یہ غزل پُرانی ہے۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے موجودہ زمانے کا حال لکھ رہے تھے خصوصاً مقطع نے تو لذاتِ دنیوی و سرور و نشاط کی بے ثباتی کا نقشہ کھینچ دیا ہے:۔

چمن میں ہم آئے جو چھٹ کر قفس سے مہینوں نشیمن سے باہر نہ نکلے

نشیمن میں گذرنے کئی موسم گل قفس میں جو ٹوٹے تھے وہ پر نہ نکلے
بٹھایا ریاض اس طرح ضعف دل نے بہار آئی ہم گھر سے باہر نہ نکلے

مہاراجہ صاحب محمود آباد کے مرنے کے بعد ریاض کا کوئی ایسا سرپرست نہیں رہا تھا جو اُن کی دستگیری کرتا اس لئے وہ اپنی عمر کے آخری دنوں میں قریب قریب گوشہ نشین ہو گئے تھے اور جہاں تک مجھے علم ہے امتداد زمانہ نے اُن کو اپنا مجموعۂ کلام تک شائع کرنے کی مہلت نہیں دی۔ اُن کے مخصوص رنگ خمریات میں بیشمار اشعار ہیں لیکن ہم اُس میں سے چند اشعار کا انتخاب درج کر کے اس مضمون کو ختم کرتے ہیں۔ خدا کرے ریاض کا مجموعۂ کلام جلد شائع ہو جائے اور یہ منتشر سرمایہ یکجا جمع ہو کر لازوال دولت بن جائے۔

دست قدرت اس طرح اک رند نے پھیرا ریاض بیٹھکر یاد خدا میں جھومتا جاتا رہا

ہوش کس کس کو کون روکے جام سے ساقیا لے ہم چلے ساغر گرا

ہمیں تو جیتے جی کوثر کی پلوا خدایا چھوڑ دی ہے تیرے ڈر سے

یہ ساقی نے ساغر میں کیا چیز دیدی کہ توبہ ہوئی پانی پانی ہماری

شیخ نے مانگی ہے اپنی عمر کی میکدہ سے اب پرانی جائے گی
پینے آتے ہیں فرشتے خود ریاض حور کے دامن میں چھانی جائے گی

مے خانہ میں جب مسجد جامع سے ریاض ساتھ ہی آپ کے قبلہ سے گھٹا بھی آئی

اُٹھے کبھی گھبرا کے تو میخانہ کو ہو آئے پی آئے تو پھر بیٹھ رہے یاد خدا میں
دل نہ مانا حضرت واعظ کو آتا دیکھکر کچھ یوں ہی تھوڑی سی پی لی دل لگی کے واسطے

دیدے دیدے مجھے ساقی تیرے صدقے دیدے دست رنگیں سے چھلکتے ہوئے پیمانہ سے

عالمِ نسواں

۱۱۔ اگست کو مدراس میں مسز سروجنی نیڈو نے انڈین ویمنس ایسوسی ایشن کے ایڈریس کا جواب دیتے ہوئے جو الفاظ ارشاد فرمائے وہ اس قابل ہیں کہ ہندوستانی خاتونیں سنہرے حروف میں لکھکر لوحِ دل پر نقش کریں۔ آپ نے فرمایا: "ہر خاتون کو سختی کے ساتھ گریبان میں منہ ڈالکر دیکھنا اور سوچنا چاہیئے کہ میں نے فرقۂ نسواں، ترقیِ وطن اور ترقیِ عالم کے لئے کون سی خدمات انجام دی ہیں۔ مختلف سماجی قیود اور معاشی حدود کی آڑ لینا فضول ہے۔ بلکہ جرأت کے ساتھ خدمتِ وطن کے میدان میں قدم بڑھانا چاہیئے" آپ نے سودیشی کی تشریح کرتے ہوئے فرمایا کہ سودیشی تحریک کے معنی صرف کھدر پہن لینا نہیں ہیں بلکہ اس کا اصلی منشا یہ ہے کہ ملک کی تمام تباہ شدہ گھریلو صنعتوں اور حرفتوں، دستکاریوں، ہنرمندیوں بلکہ ادبیات موسیقی اور تعمیرات کو بھی ترقی دیجائے۔

ملک مصر کے پایہ تخت قاہرہ میں ہوابازی کا ایک بین الاقوامی مقابلہ ہوا جس میں ایک فرانسیسی خاتون اول آئی، یہ مقابلہ صحرائے مصر وافریقہ کے نخلستانوں کا چکر تھا۔ دوسرے مقابلہ میں جسمیں قاہرہ سے اسکندریہ تک پرواز شامل تھی جرمن، فرانسیسی، انگریزی اور مصری ہوابازوں نے حصہ لیا مگر اس میں ایک مصری لڑکی لطیفہ خانم اول آئی، جسے بین الاقوامی پرواز کانفرنس طہران نے ڈھائی سو پونڈ اور اخبار "شرکت طہران" نے سو پونڈ بطور انعام دیئے۔ لطیفہ خانم کی کامیابی کو اہل مصر اپنے وطن کے لئے ایک فال نیک سمجھتے ہیں۔ لطیفہ خانم کو انگلستان کی نامور ہواباز لیڈی ایمی جانسن سے مقابلہ کرنے کا خیال ہے اور مصر کے محب وطن اور اہل ثروت حضرات لطیفہ خانم کو ہوائی جہاز نذر کرنیکا ارادہ رکھتے ہیں۔

مشہور ہندوستانی انقلاب پسند مسٹر شیام جی ورما کی اہلیہ محترمہ نے جو حال میں بحالت جلاوطنی یوروپ میں فوت ہوئی ہیں ایک وصیت نامہ کی رو سے تیس لاکھ روپیہ کی رقم ہندوستانیوں کو یورپ میں تعلیم دلانے کی غرض سے وقف کی ہے۔ اس ٹرسٹ کا انتظام کارکنان پیرس یونیورسٹی کے سپرد کیا گیا ہے اور اس ٹرسٹ سے ہندوستانی عورتوں کو بھی وظیفے دیے جائیں گے۔

بردوان کی نامور لیڈی خاتون بی بی نے کلکتہ یونیورسٹی کو سات سو روپیہ یونیورسٹی مذکور کے امتحان عربی میں سب سے زیادہ نمبر لانے والی لڑکی کو انعام دینے کی غرض سے دیا ہے۔ جس سال عربی کے امتحان میں کوئی لڑکی شریک نہ ہو اس سال یہ انعام فارسی میں سب سے زیادہ نمبر پانیوالی لڑکی کو دیا جائے گا انعام کا نام "مرحبا پرائز" رکھا گیا ہے اور اس میں مذہب اور قومیت کی کوئی قید نہیں ہے۔

ڈاکٹر گوری ناتھ سول سرجن غازیپور کی اہلیہ محترمہ منتوبی بی نے سارسوت کھتری پاٹ شالہ الہ آباد کو چوراسی روپیہ سالانہ مستحق طلبا کو وظائف دینے کے لئے عطا کیا ہے۔

لوکل گورنمنٹ نے مسز گنگا رانی مشرا ان سابق مسٹرس کٹرہ اینگلو ورنیکولر گرلس اسکول الہ آباد کو یکم جولائی سے آئندہ چار سال کے لئے تیس روپیہ ماہوار کا وظیفہ کراسویٹ گرلس انٹرمیڈیٹ کالج الہ آباد میں مزید تعلیم حاصل کرنے کے لئے عطا فرمایا ہے۔

مسٹر راجچندر راؤ ڈکشت کی اہلیہ محترمہ شریمتی جانکی بائی ڈکشت بلاسپور جیل کی غیر سرکاری وزیٹر مقرر ہوئی ہیں۔

مسز جے. شری بنشد رانجی رجسٹرڈ گریجویٹوں کی طرف سے بمبئی یونیورسٹی میں سینیٹ کی ممبر منتخب ہوئی ہیں

رائے صاحب کوشل کشور صاحب رجسٹرار ڈپارٹمنٹل امتحانات صوبہ متحدہ کی صاحبزادی کو صوبہ کا امتحان انٹرمیڈیٹ اعزاز کے ساتھ پاس کرنے کے صلہ میں تیس روپیہ ماہوار کا گورنمنٹ اسکالرشپ ملا ہے۔

امسال مہادیالہ انٹرمیڈیٹ کالج لکھنؤ سے آٹھ لڑکیاں ہائی اسکول امتحان میں شریک ہوئی تھیں جن میں سے چھ لڑکیاں اول درجے میں اور ایک سکنڈ ڈویژن میں پاس ہوئی۔ مگر سب لڑکیوں کو سنسکرت میں اعزازی نمبر حاصل ہوئے ہیں۔ ایک لڑکی نے سنسکرت اور ریاضی دونوں میں اعزاز حاصل کیا۔

برسات اور ساقی

(از حضرت جوش ملیح آبادی)

اُٹھ کہ پھر صحنِ چمن باغِ جناں ہے ساقی — دُور تک سلسلۂ ابر رواں ہے ساقی
کنج میں مرغِ چمن زاد ہے سرگرمِ نوا — باغ میں بادِ صبا عطر فشاں ہے ساقی
آج خاشاک کے لب پر بھی ہیں شیریں نغمے — آج ذرات کے منہ میں بھی زباں ہے ساقی
شاخساروں پہ ہیں مرغانِ چمن گرمِ خروش — آسمانوں پہ گھٹا نعرہ زناں ہے ساقی
اس ترنم میں ازل ہے نہ ابد اے ہمراز — اس تلاطم میں زماں ہے نہ مکاں ہے ساقی
اس برستے ہوئے موسم کی ہر اک ساعتِ کیف — شبِ آئینۂ ماہِ رمضاں ہے ساقی
خار بدمست ہیں، گل وجد میں، کلیاں سرشار — آج گلشن میں قیامت کا سماں ہے ساقی
بزم پر وادیِ ایمن کا گماں ہوتا ہے — آج وہ نور سرِ رطلِ گراں ہے ساقی
جام دے جام، کہ ہر قطرۂ صہبائے کہن — مُصلحِ نسخۂ اجزائے جہاں ہے ساقی
کیفِ صہبا سے اُمنگوں کو جگا دے تو بھی — فیضِ باراں سے ہر اک ذرہ جواں ہے ساقی
چہرۂ خاک کی رنگینی و شوخی کی طرف — عالمِ پاک پہ حسرت نگراں ہے ساقی
آج جی بھر کے پلا باغ میں پھیلی ہوئی آگ — کوہساروں پہ گھٹاؤں کا دھواں ہے ساقی
نشہ جس طرح مچلتا ہے رگِ صہبا میں — سینۂ ابر میں یوں برق تپاں ہے ساقی
شیخ کو کون یہ سمجھائے کہ گلرنگ شراب — مایۂ تربیتِ روحِ رواں ہے ساقی
ان کی خلقت نہیں حورانِ بہشتی کے لئے — یہ تو زہاد کی شکلوں سے عیاں ہے ساقی
ہاں پلا آتشِ سیالؔ کہ جس کی ہر بوند — شمعِ محرابِ جہانِ گزراں ہے ساقی
پائے جاناں پہ کروں کیوں نہ پیا پے سجدے — شورِ قلقل مجھے گل بانگِ اذاں ہے ساقی
غمِ ایام پہ دم بھر کے لئے غور کریں — اتنی فرصت ترے مستوں کو کہاں ہے ساقی

؎ یہ نظم زمانہ اور ہمارے معزز معاصر سرفراز دونوں کو مرحمت ہوئی ہے۔

بے خطر ہو کے پلا مے، کہ حقیقت میں قضا ‎ ‎ بزدلوں کا فقط اک وہم و گماں ہے ساقی
کھول نغموں سے درِ رمز و اشارات کہ آج ‎ ‎ سترِ خوباں بہ حدیثِ دگراں ہے ساقی
روک رندوں کو نہ تا دیر کہ یہ دورِ بہار ‎ ‎ موسمِ بندگیٔ لالہ رخاں ہے ساقی
نرمی و لطف سے لے کام کہ دل کے ہاتھوں ‎ ‎ زندگی کارگہِ شیشہ گراں ہے ساقی
کیوں سنوں زمزمۂ مدعیانِ عرفاں ‎ ‎ بادۂ خود کاشفِ اسرارِ نہاں ہے ساقی
اِن لچکتی ہوئی شاخوں کے خنک سایے میں ‎ ‎ مے کی اک بوند متاعِ دو جہاں ہے ساقی
آ، کہ یہ وقت ہے اِک شمعِ سرِ جادۂ باد ‎ ‎ اُٹھ، کہ یہ عمرِ رواں آبِ رواں ہے ساقی
تجھ سے ممکن ہو تو اس درد کا درماں کر دے ‎ ‎ زندگی کو مرضِ سود و زیاں ہے ساقی

جوشؔ کی بحثِ صدارت میں پس و پیش کر
جوشؔ تو قبلۂ رندانِ جہاں ہے ساقی

کمندِ عشق

(از حضرت جوشؔ ملیح آبادی)

واقف بھی ہے کہ حلقۂ حسن و جمال میں ‎ ‎ ہمراز! مرتبہ ہے مرا کس قدر بلند؟
ہر گل پکارتا ہے کہ ہاں میں ہوں عندلیب ‎ ‎ ہر ناز کہہ رہا ہے کہ میں ہوں نیاز مند
ہر سبزہ بچھ رہا ہے کہ پامال کیجئے ‎ ‎ ہر غنچہ ملتجی ہے کہ ہو مجھ سے بہرہ مند
شانہ تھا کون جس پہ نہ زلفیں بکھر گئیں ‎ ‎ میرے غرورِ عشق نے پھینکی جدھر کمند
جلووں نے ہر قدم پہ رکاب آ کے چوم لی ‎ ‎ میری نگاہِ شوق نے موڑا جدھر سمند
آخر حدودِ حلقہ بگوشی میں آ گیا ‎ ‎ جس ناز کو نیاز نے میرے کیا پسند
افراطِ شوق سے نگراں ہر مری طرف ‎ ‎ کتنے رخوں کی چاندنی کتنے لبوں کا قند
اللہ ری میری کبر شکن خاکساریاں ‎ ‎ سو بار سرنگوں ہوئے خوبانِ سربلند

آنہا کہ آہوانِ حرم را کنند صید
در آرزوئے ناوکِ صید افگنِ من اند ‎ (عرفی)

پریت کی دنیا

(از جناب محمود اسرائیلی)

پریت کی دنیا کوئی نہ دیکھے

یہ دنیا سنسان
پریت کی دنیا کوئی نہ دیکھے
بھیانک اس کے پھیر اور مُردوں کے ڈھیر
ہر نگری اندھیر ہر کُٹیا ویران
یہ دنیا سُنسان
پریت کی دنیا کوئی نہ دیکھے
پریت کی دنیا کوئی نہ دیکھے
گیان نہ جانے سنگ اس کے انوکھے رنگ
من موہنے کے ڈھنگ جو دیکھو حیران!
یہ دنیا سنسان
پریت کی دنیا کوئی نہ دیکھے
پریت کی دنیا کوئی نہ دیکھے
من ہی من کی مانگ آنکھ مچیلی نانگ
سب بھرتی ہیں سوانگ کیسے نیچے انسان
یہ دنیا سُنسان
پریت کی دنیا کوئی نہ دیکھے
پریت کی دنیا کوئی نہ دیکھے
چھل کا یہاں بیوپار ناؤ گرے منجدھار

اور دے امرت مار　　گیانی بنے انجان

یہ دنیا سنسان

پریت کی دنیا کوئی نہ دیکھے

پریت کی دنیا کوئی نہ دیکھے

آہ چل دیئے بیر　　اس دنیا میں تیر

ہوگیا گھائل ہیر　　کیسے بچاتا جان؟

یہ دنیا سنسان

پریت کی دنیا کوئی نہ دیکھے

پریت کی دنیا کوئی نہ دیکھے

پریت رُلائے نین　　پریت چھڑائے چین

پریت جگائے رین　　تو مت کر ارمان

کہنا میرا مان

پریت کی دنیا کوئی نہ دیکھے

یہ دنیا سنسان

رباعیات

(از جناب جی۔ این۔ فرحت کانپوری، بی۔ اے ایل ایل۔ بی)

رسوا آیا ہوں، خوار آیا ہوں　　سامنے تیرے شرمسار آیا ہوں

اپنی رحمت کی لاج رکھ لے مالک　　ہرچند کہ میں گنہگار آیا ہوں

ماہ و خورشید اور ثریا دیکھو　　دنیا دیکھو، نظامِ دنیا دیکھو

فطرت ہے بسیط اور خالق پنہاں　　دریا بہ حباب، یہ تماشا دیکھو

دورِ حاضر

(از حضرت محشر لکھنوی)

دورِ حاضر میں ہیں ہر قسم کے انساں بدنام
برہمن دَیر میں کعبے میں مسلماں بدنام

اُف ری بے ربطیٔ الفاظ و معانی توبہ
ایک اک نکتے پہ ہے کلکِ سخنداں بدنام

ٹانکے ٹانکے پہ ہوا ہاتھ کی لغزش کا ثبوت
ہوگیا بخیہ گرِ چاکِ گریباں بدنام

ہوش آنا تھا نہ آیا کسی دیوانے کو
ہوگئی نکہتِ گیسوئے پریشاں بدنام

سحر کی اُڑ گئی تاثیر دعاؤں کا اثر
کفر بدنام ہوا ہوگیا ایماں بدنام

قول اور فعل میں کیا کیا نہ رقابت نکلی
بوریئے پر ہے گدا تخت پہ سلطاں بدنام

پاؤں رکھنا بھی رہِ شوق میں سیکھا نہ کبھی
کردیا کوچۂ محبوب کا درباں بدنام

دستِ دامن کش و جذباتِ دلی کا کیا ذکر
چند بازاریوں میں ہے مہِ کنعاں بدنام

کاوشِ برقِ تجلّی کو نہ سمجھا کوئی
غش کے پردے میں ہوئے موسیٰ عمراں بدنام

فلسفہ داں ہی اگر جہلِ مرکب نکلیں
وید کیونکر نہ ہو اور کیوں نہ ہو قرآں بدنام

ہاتھ میں زور نہیں بنکے سپاہی نکلے
مفت میں ہو رہی ہے تیغِ صفاہاں بدنام

باغباں بنکے کھلے پھول کترنے آئے
نکلے جس وقت کیا نام گلستاں بدنام

زینتِ صدر ہوئے بزمِ سخن میں وہ ادیب
کہ ہوا جن کے کمالات سے سحباں بدنام

چاشنی زخمِ محبت کی مٹا دی دل سے
ہوگیا خلوت و جلوت میں نمکداں بدنام

ادعا علم کا اور عقل فلاطونی کا
لطف یہ کر رہے ہیں قدرتِ یزداں بدنام

ادعا عقل کا اور عقل سے دنیا طلبی
ہو رہا ہے سببِ خلقتِ انساں بدنام

وحشتِ عقل یہ ہے قوتِ ادراک نہیں
ایک مجنوں کے لئے سارا دبستاں بدنام

سمجھے اسرارِ محبت نہ زمانے والے
قیس بدنام جنوں خیز بیاباں بدنام

خود ہی دامن کو سمیٹا نہ دمِ سیرِ چمن
کانٹوں کے ساتھ کیا ہے گلِ خنداں بدنام

خون کے آنسوؤں کا تجزیہ جب کر نہ سکے — چشمِ غم کا یہ کیا کارِ نمایاں بدنام
ہر نفس خمکدۂ دہر سے آتی ہے صدا — یاد رکھے تو نہ ہوتا حدِ امکاں بدنام
دفترِ موعظہ ہے قلقلِ مینا محشر — سمجھے معنے تو نہ ہو محفلِ رنداں بدنام

مے کہ بدنام کند اہلِ خرد را غلط است
بلکہ مے می شود از صحبتِ ناداں بدنام

تمنا

حضرت باسط بسوانی

وحشت میں کروں چاک جو دامانِ تمنا — منہ دیکھ کے رہ جائے گریبانِ تمنا
خونِ جگر و دل سے بڑھی شانِ تمنا — کس رنگ پہ ہے گوشۂ دامانِ تمنا
دل اس لئے ہے اور بھی قربانِ تمنا — تم روحِ تمنا ہو، تمھیں جانِ تمنا
کیا پوچھتے ہو اس دلِ مجروح کی حالت — کہتے ہیں اسے زخمیِ پیکانِ تمنا
یوں دل پہ پڑیں تیری لگاوٹ کی نگاہیں — ہو روحِ تمنا تو کوئی جانِ تمنا
مُردہ ہوا ناکامیِ جاوید سے آخر — وہ دل جسے ہم جانتے ہیں جانِ تمنا
پھر دل کو بڑھاتی ہیں لگاوٹ کی نگاہیں — پھر دیکھئے پیدا ہوئے سامانِ تمنا
نکلے نہ ہمارے دلِ ناکام سے ہرگز — اے اہلِ تمنا ہے یہی شانِ تمنا
آسان جو ہو منزلِ دشوارِ محبت — دشوار نہ ہو منزلِ آسانِ تمنا
پھر اُلجھے گا کانٹوں سے مرا دامنِ صد چاک — مقصود ہے پھر سیرِ گلستانِ تمنا
طے کر چکے ہم منزلِ ہستی و عدم کو — باقی ہے ابھی وسعتِ میدانِ تمنا

گو یاس سے باسطؔ میں رہا سر بگریباں
چھوٹا نہ مگر ہاتھ سے دامانِ تمنا

علمی خبریں اور نوٹ

۳۰ جولائی کو اُردو کے مستند استاد اور زمانۂ حال کے مایۂ ناز شاعر حضرت ریاضؔ بھی ہمیشہ کے لئے آغوش قبر میں سو گئے۔ معاصرین نے آپ کو "خیام الہند" کا خطاب دے رکھا تھا، اور کوئی شک نہیں کہ اُردو شاعروں میں حسن و عشق کے نظریہ کے اعتبار، رندانہ نقطۂ نظر کے لحاظ، اور کلام کی سرمستی اور مسرت انگیزی کے خیال سے دور حاضر کا کوئی شاعر اس خطاب کا مستحق ہو سکتا تھا تو یہ اعزاز حضرت ریاضؔ ہی کا حصہ تھا۔ واقعی ان کے دماغ کی تربیت اور قلب و جگر کی تعمیر اس خمیر سے ہوئی تھی جو بقول مولانا سبحان اللہ صاحب عالم کو مسرت دائمی کا پیغام دیکر اس خاکدان عالم کو بہجت ازلی سے روشن اور منور کر دیتا ہے۔ زبان کی پاکیزگی، بیان کی شوخی، جذبات کی لگاوٹ، دنیا اور ما فیہا کو فراموش کر دینے والی سرمستی کے لحاظ سے آپ کا کلام آپ ہی اپنی نظیر تھا۔ اس طرز خاص میں آپ یگانۂ روزگار تھے۔ آپ کا فلسفۂ شاعری ترک دنیا یا ترک لذات نہ تھا۔ آپکی نگاہ میں دنیا لطف و خوشی کی جگہ تھی۔ آپ کے نزدیک اسکی نیرنگیاں اور پیچیدگیاں ایک سرمدی سرور کی کیفیت رکھتی تھیں۔ آپ کے اشعار میں صہبائے روح پرور کا سا نشہ ہے۔ لیکن آپکے لذات دنیا کے قائل ہونے اور عیش و طرب میں حصہ لینے کے باوجود آپ کا قلب دنیوی کدورتوں سے پاک تھا چنانچہ عمر بھر شراب معانی کے متوالے رہے لیکن دخت رز کی صحبت درکنار اُس کی صورت سے بھی نفرت تھی۔ خود فرماتے ہیں:-

ہے ریاضؔ ایک جواں مست خرام نہ پیئے اور جھومتا جائے

وفات کے وقت آپکی اسّی ترسٹھ سال کی عمر تھی، اس پر بھی آپ کی ظرافت پسندی، خوش طبعی اور آزاد منشی بدستور قائم تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ طبیعت کی شوخی کبھی ساتھ ہی نہ چھوڑے گی۔ واقعی یہی حال تھا جیسا کہ آپ کے ایک محب خاص نے لکھا ہے کہ وہ پیرانہ سالی میں بھی اس قدر شوخ تھے کہ متین بننا چاہتے تھے مگر بن نہ سکتے تھے۔ اُن کی آخری عمر کا شعر ہے:-

ریاضؔ اب شکل بھی بدلی، مذاق طبع بھی بدلا یہ سن کا ہے تقاضا جو خیالِ حور آتا ہے

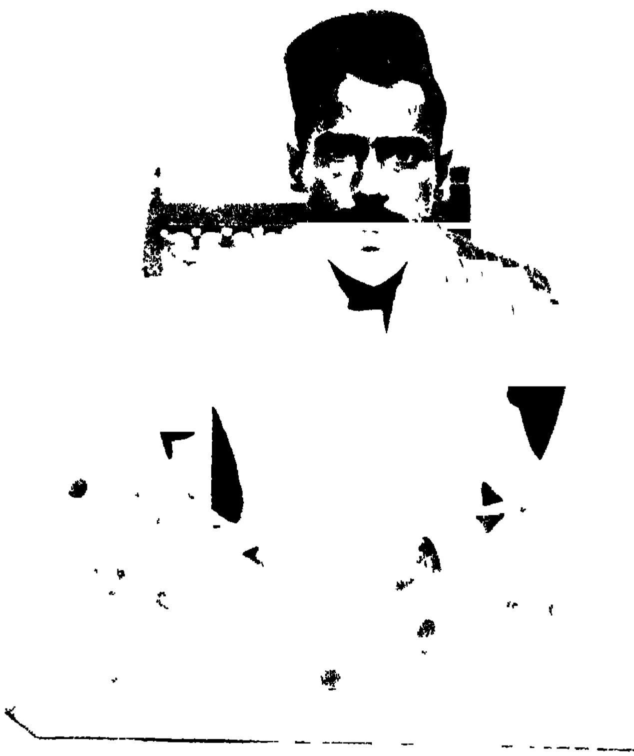
۱۹۳۱ء میں راقم الحروف کو آپ کی خدمت میں خیر آباد حاضر ہونے کا موقعہ ملا تھا۔ دو تین گھنٹے تک لطف صحبت رہا۔ آپ نے جس خلوص و محبت سے اپنا نیا اور پرانا کلام سنایا۔ اپنے شاعری کے پرلطف ابتدائی جوانی کی داستان

شنائی، اور جس حسن اخلاق سے پیش آئے، اُسکی یاد تمام عمر دل سے محو نہ ہوگی۔ افسوس اس کے بعد فرصت کی ملاقات کا پھر کبھی موقعہ ہی نہ ملا۔ مگر اس بات کو خیال کرکے دل میں ایک ٹیس سی پیدا ہوتی ہے کہ ریاض جیسے باکمال شاعر اور اُستاد فن کی بھی اُردو داں طبقے میں قرار واقعی کوئی قدر نہیں ہوئی۔ زمانہ کے کسی پچھلے نمبر میں ہم نے شکایت کی تھی کہ ریاض کے دیوان کی اشاعت کا ابھی تک کوئی خاطر خواہ انتظام نہیں ہو سکا، افسوس اس بارے میں ان کی آرزوئیں دل کی دل ہی میں رہیں۔ ریاض کے سر پر خانگی تفکرات کا بار گراں تھا۔ اُن کا سب سے بڑا شاعرانہ کمال یہی ہے کہ روزانہ ترددات اور احباب کی بے مہریوں کے مسلسل صدمات کے باوجود بھی اُن کے دماغ کی تازگی اور دلی جذبات کی خوش آہنگی میں سر مو فرق نہیں آنے پایا طبیعت کی شوخی اور مزاج کی شگفتگی دیکھکر بادی النظر میں خیال بھی نہ آسکتا تھا کہ اس خیام وقت کا دل خانگی تکلیفوں سے چھلنی ہو رہا ہے خدا مرحوم مہاراجہ صاحب محمود آباد کو غریق رحمت کرے جن کی قدر دانی نے ریاض کو اول ضروریات زندگی سے مطمئن کر رکھا تھا۔ مگر اور بہت فکریں لاحق تھیں، مثلاً اولاد کی تعلیم و تربیت، کلام کی اشاعت وغیرہ وغیرہ بہت سی ایسی باتیں تھیں جو اندرونی طور پر سوہانِ روح تھیں۔ آج جب وہ ہمارے درمیان موجود نہیں ہیں اُن کی خوبیوں کی یاد خون کے آنسو رلا رہی ہے۔ لیکن اُردو کے پست حوصلہ اور سست عقیدہ قدر دانوں کی ظاہر پرستی سے امید نہیں کہ ان حالات سے کچھ عبرت حاصل کر سکیں۔

اللہ بس باقی ہوس!

افسوس کہ جون گذشتہ میں ادبِ اُردو کو دو اور نامور اہل قلم کی ناوقت وفات کا صدمہ برداشت کرنا پڑا۔ ۲۔ جون کو دہلی کے مشہور مصنف قاری سرفراز حسین صاحب نے رحلت فرمائی۔ آپ برہما، جاپان اور انگلستان وغیرہ کی بھی سیر و سیاحت کر چکے تھے اور اصلاح معاشرت پر آپ کے کئی ناول مقبولِ عام ہو چکے ہیں۔

آگرہ کے ممتاز ادیب و نقاد سخن سید نظام الدین شاہ دلگیر کے انتقال پُر ملال سے بھی اُردو ادب کو سخت نقصان پہونچا ہے۔ آپ ایک مشہور شاعر و مضمون نگار اور نثر میں ایک طرز خاص کے مالک تھے۔ آپ ہی کے اہتمام سے آگرہ کا رسالہ "نقاد" جاری ہوا تھا جس میں اس طرز خاص کے نمونے برابر شائع ہوتے تھے۔ آپ رسالہ "نگار" کے خاص مضمون نگاروں میں تھے۔ آپ کے اکثر احباب نے آپ کے طرز کی تقلید کی لیکن ملک میں اتنے زیادہ مقبولیت حاصل نہ ہو سکی، تاہم جس جوش اور استقلال سے آپ نے اُردو کی خدمت کی اُس کی یاد عرصے تک قائم رہیگی۔



حضرت سرور جہاں آبادی

زمانہ

جلد ۶۳ | ستمبر سنہ ۱۹۳۴ء | نمبر ۳

سرور جہان آبادی

(از مسٹر جگدیش سہائے سکسینہ، وکیل، شاہجہانپور)

سرور جہان آبادی سنہ ۱۸۷۳ء میں بمقام جہان آباد ضلع پیلی بھیت پیدا ہوئے تھے۔ انھوں نے صرف سینتیس ۳۷ برس کی عمر پائی، لیکن اس قلیل عرصہ میں شعر و سخن کی جو خدمت انھوں نے کی وہ فی الواقع قابل داد ہے۔ سرور فطری شاعر تھے قدرت نے شعر و شاعری کا ملکہ ان کی سرشت میں ودیعت کیا تھا ورنہ ایک قصبہ میں رہکر جہاں تحصیل علم کے واسطے کوئی سہولت نہ تھی اور نہ شاعرانہ صحبتیں میسر ہوسکتی تھیں وہ ہرگز اتنے پُرگو اور کہنہ مشق شاعر نہ بن سکتے۔ ان کی جوانا مرگی نے اُردو شاعری کی بڑی بڑی امیدوں کو جوان کی ذات سے وابستہ تھیں خاک میں ملا دیا۔ اگر یہ عالی دماغ شاعر کوئی دن اور زندہ رہتا تو خدا جانے شعر و سخن میں کیا کیا اعجاز دکھاتا۔ جب ہم ان گلہائے رعنا کا تصور کرتے ہیں جو سرور کے چمن زار شاعری میں کھلنے والے تھے تو ان کی بے وقت موت کا واقعہ ایک عظیم ادبی نقصان کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ اس لحاظ سے ان کا اُردو شعرا میں وہی رتبہ ہے جو کیٹس کا انگلستان کے شاعروں میں ہے۔

سرور نے اپنی شاعری کی بنیاد آزاد اور حالی کے داغ بیل پر قائم کی اور جدید طرز کی شاعری کو پایۂ کمال تک پہونچایا۔

پیشتر اس کے کہ اُن کے کلام پر تبصرہ کیا جائے یہ جاننا ضروری ہے کہ جدید طرز کی شاعری کیا ہے۔ اُردو زبان نے چونکہ فارسی کی گود میں نشو و نما پائی لہذا اُردو شاعری نے بھی فارسی طرز سخن کا چربہ اُتارا

فارسی کی تشبیہ واستعارے، اسالیب بیان۔ اصنافِ سخن، تلمیحات وتصرفات اُردو شاعری میں بھی داخل ہوگئے اور خیالات کا رنگ بھی پارسی ہوگیا قدمائے ہند نے غزل میں عموماً حسن وعشق کے رموز ونکات اور عاشق ومعشوق کے راز و نیاز بیان کئے۔ چونکہ اس قسم کے خیالات محدود تھے لہذا بہت جلد ان کا سلسلہ ختم ہوگیا، اور متاخرین کے لئے بقول مولانا حالی صرف نچوڑی ہڈیاں باقی رہ گئیں، ناچار انھوں نے حسن وعشق کے فرسودہ مضامین الٹ پھیر کر باندھنا شروع کئے۔ تشبیہ واستعارے کی بھرمار سے کلام میں زور پیدا کیا اور زبان کی صفائی وشستگی اور بندش الفاظ پر زیادہ توجہ مبذول کی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ شاعری محض لفاظی ہوکر رہ گئی اور حقیقت مجاز کے پردے میں پوشیدہ ہوگئی۔ بہاریہ قصیدوں میں مناظرِ قدرت کی مرقع کشی کی جاتی تھی لیکن تشبیہ واستعارے کی رنگ آمیزی وہاں بھی حقیقت کو دبا دیتی تھی۔ مثنوی کا بھی کم وبیش یہی حال تھا البتہ مرثیہ کی صنف ان عیوب سے پاک تھی۔ لیکن اول تو شعراء کا رجحان اس طرف کم تھا، دوسرے اس قسم کی شاعری زمانۂ حال کے مذاق کے مطابق نہ تھی۔ قومی یا ملکی جذبات کو اس میں کچھ دخل نہ تھا۔

غدر ۱۸۵۷ء کے بعد اُردو شاعری میں ایک زبردست انقلاب رونما ہوا۔ دولت برطانیہ کا اقتدار ہندوستان میں ازسرنو قائم ہوا اور اس کی بنیا د روز بروز مستحکم ہوتی گئی۔ اہل ہند نے بھی روشِ زمانہ کے مطابق بادشاہِ وقت کی زبان سیکھی اور اہل انگلستان کی طرز معاشرت۔ تمدن۔ قومی اور ملکی خیالات اور ان کی خصوصیاتِ شاعری سے آگاہ ہوئے۔ اس وقت ان کو معلوم ہوا کہ اول تو مضامین حسن وعشق کی بساط گوناگوں انسانی جذبات ومحسوسات کے وسیع میدان کے سامنے نہایت تنگ ہے دوسرے ان سے وہی طبائع لطف اندوز ہوسکتی ہیں جو عشق وعاشقی سے لذت آشنا ہوں۔ ان پر یہ بھی روشن ہوگیا کہ تشبیہ واستعارے کی بھرمار حقیقت کو دبا کر نیچرل شاعری کا خون کردیتی ہے اور شاعر کا فرض محض حسن وعشق کے رموز ونکات بیان کرنا نہیں ہے بلکہ قوم وملک کی خدمت کرنا ہے۔

اُردو شعرا میں سب سے پہلے آزاد اور حالی ان نئے خیالات سے متاثر ہوئے۔ انھوں نے اُردو شاعری کی کایا پلٹ کردی، حُسن وعشق کے فرسودہ مضامین ترک کردیئے۔ مناظر قدرت اور انسانی جذبات ومحسوسات کی سچی تصویریں نظم میں کھینچیں، اور شاعری کو ارتقائے قوم وملک کا آلہ بنایا۔ لیکن یہ تبدیلی صرف خیالات کی دنیا میں ہوئی، طرز اور اسالیب بیان میں کوئی فرق واقع نہیں ہوا، البتہ ہندی الفاظ بمقابلہ پیشتر کے زیادہ استعمال ہونے لگے۔ اس انقلاب کے بعد اردو شاعری نے جو صورت اختیار کی اس کو ہم جدید شاعری کے نام سے تعبیر کرتے ہیں۔

سرور جدید شاعری کے لئے ہر طرح سے موزوں تھے، اُردو اور فارسی میں ان کو دستگاہ کامل اور اساتذہ کے کلام پر کافی عبور حاصل تھا۔ انگریزی زبان سے بھی خاصی واقفیت تھی۔ شعرائے انگلستان کے کلام کو اچھی طرح سمجھ سکتے تھے اور اُس سے لطف اندوز ہو سکتے تھے۔ مولانا آزاد پرانے رنگ کی شاعری کا تخلیہ کرتے ہوئے آبحیات میں فرماتے ہیں:۔

"ارباب زمانہ نے متفق اللفظ کہدیا کہ اُردو نظم مضامین عاشقانہ ہی کہہ سکتی ہے، اسے ہر ایک مضمون کے ادا کرنے کی طاقت و لیاقت بالکل نہیں، اور یہ ایک بڑا داغ ہے جو ہماری قومی زبان کے دامن پر لگا ہے، سوچتا ہوں اسے کون دھوئے اور کیونکر دھوئے۔ ہاں یہ کام ہمارے نوجوانوں کا ہے جو کشور علم میں مشرقی اور مغربی دریاؤں کے کناروں پر قابض ہو گئے ہیں۔ ان کی ہمت آبیاری کرے گی، دونوں کناروں سے پانی لاوئیگی اور اس داغ کو نہ فقط دھوئے گی بلکہ قوم کے دامن کو موتیوں سے بھر دے گی۔"

سرور نے صاحب آبحیات کی پیشین گوئی کو حرف بحرف سچ کر دکھایا، اُنھوں نے ہر قسم کے جدید خیالات موجودہ قیود زبان و بیان کو مدنظر رکھتے ہوئے نہایت صاف اور شستہ زبان میں ادا کئے ہیں اور پُرانے خیالات میں بھی جدید مذاق کا رنگ بھر کر ان کو دلکش بنا دیا ہے۔ واقعہ نگاری جو انگریزی شاعری کی قابل قدر خصوصیت ہے سرور کے کلام میں بدرجۂ اتم موجود ہے۔ انھوں نے جس موضوع کو لیا ہے اُس کے سارے جزئیات نہایت کاوش سے بیان کئے ہیں، اسی لئے اُن کی نظموں میں خیالات کا سلسلہ اکثر طولانی ہو جاتا ہے۔

آزاد اور حالی چونکہ اپنی عمر کے آخری حصوں میں جدید شاعری کی طرف مائل ہوئے تھے اس لئے اس کی خدمت کما حقہ نہ کر سکے۔ سرور نے سب سے پہلا کام جدید شاعری کی ترقی کے لئے یہ کیا کہ بہت سے انگریزی مضامین نظم و نثر کے ترجمے اُردو نظم میں کئے۔ اس سے کئی فائدے ہوئے مناظر قدرت کی مرقع کشی اور واقعہ نگاری جو انگریزی شاعری کی دو بڑی خصوصیات ہیں بذریعہ تراجم اُردو شاعری میں بھی داخل ہو گئیں اور شعرائے انگلستان کے مخصوص خیالات اور احساسات نے ہمارے جذبات میں شامل ہو کر اس یکرنگی کو دور کر دیا جو ہماری شاعری کو بے لطف بنا رہی تھی۔ نیز ایک نئی صنف کا اُردو شاعری میں اضافہ ہو گیا۔ اور طائر خیال کی بلند پروازی کے لئے نئی رفعت پیدا ہو گئی۔

غیر زبان کی نظموں کا ترجمہ اپنی زبان میں کرنا نہایت مشکل ہے۔ خصوصاً ایسی صورت میں جبکہ دونوں زبانیں وسعت میں ہمپایہ نہ ہوں اور ان کی طرز ادا اور ترکیب الفاظ میں زمین و آسمان کا

فرق ہو۔ اُردو زبان چونکہ محدود ہے لہذا لفظی ترجموں میں زبان وبیان کا لطف قائم رکھنا امر محال ہے۔ تاہم سرور نے اس بات کی کوشش کی ہے کہ زبان وبیان کی خوبیوں کے ہوتے ہوئے نقل بھی مطابق اصل کے ہو اور اس میں وہ بہت کچھ کامیاب ہوئے جس سے اُن کی قادر الکلامی کا ثبوت ملتا ہے۔ شعرائے انگلستان کے مخصوص خیالات انھوں نے اس خوش اسلوبی سے نظم کئے ہیں کہ ان میں قطعی اجنبیت نہیں پائی جاتی۔ یہی معلوم ہوتا ہے کہ مغربی شراب مشرقی شیشوں میں جھلک رہی ہے۔ سرور کے مطبوعہ کلام کا تقریباً ¼ حصہ غیر زبانوں کے مضامین نظم ونثر کے ترجموں پر مشتمل ہے کسی اور اُردو شاعر نے غالباً اس کثرت کے ساتھ ترجمے نہیں کئے، جس کے دو وجوہ ہیں اول یہ کہ ترجمہ کرنا آسان کام نہیں، دوسرے شاعر کی خودداری اس بات کو گوارا نہیں کرتی کہ دوسرے کے خیالات نظم کئے جائیں۔ بہ حال جدید طرز کی شاعری میں قابل قدر اضافہ کرنے کے لئے یہ صنف نہایت ضروری تھی جو سرور کی سرپرستی میں منتہائے کمال کو پہونچی۔ ذیل میں ہم ان کے تراجم کے جستہ جستہ اشعار نقل کرتے ہیں جو روانی، حسن بندش اور زبان کی صفائی وشستگی کے لحاظ سے قابل داد ہیں

فلک اخضری

تری شراب سے پرہیزگار ہوں ساقی — کہ مست بادۂ جوشِ بہار ہوں ساقی
وہ رند ہوں کہ خُمِ آسماں ہے جام مرا — بلند واعظ وصوفی سے ہے مقام مرا
ایاغ ساقیِ گردوں جو میرا بھرتا ہے — دماغ عالمِ بالا کی سیر کرتا ہے
ہوں مست نشۂ جامِ مظاہرِ قدرت — غضب کے ہوش ربا ہیں مناظرِ قدرت
پہاڑیوں کی فضائیں ہیں خوشگوار عجب — رواں ہیں کوہ کے دامن میں آبشار عجب
یہ دلفریب مقامات چل دکھا لاؤں — پہاڑیوں کی ہوائے خنک کھلا لاؤں

(نابینا پھول والی)

تصویر خانہ ہے تمھیں تو گو فضائے دہر — اور میں غریب اندھی ہوں ناآشنائے دہر
ظلمت کدہ ہے محفل دنیا مرے لئے — تاریک ہے یہ بزم تماشا مرے لئے
سائے ہیں خوب وزشت گذرتے قریب سے — پنہاں مگر ہیں دیدۂ حسرت نصیب سے
میرا بجز صداؤں کے ہمراز کون ہے — ظلمت کدے میں مونس ودمساز کون ہے

موسم سرما کا آخری گلاب

اس نظم میں سرور نے مصرعوں کی ترتیب بھی انگریزی طرز کے مطابق رکھی ہے۔

یہ آخری گلاب کا ہے یادگار پھول	اور شاخ پر کھلا ہوا تنہا چمن میں ہے
بیکس غریب فرقتِ احباب میں ملول	دھندلا سا اک چراغ سحر انجمن میں ہے

جب اُٹھ گئے جہان سے یارانِ زندہ دل	جی کر غمِ فراق کے صدمے سہیگا کون؟
کڑیاں تری اُٹھانے کو لے دردِ جاں گسل	اس غمکدے میں آہ اکیلا رہیگا کون؟

شاعری بلحاظ اپنی اثر انگیزی کے مصوری، موسیقی اور دیگر علوم و فنون پر فوقیت رکھتی ہے مردہ دلوں میں نئی روح پھونکنا، جذبات کو بھڑکانا اور ان کی اصلاح کرنا اس کے ادنیٰ کرشمے ہیں، قوم و ملک کی اصلاح اور بہبودی کے لئے اگر اس نادر آلہ سے کام نہ لیا جائے تو افسوس کا مقام ہے۔ شاعر کا فرض منصبی یہ ہے کہ قوم و ملک کی خدمت کرے، چنانچہ جدید طرز کی شاعری میں قومی اور ملکی شاعری کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ آزاد اور حالی نے اپنی قوم کی اصلاح کے لئے پر زور نظمیں لکھیں لیکن وہ وطن پرستی جو سیاسی نقطۂ نظر سے قابلِ ستایش ہو اُن کے ہاں نہیں پائی جاتی، اگر کچھ ہے تو محض نقش اولین ہے اکبر الہ آبادی نے ملکی شاعری کو ضرور ترقی دی لیکن ظرافت کی رنگ آمیزی نے ان کے کلام کو تاثیر سے محروم رکھا۔ اردو شعرا میں سب سے پہلے سرور نے ہندو مسلمان دونوں کو حب الوطنی کی تعلیم نہایت مُوثر طریقے سے دی۔ اور اس بات کی کوشش کی کہ وہ ایک نیشن بنکر یورپ کی دوسری تہذیب یافتہ قوموں کی برابری کر سکیں۔ ان کے بعد چکبست کا نمبر آتا ہے۔ علامہ اقبال "سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا" کا ترانہ گاکر خاموش ہو گئے۔ انھوں نے قوم کو نیشن پر ترجیح دینا مناسب سمجھا۔ چنانچہ "پیامِ مشرق" میں ایک جگہ فرماتے ہیں:۔

اگرچہ زادۂ ہندم فروغِ چشمِ من است	ز خاکِ پاکِ بخارا و کابل و تبریز

سرور کے ہاں حب الوطنی کا جذبہ اس قدر عام ہے کہ مشکل سے کوئی نظم اس سے خالی ہوگی۔ انھوں نے وطن کے موضوع پر متعدد نظمیں کہیں، مشاہیرِ ملک کی وفات پر جن کی ذات سے ہندوستان کی بڑی بڑی اُمیدیں وابستہ تھیں پر زور مراثی لکھے، لیکن ایسی نظموں میں بھی جن کا وطن سے ظاہر کوئی تعلق نہیں ہوتا حب الوطنی کے جذبات بے اختیار ان کے قلم سے تحریر ہو جاتے تھے۔ نظم "شمعِ انجمن" میں ایک جگہ فرماتے ہیں:۔

پروانوں کا تجھے غم لے شمعِ انجمن ہے	قسمت میں آہ میری دلسوزیٔ وطن ہے

تقسیم بنگال پر جب اہلِ ہند کے مدبروں میں تہلکہ مچ گیا اور لالہ لاجپت رائے مرحوم اپنے آزادانہ اظہار

اے کی پاداش میں جلا وطن کر دیئے گئے، تو سرور نے ایک مسدس شہر آشوب اور کئی پرزور نظمیں لکھیں جن میں سیاسی خیالات کا اظہار کیا گیا ہے کچھ اشعار اس قبیل کے ملاحظہ ہوں:-

نہ ڈھنگ کر مرے صیاد اختیار نیا — کہاں سے لائے گا ہر روز اک شکار نیا

چمن میں گیت انھیں آزادیوں کے گانے دے — وطن کے پھولوں پہ صیاد چہچہانے دے

وطن کی جو عظمت اور وقعت سرور کے دل میں راسخ تھی اس کا اندازہ ذیل کے اشعار سے ہوگا۔

(خاکِ ہند)

تیرے کنجوں میں ترنم ریز تھے مرغان قدس — تیرے ویرانے میں بھی خاک وطن تھی شان قدس

جب نہ تھی یونان میں علم و ہنر کی روشنی — جلوہ افروز خرد تھی تیرے گھر کی روشنی

لو رہا تھا پر جسم مجھا جی اکبر ہیں — رزمگہ میں جو نفشاں رانا کا تھا خنجر ہیں

کھینچ کر جو لایا گھر سے تاج کو ترا — لے اوڑا یونان سے سودا سکندر کو ترا

اٹھ رہی تیرے شعلۂ سوز محبت کی تپش — تیرے پروانوں کے دل میں تھی قیامت کی تپش

حالانکہ سرور کا رجحان حب الوطنی کی طرف زیادہ تھا لیکن انھوں نے اپنی قوم کو جس کے گہوارہ میں اُن کی پرورش ہوئی تھی کسی حال میں فراموش نہیں کیا۔ انگریزی طرز معاشرت کی پیروی نے ہندوؤں کے مذہبی وقار کو خود اہل ہنود کی نگاہوں میں بہت کم کر دیا تھا۔ ہندو دھرم کی عظمت دوبارہ قائم کرنے کے لئے سرور نے بہت سی مذہبی نظمیں مثلاً وید مقدس کی روشنی لکشمی جی۔ گنگا جی وغیرہ لکھیں جنمیں مقدسانہ جذبات کے دریا بہا دیئے ہیں۔

زمانہ سلف میں عورتوں کے جذبات نہایت پاک اور اعلیٰ تھے۔ حیا و شرم، شوہر پرستی اور وفاداری ان میں کوٹ کوٹ کر بھری تھی، اسی لئے اُن کی قدر و منزلت زیادہ ہوتی تھی اور قوم کے لئے وہ سرمایۂ ناز تھیں۔ سیتا۔ دمینتی۔ پدمنی ایسی پاکباز اور برگزیدہ ہستیاں مثال کے طور پر پیش کیجا سکتی ہیں، لیکن آجکل ان کا معیار زندگی بہت گر گیا ہے، اور یہی وجہ ان کی کس مپرسی کی ہے سرور نے زمانۂ سلف کی دیویوں کے افسانے نظم کئے ہیں اور اُن کے اعلیٰ جذبات کو بیان کر کے صنف نازک کو حیا پروری۔ شوہر پرستی اور وفاداری کی تعلیم نہایت مؤثر طریقہ سے دی ہے سرور کے نزدیک ظاہری حسن و جمال حسن سیرت کے سامنے کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔ اصلی حسن وہی ہے جو باطنی اوصاف سے آراستہ ہو۔ چنانچہ نظم "ادائے شرم" میں فرماتے ہیں۔

عفت و شرم و حیا ناز ہیں ارکان حسن — بس انھیں دو چار اجزا سے ہے قائم شان حسن

حکمائے انگلستان کا قول ہے کہ وہ قوم ہرگز ترقی نہیں کر سکتی جسمیں عورتوں کی وقعت و عزت نہو۔ سرور اس نکتہ کو سمجھتے تھے چنانچہ اُنھوں نے صنفِ نازک کے معیار زندگی کو اعلیٰ بنانے کی بہت کوشش کی، اس لحاظ سے ان کا شمار مخصوص مصلحانِ قوم میں ہو سکتا ہے۔ بخوف طوالت صرف ایک مثال پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

"پدمنی"

تو وہ تھی شمع کہ پروانہ بنایا تجکو ۔۔۔ تو وہ لیلےٰ تھی کہ دیوانہ بنایا تجکو
ناز آیا ترے حصے میں ادا بھی آئی ۔۔۔ جاں فروشی بھی محبت بھی وفا بھی آئی
آہ اے پرتو انوار صفا کی دیوی ۔۔۔ اے زیارت کدۂ شرم و حیا کی دیوی
تیری تقدیس کا قائل ہے زمانہ ابتک ۔۔۔ تیری عفت کا زباں پر ہے فسانہ ابتک

قومی اور ملکی جذبات کے علاوہ جن کی مثالیں اوپر گزر چکیں سرور نے شفقت پدری کے نکات، الفت مادری کے رموز، صنف نازک کے لطیف احساسات، عہد طفلی کے معصومانہ جذبات نہایت خوبی سے نظم کئے ہیں۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اُنھوں نے بقول نظر صحیفۂ فطرت کا ہر ورق نہایت غور سے ملاحظہ کیا تھا۔ بطون انسانی کے گہرے جذبات کو نظم کا جامہ پہنانے میں سرور فی الواقع ید طولیٰ رکھتے تھے۔ ذیل میں اُن کے چند اشعار اپنے بیان کی تائید میں پیش کئے جاتے ہیں:۔

"مہاراجہ دسرتھ کی بیقراری"

بالک تھے رام دشت نوردی کے دن نہ تھے ۔۔۔ بچے ابھی تھے بادیہ گردی کے دن نہ تھے
کانٹے قدم قدم پہ نکالے گا آہ کون؟ ۔۔۔ غربت میں بن کی جھاڑیگا پلکوں سے راہ کون؟
روئیں گے یہ تو کون گلے سے لگائے گا؟ ۔۔۔ سوئیں گے یہ تو کون تھپک کر سلائے گا؟
آنکھیں کنول سی ہیں کبت پایا چمن کے پھول ۔۔۔ کمھلا نہ جائیں دشت میں میرے چمن کے پھول

"سیتاجی کی گریہ وزاری"

مجھ سے شب فراق میں تڑپا نہ جائے گا ۔۔۔ روز سیاہ ہجر کا دیکھا نہ جائے گا
گھر میں جو چھوڑ جاؤ گے سیتا غریب کو ۔۔۔ پاؤ گے بن سے آکے نہ جیتا غریب کو
صورت تمھاری دیکھ کے غم بھول جاؤنگی ۔۔۔ صحرا کے سارے رنج و الم بھول جاؤنگی
ہوگی نہ بن میں کوئی اذیت مرے لئے ۔۔۔ تم ہو تو کند مول ہیں امرت مرے لئے

مذکورہ بالا اشعار سے واضح ہوگا کہ سرور انسانی جذبات کے بیان میں غیر معمولی سادگی سے کام لیتے تھے

یہ وصف ان میں انگریزی شعرائے مطالعۂ کلام سے پیدا ہوا۔ رنگینی زبان بیشک کلام میں زور پیدا کرتی ہے لیکن جذبات کو جامہ زیبی کی ضرورت نہیں۔ یہ جتنے عریاں ہوں اتنے ہی بھلے معلوم ہوتے ہیں یوں تو سرور نے عیش و غم، امید و یاس، ہجر و وصل ہر قسم کی حالت کا مرقع نظم میں کھینچا ہے، لیکن حسرت و غم کے بیان میں فی الواقع ان کے قلم سے چنگاریاں اڑتی ہیں جس کی وجہ یہ ہے کہ ان کی طبیعت فطرتاً پرسوز واقع ہوئی تھی جس کو حوادث زمانہ نے اور بھی گداز کر دیا تھا۔ اسی پرسوز طبیعت سے مجبور ہو کر انھوں نے زیادہ تر ان واقعات زندگی پر طبع آزمائی کی ہے جو رنج و غم سے خاص علاقہ رکھتے ہیں چنانچہ ان کے کلام میں متعدد مراثی ہیں اور اس قسم کی نظمیں بہت سی ہیں جنھیں یاس و حسرت کا عنصر بدرجہ تم موجود ہے۔ انگلستان کے مشہور شاعر شیلی کا قول ہے کہ "وہ گانے بہت زیادہ ترنم آفریں ہوتے ہیں جنھیں حسرت و غم کا بیان ہو" اس حیثیت سے سرور کا کلام نغمات کا مجسمہ ہے۔

ایسا درد آشنا دل جو سرور کے پہلو میں تھا کبھی عشق کے سوز سے محروم نہیں رہ سکتا، کسی شاعر نے کیا خوب کہا ہے:-

نشۂ عشق بہ پیمانۂ آزار دہند   بہ تشنگان دل خود را در میخانہ شمر

سرور بھی عاشق مزاج تھے لیکن عشق صادق کے دلدادہ تھے، نفس پرستی اور بوالہوسی سے انکو نفرت تھی۔ چنانچہ انھوں نے گل و بلبل کے راز و نیاز، در شمع و پروانہ کے سوز و ساز جنھیں عشق صادق کی جھلک نظر آتی ہے خوب نظم کئے ہیں۔ متاخرین کی بدمذاقی نے عشقیہ جذبات کو نہایت مبتذل کر دیا تھا۔ درد، غالب اور آتش نے اس بدمذاقی کو دور کرنے کی کوشش کی لیکن ناکام رہے اور اب تک اردو شعرا کا ایک ایسا گروہ موجود ہے جو بوالہوسی کے لچر خیالات کو نظم کرنا عین شاعری سمجھتا ہے۔ سرور عشقیہ جذبات کے نظم کرنے میں قدما کی پیروی کرتے ہیں اور واقعہ گوئی کو ہمیشہ مد نظر رکھتے ہیں عشق صادق کی عظمت انھوں نے نہایت مؤثر الفاظ میں بیان کی ہے۔ ملاحظہ ہو:-

"گل و بلبل کا افسانہ"

یہ مانا کہ کمھلا گئے پھول کھل کر   بہار اپنی دکھلا گئے پھول کھل کر
چمن سے بہت دن ہوئے چل بسے وہ   نہ دو روز بھی کھل کھلا کر ہنسے وہ
مگر میرے نالوں کا عالم وہی ہے   وہی ان کا شیون ہے ماتم وہی ہے
اگرچہ میں صیاد اک جانور ہوں   ہوں از خود رمیدہ وہ شوریدہ سر ہوں
مگر جانتا ہوں محبت کی رسمیں   نہیں ربط ممکن ہے عشق اور ہوس میں

نہیں عاشقی خامکاروں کا شیوہ کہ ہے پختہ مغزوں کا حصّہ یہ میوہ

جدید شاعری میں مناظرِ قدرت کی مرقع کشی بھی ایک ممتاز درجہ رکھتی ہے۔ اس کی مثالیں انگریزی ادب میں بکثرت موجود ہیں جن کو بذریعہ تراجم کے سرور نے اُردو شاعری میں بھی داخل کر دیا۔ انھوں نے اپنی طبعزاد نظموں میں بھی مناظر قدرت کی تصویریں خوب کھینچی ہیں۔ کہیں بہار کی رنگینی بیان کی ہے کہیں خزاں کا منظر دکھایا ہے۔ اور کہیں ظہورِ صبح کا دلفریب سماں پیش نظر کیا ہے لیکن کسی جگہ بعید اور دُور از کار تشبیہوں کی بھرمار سے حقیقت کا خون نہیں کیا بلکہ ہر منظر کے جزئیات بیان کر کے ہو بہو اسکا فوٹو کھینچ دیا ہے۔ جیسا کہ مندرجہ ذیل اشعار سے واضح ہوگا:-

"خزاں"

ڈھل گیا تھا شاہدانِ باغ کا حسنِ شباب زرد تھا ہر گل کا چہرہ صورت برگِ خزاں

چومتی تھی منہ نہ پھولوں کا نسیم عطر بیز اب نہ تھیں شاخوں پہ بادِ صبحدم کی شوخیاں

ڈالیوں پر تھے نہ مرغانِ چمن نغمہ سرا شورِ گلبانگ عنادل شاخِ گل پر تھا کہاں

جھومتے پھرتے نہ تھے اب نوجوانانِ چمن لالہ و گل کا نظر آتا نہ تھا اب کارواں

مند گئی تھی ہر کلی یوں شاخِ گل پر ہائے ہائے نزع میں آنکھیں نہ کھولے جیسے کوئی خستہ جاں

دیکھتی تھی دیدۂ عبرت سے انجامِ چمن نرگسِ بیمار کی آنکھوں سے آنسو تھے رواں

سرور نے انگریزی مذاق کے مطابق مختلف قدرتی اشیاء پر بھی نظمیں لکھی ہیں جنمیں بیر بہوٹی۔ نسیم سحر لالۂ صحرا خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان نظموں کا تفصیلی بیان آگے آئیگا۔

مولانا شبلی شعر العجم میں فرماتے ہیں کہ شاعری دراصل تخئیل کا نام ہے۔ یوں تو تخئیل کا مفہوم نہایت وسیع ہے، بطونِ انسانی کے گہرے جذبات بیان کرنا، عام موضوع پر طرح طرح کے خیالات نظم کرنا یہ سب تخئیل میں داخل ہے لیکن شاعری میں اس کے خاص معنی ہیں۔ کسی عام بات کو لطیف پیرایہ میں بیان کرنا یا اس میں کوئی خاص نکتہ پیدا کرنا تخئیل ہے۔ یہ کبھی مضمون آفرینی اور جدت ادا کی شکل میں ظاہر ہوتی ہے اور کبھی تشبیہ و استعارے کی لطافت و نزاکت میں مضمر ہوتی ہے، یہی بیان میں زور پیدا کرتی ہے اور مختلف شعرا کے کلام میں مابہ الامتیاز ہے۔ لیکن اس قوت کو اعتدال کے ساتھ استعمال کرنا نہایت ضروری ہے۔ کیونکہ اس کی کثرت حقیقت پر پردہ ڈالدیتی ہے اور لبا اوقات کلام کو مہمل اور مبہم بنا دیتی ہے۔ سرور نے اپنی شاعری میں ہر جگہ تخئیل اور جدت سے کام لیا ہے۔ ان کا کلام نازک اور لطیف تشبیہات و استعارات سے معمور ہے لیکن کہیں سر رشتۂ اعتدال کو انھوں نے ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ بعید اور دور از کار تشبیہوں

کو وہ کبھی استعمال نہیں کرتے اور خواہ مخواہ کلام میں زور پیدا کرنے کی کوشش نہیں کرتے اسی لئے ان کی شاعری آورد کے نقص سے پاک ہے۔ ذیل میں چند مثالیں درج کی جاتی ہیں جن سے ان کی جدت اور قوت تخئیل کا پتہ چلے گا۔

کنارِ جو نہیں ابرِ بہار کا دامن ــــــ ہوا کے دوش پہ پھیلا ہوا ہے دامِ نشاط

ابرِ بہار کو دامِ نشاط کہنا اور پھر اس کو ہوا کے دوش پر پھیلانا منتہائے بلاغت ہے۔ تشبیہ کس قدر لطیف اور نیچرل واقع ہوئی ہے، جس کی خوبی و عمدگی بیان میں نہیں آ سکتی، چند اشعار اور بھی اس بہاریہ قصیدہ کے ملاحظہ ہوں۔ فیصلہ ناظرین کے ذوقِ سلیم پر چھوڑا جاتا ہے ؎

شرابِ ذوقِ ترنم سے مست ہے قمری ــــــ چمن میں سرو ہے مینائے سبز فامِ نشاط
بھری ہوئی ہے ہوا میں شراب کی تاثیر ــــــ عجب نہیں کہ رگِ گل ہو خطِ جامِ نشاط
ترانہ ریز ہیں شاخوں پہ طائرانِ چمن ــــــ چہک کے دیتے ہیں غنچے صلائے جامِ نشاط

نظم "زنِ خوش خو" میں اس خیال کو کہ پاکباز عورت خلوت میں بھی اپنے شوہر سے شرماتی ہے جسکی وجہ فطری شرم و حیا ہے نہ کہ بے التفاتی، اس طرح ادا کرتے ہیں :۔

خلوت میں نگاہوں سے نگاہیں نہیں ملتیں ــــــ دل ملتا ہے دل ملنے کی راہیں نہیں ملتیں

نگاہوں کو دل ملنے کی راہ کہنا، اور ایک باریک خیال کو اس نادر پیرایہ میں ادا کرنا جدت طرازی کا اعلیٰ نمونہ ہے

معشوق کے چہرے پر زلفِ سیہ تاب بکھری ہوئی ہے، اس وقت حسن کی عالم فریبی جو منظر پیش نظر کرتی ہے اس کو شعراء عموماً یوں بیان کرتے ہیں کہ قمر ہلکے ہلکے بادلوں میں پوشیدہ ہو گیا ہے لیکن سرور اس منظر کی مرقع کشی میں خاص جدت سے کام لیتے ہیں، ملاحظہ ہو :۔

چہرے میں ترے زلف جو ہے بدر کا عالم ــــــ پھر جاتا ہے آنکھوں میں شبِ قدر کا عالم

نظم "بیر بہوٹی" میں سرور نے واقعی داد بلاغت دی ہے۔ ساری نظم نازک تشبیہات سے معمور ہے اور قوت تخئیل کی جولانگاہ ہے۔ کچھ اشعار اس نظم کے ملاحظہ ہوں :۔

گل بداماں ہے شفق میں شعلۂ تنویرِ حسن ــــــ خونِ عاشق یا زمیں پر ہے گریباں گیرِ حسن
یا عقیقِ سرخ کی چھوٹی سی ہے تعمیرِ حسن ــــــ نقشِ نیرنگِ جنوں ہے یا کوئی تصویرِ حسن
جلوۂ گل ہے فضائے وادیٔ پرخار میں ــــــ سرخ نکتہ ہے قبائے سبزۂ کہسار میں
وادیٔ پرخار میں اک مجمرِ سوزاں ہے تو ــــــ دامنِ کہسار میں اک شعلۂ عریاں ہے تو

کشت زارِ حسن میں اک دانۂ مرجاں ہے تو　　　یا کسی گلگوں قبا کا گوشۂ داماں ہے تو

ناز ہے صحرا کو تیری شوخیِ رفتار پر　　　دوڑتا ہے خوں کا قطرہ سبزۂ کہسار پر

اب ہم کو صرف سرور کی زبان اور اسٹائل پر بحث کرنا باقی ہے۔ یہ بات ظاہر ہے کہ اُردو زبان وسعت میں دنیا کی دیگر زبانوں کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ فارسی طرزِ بیان کی تقلید نے اس کو اس قابل نہ رکھا کہ چند مخصوص مضامین کے علاوہ دیگر مطالب کو بھی بخوبی بیان کر سکے۔ باوجود ان دقتوں کے سرور نے ہر قسم کے جدید خیالات کو الفاظ کا بہترین جامہ پہنانے کی کوشش کی اور اسمیں ان کو غیر معمولی کامیابی ہوئی، جس سے ثابت ہوتا ہے کہ زبان پر ان کو بہت قدرت حاصل تھی۔ انھوں نے ہر زمین اور بحر میں اشعار کہے ہیں لیکن زبان کی صفائی و شستگی، روانی اور حسن بندش میں کہیں فرق نہیں آیا۔ مضمون خواہ آسان ہو یا پیچیدہ وہ نہایت خوش اسلوبی سے اس کو چنے ہوئے بامحاورہ اور پر معنی الفاظ میں بیان کر دیتے ہیں۔

مرغابی شام کے وقت فضائے آسمان میں اڑ رہی ہے اور بڑی دلفریب معلوم ہو رہی ہے، شفق کی دلآویزی نے اس کی دلفریبی کو اور بھی بڑھا دیا ہے۔ اس خیال کو سرور اس طرح ادا کرتے ہیں:

ارغواں زارِ فلک کے طائرِ خوشرنگ نے　　　اور بھی دلکش بنایا تیرے نقشِ ناز کو

ہندی الفاظ بھی اُنھوں نے ایسی خوبی سے استعمال کئے ہیں کہ غیر مانوس نہیں معلوم ہوتے اور بعض جگہ اچھوتے قافیئے اس ادا سے باندھے ہیں کہ تعریف میں زبان قاصر ہے۔ ملاحظہ ہو:-

تو وہ جو نہیں شوخیِ رفتار قدم سے　　　بجتے نہیں گھنگرو کبھی پازیب کی چھم سے

سرور نے اپنے کلام میں فارسی ترکیبیں بہت استعمال کی ہیں لیکن ایسی خوبی اور بے تکلفی کے ساتھ کہ غالب اور مومن کی یاد آجاتی ہے۔ طرزِ بیان میں وہ انھیں اساتذہ کی تقلید کرتے ہیں بعض اشعار تو بالکل غالب کے رنگ میں کہے ہیں، مثلاً

دلِ بیتاب ہے جولانگہِ صد برقِ تپش　　　رخصت اے قافلۂ صبر و شکیبِ جگری

لیکن جذبات اور محسوسات کے بیان میں وہ عموماً سلاست اور سادگی کو مد نظر رکھتے ہیں۔ بہر حال سرور نظموں میں مقتضائے مقام کے مطابق سادہ یا رنگین جس قسم کا اسٹائل اختیار کرتے ہیں شروع سے آخر تک اس کو قائم رکھتے ہیں اور یہ ایک بڑی خوبی ہے جو صرف مخصوص اور منتخب شعرا میں پائی جاتی ہے مسدس میں سرور نے میر انیس کا تتبع نہایت کامیابی سے کیا ہے میر صاحب کی حسن بندش اور زبان کی صفائی ان کے مسدسوں میں بدرجۂ اتم موجود ہے۔ مثال کے طور پر ذیل میں چند بند نقل کئے جاتے ہیں

نسیم سحر

آتی ہے تو چمن میں جو لیکر پیام صبح
بھرتی ہے آب گوہر شبنم سے جام صبح
آنے سے تیرے باغ میں اے خوش خرام صبح
ہوتا ہے ہر روش پہ نیا اہتمام صبح

کلیاں شگفتہ ہوتی ہیں غنچے چٹکتے ہیں
شاخوں پہ طائران غزل خواں چہکتے ہیں

گلگشت باغ کیا جو گلستاں میں تو نہ ہو
سبزی نہ ہو گیاہ میں پھولوں میں بو نہ ہو
یہ جوش گل چمن میں نہ جوشش نمو نہ ہو
سبزہ میں تازگی نہ لب آب جو میں ہو

تو بھر کے ہاتھ سے جو پلائے نہ جام شوق
تازہ نہ ہو گلوں کا چمن میں مشام شوق

گھونگھٹ الٹ الٹ کے رخ نازنیں سے تو
کرتی ہے چھیڑ سلسلۂ عنبریں سے تو
ہونے کو ہمکنار گل و یاسمیں سے تو
چلتی ہے بس کے عطر میں خلد بریں سے تو

یوں دھیمے دھیمے آتی ہے تاروں کی چھاؤں میں
مہندی لگا کے جیسے چلے کوئی پاؤں میں

سرور کا کلام قریب قریب تمام اصناف سخن میں موجود ہے۔ انھوں نے قصیدہ، غزل، مثنوی، مسدس، مخمس، ترجیع بند، قطعہ، رباعی وغیرہ سب کچھ کہا ہے اور ہر صنف میں ان کا کلام زبان و بیان کی خوبیوں سے مالامال ہے۔ اس لحاظ سے سرور اپنے ہمعصروں میں نہایت ممتاز درجہ رکھتے ہیں۔ افسوس ہے کہ ایسے قادر الکلام شاعر کی نظمیں کسی تعلیمی نصاب میں بھی داخل نہیں ہیں۔ آنیوالی نسلیں ان کے کلام سے لطف اندوز نہیں ہوسکتیں اور نہ انکی ذات پر فخر کرسکتی ہیں۔ اس ناقدردانی نے ہندوستان کی شاعری کو برباد کردیا۔

مندرجہ بالا سطور لکھنے سے میرا یہ منشا ہرگز نہیں ہے کہ سرور کا کلام عیوب و نقائص سے بالکل پاک و صاف ہے۔ انکے ہاں جابجا ابتدائی مشق کی خامیاں موجود ہیں اور کہیں کہیں زبان کی لغزشیں بھی پائی جاتی ہیں لیکن اس قسم کے عیوب ہر شاعر کے کلام میں کم و بیش ہوتے ہیں۔ دوسرے جب ہم سرور کی جوانامرگی کا خیال کرتے ہیں اور انکی پرگوئی اور کہنہ مشقی کو دیکھتے ہیں تو ان لغزشوں کی اہمیت بہت کم ہو جاتی ہے۔ آپ شروع سے آخر تک سرور کا دیوان دیکھ جائیے حسن کلام اور تنوع مضامین آپ کو اس قدر محو حیرت کردیں گے کہ آپ کا ذہن زبان و بیان کے عیوب کی طرف ہرگز منتقل نہ ہوگا۔

حفظانِ صحت کے اصول

(از رائے بہادر ڈاکٹر پرملاد نراین صاحب ماتھر)

پیشتر دوسرے ملکوں میں بھی جو اس وقت ہندوستان سے زیادہ ترقی یافتہ خیال کئے جاتے ہیں، اتنی ہی موتیں ہوتی تھیں جتنی کہ اب ہندوستان میں ہوتی ہیں۔ انگلستان میں تقریباً تیس۳۰ سال ہوئے ایک ہزار بچوں میں جو پیدا ہوتے تھے سال کے اندر دو سو۲۰۰ بچے مرجاتے تھے۔ اب وہاں دو سو فی ہزار کے بجائے پچاس فی ہزار سے بھی کم بچے مرتے ہیں۔ لیکن ہندوستان کا وہی حال ہے۔ اگر ایک ملک میں پہلے سے کم اموات ہونے لگیں، اور تندرستی بہتر ہوگئی اور عمریں بھی زیادہ ہونے لگیں تو اس سے یہ ضرور ثابت ہوتا ہے کہ اب وہاں کے حالات بہتر ہوگئے ہیں۔ اور اگر اس ملک میں بھی ویسے ہی طریقے استعمال کئے جائیں تو ان سے ضرور عمدہ نتیجہ نکلے گا۔

اکثر صاحب اس کا یہ جواب دیتے ہیں کہ انگریزوں اور ہندوستانیوں کا کیا مقابلہ ہوسکتا ہے۔ ان کے پاس اس قدر روپیہ ہے کہ وہ ہر قسم کی احتیاط کرسکتے ہیں، ہندوستانی اتنے غریب ہیں کہ انھیں اچھی غذا تک میسر نہیں ہے۔ مگر ہندوستان میں امیر آدمیوں کے بچوں میں بھی موتیں کم نہیں ہوتیں اور نہ اُن کی تندرستی غریبوں سے بہتر ہے۔ کیونکہ جب تک روپئے کی زیادتی کے ساتھ تعلیم اور واقفیت میں ترقی نہ ہو دولت سے فائدہ کے بجائے نقصان ہونا ممکن ہے۔ جیسے کہ مجھکو ایک رئیس صاحب کا قصہ معلوم ہے جن کی تعلیم معمولی تھی لیکن حکام ضلع سے ملنے کا اکثر موقع ملتا تھا، وہ اُن کے بنگلے دیکھتے تھے، وہاں کے کواڑ ایسے صاف اور سڈول دیکھکر اُنھیں بہت پسند آئے خصوصاً ان کے بند کرنے کے بعد ہوا کا داخل نہ ہوسکنا اُنھیں بہت ہی اچھا معلوم ہوا چنانچہ اُنھوں نے اپنے پُرانے مکان کے سب پُرانے کواڑ جو اچھی طرح سے بند نہ ہوتے تھے اور جن میں بند کرنے کے بعد بھی ہوا آنے کی جگہ رہ جاتی تھی اُتروا ڈالے اور نئے کواڑ جیسے بنگلے میں دیکھ آئے تھے لگوا دئیے۔ رئیس صاحب کو یہ پتہ نہیں تھا کہ اول تو بنگلے کے کواڑ دن رات کھلے رکھے جاتے ہیں اور اگر ہوا کے جھونکے سے بچنے کے لئے دروازے بند بھی کردئیے تو اوپر کی کھڑکیاں کھلی رہتی ہیں، لیکن اُن کے لئے تو دروازہ محض مکان کی زیبایش اور اپنی آمد ورفت

کیلئے تھا. اس لئے پُرانی عادت کے مطابق وہ جاڑوں میں کواڑ بند کرکے سوئے اور اس میں کوئلوں کی انگیٹھی بھی جلائی. نتیجہ یہ ہوا کہ ہوا خراب ہو جانے سے وہ بیہوش ہوگئے. اور اگر کسی ضرورت سے نوکر کواڑ نہ کھولتے تو اُن کا خاتمہ ہو جاتا. اس سے صاف ظاہر ہے کہ نئے طریقوں کے اختیار کرنے اور پُرانی رسموں کے چھوڑنے سے پہلے ان لوگوں سے جو اس فن کے ماہر ہیں ضرور رائے لے لینا چاہیئے ورنہ نقصان کا احتمال ہے۔

قدرت کے معمولی قانون تو سبھی کو معلوم ہیں، لیکن اس وقت تک ترقی نہیں ہو سکتی جب تک ہر نئے معاملہ میں واقفکار ماہرین سے مشورہ نہ لیا جائے۔

دوسرے ملک جو اس وقت ترقی کر رہے ہیں وہ نئی دریافتوں سے ہمیشہ فائدہ اُٹھاتے ہیں لیکن ہندوستان میں جو پُرانے قاعدے چلے آرہے ہیں لوگ اُنھیں پر چلنا پسند کرتے ہیں اور نئی معلومات سے فائدہ نہیں اُٹھاتے. اگر آپ چاہتے ہیں کہ ہندوستان بھی دوسرے ملکوں کی طرح ترقی کرے تو ضروری ہے کہ ہر نئی تحقیقات سے فائدہ اُٹھانے کی کوشش کی جائے. پُرانی لکیر کے فقیر بنے رہنے سے ترقی نہیں ہو سکتی.

اگر یہ سوال کیا جائے کہ گاؤں کے کاشتکار شہر والوں سے کم تعلیم یافتہ ہیں اور تندرستی کے قاعدوں سے زیادہ ناواقف ہیں، تو یہ بات قابلِ غور ہے کہ اہلِ دیہات شہر والوں سے کیوں زیادہ تندرست ہیں، اس کا جواب یہی ہے کہ قدرت کے قواعد کا صرف جاننا ہی کافی نہیں ہے بلکہ ان پر عمل بھی ضروری ہے اگر کسی گدھے پر کتابیں لاد دی جائیں تو وہ ان سے کیا فائدہ اُٹھا سکتا ہے۔ دیہات کے رہنے والے تندرستی کے قاعدوں سے واقف ہوں یا نہ ہوں مگر اُنھیں مجبوراً اُن پر عملدرآمد کرنا پڑتا ہے، تمام دن وہ کھیت میں کام کرتے ہیں. تندرستی کے لئے سب سے زیادہ ضروری چیز صاف ہوا اور روشنی ہے جو پرمیشور نے سب کو مفت دے رکھی ہے، ہر کاشتکار ان قدرتی نعمتوں سے فائدہ اُٹھاتا ہے، وہ صبح سے شام تک جو کھیت کھودتا ہے وہ ہر ایک ورزش سے جو شہر کے آدمی کر سکتے ہیں کہیں زیادہ ہے۔ صاف ہوا، روشنی اور ورزش کے لئے گاؤں میں رہنے والوں کو کسی قسم کے صرف کی ضرورت نہیں لیکن غذا کے لئے البتہ روپیہ درکار ہے. اس لئے اگر گاؤں کے رہنے والوں کی تندرستی کا آپس میں مقابلہ کیا جائے تو وہاں کے کاشتکار جہاں دودھ گھی اور مٹھا کثرت سے ہوتا ہے زیادہ تندرست ہیں بہ نسبت اُن گاؤں کے جہاں یہ چیزیں میسّر نہیں ہیں.

سب آدمی اتنا نہیں پڑھ سکتے کہ تندرستی کے کل قواعد سے واقف ہو جائیں، اس لئے ترقی

ترقی کرنے کے لئے ضروری ہے کہ قوم ان لوگوں کی رہنمائی قبول کرے جنھوں نے اپنی عمریں قدرت کے ان قاعدوں کے جاننے میں صرف کردی ہیں جن پر تندرستی کا انحصار ہے۔ علم یا نئی تحقیقات کسی خاص قوم کی میراث نہیں ہے۔ اگر طبابت کو دیکھا جائے تو اس میں مختلف ملکوں میں نئی نئی تحقیقاتیں ہوئی ہیں۔ مثلاً طاعون کا کیڑا جس سے بیاری پھیلتی ہے ایک جاپانی ڈاکٹر کیٹا ساٹو (Kitasatoo) نے دریافت کیا اور اس کے بعد یہ تحقیقات انگریز ڈاکٹروں کی امداد و اعانت سے مکمل ہوئی، کہ بیمار چوہے کے خون سے طاعون کے کیڑے پسوؤں کے اندر ہو جاتے ہیں اور پھر یہ پسّو انسان کا خون چوستے وقت بیمار چوہے سے جو طاعون کے کیڑے لئے تھے وہ آدمی کے جسم میں داخل کردیتے ہیں تو آدمی کو طاعون ہو جاتا ہے اسی طرح سے تپ دق اور ہیضہ کا کیڑا جن سے یہ بیماریاں پھیلتی ہیں کاک (Kaok) ایک جرمن ڈاکٹر نے نکالا تھا۔ ملیریا کا کیڑا فرانس کے ایک ڈاکٹر لیویرین (Lauerian.) نے نکالا اور بعد کو مین سن (Manson) اور روس (Ross) انگریز ڈاکٹروں نے یہ دریافت کیا کہ یہ جاڑے بخار کا زہر خاص مچھروں کے کاٹنے سے ایک بیمار سے دوسرے بیمار تک پہونچتا ہے۔ اسی طرح ایک انگریز ڈاکٹر جیمس (James) صاحب نے چیچک کا ٹیکہ نکالا جو آجکل رائج ہے۔ اگر انگریز یہ کہتے کہ جاپان، روس یا جرمنی میں جو نئی تحقیقاتیں ہوئی ہیں اُن سے فائدہ نہ اُٹھائیں تو آج اتنی ترقی پر نہ ہوتے۔

اوپر ذکر آچکا ہے کہ ہیضہ۔ دق۔ پلیگ وغیرہ بیماریاں بہت چھوٹے اور ننھے کیڑوں سے پھیلتی ہیں جو آنکھوں سے دکھلائی نہیں دیتے مگر اپنا زہر انسان کے جسم میں داخل کرکے بیماری پیدا کردیتے ہیں بعض اصحاب اس تحقیقات کے قائل نہیں ہیں لیکن خوردبین کی ایجاد کے بعد جس کے ذریعے ایک بال اتنا موٹا معلوم ہوتا ہے جیسے ایک بڑے درخت کی موٹی شاخ، مغربی ممالک کے عالموں نے جنھوں نے طبی تحقیقات پر اپنی عمریں قربان کردی ہیں یہ معلوم کیا ہے کہ دنیا کے ظاہری جانداروں کے علاوہ لکھو کھا کیڑے مکوڑے اور جراثیم ایسے بھی موجود ہیں جو آنکھوں سے نظر نہیں آسکتے ہیں اور جس طرح دنیا کے بہت سے وہ جانور جو آنکھوں سے نظر آتے ہیں آدمی کی جان کے دشمن ہیں اسی طرح بہت سے وہ ننھے ننھے کیڑے بھی جو صرف خوردبین سے نظر آسکتے ہیں آدمی کے جانی دشمن ہیں۔ بعض انسان کے دوست بھی ہیں مثلاً جو کیڑے گنّے سے بنے ہوئے سرکہ میں یا دودھ سے بنے ہوئے دہی میں ہوتے ہیں اور جو صرف خوردبین سے نظر آسکتے ہیں وہ سب انسان کے دوست ہیں۔ اس طرح بہت سے چھوٹے چھوٹے کیڑے ایسے بھی ہیں جو انسان کے جسم میں پہونچکر پلیگ۔ ہیضہ۔ جاڑا بخار اور تپ وغیرہ امراض پیدا کردیتے ہیں، یہ سب انسان کے دشمن ہیں، یہ اس قدر چھوٹے ہوتے ہیں کہ انھیں کوئی شخص آنکھوں سے نہیں دیکھ سکتا ہے لیکن ان سب

تو معمولی شخص بھی خوردبین کی مدد سے بخوبی دیکھ سکتا ہے۔

اگر کسی شہر یا قصبے میں کوئی دشمنِ انسان جانور مثل شیر بھیڑیے کے جو ہر شخص کو نظر آسکتا ہے دکھائی دیتا ہے تو سب لوگ اس کے مارنے کی فکر کرتے ہیں۔ لیکن افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ اس کے برعکس بہت سے لوگ ان چھوٹے چھوٹے کیڑوں کو جو آنکھوں سے تو دکھائی نہیں دیتے لیکن آدمی کے لئے بہت ہی نقصان رساں ہیں مارنے کے بجائے پرورش کرتے ہیں اور انھیں ہر قسم کی مدد دیتے ہیں۔

اگر لوگوں کو یہ معلوم ہو کہ مکانات بنانے کے لئے قصبوں کے نزدیک جو گڑھے کھود دے جاتے ہیں اور جہاں برسات میں پانی بھر جاتا ہے ان میں خاص قسم کے مچھر پیدا ہو جاتے ہیں جو جاڑے بخار کا زہر ایک بیمار سے لیکر دوسرے تندرست آدمیوں میں داخل کر کے انھیں بھی بیمار کر ڈالتے ہیں تو شہر کے نزدیک گڑھے نہ کھودے جائیں۔ اسی طرح شاید یہ بھی عام طور پر لوگوں کو معلوم نہو کہ صاف ہوا جو پرمیشور نے اس کثرت سے عطا فرمائی ہے بہت سی بیماریوں کو دفع کرتی ہے اور تپ دق جس سے دنیا کی آبادی کا ساتواں حصہ مرجاتا ہے اُس کے روکنے کی یہی خاص دوا ہے تو لوگ ایسے مکان نہ بنائیں جنمیں ہوا کا گذر ہی نہیں ہوتا ہے۔

اگر یہ معلوم ہوتا کہ ہیضہ کا زہر بیمار کے دست اور قے میں ہوتا ہے اور اسپر جو مکھیاں بیٹھتی ہیں اُن کے پر اسی دست اور قے میں سن جاتے ہیں اور پھر جب وہ کسی کھانے پینے کی چیز پر بیٹھتی ہیں تو اس میں ہیضہ کا زہر بھی داخل کر دیتی ہیں اور جب وہ کھانا انسان کے پیٹ میں پہونچتا ہے تو ہیضہ کا حملہ ہو جاتا ہے۔ اسی طریقہ سے مکھیاں پیچش اور موتی جھارہ کا زہر ایک بیمار سے دوسرے تندرست آدمی تک پہونچا دیتی ہیں اس لئے مکھیوں کو کھانے کی چیزوں پر نہ بیٹھنے دینا چاہیئے۔ لیکن محض ناواقفیت کی وجہ سے آپ دیکھتے ہیں کہ مٹھائی اور دودھ وبالائی وغیرہ پر کتنی ہی مکھیاں بیٹھی رہتی ہیں، لیکن کھانیوالوں کو مطلق اعتراض نہیں ہوتا۔ وہ ان چیزوں کو شوق سے خرید کر کھا جاتے ہیں۔

بعض صاحبوں کو یہ سنکر تعجب ہوگا کہ گینڈا جو پاخانہ یا نالیوں میں ہوتی ہیں وہ در اصل سب مکھیوں کے بچے ہیں۔ کچھ دنوں کے بعد مکھیوں میں تبدیل ہو جاتے ہیں اس لئے اگر کہیں مکھیاں زیادہ ہوں تو سمجھنا چاہیئے کہ اس محلہ اور گرد و نواح میں پاخانہ اور نالیوں اور کوڑے کی صفائی ٹھیک طور سے نہیں ہوتی ہے۔

ہندوستانیوں کے بہت سے بچے جو پیدا ہوتے ہی جمو گا یا سرخ بادہ کی بیماریوں میں مبتلا ہو کر مرجاتے ہیں، وہ پیدائش کے وقت گندہ چاقو سے نال کاٹنے اور میلے گندے تاگے کے باندھنے سے ہو جاتے ہیں، اور جس قدر عورتیں بچہ پیدا ہونے کے بعد زچہ خانوں میں بخار وغیرہ سے مرجاتی ہیں وہ دائیوں کے گندہ ہاتھوں کے چھونے سے ہوتا ہے۔ بچے جنانے کا کام ہمارے ملک میں معمولی ناواقف اور ناسمجھ مترانیوں چماریوں یا اُن

قوموں سے لیا جاتا ہے جو بہت زیادہ گندہ رہتی ہیں۔ بچہ اپنے آپ پیدا ہوتا ہے اور معمولی طور پر کسی تعلیم یافتہ ڈاکٹر یا ڈاکٹرنی کی ضرورت نہیں ہوتی، اگر صرف قینچی اور تاگا پانی میں پکا لیا جائے اور دائی اپنے ہاتھ صابن اور دوا سے دھو ڈالے تو ان سب بیماریوں سے بہت آسانی سے بچ سکتے ہیں، ہاں اگر کوئی پیچیدگی واقع ہو تو ڈاکٹر بلا لیا جائے ورنہ اگر دائی صرف صفائی سے کام کرے تو بہت سی جانیں بچ سکتی ہیں

اگر لوگوں کو یہ معلوم ہو کہ جب چوہے پلیگ میں مبتلا ہو جاتے ہیں تو ان کے پسّو جو چوہوں کے بر پر ہوتے ہیں ان کا خون چوس لیتے ہیں اور اگر یہ پسّو بیمار چوہوں کا خون چوس کر انسان کا خون چوسیں تو پلیگ کا زہر انسان کے جسم میں داخل کر دیتے ہیں جس سے آدمی کو بھی پلیگ ہو جاتا ہے۔ اس لئے اگر چوہے نہ ہوں تو پلیگ کی بیماری کبھی ایک مکان سے دوسرے مکان میں پھیلنے نہ پائے۔ تو لوگ چوہوں کے مارنے کے مخالف نہ ہوں۔

اب جبکہ یہ معلوم ہو گیا کہ زیادہ تر بیماریوں کا زہر علٰحدہ علٰحدہ ہے اور جب تک وہ زہر جسم میں داخل نہ ہوگا وہ بیماری نہ ہوگی، جیسے گیہوں کے بونے سے گیہوں اور جَو بونے سے جَو پیدا ہوگا۔ اسی طرح اگر پلیگ کا زہر جسم میں داخل ہوگا تو پلیگ کی بیماری ہو جائیگی اور اگر ہیضہ کا زہر جسم میں داخل ہوگا تو ہیضہ کا حملہ ہوگا۔ تپ دق کا زہر جسم میں داخل ہوگا تو تپ دق اور جوڑی بخار کا زہر جسم میں داخل ہوگا تو جاڑا اور بخار کا دورہ ہوگا۔ اور پیپ بنانے والا زہر جسم میں داخل ہوگا تو پیپ پڑ جائے گی ورنہ زخم پیپ پڑے بغیر اچھا ہو جائیگا۔ یہ سب قسم کے زہر گندگی میں پرورش پاتے ہیں، اسی قبیل سے کیڑے بھی جو مچھر، پسّو، کھٹمل اور چوہوں کی طرح گندگی میں پرورش پاتے ہیں ایک بیمار سے دوسرے تندرست آدمی میں بیماری پہونچا دیتے ہیں۔ اس لئے تندرستی ٹھیک رکھنے کی سب سے بڑی تدبیر یہ ہے کہ شہر سے گندگی دُور کی جائے جس طرح جنگ میں دشمن کے ملک میں جا کر لڑائی لڑنا چاہیئے تاکہ اپنا ملک تباہی سے محفوظ رہے۔ اسی طرح بیماریوں کا زہر انسانی جسم سے باہر جہاں کہیں ملے وہاں سے نیست و نابود کر دینے کی کوشش کرنا چاہیئے اور اس بات کا انتظار نہ کرنا چاہیئے کہ جب جسم میں داخل ہو کر وہ نقصان پہونچائے اس وقت اس کی فکر کیجائے امراض کے زہر جو کوڑے کرکٹ اور گندہ نالیوں میں ہوتے ہیں اس لئے ان کی صفائی بہت ضروری ہے اور مکان ہمیشہ ایسا بنانا چاہیئے جس میں دھوپ اور ہوا کا پورا گذر ہو کیونکہ ہوا اور دھوپ دونوں سے بہت سے زہر خود بخود ضائع ہو جاتے ہیں۔ پوری تندرستی کی حالت میں یہ زہر اگر جسم میں داخل بھی ہو جائیں تب بھی سرسبز نہیں ہو سکتے ہیں بلکہ جسم کے اندر ہی مر جائینگے۔ اسلئے جسم کو تندرست رکھنا بھی مقدم ہے جسکے لئے صاف ہوا صاف پانی اور عمدہ غذا کا استعمال ضروری ہے۔ ہمارے طور طریقے اور طرز معاشرت اس قسم کی ہونی چاہیئے جس سے تندرستی کو ترقی ہو

اُردو کی چار مثنویاں

(از جناب طالب الہ آبادی)

اُردو شاعری سے دلچسپی رکھنے والے خوب جانتے ہیں کہ اُردو کی مثنویاں تعداد کے لحاظ سے فارسی مثنویوں سے اگر زیادہ نہیں تو کم بھی نہیں ہیں۔ اقسام کے اعتبار سے رزمیہ، بزمیہ، بیانیہ، مدحیہ عشقیہ اور ظریفانہ غرض ہر طرح کی مثنویاں موجود ہیں۔ عمدگی کو لیجئے تو سحر البیان، گلزار نسیم، صبح تجلے اور معراج المضامین کو چھوڑ کر زہر عشق، حسن خیال، شاہنامہ اسلام اور بحری کی صوفیانہ، میر کی مضحک اور مومن کی جگر دوز مثنویاں اپنا جواب نہیں رکھتیں۔

مثنوی کا لکھنا سہل بھی اور مشکل بھی ہے۔ سہل اس لئے کہ بحر کی قید سے قطع نظر نہ ردیف کی قید ہوتی ہے اور نہ اشعار کی، جس مضمون کو چاہیئے۔ جتنے شعر چاہیئے اس پر کہتے چلے جائیے کوئی روک ٹوک نہیں۔ مشکل اس لئے ہے کہ جب تک شاعر فطرتِ انسانی کا سمجھنے والا اور زبان پر پوری قدرت رکھنے والا نہ ہوگا اُس سے قدم قدم پر لغزشیں ہونگی۔ مضامین کا ربط بڑی مشکل چیز ہے، کونپل سے کونپل پھوٹے، بات سے بات نکلے جب ہی مزہ ہے۔ وسعت ہو مگر ناگوار طوالت نہ ہونے پائے ورنہ ساری محنت برباد ہو جائے گی۔ ایک ہی مضمون پھیلا کر بہت سے اشعار میں ادا کیا جا سکتا ہے۔ لیکن پھیلاؤ ایسا ہی ہونا چاہیئے جیسے سورج اپنی کرنوں کو یا دوشیزۂ شام اپنے بالوں کو پھیلاتی ہے۔ ربط بھی ایسا ہونا چاہیئے کہ زبردستی کی کڑیاں اور صرف فن کی بندشیں نہ معلوم ہوں جب تک واقعات پر عبور اور فطرت انسانی کی پوری معلومات نہ ہوں گی اُس وقت تک نہ اثر ہوگا اور نہ دلچسپی پیدا ہوگی۔

سحر البیان اور میر حسن سے ہم آپ سب واقف ہیں۔ شرر اور چکبست کا مکمل معرکہ ایک طرف خود سحر البیان پر اکثر بسیط مضامین موجود ہیں، کاشف الحقائق میں روح تنقید اور دوسرے تذکروں میں اس پر خوب دل کھول کر بحث کی گئی ہے۔ اُردو رسائل میں بھی مضامین شائع ہوتے رہے ہیں۔ قبول عام کا یہ حال ہے کہ ۱۱۹۹ھ میں لکھنؤ میں لکھی گئی اور ۱۸۰۲ء میں کلکتہ پہونچ گئی چنانچہ جب حیدری صاحب حاتم طائی لکھنے بیٹھے تو سحر البیان سے حاشیئے سجالئے۔

یہ مثنوی ہر جگہ اور ہر زمانے میں چھپی، ظاہر ہے کہ ایسی کامیاب مثنوی میں بہت سی خوبیاں ہونگی، مگر اس مختصر سے مضمون کا مقصد یہ ہے کہ اس کے خاص خاص محاسن بیان کر دیے جائیں' اور آپ کو راقم کی رائے سے اختلاف ہو یا اتفاق مگر جو رائے قائم کیجئے وہ خود مثنوی کے مطالعہ کے بعد کیجئے

(۱) اس مثنوی کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس کی زبان نہایت صاف ستھری اور بڑی پیاری ہے۔ شمس العلما آزاد کو آبحیات لکھتے وقت یہ محسوس ہو رہا تھا کہ سَو برس کے قریب گذرنے پر بھی سحرالبیان کی زبان سے بہت کم فرق ہوا ہے۔ آج ۱۹۳۲ء میں بھی ہم کو آزاد کا ہمخیال ہونا پڑتا ہے کہ اس مثنوی میں جو لفظ جہاں کے لئے مناسب تھا وہیں صرف ہوا ہے، نفس مضمون کے علاوہ ترنم کا بھی پاس رکھا گیا ہے اور لطف یہ کہ کہیں بھی آورد کا نام و نشان نہیں ہے۔ ہندی کے جو لفظ آئے ہیں سب کے سب ایسے پیارے اور دل لبھانیوالے ہیں کہ زبان انھیں پڑھکر چٹخارے لیتی ہے۔ مزہ یہ ہے کہ جو لفظ اب متروک سمجھے جاتے ہیں، وہ بھی ایک خاص کیفیت رکھتے ہیں۔

دوسرے اس کے اندازِ بیان میں ترتیب، ربط، توازن، اُتار چڑھاؤ، بے ساختگی، صفائی اور روانی سبھی کچھ موجود ہے۔ ہر لفظ کی تشریح میں سحرالبیان کے متعدد شعر لکھے جا سکتے ہیں۔

تیسرے واقعہ نگاری میں مبالغہ کی چاشنی ہے مگر کیف کو صدمہ نہیں پہونچتا جس کی وجہ سے فطری عناصر درہم برہم نہیں ہونے پاتے، کہیں بھی دو مختلف مناظر ایک ہی طرح سے بیان نہیں کئے گئے ہیں۔

چوتھے قصے کی بندش ہر صورت سے مکمل ہے، بدرمنیر اور بے نظیر کی داستان سب سے زیادہ اہمیت رکھتی ہے، مگر نجم النسا اور پری کی کہانیاں بھی اصل قصے کا جزو معلوم ہوتی ہیں اور اپنی جگہ ضروری اور دلچسپ ہیں۔

پانچویں، سحرالبیان اپنے ماحول کا ایک صحیح مرقع ہے کیونکہ اسمیں رسوم۔ لباس، مشاغل اور رواج کے پورے نمونے موجود ہیں۔

چھٹویں، کردار نگاری، مصوری اور سیرت نویسی کے اعتبار سے بھی سحرالبیان میں ڈراما کی تمام امتیازی خصوصیات موجود ہیں، اس کے تمام افراد داستان کا موازنہ بہت لطیف ہے اور نجم النسا تو حسن، موقع شناسی، موسیقی، شرارت، بیباکی اور استقلال کی ایک جیتی جاگتی مورت معلوم ہوتی ہے۔

ساتویں، اس میں اخلاقی پہلو کہیں چھوٹنے نہیں پایا ہے۔

رموز العارفین اور گلزار ارم تو دُور ہیں جتنی خوبیاں اس ایک سحرالبیان میں ہیں مصنف کی کسی دوسری تصنیف میں نہیں ہیں، در اصل یہ اس کی آخری تصنیف ہے

(۲) گلزارِ نسیم

اُردو کی دوسری سب سے بڑی مثنوی گلزارِ نسیم ہے۔ گل بکاؤلی کا قصہ اُردو نثر میں بہت دنوں سے تھا۔ پنڈت دیا شنکر نسیم نے نظم کا جامہ پہنایا اور شاہد معنی پر یہ نیا لباس ایسا پھبا کہ اب صورت بھی پہچانی نہیں جاتی۔ پُرانی شراب اور نیا جام، ساقی کی اداؤں نے سارے میکدہ کو مدہوش کر دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سحر البیان اور گلزارِ نسیم کے آگے کسی تیسری مثنوی کو شہرت حاصل نہ ہو سکی۔

گلزارِ نسیم پر تنقید کرتے وقت یہ بات نہ بھولنی چاہیئے کہ وہ ۱۲۵۴ھ کی تصنیف ہے اور آجکل کے اور اُس زمانہ کے مذاق میں قطبین کا فرق ہے، کوئی وجہ نہیں کہ ہم اپنے موجودہ مذاق کے معیار سے اُس زمانہ کی شاعری کو جانچیں۔

گلزارِ نسیم کی خصوصیات میری نگاہ میں حسب ذیل ہیں۔

(۱) اول تو زبان کے اعتبار سے وقار، شوکت، دبدبہ، ترنم، صحت اور دلکشی سب کچھ اسمیں موجود ہے قوافی اضافت بھی ہے اور تشبیہات بھی ہیں مگر بندرت برجگہ ہے۔ نسیم نے جس کامیابی اور خوش اسلوبی کے ساتھ صنائع صوری و معنوی دونوں کا دل کھول کر صرف کیا ہے اسکا اُردو میں آج تک جواب نہیں ہے

(۲) طرز بیان کے اعتبار سے یہ مثنوی اپنے زمانہ میں بے نظیر سمجھی جاتی ہے۔ اگر ہم تصور کی مدد سے تھوڑی دیر کے لئے اپنے آپ کو اسی دنیا میں منتقل کر سکیں تو یہ اجنبیت بڑی حد تک کم ہو جائیگی۔

(۳) اسکے بھیانک مناظر خاص طور پر اچھے ہیں البتہ درد کم ہے مگر اُردو میں اسکی کمی کوئی تعجب کی بات نہیں ہے

(۴) اس کا اختصار بے نظیر اور نہایت لطیف ہے۔

(۵) جہاں کہیں سادگی سے کام لیا گیا ہے وہاں طرز بیان از حد دلکش ہو گیا ہے

(۶) اس میں ابتذال بہت ہی کم ہے اور اگر کہیں ہے بھی تو قابل لحاظ نہیں ہے۔

(۷) اسکا خاکہ اور سیرت نگاری قریب قریب وہی ہے جو نثر کے قصہ میں تھی۔

(۸) اس میں محاورات اور ضرب الامثال بڑی کثرت سے ہیں، قدرت کلام اور زور بیان تو ہر جگہ موجود ہے۔

(۹) فن کے اعتبار سے مثنوی گلزارِ نسیم میں بہت ہی کم نقص ہیں۔ اور نسیم کی ساری عمر کی یہی کمائی ہے۔

(۳) صبح تجلّی

اُردو کی تیسری مثنوی صبح تجلّی در اصل رسول مقبول کا میلاد نامہ ہے۔ محسن کاکوروی غالبؔ

اُردو زبان کے سب سے پہلے شاعر ہیں جنھوں نے اپنی ساری عمر صرف مدح و نعت و منقبت میں صرف کی۔ یہ مثنوی بھی اُنھیں کی تصنیف ہے۔

اس کی سب سے نمایاں خوبیاں یہ ہیں کہ۔

(۱) مصنف نے اس میں جوشِ عقیدت کے دریا بہا دئے ہیں۔ جس کی وجہ سے مثنوی پڑھتے وقت ایک خاص قسم کا روحانی جوش محسوس ہوتا ہے

(۲) ساری مثنوی قرآنی آیات، احادیث اور اسلامی تاریخ سے معمور ہے۔

(۳) اسمیں جہاں کہیں مبالغے سے بھی کام لیا گیا ہے مخاطب کی بزرگی اور جلالت کے سامنے وہ مبالغہ نہیں معلوم ہوتا ہے۔

(۴) اسمیں جہاں کہیں صنائع بدائع سے کام لیا گیا ہے وہاں شاعر کے کمال فن اور اس کی مشاقی کا ثبوت ملتا ہے۔

(۵) اسمیں رعایات کی کثرت ہے مگر اس کثرت سے اسکی شاعرانہ کیفیت میں نقص نہیں آنے پاتا۔

(۶) اس مثنوی کی تشبیب، گریز اور مدح سب میں قصیدے کی شان ہے اور اس کے لفظ لفظ سے شاعر کی دلی عقیدت کا اظہار ہوتا ہے۔

(۴) معراج المضامین

اُردو کی چوتھی مثنوی معراج المضامین منیر کی تصنیف ہے۔ اُردو ادب سے دلچسپی رکھنے والے خوب جانتے ہیں کہ صحت زبان، ترک متروکات اور نکاتِ فن کے اعتبار سے اُردو زبان کے مانجنے اور صاف کرنے میں جو کام ناسخ نے کیا ہے وہ آپ اپنی مثال ہے۔ منیر مرحوم بھی ناسخ کے شاگرد اور پیرو تھے معراج المضامین لکھکر اُنھوں نے ہر لحاظ سے اُردو ادب میں ایک قابل فخر اضافہ کیا ہے۔

(۱) اِس مثنوی میں مفروضہ قصّے اور ناقابل یقین داستانیں نہیں ہیں بلکہ یہ مجموعۂ صداقت، طرز بیان اور پاکیزگی و تاثیر کے اعتبار سے بہت بلند ہے۔

(۲) اس کی سب مثنویاں ایک ہی بحر میں ہیں اور حمد سے لیکر بارھویں امام کے معجزات تک اس میں نہ کہیں تکرار ہے نہ طوالت بلکہ ندرت اور دلپذیری بڑھتی جاتی ہے

(۳) فصاحت و بلاغت اور معلومات کے اعتبار سے واقعی یہ مجموعہ مضامین کی معراج ہے۔

(۴) شاعر نے واقعات، معجزات اور حالات بیان کرنے میں کہیں بھی تاریخی اور تحقیقی پہلو نظر انداز نہیں ہونے دیا۔

(۵) ہندی الفاظ کا استعمال بہت ہی لطیف ہے، عربی اور فارسی الفاظ کے ساتھ ہندی بھاشا اور سنسکرت کے الفاظ نہایت باموقعہ استعمال ہوئے ہیں

(۶) اس میں قدرتی مناظر کا بیان نہایت دلچسپ ہے، شاعر نے مذہبی روایات کے بیان کرنے میں بھی ادبی لطف کو نظر انداز نہیں کیا ہے۔

اب اِن چاروں مثنویوں کے نمونے بھی ملاحظہ فرمائیے:۔

اِنتخاب مثنوی صبح تجلیٰ

بیضاوی صبح کا بیاں ہے — تفسیر کتاب آسماں ہے
واللیل کو ختم کر چکا ہے — آمادۂ دورِ والضحیٰ ہے
پستی کا دماغ آسماں پر — اوجِ افلاک مہر گستر
موقوف حدیثِ شب کی تصبیح — رکھ دیجئے طاق پر مصابیح
سبزہ ہے کنارِ آب جو پر — یا خضر ہے مستعد وضو پر
تسبیح شگوفہ یا مصور — تحریرِ تاک ربِ اغفر
خدمت میں بہار کی صبا ہے — سبزہ سنبل کا بالکا ہے
القاب نسیم دامن دشت — مخدوم جہانیاں جہاں گشت

معراج المضامین

صریرِ کلک اگر دلخواہ نکلی — صفیرِ مرغ بسم اللہ نکلی
خدائے واحد و قیوم و دانا — قوی و قادر و حی و توانا
بری مالا بری جزوی و کلی — نہیں ہے اس سے کوئی چیز مخفی

سخن جامِ شرابِ زندگانی — سخن آبحیاتِ جاودانی

نہیں بھاتی مجھے خلوت کسی کی — پسند آئی ہے صحبت بے کسی کی

شبِ مشکینہ جال و عنبریں مو — شب کعبہ لباس و خالِ ہندو

اسد ہیبت فلک پیکر قمر سم غنائین دو توں جوزہ سنبلہ دم

یہ سن کر گفتگوے بت پرستاں ہوے خوفِ خدا سے آپ لرزاں
نبوت کھیل تم سمجھے ہو حاشا بنایا معجزہ کوئی تماشا

یہ دنیا بھی ہے اک دریائے مواج ہوئی ہیں کشتیاں لاکھوں کی تاراج

بڑھی شعلہ کو لے کر باد صرصر فنا مت ہٹ گئی دامن بچا کر

طویل القد مہیب الشکل پُرہول سراپا خوف بدترکیب بیڈول
بھلا کیا مکرِ شیطاں کا اثر ہو جب اپنی بھی نہ حضرت کو خبر ہو

سنہری تھالیاں چومک سے روشن تبات، دُوب، تلسی، دھوپ، چندن
بھرے مانگوں میں سیندور اور صندل گلابی مدھ بھری آنکھوں میں کاجل

سحر البیان

کروں پہلے توحیدِ یزداں رقم جھکا جس کے سجدے کو اول قلم
سرِ لوح پر رکھ بیاضِ جبیں کہا دوسرا کوئی تجھ سا نہیں

بنا سایہ اس کا لطیف اس قدر نہ آیا لطافت کے باعث نظر
نظر سے جو غائب وہ سایہ رہا ملائک کے دل میں سمایا رہا

کسی سے نہ کرنی پڑے التجا تو کر خود بخود میری حاجت روا

زہے بے تمیزی و بے حاصلی کہ از فکرِ دنیا و دیں غافلی

کہا رام جی کی ہے تجھ پر دیا چندماں سا بالک ترے ہوئیگا

کہا زن نے ہم سے بہر شگوں کہ دوں وُوں خوشی کی خبر کیوں نہ دوں

صدا قرقروں کی لعلوں کا وہ شور درختوں پہ بگلے منڈیروں پہ مور
چمن آتشِ گل سے دہکا ہوا ہوا کے سبب باغ مہکا ہوا

کنیزان مہرو کی ہر طرف ریل چنبیلی کوئی اور کوئی رائے بیل
کوئی سیوتی اور جوہی کہو کوئی کوئی دل لگن اور تن سکھ کوئی

ہنسا کھلکھلا کر وہ گل نو بہار لیا کھینچ ماؤں کو بے اختیار
عجب عالم اس نازنیں پر ہوا نہ گدگدی کا جبیں پر ہوا

کوئی لبلائی سی پھرنے لگی کوئی صنعت کھا کھا کے گرنے لگی

یہ کہہ کر کہ میرا ہے تیرا نہیں پر اب گھر تو تیرا ہے میرا نہیں

جہاں راستی چاہیئے راستی کجی جس جگہ چاہیئے واں کجی

مرتی حاف ٹک دیکھ تو بارے بنے مثل ہے کہ من بھائے منڈیا ہلائے

سدا عیش دوراں دکھاتا نہیں گیا وقت پھر ہاتھ آتا نہیں
مسافر سے بھی کوئی کرتا ہے پیت مثل ہے کہ جوگی ہوئے کس کے میت

جو پانی پلانا تو بیٹا اسے غرض غیر کے ہاتھ جینا اسے

دوانی سی ہر طرف پھرنے لگی   درختوں میں جا جا کے گرنے لگی

تجھے سیر کرنے کو گھوڑا دیا   کہ اس مال زادی کو جوڑا دیا
نہ سُدھ بُدھ کی لی اور نہ منگل کی لی   نکل گھر سے بس راہ جنگل کی لی

وہ اجلا سا میداں چمکتی سی ریت   اُگا نور سے چاند تاروں کا کھیت
درختوں کے پتے چمکتے ہوئے   خس و خار سارے چمکتے ہوئے
درختوں کے سائے سے مہ کا ظہور   گرے جیسے چھلنی سے چھن چھن کے نور

کبھی تیکھی نظروں سے گھائل کیا   کبھی میٹھی باتوں سے مائل کیا

نہیں مثنوی ہے یہ اِک پھلجھڑی   مسلسل ہے موتی کی گویا لڑی

گلزار نسیم

ہر شاخ میں ہے شگوفہ کاری   ثمرہ ہے قلم کا حمد باری
پانچ انگلیوں میں یہ حرف زن ہے   گویا کہ مطیع پنجتن ہے

پر بحر سخن سدا ہے باقی   دریا نہیں کار بند ساقی

اک نہر تھی شہر کے برابر   ٹھٹکے سیارے کہکشاں پر

آواز پہ وہ لگی ہوئی تھی   آپ آن کے ٹھاٹھ دیکھتی تھی

بلّی کا سر چراغداں تھا   چوہا پاتسے کا پاسباں تھا

کیا لطف جو غیر پردہ کھولے   جادو جو سر پہ چڑھ کے بولے

سایہ کو بتہ نہ تھا شجر کا — عنقا تھا نام جانور کا
مرغانِ ہوا تھے ہوش باہی — نقشِ کفِ پا تھی ریگ ماہی
دانت اسکے تھے گورکن قضا کے — دو تھنے رہ عدم کے ناکے

دیکھ تو وہ گل ہَوا ہوا ہے — کچھ اور ہی گل کھلا ہوا ہے
چاہا گلچیں کا امتحاں لے — پوچھا کہ نگیں جو لے کہاں لے

اک مرغ ہوا اسیرِ صیاد — دانا تھا وہ طائرِ چمن زاد
بولا جب اس نے باندھے بازو — کھلتا نہیں کس طرح یہ ہے تو

آتا ہو تو ہاتھ سے نہ دیجئے — جاتا ہو تو اس کا غم نہ کیجئے
چلنی ڈلی عطر الائچی پان — نقل و مے جام و خوان الوان
کچھ گائیں کلیلیں کر رہی تھیں — بن میں ہری دوب چر رہی تھیں
پتے پھل گوند چھال لکڑی — اس پیڑ سے لے کے راہ پکڑی

اقرار میں تھی جو بے حیائی — شرمائی لجائی مسکرائی

ہمبستر آدمی پری تھی — سائے کے بغل میں چاندنی تھی

ہنستے ہنستے کہا ہنسے کیوں — ہنستا نہیں کوئی بے سبب یوں
جھک جھک کے بدن چراتی آئیں — اِک اِک کے قدم اُٹھاتی آئیں

صورت میں خیال رہ گئی وہ — ہیبت میں مثال رہ گئی وہ

پتھر کی اگر کہو تو میں ہوں — فولاد جگر کہو تو میں ہوں

خیام الہند حضرت ریاضؔ

(از مولانا مولوی سید محمد سبحان اللہ صاحب رئیس گورکھپور۔)

منشی سید طفیل احمد خیرآبادی ضلع سیتاپور کے رہنے والے پھرتے پھراتے انسپکٹر پولیس ہوکر گورکھپور میں تشریف لائے۔ یہ واقعہ ۱۸۷۰ء کے بعد کا ہے، ۱۸۷۰ء سے ۱۸۸۲ء تک صرف بارہ سال ہوتے ہیں جبکہ مسلمانوں کی سلطنت جاچکی ہے، مگر ہندوستان میں جابجا چھوٹی چھوٹی خودمختار نوابیاں قائم تھیں اور مختلف فن کے کاملین ہر شہر میں امراء کے درباروں کی زینت تھے۔ خود امراء ہندوستان سلطنت جانے کے بعد ابھی تک علوم و فنون سے بے بہرہ نہیں ہوئے تھے۔ یہی حال گورکھپور کا بھی تھا کہ یہاں بھی امراء، شرفاء و متوسط الحال لوگ کسی نہ کسی علم یا کسی نہ کسی فن میں دستگاہ رکھتے تھے اس ماحول میں منشی سید طفیل احمد صاحب مرحوم مغفور کا انسپکٹر ہوکر آنا فارسی اور اردو تہذیب اور شوقینی کا ایک مجسمہ ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ منشی سید طفیل احمد صاحب مرحوم و مغفور اپنے سے زیادہ عمر والوں کی مجلس کی رونق افروزی کرنے لگے۔ ان کے لڑکے منشی سید ریاض احمد ریاضؔ گورکھپور کے امراء و شرفاء کے ہم عمر لڑکوں کے ساتھ گھل ملکر کھیلتے اور تعلیم پاتے رہے۔ جو پود ریاضؔ کے ساتھ گورکھپور کے امراء و شرفاء متوسط الحال ہندو مسلمانوں کی بڑھ رہی تھی گویا ایک بھرپور بے شمار خوشبودار پھولوں کا باغ تھا جسمیں ریاضؔ بلبل شیراز بنا ہوا تھا۔ گورکھپور کی جوان ہونے والی جماعت سے لیکر بڑھاپے تک نہ پہونچنے والی تک کی ہر جماعت صبح سے شام تک اور شام سے صبح تک بے ریاضؔ کے زندہ رہنا نہیں چاہتی تھی۔ منشی سید طفیل احمد صاحب مرحوم پولیس انسپکٹر تھے، گھر پر کوئی جائداد نہ تھی جو کمائی تھی وہی آزوقہ تھا۔ خیام الہند ان کا بیٹا اس طرح کے باپ کا بیٹا، مگر اہل گورکھپور میں اس طرح پل رہا تھا کہ امیر سے امیر کا بیٹا اور ریاضؔ دن رات کی زندگی میں ایک دوسرے سے ممتاز نہ تھے۔ جب گورکھپور کے پھولوں کا باغ اپنے شباب پر آیا تو اس وقت صوبۂ متحدہ ایک خاص قسم کے لٹریچر سے گونج رہا تھا۔ وہ لٹریچر اس مانجھی کا تھا جس نے علیگڈھ میں ایک ناؤ تیار کرنی چاہی تھی جس کا نام مدرستہ العلوم تھا اور اس مانجھی کا نام سید احمد خاں تھا۔ مرحوم سید احمد خاں نے علی گڈھ سے تہذیب الاخلاق "

نکلا تھا جس کے جواب میں سارے ہندوستان کو چھوڑ دو تو صرف صوبۂ متحدہ میں کوئی ضلع ایسا نہ تھا جہاں سے متعدد پرانے یا نئے اخبار یا رسالے نہ نکل رہے ہوں۔ گویا صوبۂ متحدہ میں تہذیب الاخلاق کے موافق اور مخالف لٹریچر کی آگ مشتعل ہو رہی تھی، کوئی گھر پڑھے لکھوں کا ایسا نہ تھا جس میں تہذیب الاخلاق اور اس کے موافقین یا اس کے مخالفین کا کوئی نہ کوئی اخبار یا رسالہ نہ آتا ہو۔ خیام الہند اگرچہ جوان ہو کر باپ کی ہم پیشگی کی وجہ سے گورکھپور ہی میں سب انسپکٹر ہو گئے تھے مگر یہ معمولی روزی کا سامان تھا اور نہ دن رات کی اہل گورکھپور کی صحبتیں اور اس قسم کا لٹریچر ان کی زندگی کی اٹھان کا ایک اہم معاملہ تھا۔ یہی وہ زمانہ تھا کہ منشی امیر جگت استاد شاعری موجود تھے، مگر منشی سید امیر احمد مینائی علیہ الرحمۃ ان کے مکمل شاگرد اب ان کی جگہ لینے والے تھے۔ چنانچہ انھوں نے ان کی جگہ لی اور گورکھپور کی من چلی جماعت نے جس میں ریاض بھی شامل تھے منشی امیر احمد کی شاگردی اپنا افتخار سمجھا۔ کوئی اور استاد زمانہ شاعری کا اس وقت گورکھپور پر قابض نہ تھا۔ اسی فضا کے اندر منشی ریاض احمد کے ایک عزیز منشی سید نظام احمد رئیس خیرآبادی بھی گورکھپور میں تشریف لائے۔ باپ سے کچھ روپیہ مار لائے تھے دونوں نے ملکر ریاض الاخبار جاری کیا۔ "ریاض الاخبار" گورکھپور۔ لکھنؤ میں "اودھ پنچ" "اودھ اخبار" "دلگداز" کانپور میں "زمانہ" آگرہ۔ مرادآباد اور کہاں کہاں انھیں ریاض احمد کے ہم عمر لوگوں نے اخبارات جاری کئے تھے جسمیں "ریاض الاخبار" کا مرتبہ اپنے لٹریچر کے اعتبار سے کسی دوسرے نمبر پر نہ تھا۔ پنڈت رتن ناتھ سرشار مصنف فسانۂ آزاد۔ نثار حسین۔ سجاد حسین۔ مولوی عبدالحلیم شرر، ناصر علی دہلوی اور معلوم نہیں کتنے باذوق اور ٹھوس لکھنے والے اس وقت کی فضا میں گونج رہے تھے۔ جب ریاض احمد کا لٹریچر اپنی بہاریں دکھا رہا تھا۔ شاعری کا یہ حال تھا کہ گورکھپور کی چوبیس گھنٹے کی صحبت مشاعروں کی صحبت تھی، یہ مشاعرے باقاعدہ نہ تھے بلکہ ہر صحبت باقاعدہ مشاعرہ تھی۔ منشی سید ریاض احمد بچپن سے اس قدر شوخ و شریر واقع ہوئے تھے کہ ان کا کوئی ملنے والا ان کی شوخی و شرارت کا شکار ہونے سے بچا نہ تھا۔ نثر میں وہی شوخی، نظم میں وہی شوخی، لیکن قاعدہ ہے کہ جوانی کی امنگ تک ہر شخص کم و بیش شوخی برتتا ہے، عمر بڑھتی ہے تو متانت آتی جاتی ہے مگر منشی ریاض احمد سر سے پیر تک اس قدر شوخ تھے کہ متین بننا چاہتے تھے مگر بن نہیں سکتے تھے۔ میں نے اردو کے پچاس شاعروں کا کلام اول سے آخر تک دیکھا ہے جسمیں اُن کا ابتدائی متوسط اور آخری دور سب شامل ہوگا۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ ابتدائی کلام ہے، اب متانت آرہی ہے، اب متانت آگئی۔ ریاض کی شوخی کا قدرت کی طرف سے ایسا پختہ رنگ تھا جو کبھی پھیکا نہ پڑا۔ ابتدائی کلام کا ایک شعر سنیئے:۔

اوڑھی ہیکل کو چوم لے گی وہ چیز جو کچھ اٹھی اٹھی ہے

آخری عمر کا شعر ملاحظہ ہو:۔

ریاض اب شکل بھی بدلی مذاق طبع بھی بدلا یہ سن کا ہے کا تقاضا جو خیال حور آتا ہے

منشی ریاض احمد کی یہ بات کوئی زیادہ قابل ذکر نہیں ہے (مگر ان کی طبیعت کی شوخی اور رنگینی دکھانے کو لکھ رہا ہوں) کہ انھوں نے جب سید احمد خانی دور ہوا تو ترکی ٹوپی جس میں "چاند تارا" لگا ہوتا اور چندنا سنہرا ہوتا زیب سر کرتے تھے۔ اسی سید احمد خانی دور میں ترکی کوٹ جو پیچھے سے کٹا ہوتا اور کمر کے قریب دو بٹن لگے ہوتے رائج تھا۔ انھوں نے شیروانی میں پیچھے یہی چیز بنوائی۔ آگے بالا بر کھلا ہوا اور بٹن کھلے ہوئے اور دونوں پہلوؤں سے اسی کپڑے کا دو ٹکڑا ادھر اُدھر سے آ کر بٹن بند ہوا کرتا جس سے معلوم ہوتا کہ یہ شیروانی یا مصنوعی ترکش کوٹ کے نیچے واسکٹ پہنے ہوئے ہیں۔ اس طرح گریبان چاک جھومتا ہوا ریاض کا چلنا ایسی انوکھی مستانی ادا تھی کہ جس کی مثال ان کے مرتے دم تک ہندوستان بھر میں مجھے کیا کسی کو بھی نظر نہ آئی:۔

ہے ریاض ایک جوانِ مست خرام نہ پیئے اور جھومتا جائے

ہاں اس وقت گورکھپور کی وہ صحبت جس میں ریاض بلبل شیراز بنا ہوا تھا بے کم و کاست خوش باش خوش پوشش، عیش و انبساط میں گذارنے والے لوگوں کا مجموعہ تھی اور اگر اس صحبت میں دو درجن آدمی تھے تو ڈیڑھ درجن ضرور شرابی تھے۔ ریاض کی شاعری منشی امیر احمد صاحب کی اصلاح کے ساتھ یہاں شوخی و شرارت اور اس ماحول مستی میں گامزن تھی۔ ریاض اس طرح کی شراب اور صحبت میں ایک قطرۂ شراب سے ناآشنا تھے، مگر طبیعت کی شوخی و شرارت، دوستوں کی شراب نوشی شاعری میں لطافت پیدا کرنے کی شراب نوشی ان سب نے ملکر ریاض کو "خیام الہند" بنا دیا۔ ریاض کے کلام میں ایک خاص بات ہے جو میں آپ کو بتانا چاہتا ہوں۔ سارے ہندوستان کے شعرا کے کلام میں سے شراب کے مضمون کا انتخاب کیجئے اور ریاض کے کلام سے شراب کے مضمون کا انتخاب کیجئے تو سب ملکر ریاض کے یا برابر ہونگے یا کچھ گھٹ بڑھ جائیں گے۔ دوسری بات ریاض کے شراب کے مضمون میں یہ ہے کہ ریاض کی شراب کی شاعری اصل شراب کی اداؤں سے شروع ہوتی ہے اور بعد کو اس میدان کو چھوڑ دیتی ہے اور شراب عرفاں کی حد میں آجاتی ہے۔

ریاض نے "ریاض الاخبار" نکالا "فتنہ" اور "عطر فتنہ" نکالا۔ اس کے بعد کمپنی کی صورت میں جب منشی سید عبدالکریم برہم کو انھوں نے بھوپال سے بلایا تو روزانہ "صلح کل" نکالا۔ یہ واقعہ ۱۹۰۳ء کا ہے۔

ریاض الاخبار" و "صلح کل" برابر برابر چلتے رہے۔ آخر کار ریاض الاخبار مالی مشکلات کی وجہ سے بند ہو گیا "صلح کل" جاری رہا۔ یعنی ۱۸۸۱ء سے ۱۹۰۹ء تک بلا فصل ریاض گورکھپور ہی میں رہے۔ "صلح کل" بھی بند ہوگیا تو ریاض سے گورکھپور کو بے اخبار چھوڑتے نہ بنا تو حکیم برہم سے مشرق نکلوایا۔ خود دو تین سال کے لئے لکھنؤ چلے گئے مگر ۱۹۳۱ء تک ریاض صاحب کا گورکھپور سے یہ تعلق رہا کہ اگر وہ خیرآباد میں رہے تو ہر روز عازم گورکھپور رہے۔ ریاض کی غزلوں کا مجموعہ مکمل طور پر انکا دیکھا اور صحت کیا ہوا میرے بیٹے مولوی سید رضوان اللہ ایڈوکیٹ کے پاس چھپنے کی غرض سے آچکا ہے اور محفوظ ہے

ریاض صاحب کا انتقال کوئی نئی چیز نہیں ہے جس پر بڑی لمبی چوڑی آہ و واویلا کی جائے۔

"موت" اس خدا کا حکم ہے جس کے حکم سے پیدائش ہوتی ہے۔ پیدائش اگر رونے کی چیز ہے تو موت بھی رونے کی چیز ہے میرے نزدیک تو کامیاب موت جیسی کہ ریاض کی ہوئی ہے ہزارہا بلکہ لاکھوں ناکامیاب پیدائش سے لبسا قابل مبارک باد ہے کہ اب ان کے کارنامے جو ہم نا اہلوں کے پاس ہیں آج اصلی مالک کے سامنے ہیں جس سے حقیقی صلہ ملنے والا ہے، اور ظاہر ہے کہ ریاض کی صورت شکل طور طریقہ اور اس قدر وسیع دائرہ کے ملنے والے آدمی سے کسی کا ناخوش نہ ہونا ان کی بخشایش کی بہترین گواہی ہے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

خیام کی شاعری پر تبصرہ تو میں آئندہ فرصت میں لکھوں گا مگر سید ریاض احمد ریاض کا ذکر آجائے اور میں کوئی شعر اُن کا نہ پڑھوں یہ بے بس سے باہر ہے لہذا دو چار شعر سُن لیجئے۔

خیام نے چار مصرعوں میں اہتمام کیا تو مہینہ بھر سویا، ریاض نے دو مصرعوں میں قیامت سے اُدھر تک کی خبر لے لی:۔

خیام

گویند کہ ماہِ رمضاں گشت پدید — من بعد بگرد بادہ نتواں گردید
در آخرِ شعباں بخورم چنداں مے — کاندر رمضاں مست بخسپم تا عید

ریاض

پی لی تھی کچھ کہ چین سے گذرے شب لحد — دن ڈھل چکا ہے حشر کا ابتک خمار ہے

آخر کہیں بنائیں زمیں پر بنائینگے — ٹوٹے گا آسمان جہاں گھر بنائینگے

نسخہ بیاضِ ساقیِ کوثر سے مل گیا　　گھر بیٹھے اب تو بادۂ کوثر بنائیں گے

جس شعر کو مجھ نااہل نے نعت کا شعر سمجھا اور ریاضؔ کو اپنی سمجھ کے مطابق داد دی وہ شعر بھی ملاحظہ ہو:۔

گل مرقع ہیں ترے چاک گریبانوں کے　　شکل معشوق کی انداز ہیں دیوانوں کے

(۴)

ریاضؔ کی نثر کی بابت اوپر لکھ چکا ہوں کہ تہذیب الاخلاق کے دَور کے مخالف اور موافق تحریریں ریاض یا ریاضؔ کی وجہ سے ریاض الاخبار کو صوبہ کے کسی ٹھوس لکھنے والے نے نمبر۲ پر نہیں رہنے دیا۔ اب میں ریاضؔ کی نثاری کا دوسرا دَور دکھاتا ہوں۔ ریاض اسی ضلع میں سب انسپکٹر ہو گئے تھے، اور ایک سپرنٹنڈنٹ پولیس مسٹر ڈیوس گورکھپور میں آئے تو اُن کو اپنی پیشکاری میں لے لیا۔ مسٹر ڈیوس دائم الخمر انگریز تھے۔ اپنی کوٹھی میں برآمدہ سے لیکر ہر کمرہ کے دروازے پر ٹٹی پردے ڈالے رہتے تھے، خود کمرے اونچے پایوں کے نواڑ کے پلنگ پر بغیر بستر کے بنیائن اور دھوتی پہنے ہوئے لیٹے رہتے چاروں طرف برف کی سلیں رکھی ہوتیں اور ایک طرف تھرمنٹی ڈوٹ چلتا رہتا، شمع جلتی رہتی۔ لالٹین لیمپ کوٹھی کے احاطہ میں نہیں آسکتے تھے۔ ایسے گرم مزاج کی پیشکاری ریاضؔ کو کرنا پڑی۔

مسٹر ڈیوس انگریزی کا زبردست انشا پرداز تھا، اُردو کے احکام میں ویسا ہی زبردست لٹریچر چاہتا تھا جو کہ اس کو ریاضؔ کی بدولت مل گیا۔ یہاں تک تو میں نے مسٹر ڈیوس کے مزاج کا حال لکھا۔ اب ملاحظہ ہو کہ مسٹر ڈیوس پر ان کی کوٹھی کے گارد کے کانسٹبل نے دو فیر کئے۔ ضلع کے کلکٹر ملنے آئے، ملنے سے انکار کر دیا۔ لفٹنٹ گورنر اور انسپکٹر جنرل ان کی کوٹھی کا معائنہ کرنے آئے، اُن سے بھی نہیں ملا۔ اب ضلع کا کلکٹر مع اپنے تمام ڈپٹی کلکٹروں کے، اور پولیس سب انسپکٹروں اور انسپکٹروں کے ایک دم ڈیوس صاحب کے خلاف ہو گئے۔ اُس وقت کا تھراتا ہوا، گرجتا ہوا، گونجتا ہوا، اُردو لٹریچر کے ہتھیاروں سے اسی طرح آراستہ جیسے پرانے زمانہ میں عورتیں بارہ ابھرنگ، سولہ سنگار کیا کرتی تھیں چھم چھم کرتا ہوا "ریاض الاخبار" کا ایڈیٹوریل رقص کناں خلوت وجلوت میں ہر ہفتہ اپنی جلوہ گری کرتا تھا جس میں ایک انگریز کی طرفداری، دوسرے پر چوٹیں، ہفتہ بھر کی بنائی ہوئی اسکیم "ریاض الاخبار" کے ایڈیٹوریل کے انتظار میں رُکی رہتی۔ اخبار نکلتے ہی وہ اسکیم باد ہوا سمجھ کر فیل کر دی جاتی۔ اور پھر ہفتہ بھر انتہائی زور لگا لگا کر دوسری اسکیم تیار ہوتی۔ پھر اخبار نکلتا اور وہ اسکیم اور اسکیم والے ایکدم چت گر جاتے۔ تیسری مرتبہ اور اہتمام کے ساتھ دوسری اسکیم تیار ہوتی اور پھر اخبار کے نکلتے ہی اس پر اوس پڑ جاتی اسی طرح ہر ناکامی کے

بعد ضلع میں کلکٹر اور اس کا کل محکمہ اور پولیس کا کل محکمہ ہر بار اسکیموں کی ناکامیابی کے غصہ میں کچھ اور غیر محکمے والوں کا اضافہ کرتے اور اسی ہفتہ اخبار کا انتظار کرنے کے بعد ردّی کی ٹوکری میں اس اسکیم کو ڈالنا پڑتا۔ مسٹر ڈیوس کی مخالفت کی آگ صرف گورکھپور کے ضلع میں نہ تھی بلکہ گورنمنٹ کے تمام محکموں میں لگی ہوئی تھی۔ سید ریاض احمد کا ذوالفقاری ایڈیٹوریل ہر معرکہ کو فتح کرتا چلا آرہا ہے یہ جنگ پورے ایک سال تک لڑی گئی، اور آخرکار پورے ضلع اور گورنمنٹ نے تھک کر کاغذات داخل دفتر کردیے اور مسٹر ڈیوس کے خلاف ایک لفظ نہ لکھا جاسکا۔ چنانچہ مسٹر ڈیوس کو یہاں سے بریلی بھیجا چھ مہینہ تک کوئی کام نہیں لیا، علیگڈھ میں تعینات کیا، مسٹر ڈیوس نے بریلی ہی سے گورنمنٹ سے لڑنا شروع کیا اور علیگڈھ میں اُن کو پھر منشی ریاض احمد کو بلانے کی ضرورت واقع ہوئی۔ منشی ریاض احمد مسٹر ڈیوس کے گورکھپور چھوڑتے ہی مستعفی ہوگئے تھے، وہ پھر وہاں گئے اور چھ مہینے تک ریاض کا قلم پھر مسٹر ڈیوس کے لیے سپر بنا رہا۔ یہاں تک کہ ڈاکٹروں کے قطعی رائے دینے سے مسٹر ڈیوس کو ولایت جانا پڑا۔ آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ اخباروں سے ریاض کا لٹریری مجادلہ اور جینز ہے اور اس طرح کے معرکہ میں ذمہ دارانہ مضمون اس طرح پر کہ پورا ضلع اپنی اسکیم لیکر کانپ اُٹھتا ہو لکھنے والے کے دماغ کے کس حصہ کی داد دی جاسکتی ہے۔ اب ریاض کا لٹریچر اور ریاض کا قلم بے پناہ ہوگیا جس ضلع کے جس حاکم کے متعلق ایک نوٹ لکھ دیا اُس کا پرائیویٹ آدمی دوڑتا ہوا ریاض تک پہنچتا ہے اور منتیں اور خوشامدیں کرتا ہے۔ جس ریاست کے متعلق ایک ایڈیٹوریل لکھدیا ریاض کو فرسٹ کلاس کے اخراجات کے ساتھ وہاں کا معزز آدمی لینے آیا ہے۔ اور بارہا اس مستغنی المزاج شخص نے اس کو ٹھکرا دیا۔

(۳)

اب میں یہ بتلانا چاہتا ہوں کہ مجھ سے اور میرے گھرانے سے منشی سید ریاض احمد کا کیا تعلق تھا سید ریاض احمد مرحوم کے والد منشی سید طفیل احمد صاحب جب گورکھپور میں انسپکٹر ہوکر آئے تو اُس وقت میرے دادا مولوی حبیب اللہ صاحب مرحوم مغفور سب ججی سے پنشن لیکر خانہ نشین ہوچکے تھے اور گورکھپور کے ہندو مسلمانوں کی ممتاز ہستیوں کے ایک اہم فرد تھے اُن کی عمر کے لوگ بھی اُن کے برتاؤ کی وجہ سے اُن کا احترام کرتے تھے۔ منشی سید طفیل احمد صاحب بھی میرے دادا کے پاس آنے اور اُن سے ملنے میں اپنی سعادت سمجھتے تھے۔ عمر علم اور حالات کے لحاظ سے میرے دادا اُن کے ساتھ اپنے لڑکوں جیسا برتاؤ فرماتے تھے اور وہ بھی اُن کو اپنا بزرگ تصور فرماتے تھے۔ اس کے بعد میرے دادا مرحوم کے سب سے چھوٹے بیٹے مولوی عطاء اللہ صاحب مرحوم جو سید ریاض احمد

کے ہمجولی تھے اُن سے اور سید ریاض احمد مرحوم سے دوستی و ربط بڑھا اور اسی کے ساتھ دادا صاحب کی محبت بھی بڑھتی گئی۔ ان تعلقات کے بڑھنے میں کئی چیزیں شامل ہوتی گئیں۔ اول منشی امیر احمد صاحب مرحوم سے دونوں کا شاعری میں شاگرد ہونا، دوسرے تہذیب الاخلاق لٹریچر کا اثر قبول کرنے سے اُس وقت کی نئی پَود نے اپنا لباس وطرز مند و بود پُرانی وضع کو ترک کرکے بدلنا شروع کردیا تھا جس میں حسب حیثیت ہر شخص زیادہ سے زیادہ منہمک تھا۔ تیسرے منشی ریاض احمد کی شوخی اور چلبلا پن اور اُس وقت کی گورکھپور کی جوان پارٹی کی اُمنگیں رندانہ وہم رندانہ صحبتیں اس نے میرے چچا اور منشی سید ریاض احمد میں اصلی برادرانہ تعلقات پیدا کردیئے تھے جو چچا مرحوم کی حیات تک ایک طرح پر قائم رہے۔ میرے چچا کا انتقال ۱۸۸۵ء میں ہوا اُس وقت میں چار برس کا تھا میرے دادا کا انتقال ۱۸۹۱ء میں ہوا تب میرا دسواں سال تھا۔ آخر ۹۶ء سے اپریل ۹۸ء تک مَیں علی گڈھ میں تھا۔ وہاں سے واپس آیا تو گورکھپور کا ریاض الاخبار دیکھنا پڑا کیونکہ علی گڈھ ہو آنے کے بعد ہندوستان کی اور کبھی کبھی ہندوستان سے باہر کی خبریں معلوم کرنے کا قدرتی طور پر ذوق ہو گیا تھا اور جب خبریں پڑھتے پڑھتے کبھی کبھی ایڈیٹوریل بھی پڑھ لیتے تھے۔ تین ہی چار ہفتے گذرے ہونگے کہ ریاض الاخبار کا ایڈیٹوریل (جو اُس وقت ریاض ہی کے قلم کا ترشح ہوا کرتا تھا) بے دیکھے خبروں کا دیکھنا ناگوار ہونے لگا۔ اسی طرح مجھے ریاض کی نثر دیکھنے کا شوق پیدا ہوا۔ فتنہ اور عطر فتنہ بھی ریاض الاخبار کے ساتھ ساتھ نکلتے تھے۔ اُس میں ریاض صاحب کی غزلیں بھی چھپتی تھیں اس کو دیکھکر طبیعت کا رجحان طبعاً اُن کی شاعری کا شایق بنا آخر ۱۸۹۹ء و ۱۹۰۱ء میں ریاض صاحب نے کمپنی کی صورت میں روزانہ صلح کل جاری کیا، میں بھی اُس کا حصہ دار بنا۔ ریاض صاحب سے بزرگانہ ملاقات بچپن ہی سے تھی۔ ۱۹۰۱ء میں علیگڈھ سے آنے کے بعد کچھ اور ربط بڑھا۔ اور اُن کی شوخ طبعی اور پُرانے تعلقات کی بنا پر میں بھی اُن سے زیادہ دونوں با تکلف نذرہ سکا۔ ۱۹۰۳ء میں ریاض احمد صاحب نے حکیم برہم مرحوم کو صلح کل کی ایڈیٹری کے لئے بلایا مگر ۱۹۰۳ء میں صلح کل کی مالی حالت خراب ہوگئی تو میں نے اُسے خرید لیا اب منشی ریاض احمد، حکیم برہم مرحوم دونوں کی نشست روزانہ مغرب کے بعد میرے پاس ہوتی تھی۔ ۱۹۰۸ء تک یہ سلسلہ بلاناغہ قائم رہا، اس کے بعد صلح کل بند کرنا پڑا۔ مگر منشی سید ریاض احمد صاحب سے بے تکلفانہ ربط جاری ہوگیا۔ سید صاحب کی غزل میں سے جب مجھے ایک یا دو شعر اپنے ذوق کے مطابق مل جاتے تو کئی کئی روز میں ان کے سرور میں مبتلا رہتا اور، اسی طرح جب منشی سید ریاض احمد صاحب کو میری مذاق فہمی کا اندازہ ہوگیا تب وہ بھی اپنے

مذاق کے شعر اپنی غزل میں سے مجھے سنانے لگے اور اس طرح اُن کی شاعری کا اُن کے خیال میں صحیح لطف اُٹھانے والا اُن کو مل گیا۔ مجھ سے اور سید ریاض احمد صاحب سے بے تکلفانہ تعلقات اپریل ۱۹۰۳ء سے شروع ہوئے اور اُن سے میری آخری ملاقات ۸۔ جون ۱۹۳۴ء کو لکھنؤ میں ہوئی جس کے پونے دو مہینے بعد ۳۰۔ جولائی ۱۹۳۴ء کو اُن کا انتقال ہوا ہے۔ اس طرف دس سال سے منشی ریاض احمد صاحب مرحوم لوگوں سے یہ فرمایا کرتے تھے کہ اب میں جو شعر کہتا ہوں وہ سبحان اللہ کے سنانے کو کہتا ہوں۔ یہ اُن کی کمال بزرگانہ شفقت تھی جس پر مجھے فخر ہے۔

ان صحبتوں کا کیا ذکر کیا جائے بس یہ سمجھ لیجئے منشی سید ریاض احمد صاحب مجھ سے پانچ چھ ہاتھ کے فاصلے پر داہنے جانب زاویہ حادہ بناتے ہوئے بیٹھے ہیں، میں نے فرمایش کی کہ کوئی شعر سنائیے، اُنھوں نے یہ شعر پڑھا:۔

نسخہ بیاض ساقی کوثر سے مل گیا　　گھر بیٹھے اب تو بادہ کوثر بنائیں گے

میں نے کہا سمجھے؟ اُنھوں نے کہا نہیں سمجھے! میں نے کہا بیشک نہیں سمجھے ہونگے۔ اُنھوں نے کہا ہاں کہیئے میں نے کہا کہ سنیئے!!

آپ کو شراب کے مضمون باندھنے کی مشق ہے۔ زمین کی شراب کے مضامین لکھتے لکھتے تھکے تو آسمان کی سوجھی۔ الفاظ کی مشق نے اور خیالات کی گونا گونی نے آپ کو یہ بتلایا کہ پرانی بیاضوں میں تجربہ کے نسخے ہوتے ہیں اور بنانا تھی کوثر والی۔ لہذا کوثر و بیاض اور نسخہ ان تین چیزوں کو آپ کی مشق سخن نے دو مصرعوں میں اپنی اپنی جگہ موزوں کر دیا۔ آپ نہیں سمجھے کہ آپ نے کیا کہا۔ اب میں بتلاتا ہوں کہ آپ نے کہا کیا، آپ نے یہ شعر شاعری کے لحاظ سے کہا، میں شعر کو واقعی اور روحانی دکھاتا ہوں ساقی کوثر کون قرآن کے بیان کے مطابق کہ وَسَقاھم ربھم شرابًا طھورًا خدا ساقی کوثر ہوا اُس کی بیاض قرآن اور اسی قرآن میں خداوند تعالیٰ نے اِنّا اعطیناک الکوثر فرما کے کوثر حضور نبی آخرالزماں صلی اللہ علیہ وسلم کو عنایت فرمایا لہذا حضور اقدس مالک کوثر و ساقی ہوئے۔ حضور کی بیاض حدیث ہوئی۔ مفسرین ارشاد فرماتے ہیں کہ کوثر پلانے والے آل رسول و اہلبیت ہونگے ان کے سرگروہ حضرت مولا علی کرم اللہ وجہہ ہیں لہذا وہ ساقی کوثر ہوئے۔ اُن کی بیاض کتب معرفت ہے۔ ان بیاضوں سے نسخہ نکلا اور جنید و شبلی و عطار شدمست اور تمام اولیاء اللہ پلاتے چلے آ رہے ہیں اور قیامت تک پلاتے چلے جائیں گے۔ شعر ایک دفعہ اور سن لیجئے۔

نسخہ بیاض ساقی کوثر سے ملگیا　　گھر بیٹھے اب تو بادہ کوثر بنائیں گے

یہاں پر ایک شعر کا اور مطلب سُن لیجئے :۔

فروغِ مے سے یا عرشِ بریں سے نُور آتا ہے　　کہ ساغر طاق سے بنکر چراغِ طور آتا ہے

وہ نور جو موسیٰ سے کوئی ستر ہزار برس پہلے قندیلِ عرش میں یعنی طاقِ عرش میں لٹک رہا تھا جب اسکی مسکراہٹ نے شجرِ طور کو منور کیا ہے تو موسیٰ کو تاب دیدار نہ رہی، جہاں موسیٰ کو یہ حکم ملا تھا کہ فخلع نعلیک انک بالواد المقدس طویٰ جس تجلی کے بعد موسیٰ علیہ السلام کی یہ حالت ہوئی کہ جس چیز پر نظر ڈال لیتے تھے وہ جل جاتی تھی یہاں تک کہ لوہے کی نقاب بھی گل کر گر جاتی تھی تب اُن کو ملہم غیب نے یہ خبر دی کہ کپڑے پر حضور نبی آخر الزماں کا نام نامی لکھکر نقاب بناؤ تب نقاب ٹھہرے۔

شعر ایک دفعہ اور سُن لیجئے۔

فروغِ مے ہے یا عرشِ بریں سے نور آتا ہے　　کہ ساغر طاق سے بنکر چراغِ طور آتا ہے

صبح

از سردار حسین خانصاحب شباب ملیح آبادی

صبح گلشنِ فردوس کی ایک خوبصورت حور کا نام ہے جسکے بال سیاہ ہیں اور چہرہ برف کے مانند شفاف و روغن صبح کے خوبصورت چہرے پر تبسم کی لہریں یوں رقص کرتی ہیں جیسے ہوا میں خوشبو یا سمندر پر جھاگ

صبح ایک شیریں بوسہ ہے جس سے پیشانیِ حور جگمگا اُٹھتی ہے۔ دنیا شاعر کی آنکھوں میں اپنا منہ دیکھتی ہے اور شاعر صبح کے خوبصورت آئینے میں۔ میں صبح کی ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں میں مست و بیخود ہو کر کچھ اسطرح گنگنانے لگتا ہوں جیسے کوئی عاشق اپنی معشوقہ کی یاد میں روتے روتے سو جائے اور پھر کوئی حسین خواب دیکھنے لگے۔

صبح کے وقت شبنم کو روتا ہوا دیکھکر شاعر کا دل بھی رو دیتا ہے۔ برسات کے منتشر بادلوں میں صبح کا چہرہ یوں مسکراتا ہے جیسے گلاب کی ہری بھری پتیوں کے درمیان کوئی خوبصورت پھول۔ عارف کی آنکھوں سے جو آنسو صبح کے وقت گرتے ہیں فرشتے انھیں اٹھا کر بہشت میں لیجاتے ہیں جن سے حوروں کے چہرے کا غازہ تیار ہوتا ہے جسطرح کسی خوبصورت معشوق کے کان میں جڑاؤ بندا جگمگاتا ہے بالکل اسی طرح شفاف آسمان پر صبح کا ستارہ۔

روزانہ جب صبح کی دیوی اپنی رعنائیوں کے ساتھ باغ میں سیر کرتی ہے میں گلاب کے خوبصورت پھولوں کو چُنکر ایک ہار بناتا ہوں اور اسکی خدمت میں پیش کر دیتا ہوں جسکے شکریہ میں وہ نیکی اور تندرستی کی دعا دیتی ہے

دوشیزۂ صبح کی دو سہیلیاں ہیں جو اُس کے اِدھر اُدھر رہتی ہیں۔ ایک سیاہ زلفوں والی جسکو رات کہتے ہیں اور دوسری سنہرے بالوں والی جسکا نام دن ہے۔ شاعر کو صبح کا پیغمبر بھی کہتے ہیں۔

کاش صبح اپنی نورانی کشتی میں جو پھولوں سے کھچا کھچ بھری ہے مجھکو بٹھا کر زندگی کے سمندر کے اُس پار پہونچا دے جہاں سے ابدی حکومت شروع ہوتی ہے۔

حضرت ریاضؔ کی شاعری

(از ایڈیٹر "مشرق" گورکھپور)

حضرت ریاضؔ دنیا میں ایک کامیاب شاعر اور مستند استاد کی حیثیت سے مشہور تھے دنیا ان کے مست کرنے والے نغموں سے لبریز اور وہ دنیا کی مست کردینے والی کیفیتوں سے معمور۔ حضرت ریاضؔ کی شاعری خاکدانِ عالم کی تمام نیرنگیوں سے علٰحدہ اور تمام پیچیدگیوں سے دور ایک کیفیت سرمدی میں مسرور اور انبساط ریز رہتی تھی۔ حضرت ریاضؔ کے قلب و جگر کی تعمیر اس خمیر سے ہوئی تھی جس سے ان مقدسین کی روحیں تعمیر ہوئی ہیں جو عالم کو مسرت دائمی کا پیغام دیکر محبت ازلی سے اس تیرہ دان کو روشن اور منور کردیتی ہیں۔ حضرت ریاضؔ اسمیں شک نہیں کہ دنیا کی ایذا رسانیوں سے محفوظ نہیں رہے۔ آپ پر بھی دنیا نے اسی سموم اور دھار دار آلہ سے حملہ کیا جس سے یہ عادتاً ہر مقدس اور برتر روح کو گزند پہونچاتی ہے۔ خانگی تکلیفوں، احباب کی کج ادائیوں اور ہر قدم پر بچھنے والوں کی نگاہ کشیوں کے دلوں میں پیوست ہونیوالے تیر آپ کے قلب و جگر پر پڑے اور پیہم پڑے۔ لیکن اس کے آہن گداز حوصلے اور سرور سرمدی سے لبریز اور محبت ازلی سے معمور دل نے ان کی اس انداز سے خاطر کی جس طرح ایک سچا عاشق اپنے معشوق کے سخت ترین تیر کی مہمان نوازی کرتا ہے۔ آپ نے ان کیفیتوں سے لطف حاصل کیا، مسرتوں کی کیفیتوں میں ان سے اور اضافہ کی صورتیں پیدا کیں اور اپنے جذبات کی خوشگوار دنیا پر اسکی ایک آنچ بھی نہ آنے دی۔ اُردو شاعری سلاطین مغلیہ کے زوال کے بعد یتیمی کے جس دور میں مبتلا ہوئی اُس سے آج تک اس کو نجات نہ مل سکی۔ نقالی اور محض نقالی نے اُردو شاعری کو چاروں طرف سے گھیر لیا اور شاعری میں کسی قسم کی کوئی ایجاد اور کسی قسم کا حوصلہ باقی نہیں رہ گیا۔ شعراء کے پاس نہ کوئی پیغام عمل رہا نہ کوئی بلند نصب العین جس کی طرف وہ لوگوں کو بلاتے اور شاعری جزویست از پیغمبری کا نقشہ پیش کرتے۔ اس سے انکار نہیں کہ اُردو نے بھی بڑے بڑے شعرا پیدا کئے جنھوں نے بڑی بڑی محفلوں میں بڑی بڑی دادیں لیں اور راج، ریاستوں سے بڑے بڑے

انعامات حاصل کئے لیکن سوائے رنگ و روغن کی تعریف کے اور کچھ بھی نہ کر سکے۔ دَورِ جدید نے کچھ ایسے باکمال ضرور پیدا کئے جو دنیا کی موجودہ بلند خیالی کو نشو و نما دے رہے ہیں اور مختلف طور پر دنیا کو دنیا والوں کے لئے بہتر بنا رہے ہیں، مگر آپ کا وجود الشاذ کالمعدوم کے مصداق تھا۔

حضرت ریاض کا پیغام شاعری اپنے اندر ایک خاص کیفیت رکھتا ہے۔ حضرت ریاض دنیا کے تمام اختلافات سے بلند اور تمام سیاسی اور مذہبی پیچیدگیوں سے دُور اپنے تخیل کی اونچائیوں سے دنیا کو ایک خاص پیغامِ حیات اپنی شیریں بانسری کے ذریعہ سناتے ہیں، آپ کا فلسفۂ حیات دنیا کے گذشتنی اور گذاشتنی ہونے پر مبنی ہے، لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ آپ رہبانیت کا سبق دیتے ہیں اور دنیا کو ترکِ دنیا پر مائل کرتے ہیں بلکہ حقیقت حال اس کے بالکل مخالف اور متضاد ہے۔ آپ دنیا کی ہر چیز سے صحیح اور جائز تمتع حاصل کرنا چاہتے ہیں اور انسان کے تمام جذبات صحیحہ کی ارتقا کے ساتھی اور داعی ہیں۔ آپ کے کلام میں رنگیں کلامی اور رنگیں بیانی کا زور پایا جاتا ہے، آپ کی خوش فکری کبھی کبھی عمر خیام سے ٹکریں لیتی نظر آتی ہے۔ لیکن آپ کے کلام پر ناقدانہ نظر ڈالنے والے جانتے ہیں کہ آپ دنیا کو کائنات کا گلِ نوبہار سمجھتے ہیں اور انسان کو صانع حقیقی کے ہر پھول پنکھڑی پر مرمٹنے کا سبق دیتے ہیں۔ شراب آپ کی شاعری کا ایک خاص رنگ رہا ہے اور آپ نے اس رنگ میں ہزارہا باریک سے باریک مسائل تصوف بیان کر ڈالے اور خدا رسی کے اسباق پیش کر دیئے ہیں۔ حضرت غالب کا قول ہے:

ہرچند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

اور حضرت ریاض کا تمام دیوان اس کی تائید میں ہے۔

اُردو شاعری شعرائے فارس کی تقلید ہے اور اس کے علاوہ دربار سلاطین مغلیہ جہاں اُردو نے پیدا ہو کر نشو و نما پائی وہاں بھی وہی فارسی رنگ غالب تھا جس کی وجہ سے اُردو نے وہی گل و بلبل، شراب و مینا، تیر و ابرو، میں گفتگو شروع کی کہ جس میں حضرت حافظ، مولانا رومی، حضرت جامی وغیرہم صدیوں پیشتر فلسفہ اور مذہب کے نکات بیان کر کے حق کا نشر و ابلاغ کر چکے تھے حضرت ریاض نے بھی اسی فضا میں جنم لیا اور اسی گہوارہ میں نشو و نما پائی اور پھر اگر آپ نے بھی اسی لب و لہجہ میں گفتگو کی تو جائے تعجب نہیں۔

اور اگر ان شعرائے فارس کے کلام میں ہم کو معرفت کے دفتر نظر پڑتے ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ حضرت ریاض کے کلام سے استفادہ نہ حاصل کریں۔ حضرت ریاض کی زندگی بتاتی ہے کہ آپ خاص

فلسفی تھے اور آپ کا تخیل وحدت الوجود کے اس مرکز پر تھا جہاں توحید کے سمندر کی روانی ہزارہا گندے نالوں کی پھینکی ہوئی کثافتوں کو ایک ہچکولے میں شیریں اور مصفا کر دیتی ہے۔

حضرت ریاض کی شاعری نسیم خوشگوار کا ایک لطیف جھونکا، تخیل کے نمود صبح کے وقت آفتاب کی تجلی پاشیوں سے مستفیض ہونے کے لئے وحوش وطیور کو بیدار کرتا ہے اور سطح زمین سے لے کر شجر وحجر کو مصفا ومنزا کرتا ہے۔

حضرت ریاض کی شاعری صبح کے پھولوں کے چٹکنے کا پیغام ہے اور شبنم آسمانی کے پاک قطروں سے دھلی ہوئی پھولوں کی زبان کا مسکراتا ہوا پیغام ہے۔

ریاض کے کلام میں بلبل کے نالوں صیاد کے مظالم، اور معشوقوں کی نمک پاشیوں کا تذکرہ ہے اور ضرور ہے، لیکن نالۂ بے ربط نہیں، سازِ بے صدا نہیں، ہجر یار کا شیون ضرور ہے لیکن اتنا ہی ہے جتنا ایک محبت سے لبریز دردمند دل کرے۔ آپ کا طغرائے امتیاز یہ ہے کہ آپ پریشان حال متفکر ہزارہا جھگڑوں میں پھنسی ہوئی اور مختلف کشمکشوں اور مصیبتوں میں مبتلا، دنیا کو جسے تمدن کی عفنتوں اور تہذیب جدید کی بدبختیوں نے اور زیادہ سراسیمہ وبدحواس بنا دیا تھا۔ اپنے سرمدی نغموں سے اپنے درد بھرے دل کی آواز سے اپنے رس بھرے کلام سے اپنی طرف کھینچتے ہیں اور کھینچنے کے بعد ان کے رگ وپے میں جذبات کی وہ کیفیات سرایت کر دیتے ہیں کہ آپ کی آواز کا سننے والا ایک شراب صافی کے رند بدمست کی طرح دنیا ومافیہا کو فراموش کر کے سرور اور محض سرور میں مست وشادکام ہو جاتا ہے۔

حضرت ریاض کے کلام پر ایک اچٹتی نظر بھی دشوار ہے البتہ اگر کبھی موقع ملا تو ہم مکمل تبصرہ پیش کرنے کی کوشش کریں گے۔ اس موقعہ پر صرف اتنے پر اکتفا کرتے ہیں کہ دنیا سے ایک باکمال اٹھ گیا اور یقین ہے کہ صدیوں کا چکر پھر ایسا باکمال پیش نہ کر سکیگا۔ حضرت ریاض کی زندگی دنیا والوں کے ہاتھوں ویسی ہی گذری جیسی پیغمبروں کی دنیا نے انکی تکلیف دہی کا کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ لیکن اب جبکہ حضرت ریاض دنیا کی ایذا رسانیوں سے بہت دور ہیں ہمیں امید ہے کہ دنیا والے اپنا دوسرا رویہ بھی سابق ہی جیسا رکھیں گے اور آپکے پسماندگان اور خصوصاً کلام کے ساتھ اچھا سلوک کرینگے۔ اس موقع پر ہم حضرت غالب کا مقولہ جو انھوں نے اپنے کلام کے بارے میں کبھی لکھا تھا ہدیۂ ناظرین کرتے ہیں

تا ز دیوانم کہ سرمستِ سخن خواہد شدن — ایں مے از قحطِ خریداری کہن خواہد شدن
طالعم را در عدم اوجِ قبولی بودہ است — قدرِ شعرِ من بہ گیتی بعد من خواہد شدن

جرمنی کے صحّت افزا مقامات

(از رائے بہادر پنڈت شیو نراین شمیم، ایڈوکیٹ، پنجاب)

مضمون ذیل میں ہم جرمنی کے بعض فرحت افزا اور صحت بخش مقامات کا حال لکھتے ہیں۔ واضح ہو کہ ہمارے ملک میں سیکڑوں چشمے ہیں جن کے پانی کی تاثیروں کی نسبت مختلف روایتیں مشہور ہیں مگر ابتک نہ گورنمنٹ ہی کی اور نہ ہندوستانی ڈاکٹروں اور عوام الناس کی توجہ اس طرف مبذول ہوئی ہے کہ کیمیاوی اجزا دریافت کریں۔

ہم نے راج گرمہ (بہار) میں سرد اور گرم چشمے دیکھے۔ کراچی سے دس بارہ میل فاصلہ پر ایک ابلتا ہوا چشمہ دیکھا، پنجاب اور کشمیر میں بھی بہت سے مقامات پر گرم اور سرد چشمے موجود ہیں مگر ابتک ان کے طبّی فوائد کی تحقیقات نہیں ہوئی۔ ہماری غرض مضمون ذیل سے یہ ہے کہ پبلک کی توجہ اس طرف مبذول کی جائے تاکہ نہ صرف عوام ہی کی صحت کو فائدہ ہو بلکہ اگر کچھ سرمایہ صرف کیا جائے تو ان چشموں کے پانی کو بوتلوں میں بھر کر فروخت کرکے مالی فائدہ بھی اُٹھایا جا سکے۔ اس طرح بہت سے اہل ملک کے معاش کا ذریعہ نکل آئے گا۔ اگر ہمارے ڈاکٹر اس طرف توجہ فرمائیں تو بہت لوگوں کے لئے رزق پیدا کرنے کا ایک نیا راستہ نکل سکتا ہے۔

جرمنی کے سپا (صحت بخش مقامات)

جرمنی میں دو سو صحت افزا مقام ہیں جنھیں انگریزی میں سپا یعنی مقامات آبی کہتے ہیں۔ جہاں جہاں یہ مقامات واقع ہیں اُن کے نواح میں صحت افزا مقام جنھیں انگریزی میں سینیٹوریم Sanitorium کہتے ہیں بنائے گئے ہیں یہاں پر موٹل قیام گاہیں، ڈاکٹر اور سامان ریاضت جسمانی اور سامان تفریح مہیا کئے گئے ہیں جن کا ہم آگے چلکر ذکر کرینگے۔ ہزارہا لوگ یہاں آتے غسل کرتے، پانی پیتے ریاضت کرتے اور تفریحی مشاغل سے استفادہ کرتے ہیں، اور تنومند و تندرست ہو کر اپنے گھروں کو واپس جاتے ہیں۔ اولوالعزم لوگوں کو اس سے لاکھوں روپیہ کا مالی فائدہ ہوتا ہے اور خلق اللہ سب مستفید ہوتی ہے۔

یہاں پر تمثیلاً چار ایسے صحت و فرحت بخش مقاموں کے مختصر حالات لکھے جاتے ہیں:-

(۱) ویس بادن (Wiesbadan.)

جرمنی کیا دنیا کے تمام صحت بخش مقاموں سے یہ جگہ سب سے عمدہ ہے۔ دریائے راآس کا شفاف پانی اس کے لطف کو دوبالا کر دیتا ہے۔ یہ مقام ٹانس کی پہاڑیوں کی وادی میں واقع ہے۔ سطح سمندر سے تین سو اسی فٹ بلندی پر ہے یہاں ستائیس گرم چشمے ہیں۔ وجع مفاصل نقرس۔ عارضات تنفس اور معدہ کی شکایتوں کے علاج کے لئے لوگ کثرت سے یہاں آتے ہیں، ہوائی جہازوں کے لئے بھی یہاں جگہ بنی ہوئی ہے۔ تیز رفتار ریلوے کے ذریعہ سے یہاں ہجوم خلائق رہتا ہے۔ خوبصورت باغات خوش وضع مکانات نے اس جگہ کو چار چاند لگا دیے ہیں۔ رومن عہد سے اس مقام کو بین الاقوامی شہرت حاصل ہے۔ یہاں پر غسل کے سب طریقے موجود ہیں۔ تازہ پانی، گرم پانی، کاربانک ایسڈ آکسیجن۔ ریت۔ بجلی۔ مٹی ترکی غسل خانے۔ الغرض جس قسم کا غسل مطلوب ہو یہاں میسر ہے۔
علاجوں کے جتنے طریق دنیا میں اس وقت موجود ہیں وہ سب یہاں ملتے ہیں۔ آٹھ سینی ٹوریم ہیں، تیرہ میڈیکل اسپتال ہیں۔ دو سو تیس ڈاکٹر بھی یہاں رہتے ہیں۔ لوگوں کے قیام کے لئے پچاسی ہوٹل اسی بورڈنگ ہوس موجود ہیں جہاں چاہیے قیام کیجئے۔ ایک پارک بھی ہے جس کی لاگت دو لاکھ پچاس ہزار پونڈ ہے۔ اس پارک میں موسیقی خانہ ہے جہاں ہر قسم کی موسیقی کا لطف اٹھایا جا سکتا ہے۔ یہ میوزک ہال مطلا ہے اور اس میں ایک بینڈ بھی ہمیشہ رہتا ہے جس کے ساتھ بائیس موسیقار ہوتے ہیں۔ گالف (Golf) ٹینس (Tennis) ہاکی (Hocky) ماہی گیری (Fishing) پیراکی (Swimeng) وغیرہ وغیرہ مشغلہ دل بہلانے کے لئے مہیا ہیں۔ مقررہ دنوں پر روشنی آتشبازی۔ موٹر کاروں کی دوڑ۔ اسٹیمر (Steamer) پر ناچ۔ دریائی سیر کی کشتیاں۔ غرض ہر قسم کی رنگ رلیاں، کھیل تماشے، علاج معالجہ، تفریحات اور انواع و اقسام کے سامان یہاں مل سکتے ہیں گویا جنگل میں منگل ہے۔ حتی کہ دو سرکاری تھیٹر بھی موجود ہیں، میونسپل آرکسٹرا (Orchestra) بھی موجود ہے۔ شہری زندگی کی کوئی کیفیت نہیں جو یہاں میسر نہ ہو، فرق اتنا ہے کہ شہروں میں امراض لاحق ہوتے یہاں ان کا علاج ہوتا ہے شہروں میں دھواں، شور و غل، کثافت، بھیڑ بھڑکا ہوتا ہے، یہاں فرحت، صحت، شغل، کھیل، دریا کی مقاربت، پاکیزہ مکانات، تازہ ہوا، آب حیات سب ملتے ہیں۔ شہروں میں لوگ روپیہ کماتے ہیں اور یہاں آکر خوب خرچ کرتے ہیں۔

"برائے نہادن چہ سنگ و چہ زر"

ہندوستان پر عائد ہوتا ہے، یوروپین لوگوں پر اس کا ہرگز اطلاق نہیں ہوسکتا، یہ لوگ صحت کو مقدم سمجھتے ہیں، آرام و مسرت کے ساتھ زندگی بسر کرتے ہیں۔ ہندوستان کے لوگ پست ہمت ہیں اور ایا بیج بچوں کی طرح چاہتے ہیں کہ ہمارے منہ میں کوئی پیر ڈال دے اور خود ہم کو کوئی محنت یا حرکت نہ کرنا پڑے۔

(۲) آئے لاشپیل (A ise la Chappelle)

یہ سپا (Spa) بھی بہت مشہور ہے۔ شہنشاہ شارلیمین (Charlemagne) کے زمانہ سے یہ تاریخی اہمیت رکھتا ہے۔ یہاں یہ شہنشاہ جو فرنگی تزک وشان کا سرگروہ نامور شاہ تھا مدفون ہے اور اُس کا بنایا ہوا عالی شان قلعہ آج تک اُس کی عظمت کی یاد تازہ کر رہا ہے۔ گذشتہ سات سو سال کے عرصہ میں کم از کم بیس شاہان جرمنی کی تاجپوشی اسی مقام میں ہوئی ہے۔ یہاں پر اٹھائیس گرم چشمے ہیں۔ سب سے زیادہ گرم چشمہ کا ٹمپریچر ۵۵ درجہ سینٹی گریڈ (Centragade) ہے۔ وجع مفاصل یعنی گٹھیا کے علاج کے لئے اس سے بڑھکر کوئی چشمہ نہیں، راگ رنگ کا بھی یہاں ایسا انتظام ہے جس کی قدر عاشقان موسیقی ہی بتا سکتے ہیں۔ یہاں گھوڑے کی سواری اور بگھی ہانکنے کی دوڑیں ہوتی ہیں جس کے لئے چاردانگ عالم سے لوگ جوق جوق آتے اور لطف اُٹھاتے ہیں۔

(۳) ولڈ باد (Wildbad)

یہ ایک جنگل میں واقع ہے۔ گذشتہ چھ سو سال سے اس (Spa) کو شہرت حاصل ہے، ناظرین تعجب سے سنیں گے کہ ہر سال یہاں پچیس ہزار لوگ آتے ہیں۔ سطح سمندر سے یہ مقام دو ہزار فٹ اونچا ہے۔ اردگرد پہاڑیاں اور چیر کے درختوں کے جھرمٹ ہیں، چٹانوں میں گزرتے ہوئے یہاں کے چشمے بہت کیمیائی اجزا لاتے ہیں، مثلاً ریڈیم، ہلیم، آرگن۔ ان چشموں کا قائم ٹمپریچر ۳۳ تینتیس سے ۳۵ پینتیس سینٹی گریڈ ہمیشہ رہتا ہے۔ اسکی آب وہوا معتدل ہے، پارک وسیع ہیں، پاس ہی ایک شفاف ندی بہتی ہے جسمیں ٹراوٹ مچھلی (Trout) کثرت سے موجود ہے جسکے یوروپین بہت شیدائی ہیں۔

(۴) ہوم برگ (Bad Homburg)

یہ مقام ٹانس پہاڑ کے قرب میں ہے اور شاہ اڈورڈ ہفتم یہاں اکثر آیا کرتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ اسکے چشموں کی تاثیریں رومن قوم کے جرمنی میں آنے سے پہلے ہی مشہور تھیں، قیصر کی افواج یہاں قیام کیا کرتی تھیں اور اسکے سپاہی ہیں کا پانی جو معدنیات سے پُر ہے استعمال کرتے تھے۔ یہاں کے چشمے امراض معدہ، قلب اور اعصاب کے علاج کیلئے مشہور ہیں۔ یہاں تمام یورپ کے لوگ ٹینس ٹورنامنٹ کیلئے بھی آتے ہیں۔ یہاں کے تھیٹر کی بھی تمام جرمنی میں شہرت ہے۔ یہ مقام چونکہ معتدل ہے اور سال بھر کھلا رہتا ہے اور سائرین کے لئے ہمیشہ ڈاکٹر اور علاج میسر ہیں۔

پریم نگر

(از مسٹر ضیاء الدین احمد برنی ۔ بی ۔ اے)

میں آگرہ کو پریم نگر کے نام سے یاد کیا کرتا ہوں، نہ صرف اس وجہ سے کہ میری مرحوم بیوی آگرہ کی رہنے والی تھی۔ بلکہ زیادہ تر اس وجہ سے کہ وہاں ایک ایسے باعظمت اور صاحب جبروت شہنشاہ کی قبر ہے جس نے اپنی حسین اور پیاری ملکہ کی محبت کو ابدالآباد تک زندہ ۔ رکھنے کے لئے ایسی پاکیزہ اور خوبصورت عمارت تعمیر کی جو اس زمانہ میں بھی جب فن تعمیر اپنے انتہائی عروج کو پہونچگیا ہے' دنیا کو محو حیرت بنائے ہوئے ہے۔ اُس شہنشاہ کا نام شاہجہاں اور اُس کی خوش قسمت ملکہ کا نام ممتاز بیگم تھا اور جس عمارت میں یہ دونوں پہلو بہ پہلو آرام کررہے ہیں وہ "تاج" کے نام سے مشہور ہے۔ جو لوگ ایک مرتبہ "تاج" کو دیکھ لیتے ہیں وہ اس کی دلکشی، خوبصورتی، رعنائی، موزونیت اور ماحول کو دیکھکر اُس کے اس قدر گرویدہ ہو جاتے ہیں کہ پھر دنیا کی کسی اور عمارت کو دیکھنے کا شوق اُن کے دل میں باقی نہیں رہتا۔

لیکن محض یہ حقیقت کہ آگرہ میں کسی عاشق و معشوق کی قبر ہے، اُس شہر کو "پریم نگر" کا لقب دینے کے لئے کافی نہیں ہو سکتی۔ البتہ جو چیز اس سے بھی بڑھکر ہے وہ یہ ہے کہ اِس خوبصورت عمارت کی تعمیر میں ہندوؤں مسلمانوں دونوں نے فراخدلی سے حصہ لیا تھا۔ اور ہندو راجاؤں اور مسلم نوابوں نے اپنی اپنی ریاستوں سے سنگ مرمر، سنگ سرخ، سنگ اسود اور دوسرے قیمتی پتھر بطور نذرانہ بھیجے تھے تاکہ جس وقت وہ لاثانی عمارت تیار ہوجائے تو دنیا بھر میں ہندوستان کی ان دونوں قوموں کے باہمی اتحاد و اخلاص کا نقش ہمیشہ کے لئے بیٹھ جائے۔ یہی وہ چیز ہے جو ہندوستان کے تمام شہروں میں آگرہ کو ممتاز بنا رہی ہے اور اسی لئے جب میں نے آگرہ میں ہندو مسلمانوں کے فساد کی خبر سُنی تو مجھے سخت صدمہ پہونچا، اور یہ خیال آیا کہ آج یہ دونوں قومیں اپنی جہالت اور لاعلمی میں محبت کی اس شاندار عمارت کو گرا رہی ہیں جس کی بنیاد رکھنے میں ان کے بزرگوں نے تین سو سال پہلے حصہ لیا تھا۔

اس بیسویں صدی میں جسے شروع ہوئے چونتیس سال ہوگئے، آگرہ میں چند بار خون کی ندیاں

بہہ چکی ہیں۔ پہلا فساد بیس بائیس برس قبل ہوا تھا اور اُس کے بعد سے یہ منحوس سلسلہ کچھ اس طرح شروع ہوا ہے کہ ختم ہونے میں نہیں آتا۔ ان فسادات میں بہت سی قیمتی جانیں ضائع ہو چکی ہیں۔ بچے یتیم ہو گئے ہیں اور عورتیں بیوہ ہو گئی ہیں۔ مگر بظاہر یہ باتیں ہماری آنکھوں کو دکھائی نہیں دیتیں ورنہ جنگ کے یہ خوفناک اعداد ہمیں ان حماقتوں کے اظہار سے باز رکھنے کے لئے کافی تھے۔

اور جھگڑا بھی ہوتا ہے تو کس بنا پر؟ ایسی خفیف باتوں پر جن کو سُنکر دونوں قوموں کی عقل پر ماتم کرنے کو جی چاہتا ہے۔ دونوں فریق اپنے ایک خدا کی عبادت اور پرستش کرنا چاہتے ہیں لیکن بدقسمتی سے دونوں کے اوقات آپس میں لڑ گئے ہیں۔ لیکن کسی کو اتنی توفیق نہیں ہوتی کہ وہ باہمی رواداری سے کام لیکر اس نزاع کو طے کرلیں۔ کیا خدا جو دونوں قوموں کا خدا ہے، اِس جنگ سے خوش ہو سکتا ہے، اور کیا ایسی عبادت اور پرستش سے جس کا خاتمہ خونریزی پر ہو یہ بہتر نہیں ہے کہ اُس سے کلیتًا باز رہا جائے؟

ہندو اور مسلمان دونوں دعویدار ہیں کہ اُن کا مذہب بَیر نہیں سکھاتا۔ آج اِن دونوں مذاہب کے پیرووں سے کہئیے کہ وہ مذہبی رواداری پر تقریر کریں یا کوئی تحریر پڑھیں تو پھر آپ دیکھیں گے کہ بلاغت کے دریا بہائے جا رہے ہیں، اور مذہبی کتب کے حوالوں سے ثابت کیا جا رہا ہے کہ اُن کا مذہب صلح کا علمبردار اور شانتی پھیلانے کا موید ہے۔ اسی طرح اگر دونوں مذاہب کے پیشواؤں سے یہ کہا جائے کہ وہ انسانی جان کی عظمت اور تقدس پر تقریر کریں تو پھر ایسا معلوم ہو گا کہ اُن سے بڑھکر انسانی جان کا محافظ دنیا میں موجود نہیں اور یہ کہ انسانی جان لینا ان میں سے ہر ایک کے نزدیک بدترین جرم ہے لیکن ذرا عملی حیثیت سے دیکھیئے تو معلوم ہو گا کہ دونوں مذاہب کے پیرو اپنے اپنے مذہب سے کس قدر دُور جا پڑے ہیں۔ اور اُس کی مقدس تعلیم سے دُور کا بھی واسطہ نہیں رکھتے۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ ہم ایک دوسرے کو ناراض کئے بغیر خدا کی عبادت کر سکیں؟ اور اگر یہ عملاً ناممکن ہے تو پھر ضرورت نہیں کہ دنیا میں مذہب کو باقی رکھا جائے جو کسی دو قوموں کو روادار بنانے سے سراسر قاصر ہے۔

اس کا علاج کیا ہے؟ میرے خیال میں ہم مذہب کو صرف آڑ کے طور پر کام میں لا رہے ہیں، ورنہ خود ہماری ذاتی بُرائیاں، کدورتیں، نفاق انگیزیاں اور بے اعتمادیاں ہی ہمارے باہمی جھگڑوں کی اصل وجہ ہیں۔ وقت آگیا ہے کہ ہم دنیا کے روبرو مذہب کے مقدس نام کی توہین کرنا چھوڑ دیں اور اپنے اصلی رنگ میں جلوہ گر ہو جائیں

مولانا محمد علی مرحوم ایک مرتبہ بنارس کالج میں تشریف لے گئے تھے۔ اور وہاں جا کر اُنھوں نے

طلبا کے سامنے موجودہ فسادات کا علاج بتایا تھا۔ انھوں نے اپنی تقریر میں یہ فرمایا تھا کہ اگر آج ہندو اور مسلمان حقیقی معنوں میں مذہبی بن جائیں، یا بالفاظ دیگر اگر ہندو بہتر ہندو بن جائیں اور مسلمان بہتر مسلمان بن جائیں تو باہمی جھگڑوں کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ ہوسکتا ہے۔ کیا ان لوگوں کے لئے جو مذہب کو آڑ بنا کر اپنی ذاتی خواہشات کو عملی جامہ پہناتے ہیں، اس مشورہ میں کوئی درس عبرت موجود ہے:

بہرحال دونوں قوموں کے لیڈروں سے میری یہی درخواست ہے کہ خدا کے لئے دنیا کو اور زیادہ ہنسنے کا موقعہ نہ دیجئے اور اُسی صلح، آشتی، سکون اور شانتی کے ساتھ زندہ رہنا سیکھیئے جو ہمارے بزرگوں کا وطیرہ تھا، جس کی ایک جھلک اُس تاج میں آج بھی نظر آسکتی ہے جس پر ہندو اور مسلمان دونوں بجا طور پر فخر کرسکتے ہیں۔

گوتم بُدھ کے نصیحت آموز مقولے

(۱) یہ میری دولت ہے، یہ میرے بال بچے ہیں، بیوقوف ایسی ہی باتوں میں گھرا رہتا ہے جب تو آپ اپنا نہیں ہے، بیٹے اور دولت بھلا کیا ساتھ دینگے۔

(۲) وہ بیوقوف جو اپنے کو بیوقوف سمجھتا ہے کسی حد تک عقلمند ہے، لیکن ایسا نادان جو اپنے آپ کو دانا سمجھتا ہے یکدم جاہل ہے۔

(۳) جاہل عمر بھر اچھوں سے ملتا رہے، کیا فائدہ، جس طرح چمچے کو کھانے کا مزا نہیں آتا، بے سمجھ کو اصلیت کا پتہ نہیں لگتا۔

(۴) جنھوں نے معرفت کی تمام باریکیوں کو سمجھ لیا ہے، جن کا کسی چیز سے لگاؤ نہیں، جو آزادی میں خوش ہیں جن کی خواہشیں مٹ گئیں جو معرفت کے نور سے چمک رہے ہیں وہ اس دنیا میں رہتے ہوئے بھی آزاد ہیں جیتے جی ان کو نجات مل گئی۔

(۵) جاگتے ہوئے کی رات بڑی ہے، تھکے ہوئے کو ایک میل کا سفر بھی بہت ہے۔ سچے مذہب پر چلنے والے کی زندگی دوبھر ہوجاتی ہے اور دنیا اُسے دکھ کی جگہ معلوم ہوتی ہے۔

(۶) جھونپڑی میں رہے، جنگل میں بسے یا زمین پر سوئے۔ اچھا آدمی جہاں پر رہتا ہے وہ جگہ خوشی دینے والی ہے۔

تنقیدِ کتب

مرہٹی زبان پر فارسی کا اثر

یہ کتاب بھی انجمن ترقی اُردو اورنگ آباد دکن کی تازہ مطبوعات میں سے ہے جسے محقق بے بدل مولوی عبدالحق بی۔ اے۔ سکریٹری انجمن مذکور نے تصنیف کر کے زبان اُردو پر خاص احسان فرمایا ہے یہ ادبی مقالہ درحقیقت اپریل ۱۹۲۱ء کے رسالہ "اُردو" میں شائع ہو چکا ہے مگر اب یہ از سرِ نو نظرِ ثانی کے بعد کتابی صورت میں شائع کیا گیا ہے۔

ہمسایہ قوموں کے تعلقات ہمیشہ ایک دوسرے سے وابستہ ہوتے ہیں اور ان پر ایک دوسرے کی تہذیب و معاشرت اور زبان پر ضرور اثر پڑتا ہے چنانچہ ایک زبان کے الفاظ دوسری زبان میں اس طرح داخل ہو جاتے ہیں کہ چند ہی دنوں کے کثرتِ استعمال سے وہ گھل مل کر زبان کا جزو بن جاتے ہیں۔ البتہ لب و لہجہ کے اعتبار سے الفاظ کی اصلی صورت ضرور بدل جاتی ہے، مگر اس قدر نہیں کہ غور و تامل کے بعد اُن کی شناخت نہ ہو سکے۔ جس طرح فتحِ ایران کے بعد عربی زبان کا فارسی زبان پر غیر معمولی تسلط ہو گیا، اسی طرح ہندوستان میں فارسی۔ عربی اور ہندی کے میل جول سے ایک نئی زبان اُردو یا ہندوستانی پیدا ہو گئی۔ اسی عنوان سے جب جنوبی ہند میں مسلمان داخل ہوئے تو وہاں کی مرہٹی۔ گجراتی۔ تلنگی، تامل اور مالایالم زبانیں بھی فارسی زبان سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہیں دکھنی زبانوں پر فارسی کا سب سے زیادہ اثر اُس وقت پڑا جب محمد تغلق نے دولت آباد کی بنیاد ڈالی اس کے بعد سلاطین بہمنیہ کے عہد میں فارسی زبان کا اثر بہت بڑھ گیا چنانچہ درباری زبان تو تقریباً آدھی فارسی ہو گئی۔

غرض ۱۳۱۸ء سے جب اول اول مسلمانوں کی حکومت مہاراشٹر میں قائم ہوئی تو فارسی الفاظ سیلاب کی طرح داخل ہونا شروع ہوئے اور تقریباً تین سو سال کے اندر مرہٹی زبان کی ہیئت ہی تبدیل ہو گئی۔ اب اسلامی اور مرہٹی سلطنتوں کے عروج و زوال کو صدیاں گذر گئیں لیکن مرہٹی پر

فارسی زبان کا اثر ہنوز باقی ہے۔ مثلاً مرہٹی زبان میں خالی کردن، معاف کردن، ہلہ کردن، رد کردن منع کردن کی جگہ کھالی کرنا، ماپھ کرنا، ہلہ کرنا، رد کرنا، منا کرنا، آجتک استعمال ہو رہا ہے۔ یہ کتاب کتبخانوں کے قابل ہے۔ اس کی ضخامت ۱۲۲ صفحات۔ ٹائپ کی چھپائی میں عمدہ کاغذ پر چھپی ہے۔

ملنے کا پتہ: انجمن ترقی اُردو اورنگ آباد دکن۔

مثنویات میرؔ

یہ کتاب خدائے سخن میر تقی میرؔ کی چھوٹی بڑی بتیس مثنویوں کا مجموعہ ہے۔ میر صاحب کی زبان اور جذبات سے معمور شاعری کی نسبت کچھ لکھنا تحصیل حاصل ہے کیونکہ بقول غالب :۔

آپ بے بہرہ ہے جو معتقدِ میر نہیں

کتاب کے شروع میں فاضل مرتب نے ایک مبسوط مقدمہ لکھا ہے جس میں میر کے حالات زندگی اور اُن کی شاعرانہ خصوصیات پر معقول تبصرہ کیا گیا ہے۔ یہ کتاب ادبی حیثیت سے اُردو لٹریچر میں خاص پایہ رکھتی ہے۔ اگرچہ فاضل مرتب نے کتاب کی تصحیح میں کافی محنت سے کام لیا ہے لیکن کاتب کی مہربانی سے اتنی غلطیاں رہ گئی ہیں کہ آخر میں بیس صفحوں کا ایک غلطنامہ بھی لگانا پڑا ہے لیکن یہ غلطنامہ سید محمد صاحب بی اے کے ادبی ذوق اور عرقریزی کا بہترین ثبوت ہے۔ بہرحال کتاب ہر اُردو لائبریری میں رکھے جانیکے قابل ہے۔

دیوان نایاب

یہ منشی نبی بخش صاحب نایاب ساکن نکودر ضلع جالندھر کے اُردو و فارسی کلام کا مجموعہ ہے جو تین حصوں میں منقسم ہے۔ پہلے حصہ میں اُردو غزلیں، دوسرے حصہ میں نعتیہ کلام اور تیسرے حصہ میں فارسی کلام ہے۔ چند صفحے متفرقات کے بھی ہیں، جنمیں قطعات، متفرق ابیات، نصائح، مناجات مرثیہ اور چند چیزیں ہندی کی درج ہیں یہ دیوان ۱۹۱۱ء میں بھی شائع ہوا تھا مگر اب اس میں فارسی کلام بھی شامل کر دیا گیا ہے اور یہ اڈیشن کافی اصلاح کے بعد شائع کیا گیا ہے۔ اس پر بھی افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اس دیوان میں ضرورت سے زیادہ خامیاں موجود ہیں۔ کلام کا نمونہ ذیل میں دیا جاتا ہے جس سے ناظرین خود اندازہ فرماسکتے ہیں :۔

لے مرتبہ سید محمد ایم۔ اے مولف ارباب نثر اُردو۔ چھوٹی تقطیع کے ۴۴۲ صفحات۔ قیمت دو روپیہ عہ
ملنے کا پتہ: انجمن امداد باہمی مکتبہ ابراہیمیہ حیدرآباد دکن۔

میرا دست تعشق اور اس ہوس کا داماں تھا جو ظاہر جا ہو یدا، ہر ہو یدا میں جو پنہاں تھا

عید مقتل ہیں مناتی ہیں شہیدوں کی روحیں تیغ کو بوسہ دو سر گرم جہاد دیتا ہے
دیکھئے آئے پس مرگ مری گور پہ کون کون گنگا میں مرے پھول بہا دیتا ہے

خدا بھلایا خیالات خام نے ہے تجھے فرشتہ موت کا ہر وقت تیری تاک میں ہے

نایاب صاحب نے کہیں کہیں اساتذہ کی روح سے بھی فیض حاصل کیا ہے، مثلاً کسی استاد کا شعر ہے ؎

غافل تجھے گھڑیال یہ دیتا ہے منادی گردوں نے گھڑی عمر کی اک اور گھٹا دی

اس مضمون کو نایاب صاحب نے اپنے سانچے میں اس طرح ڈھالا ہے:

اٹھ کر باندھ میری جاں تجھے کہتے شب و روز کوچ کر جانے کا گھڑیال پتا دیتا ہے

غالب مرحوم کا ایک شعر ہے:-

درد منت کش دوا نہ ہوا میں نہ اچھا ہوا برا نہ ہوا

اس کا چربہ یوں اتارا گیا ہے:-

نایاب چارہ گر کی خوشامد بھی ہے عذاب اچھا ہوا کہ درد مجھے لا دوا ملا

اس کتاب میں اگر کوئی خوبی قابل ذکر ہے تو یہ کہ اس کی لکھائی چھپائی بہت پسندیدہ ہے۔ حجم ۲۲۱ صفحات قیمت ایک روپیہ عہ، ملنے کا پتہ: منشی نبی بخش نایاب سیونسپل کمشنر نکودر ضلع جالندھر

(۱) لاش اور دوسرے ہیبت ناک افسانے

اور

(۲) میری ناتمام محبت اور دوسرے رومان

یہ دونوں کتابیں جناب اسمٰعیل صاحب کی تصنیف ہیں جنھیں دارالاشاعت پنجاب لاہور نے نہایت آب و تاب کے ساتھ شائع کیا ہے۔ مصنف کا نام اردو ادب کی دنیا میں کافی شہرت حاصل کر چکا ہے۔ ان کے مضامین پنجاب کے مختلف اردو رسائل میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔ زبان و تخیل کے لحاظ سے اگر دیکھا جائے تو وہ اس قدر کامیاب فسانہ نگاروں کے مردوں میں بھی اس پایہ کے کم ملیں گے۔ لیکن ہمیں مندرجہ بالا کتابوں کے متعلق بعض

ضروری باتیں عرض کرنا ہیں، تاکہ آئندہ خیال رکھا جائے۔

اگرچہ دونوں کتابیں ٹائیٹل کی عبارت کی رو سے جناب اسمٰعیل صاحب کی تصنیف ہیں لیکن بظاہر یہ ترجمہ معلوم ہوتی ہیں، کیونکہ جو محاورات اور فقرے اسمیں جابجا استعمال ہوئے ہیں اُن سے یہی ثابت ہوتا ہے۔ مثلاً ایک جگہ "سنگ مرمر کی نشستیں بچھی ہوئی تھیں" لکھا ہے اُردو میں نشستیں کہیں بچھی ہوئی نہیں ہوتیں یہ "Marble Seats" کا ترجمہ معلوم ہوتا ہے۔ جہاں روزمرہ کی گفتگو لکھی گئی ہے اسمیں بھی بعض ایسے الفاظ استعمال کئے گئے ہیں جو عام طور پر استعمال نہیں ہوتے۔ مثلاً ہندوستان میں کوئی بھی اپنی بوڑھی ملازمہ کو "بوڑھی گائے" یا "اونچی مینڈک" "بوڑھی چوہیا" یا "اری بوڑھے جن کی بیوی" نہ کہے گا۔ یہ سب مغربی محاورے معلوم ہوتے ہیں۔

ایک جگہ یہ بھی لکھا ہے کہ "خشخاش اور انجیر کے درختوں پر سرخ قمریاں گیت گا رہی تھیں" انجیر کا درخت تو ہوتا ہے لیکن خشخاش کا درخت دنیا میں آج تک کسی نے نہیں دیکھا جس پر قمریاں بیٹھ سکیں، یہ ڈیڑھ یا دو فیٹ کا نازک پودا ہوتا ہے جو چڑیوں کے بوجھ کا متحمل نہیں ہو سکتا ہے اسی طرح "لیموں کی گھاس" بھی ہندوستان سے باہر کسی ملک کی پیدا وار ہے۔

"عظیم الشان آسمان کی قسم" بھی ہندوستان میں مستعمل نہیں ہے۔ اس قسم کے سقم "لاش اور دوسرے ہیبت ناک افسانے" میں ہیں۔ لیکن فاضل مصنف کی دوسری کتاب یعنی "میری ناتمام محبت اور دوسرے افسانے" ہر حیثیت سے قابل قدر ہے اور اس کی زبان میں اس قسم کے اعتراضات کی گنجائش نہیں ہے۔ بہر حال جہاں تک افسانوں کا تعلق ہے دونوں مجموعے بیشک دلچسپ اور قابل مطالعہ ہیں۔ ان کی لکھائی چھپائی، کاغذ اور ظاہری زیبائش بھی دارالاشاعت لاہور کے بہترین روایات کے مطابق ہے۔ پہلی کتاب میں چھ ہیبت ناک افسانے ہیں اور اسکی ضخامت ۲۱۱ صفحات اور قیمت عہ ہے۔ دوسری کتاب چار دلچسپ افسانوں کا مجموعہ ہے جو ۲۰۱ صفحات پر آئے ہیں اور قیمت عہ ہے۔ دونوں کتابوں کے ملنے کا پتہ: دارالاشاعت پنجاب۔ لاہور

اصغر گونڈوی کی شاعری[1]

قبولیت عوام اور شہرت دوام خداداد چیزیں ہیں۔ اسمیں کسی کا چارہ نہیں۔ لیکن بعض لوگوں کو دوسروں کی شہرت و نیکنامی گوارا نہیں ہوتی، دنیا ایسے لوگوں سے نہ کبھی خالی تھی اور نہ اب ہے،

[1] ملنے کا پتہ: مہدی علی خاں بک سیلر، چوک الہ آباد دوکان نمبر ۲۴

اصغر صاحب گونڈوی کو تغزل میں جو شہرت حاصل ہے وہ محتاج بیان نہیں لیکن بعض اصحاب ان کے خلاف پروپیگنڈا کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔ چنانچہ انھیں حضرات میں سے اِس رسالہ کے مصنف بھی ہیں جنھوں نے یہ کتاب مرتب کی ہے۔ اس کے بارہ مضامین میں سے تین اصغر صاحب کی موافقت میں ہیں اور نو مخالفت میں۔ ہمارے نزدیک اس کتاب کی اشاعت سے ذاتیات کے سوا اور کوئی فائدہ نہیں ہو سکتا۔

جنسی[1] امراض اور اُن کا علاج

کرنل بھولا ناتھ صاحب سی۔ آئی۔ ای کا اسم گرامی طبی اور علمی دنیا میں محتاج تعارف نہیں ہے۔ آپ میڈیکل سروس کے ڈائرکٹر اور برٹش فیلڈ اسپتال عراق کے جنرل انچارج رہ چکے ہیں اور ہز مجسٹی شہنشاہ جارج پنجم کے آنریری فزیشن ہیں۔ آپ ایک بلند پایہ ادیب اور فارسی کے اسکالر بھی ہیں "زمانہ" کے آپ پرانے مضمون نگار ہیں، چنانچہ آپ کا ایک عالمانہ مضمون "راز دہر" کے عنوان سے پچھلے نمبر ہی میں شائع ہو چکا ہے۔

جنسی تعلقات پر اُردو میں ابتک جو کتابیں شائع ہوئی ہیں ان میں سے اکثر فحش اور مخرب اخلاق ہیں لیکن اس طرف اس قسم کے لٹریچر پر زیادہ توجہ دیجا رہی ہے۔ اُردو داں جماعت کو کرنل صاحب کا ممنون احسان ہونا چاہیئے کہ انھوں نے جیسا کہ اُن کی ذات بابرکات سے توقع کیجا سکتی تھی مرد و زن کے امراض مخصوص کی تشریح و بیان میں محققانہ اسلوب اختیار کیا ہے جس کے متعلق کسی قسم کے اعتراض کی گنجایش نہیں ہے۔ شاید ایسا عمدہ اور دلنشین اسلوب بیان ابتک کسی مشرقی مصنف نے اختیار نہیں کیا ہے۔ فاضل مصنف نے تشخیص امراض و تجویز علاج کی بنیاد سائنٹیفک اصولوں پر قائم کی ہے۔ آجکل ہندوستان کیا تمام دنیا میں ضبط تولید (برتھ کنٹرول) کا بہت چرچا ہو رہا ہے۔ چنانچہ اس کتاب کے تیسرے حصہ میں بھی اس موضوع پر بہت کافی روشنی ڈالی گئی ہے۔ کرنل صاحب نے اس موضوع پر بالکل نئے طرز سے بحث کی ہے سچ پوچھیئے تو کتاب کا یہ باب انگریزی کتابوں سے بھی زیادہ مفید واضح اور مدلل ہے۔ اس کے پہلے حصے میں جنسی مجامعت کا مدعا، ماہیت، کمی یا فقدان، اسکا تناسلی جزو، جنسی عجائبات، امراض مخصوصہ کے اصول اور طریق علاج وغیرہ وغیرہ امور سے مفصل بحث کی گئی ہے۔ دوسرے حصے میں جسکی ذمہ داری حکیم مظفر حسین صاحب پر ہے مشاہیر اطبا کے مجربات، کشتہ جات، ویدک مرکبات و رسائن وغیرہ وغیرہ کا ذکر ہے ہماری رائے میں اس ضمیمے کو اصل کتاب سے علٰحدہ شائع ہونا چاہیئے تھا۔

---

[1] مصنفہ کرنل بھولا ناتھ آئی۔ ایم۔ ایس (ریٹائرڈ) سی۔ آئی۔ ای۔ تقطیع ۲۲ + ۱۸ حجم ۳۰۰ صفحات۔ قیمت تین روپیہ عہ، ملنے کا پتہ: کتب خانہ لطف زندگی۔ اعوان منزل۔ اندرون موچی دروازہ۔ لاہور۔

تیسرے حصہ میں تناسل بالاختیار جنسی صفائی اور ضبط تولید کی عملی تدابیر سے بحث کی گئی ہے بہر حال بحیثیت مجموعی یہ کتاب بہت قابل قدر ہے۔ اور اس کتاب کو لکھکر کرنل صاحب نے اردو زبان پر احسان کیا ہے۔

فانوسِ خیال

یہ ایک مغرب زدہ مسلمان خاندان کے عشق و محبت، حسرت و ارمان، بادیہ پیمائی اور بالآخر حسرت انگیز موت کی المناک داستان ہے جسے نواب صاحب لوہارو نے لکھا ہے۔ آجکل کی دنیا فلسفۂ ایپیقیورین (Epicurean Philosophy) یا حکیم عمر خیام کے اصول پر عامل ہے جس کا نصب العین شاد باید زیستن ہے۔ اسلئے الم انگیز داستانوں کو پسند نہیں کیا جاتا۔ علاوہ بریں ابھی ہندوستان کے امرا و شرفا اس قدر مغرب زدہ بھی نہیں ہوئے کہ ناکامیِ عشق سے دل شکستہ ہو کر آسٹریلیا۔ جاپان۔ کالیفورنیا وغیرہ کے کوہ و بیابان کی خاک چھانتے پھریں۔ ایک شریف زادی کا اپنے شوہر کو ساتھ لیکر اپنے پہلے عاشق کی تلاش میں ممالک غیر کی سیاحت کرنا بھی ہندوستانی فطرت کے خلاف ہے۔ غرض اسکا پلاٹ انگریزی وضع کا ہے۔ فاضل مصنف انگریزی طریقۂ معاشرت اور اوضاع و اطوار سے بخوبی واقف معلوم ہوتے ہیں کتاب کا اسلوب بیان صاف اور زبان سلیس ہے لیکن جس پہاڑ کو انگریز "مسوری" کہتے ہیں اسے وہاں کے رہنے والے "منصوری" کہتے ہیں۔ اسی طرح اس کتاب کے بعض فقرے مثلاً "دنیا کے کسی سہی سرے اور پردے پر کیوں نہ ہو" اور "مڑتی تڑتی سڑک" کی ترکیبیں مذاق سلیم پر گراں گذرتی ہیں۔ لکھائی چھپائی روشن کاغذ اچھا، ضخامت ۱۵۰ صفحات۔ قیمت ایکروپیہ ۸؍

ملنے کا پتہ: لائبریرین اسٹیٹ لائبریری، لوہارو

کوئی قوم لامذہبیت کے ریگ زار پر اپنی عظمت کی بلندیاں قائم نہیں کر سکتی۔

مچھلی پانی میں خاموش ہے، جانور زمین پر غل مچا رہے ہیں، چڑیاں ہوا میں گا رہی ہیں، اور انسان کی ہستی سمندر کی خاموشی، زمین کا شور اور ہوا کا راگ پنہاں ہے۔

زندگی موسم گرما کی طرح حسین سہی، موت بھی خزاں کے پتوں سے کم خوبصورت نہیں ہے۔

ہر نیا بچہ اپنے ساتھ یہ پیغام لاتا ہے کہ خدا ابھی اپنی مخلوق سے بددل نہیں

(عالمگیر)



مسٹر اے۔پی۔سین مرحوم

یادِ رفتگاں

مسٹر اے۔ پی۔ سین مرحوم

لکھنؤ کے نامور محبِ وطن مسٹر اے۔ پی۔ سین ۲۶۔ اگست ۱۹۳۲ء کو صرف چند گھنٹوں کی علالت کے بعد رحلت فرما گئے۔ ۲۵۔ اگست کی سہ پہر تک آپ بظاہر تندرست و توانا تھے۔ شام کو قضا و قدر کا حکم فالج کا دورہ بنکر آیا اور رات کے دو بجے موصوف انتقال کر گئے۔ افسوس صد افسوس۔

مسٹر سین ۱۸۶۱ء میں بمقام ڈھاکہ ملک مشرقی بنگال پیدا ہوئے تھے، وطن ہی میں پرورش اور ابتدائی تعلیم پائی۔ بعد ازاں پریسیڈنسی کالج کلکتہ میں داخل ہوئے، لیکن اٹھارہ سال کی عمر میں آپ بیرسٹری کے لئے انگلستان چلے گئے، جہاں سے ۱۸۹۵ء میں بیرسٹری پاس کرکے وطن واپس آگئے۔ شروع میں آپ نے کلکتہ ہی میں پریکٹس کی بعدہٗ ۱۹۰۲ء میں لکھنؤ آگئے، جہاں آپ نے چند ہی روز میں اس قدر امتیاز اور عزت حاصل کی کہ اودھ بار کے لیڈر بن گئے، اور مرتے دم تک اسی بلند مرتبہ پر فائز رہے۔ آپ کی سرگرمیوں کا میدان صرف قانونی مسائل کی بال کی کھال نکالنے تک محدود نہ تھا بلکہ آپ ہر قسم کی پبلک خدمت کرنا اپنا فرض سمجھتے تھے۔ تعلیم سے آپ کو ہمیشہ خاص دلچسپی رہی، چنانچہ اخیر دم تک آپ لکھنؤ یونیورسٹی کی اگزکٹیو کونسل کے ممبر تھے۔ علاوہ بریں اصلاح معاشرت اور سیاسیات اور خدمت عامہ میں بھی آپ نہایت سرگرم حصہ لیتے تھے۔ آپ اودھ سیوا سمتی لکھنؤ کے پریسیڈنٹ تھے اور اچھوت اُدھار کی موجودہ تحریک کے آغاز سے بہت پہلے آپ نے ہریجن اُدھار کا کام شروع کر رکھا تھا۔ سیاسیات میں آپ مسٹر گوکھلے مرحوم کے شاگرد رشید تھے۔ ایک مرتبہ بنارس اور دوسری مرتبہ الہ آباد میں آپ صوبۂ متحدہ کی پراونشل لبرل کانفرنس کے صدر منتخب ہوئے۔ لکھنؤ میونسپل بورڈ کے پانچ سال تک آپ چیرمین بھی رہے۔ بنگالی ینگ مین ایسوسی ایشن کے بھی آپ پریسیڈنٹ تھے، اور کانپور و گورکھپور میں دو مرتبہ بنگلہ زبان کی ادبی کانفرنسوں کی صدارت فرما چکے تھے۔ غرض اس صوبے کی ایسی ہی کوئی تحریک ہوگی جس سے آپ کا تعلق نہ ہو لکھنؤ میں تو کوئی خیراتی کام یا تعلیمی کوشش آپ کی امداد و اعانت سے محروم ہی نہیں رہی۔

درحقیقت آپ کو بچپن ہی سے فنون لطیفہ مثلاً موسیقی و نقاشی وغیرہ سے خاص شوق تھا۔

اور شاعری جو فنونِ لطیفہ کی جان ہے اس میں آپ کو ایک خاص شہرت حاصل تھی بنگلہ زبان میں آپ کی بلند پایہ و دلچسپ نظمیں اور گیت نہ صرف بنگال بلکہ ہندوستان بھر میں جہاں جہاں بنگالی زبان کے بولنے والے آباد ہیں ہر کس و ناکس کی زبان پر چڑھے ہوئے ہیں۔ بہرحال آپ کی خوبیوں اور آپ کے کارناموں کا گہرا نقش ہمارے اور ہماری آئندہ آنیوالی نسلوں کے دلوں پر قائم رہیگا۔ آپ کی یکایک اور غیر متوقع وفات سے اودھ بار کو جو صدمۂ عظیم پہونچا ہے اسکی تلافی ناممکن ہے۔ آپ اودھ بار ایسوسی ایشن اور اودھ بار کونسل دونوں کے پریسیڈنٹ تھے، اور یہ خصوصیت آپ کے بعد شاید ہی کسی شخص واحد کو حاصل ہوگی۔ نوجوان ممبرانِ بار کے حق میں آپ کی ذات خضرِ راہنما سے کم نہ تھی آپ کی خوش مزاجی کی یہ کیفیت تھی کہ جب کبھی اور جہاں کہیں آپ نظر آتے تھے ہمیشہ شگفتہ رو اور خندہ پیشانی نظر آتے تھے۔ آدمی کے سیکڑوں دوست اور سیکڑوں دشمن ہوتے ہیں لیکن آپ کے متعلق یہ صحیح طور سے کہا جاسکتا ہے کہ آپ کا کوئی دشمن نہ تھا۔ آپ کے حسنِ اخلاق اور نیک مزاجی کی یہ کیفیت تھی کہ جو شخص ایک مرتبہ بھی آپ سے مل لیتا تھا وہ ہمیشہ کے لئے گرویدہ ہوجاتا تھا۔ آپ کے متعلق اخبار "لیڈر" کا یہ ریمارک بالکل صحیح ہے کہ آپ مجسم نیکی مجسم عزت اور مجسم سخاوت تھے"۔

مرحوم ۱۹۰۵ء میں کانگریس میں داخل ہوئے اور تحریک سول نافرمانی کے آغاز تک پکے کانگریسی رہے۔ لیکن ۱۹۱۹ء کے بعد جب کانگریس نے تحریک سول نافرمانی جاری کی تو آپ اس سے علحدہ ہوکر لبرل پارٹی میں شامل ہوگئے۔

مسٹر سین بقول مسٹر چنتامنی ایک سرگرم مذہبی ریفارمر بھی تھے اور لکھنؤ کے برہمو سماج کی جس قدر عظیم خدمت آپ نے تنِ تنہا کی تھی اتنی غالباً سب ممبروں نے بھی مشترکہ حیثیت سے نہ کی ہوگی۔ محبت اور حمیت انسانی کے آپ پتلے تھے۔ ناممکن تھا کہ کوئی حاجتمند یا مصیبت زدہ آپکی خدمت میں حاضر ہوکر اپنی داستانِ مصیبت سنائے اور آپ اس کی امداد نہ فرمائیں۔ دوسروں کی مصیبت کا حال سُنکر آپکی نہ صرف دریا دلی جوش میں آجاتی تھی بلکہ آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگتے تھے۔ ہاتھ فوراً جیب میں پہونچتا تھا اور جو کچھ اُس وقت ہوسکتا تھا اُسے نذر کردیتے تھے۔ اس بارے میں جو کیفیت الہ آباد میں مرحوم سخی اور فیاض ڈاکٹر ستیش چندر بنرجی کی تھی وہی لکھنؤ میں مسٹر اے۔ پی۔ سین مرحوم کی تھی۔

اگرچہ اپنے پیشہ کی مجبوریوں سے مرحوم انگریزی لباس و معاشرت اختیار کئے ہوئے تھے لیکن سودیشی تحریک کے بھی آپ نہایت سرگرم حامی تھے جس کا بہترین ثبوت یہ ہے کہ آپ عرصہ دراز تک لکھنؤ سودیشی اسٹورز کے انچارج رہے اور سودیشی کمپنیوں میں بھی آپ نے بیشمار روپیہ لگایا

حالانکہ ان میں سے اکثر کامیاب نہیں ہوئیں۔ خدمتِ خلق کا یہ حال تھا کہ آپ کمبھ کے میلہ میں اودھ سیوا سمتی کی وردی پہنے ہوئے معمولی والنٹیروں کی طرح پنڈت ہردے ناتھ کنزرو کی ماتحتی میں بے تکان کام کیا کرتے تھے۔ غرض آپ کی وفات سے صوبہ کی رفاہِ عام کی تحریکوں کو غیر معمولی نقصان پہونچا ہے ع

خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنیوالے میں

مہارانا پرتاپ (انگریزی)

مسٹر سری رام ایم۔ اے پروفیسر تاریخ ڈی۔ اے۔ وی کالج لاہور نے اُودے پور کے مشہور و معروف بہادر مہارانا پرتاپ کی سوانحعمری لکھی ہے جسمیں نہ صرف مروجہ کتب تاریخ سے بلکہ راجپوتانہ کی قدیم روایات اور ہندی تصانیف سے بھی مدد لیگئی ہے۔ آجکل جبکہ تاریخی واقعات پر قدامت کا پردہ پڑتا جاتا ہے اور ہمارے سورماؤں اور بزرگوں کے کارنامے فراموش ہوتے جاتے ہیں۔ اس امر کی سخت ضرورت ہے کہ نوجوانانِ قوم میں زندگی کی نئی روح پھونکنے کے لئے ہندوستان کے مشاہیر بہادروں اور قابل تقلید بزرگوں کے سوانح حیات اور روشن کارناموں پر تحقیق و تدقیق کی لائنوں پر معقول روشنی ڈالی جائے۔ ہم پروفیسر سری رام صاحب کو مبارکباد دیتے ہیں کہ اُنھوں نے مہارانا پرتاپ کی مفصل سوانحعمری لکھکر قوم پر بہت بڑا احسان کیا ہے۔ یہ وہی بہادر مہارانا تھا جس نے اکبر اعظم کی دھمکیوں اور ترغیبوں۔ دولت اور فوجی طاقت کی مطلق پروا نہ کرتے ہوئے حریت و آزادی کا جھنڈا بلند کئے رکھا، اور باوجودیکہ زندگی کا بہت بڑا حصہ آلام و مصائب کے ساتھ پہاڑوں میں رہ کر یا رات دن گھوڑے پر شمشیر بدست بسر کرنا پڑا مگر اس بہادر نے سر اطاعت خم نہ کیا اور اپنی قومی آن کے لئے ہر طرح کی مصیبت خوشی سے برداشت کی۔

کتاب میں راجپوتانہ اور سلطنت اکبری کے نقشوں کے علاوہ اشخاص و مقامات متعلقہ کی بہت سی ہاف ٹون تصویریں بھی شامل کی گئی ہیں جن سے کتاب کی خوبیاں دوبالا ہوگئی ہیں۔ مسٹر اے۔ سی۔ وولنر سی۔ آئی۔ ای، ایم۔ اے وائس چانسلر پنجاب یونیورسٹی کے قلم سے ایک مختصر مگر پرمغز تمہید بھی شامل ہے۔ کتاب موجودہ مہارانا صاحب اُودے پور مہارانا سر بھوپال سنگھ بہادر کی منظوری سے شائع کی گئی ہے۔ کتبخانوں اور لائبریریوں میں رکھنے کے قابل ہے۔

ملنے کا پتہ: ڈی۔ اے۔ وی کالج مینیجنگ کمیٹی۔ لاہور

شعر کی آگ

(از حضرت جوشؔ ملیح آبادی)

میری نظمیں آتشِ سوزاں کا ہے جن پر گماں
سننے والے یہ تو ہیں سیلی ہوئی چنگاریاں

فکرِ بے پروا نے سینے سے نکالا ہے جنھیں
ناطقے نے برف کے سانچے میں ڈھالا ہے جنھیں

یہ مرے نغمے نظر آتے ہیں جو تپتے ہوئے
سب کے سب ہیں شبنمِ الفاظ سے بھیگے ہوئے

کب ملیگی میری نظموں کی خس و خاشاک میں
وہ سنہری آگ روشن ہے جو میری خاک میں

ان کا اک پرتو بھی آ سکتا نہیں اشعار میں
سانس بنتے ہیں جو شعلے اس دلِ بیزار میں

کیا کہوں وہ برق جو رگ رگ کو پگھلاتی ہوئی
دوڑتی پھرتی ہے اس سینہ میں بل کھاتی ہوئی

کیا کہوں وہ سوزِ پنہانی جو میرے دل میں ہے
آہ اس شعلے کی عریانی جو میرے دل میں ہے!

ولولے اس روح کے آتے ہیں جب ہیجان میں
سنسناہٹ آنچ کی آتی ہے میرے کان میں

بجلیاں میری اگر کھنچ آئیں میرے راگ میں
ناطقہ تبدیل ہو جائے دہکتی آگ میں

سننے والے جل اٹھیں شور و فغاں اٹھنے لگے
پڑھنے والے کی رگ و پے سے دھواں اٹھنے لگے

آنچ اس دل کی اگر نظموں کو ضو دینے لگے
حرف گل جائیں لبِ گفتار لَو دینے لگے

متھراجی

(از مولانا حسرت موہانی)

متھرا، کہ نگر ہے عاشقی کا، دم بھرتی ہے آرزو اسی کا
ہر ذرۂ سرزمینِ گوکل دارا ہے جمالِ دلبری کا
برسانہ و نند گانوں میں بھی دیکھ آئے ہیں جلوہ ہم کسی کا
پیغامِ حیاتِ جاوداں تھا ہر نغمہ کرشن بانسری کا
وہ نورِ سیاہ تھا کہ حسرت
سرچشمہ فروغِ آگہی کا

پیاسی ندی

(از حضرت جوش ملیح آبادی)

اے برادر پل پہ گنگا کے جب آ جاتی ہے ریل! پھینکتا ہے کس لئے پیسے یہ کیا کرتا ہے کھیل؟
قوم کی آنکھوں سے جاری ہیں لہو کی ندیاں بہہ رہی ہے جن کے اندر عزتِ ہندوستاں
کیوں نہیں آتا ہے تو اس خون کی ندی کے پاس جسکو گنگا سے کہیں بڑھ چڑھ کے ہے دولت کی پیاس
ڈوب کر گنگا میں اک پیسہ ابھر سکتا نہیں ہند کی آنکھوں سے آنسو خشک کر سکتا نہیں
کارآمد ہے جو آبِ زندگانی کی طرح تو وہی دولت بہا دیتا ہے پانی کی طرح
دیکھکر تیری یہ نادانی، یہ کارِ ناصواب شرم کے مارے ہوئی جاتی ہے گنگا آب آب
بازوئے زر نا خدائی کے لئے تیار ہو ڈوبنے والی ہے کشتی قوم کی ہشیار ہو
کی گئی ناوقت قربانی تو پھر کیا فائدہ
سر سے اونچا ہو گیا پانی تو پھر کیا فائدہ

ہندوستان کی عورت

(از منشی فیاض الدین احمد خاں فیاض گوالیاری)

زمانہ میں نہ تھی جب روشنیِ شمعِ وفا تھی تو ۔ نہ تھا جب کوئی رنگیں نقش تصویرِ حیا تھی تو
بہت محدود رہ کر پیکرِ ناز و ادا تھی تو ۔ تری قیمت نہ تھی کچھ بھی وہ جنسِ بے بہا تھی تو
بڑھایا ہے تری ساری کا آنچل تیری عصمت نے
کہ تیری پردہ داری کی ہے اکثر دستِ قدرت نے

بلائیں قحط میں، افلاس میں مشکل میں آفت میں ۔ وہ قسمت کا دھنی تھا آئی تھی تو جسکی قسمت میں
وفا شوہر پرستی حلم۔ ہمدردی۔ صداقت میں ۔ مثالیں کب تری پیدا ہیں دنیا کے محبت میں
سراہا ہے بہت ہر صاحبِ احساس نے تجھکو
کیا ہے زندۂ جاوید کالیداس نے تجھکو

وطن پر کس نے قرباں دل کے ٹکڑوں کو کیا؟ تو نے! ۔ خوشی سے اپنا سکھ اپنا عیش کس نے تج دیا؟ تو نے!
ہلاہل کو بھی امرت جانکر کس نے پیا؟ تو نے! ۔ مصیبت آپڑی تو کام ہمت سے لیا تو نے
تری غیرت بنی پروانہ اپنی شمع عصمت کا
یہ جوہر تھا کہ دل ٹھنڈا کیا جل کر محبت کا

ستی ستونتی ساوتری کبھی تھی تو کبھی سیتا ۔ نہ تجھکو موت نے روکا، نہ راون نے تجھے جیتا
رشی وہ کونسا ہے دودھ جو تیرا نہیں پیتا ۔ تری ہر بات سبر کی بات ہے، ہر گیت ہے گیتا
بھرم دنیا میں قائم دھرم کا تیری بدولت ہے
ترے سایہ میں برکت ہے ترے قدموں میں جنت ہے

صنمخانے رہے روشن ترے جوشِ عقیدت سے ۔ تڑپ پیدا ہے جمنا میں ترے جذبِ محبت سے
ابھی تک برج کی دنیا ہے رنگیں تیری رنگت سے ۔ فضا مملو ہے میراں بائی کے نغماتِ الفت سے
گنہ مخلوق کے دھوتا ہے ابتک گھاٹ گنگا کا
ترے معصوم اشکوں نے بڑھایا پاٹ گنگا کا

ترا ٹیکہ، تری بندی، ترا چندن، ترا قشقہ	تری چادر، تری ساڑھی، ترا آنچل، ترا جلوہ
ترے تیور، تری آنکھیں، تری چتون، ترا نغمہ	تری چلبل، تری بنوٹ، ترے گیسو، ترا شانہ
یہ مستی کی دھڑی، یہ آنکھ کا کاجل قیامت ہے
یہ ناگن زلف، یہ ہاتھوں میں کنگا جل قیامت ہے
ترے مبوسس زنگار رنگ کی رنگینیاں واللہ!	تری پازیب کے نغموں کی خوش آہنگیاں واللہ!
ترے گھونگھٹ کی وہ محجوب جلوہ چینیاں واللہ!	تری دینداریاں واللہ تری بے دینیاں واللہ
تری برسات میں جھولوں پہ وہ نغمہ نوازی اُف
تری ہر صبح کو پنگھٹ پہ وہ جلوہ طرازی اُف
صباحت میں ملاحت کی نزاکت، تیرا حصہ ہے	مزاج رنگ و رنگینی و رنگت تیرا حصہ ہے
ادائیں تیری فطری حسنِ فطرت تیرا حصہ ہے	نہ ہے صورت، نہ ہے سیرت، محبت تیرا حصہ ہے
مشقت خانگی مصروفیت کی کام ہے تیرا
تری صحت کا ضامن ہے، تو یہ ہی کام ہو تیرا
ٹھہر اے مشرقی دیوی کدھر کو جا رہی ہے تو	یہ مغرب کی طرف رخ کرکے ٹھوکر کھا رہی ہے تو
شفق کو خون کے آنسو عبث رُلوا رہی ہے تو	گذشتہ دور سے اپنے عبث شرما رہی ہے تو
خصوصیات اپنی وجہ نازش کیوں نہیں تجھکو
انھیں کھونے کی ہر کوشش پہ کاہش کیوں نہیں تجھکو
پرستاروں کے جگمٹ میں نظر کا لطف جائے گا	رہیگی گھر سے باہر تو، تو گھر کا لطف جائے گا
محبت کا، عقیدت کا، اثر کا لطف جائے گا	گھڑی بھر کی ہوس میں عمر بھر کا لطف جائے گا
یہ مانا علم اچھا، روشنی اچھی، ہنر اچھا
مگر وہ کیا برا تھا، آپ اچھے اپنا گھر اچھا
تری تعلیم سے ہے تربیت آئندہ نسلوں کی	اسی پر ہے بنائے فوقیت آئندہ نسلوں کی
اسی سے شُستہ ہوگی ذہنیت آئندہ نسلوں کی	مگر سُن لے امید و تقویت آئندہ نسلوں کی
ہوائے ہمسری قاعدہ تقسیم عمل اچھی
کہ گھر باہر میں قایم سدِّ تقسیم عمل اچھی
خوشی سے سیکھ تو حفظانِ صحت کے اصولوں کو	خوشی سے سیکھ دنیا میں معیشت کے اصولوں کو

نہ بھول اتنا مگر اپنے قدامت کے اصولوں کو — اصول خانہ داری کو۔ محبت کے اصولوں کو
نہ اِس ردِ عمل میں انتقامی شان پیدا کر
حدوں میں اپنی رہ کر انقلابی شان پیدا کر
ابھی فیاض پھر ابھی ہے ہندوستان کی عورت — ابھی بنکر نہیں بگڑی ہے ہندوستان کی عورت
ابھی اتنی نہیں بدلی ہے ہندوستان کی عورت — ابھی صورت میں عورت کی ہے ہندوستان کی عورت
کبھی حد سے گذرنے کا جنوں اسکو بھی ہوتا ہے
مگر ہنستی نہیں یہ اُسپہ۔ یورپ جس کو روتا ہے

نسیمِ سحر

(از پنڈت اندر جیت شرما ماجرہ ضلع میرٹھ)

کس ناز کس ادا سے نسیمِ سحر چلی — بُو کی طرح رواں ہوئی مثلِ نظر چلی
باغوں کا رُخ کیا تو گراتی ثمر چلی — شبنم کے پتیوں پہ لٹاتی گہر چلی
پھولوں کے جام بادۂ مستی سے بھر چلی — اہلِ چمن کو خواب سے بیدار کر چلی
روئے چمن کی دیکھ کے زینت مچل پڑی
سبزہ کو چھیڑ چھاڑ کے لہرا کے چل پڑی
تختے گلوں کے چشم زدن میں کھلا چلی — خوشبو کے اور شمیم کے دریا بہا چلی
سجدہ میں شکر کے لئے شاخیں جھکا چلی — چڑیوں کو شاخ شاخ پہ جھولا جھلا چلی
پتوں کو لڑکھڑا دیا باجا بجا چلی — بزمِ طرب کا رنگ چمن میں جما چلی
سنبل کی زلفِ ناز کو سلجھا کے چل پڑی
دامن کو خار خار سے اُلجھا کے چل پڑی
باہر چلی چمن سے اُڑاتی نشاں چلی — عیش و طرب کا ساتھ لئے کارواں چلی
مُردہ دلوں کو بن کے مسیحِ زماں چلی — کھوتی ہوئی زمانہ کا دردِ نہاں چلی
دیتی چلی پیامِ بقا کا جہاں چلی — بن کر چمن کے واسطے روح و رواں چلی
پھر غُٹ گئی جو مہر سے جھلا کے چل پڑی — میداں کی سمت بڑھ گئی گرما کے چل پڑی

جھیل ڈل کشمیر

(از جناب بابو رام پرشاد کھوسلہ ایم۔ اے (آکسن) پرنسپل بھاگلپور کالج)

اے ڈل تو ہے پیشانیِ کشمیر کا زیور
تو شاہدِ فردوس کے ماتھے کا ہے جھومر

تو زینت و رعنائیِ عروسانِ چمن کو
دانوں میں زمرد کے لٹکتا ہوا گوہر

اے حسن کی دیوی تو بتا خود ہی کہ کیا ہے
ہیرے کی کنی ہے کہ چمکتا ہوا اختر

آتی ہیں قدمبوسی کو جنت کی ہوائیں
کرتا ہے کواکب کو فلک تجھ پہ نچھاور

سرسبز ہوئی کشتِ فلک تیرے کرم سے
کشمیر ہے فردوس تو تو ثانیِ کوثر

پانی نہیں یہ جو ترے ساغر میں بھرا ہے
لبریز ہے تو بادۂ عرفاں سے سراسر

وہ بات یہاں دیکھی جو کانوں نہ سنی تھی
ہیں کھیتیاں اور باغ یہاں پانی کے اندر

تو چاروں طرف سبزۂ دلکش سے گھری ہے
سبزہ نظر آتا ہے تری سطح کے اوپر

تختوں پہ جمی مٹی ہے مٹی پہ اُگے پھول
گویا ہے چمن پھولا ہوا تختِ رواں پر

تیرے رخِ روشن کی شعاعوں کا ہے پرتو
کشمیر کی پریوں کا جو ہے حسن منور

تیوں سے کیا تجھ پہ چناروں نے ہے سایہ
ہیں تیری حفاظت کو کھڑے سرو و صنوبر

ہے ناز ترا نازِ حسیناں سے زیادہ
غمزہ ہے ترا غمزۂ معشوق سے بڑھکر

کہتا ہے کوئی چشمہ تجھے آبِ بقا کا
اور کوئی تجھے کہتا ہے امرت کا سرودر

بیخود ہوا جاتا ہے وہاں پیرِ فلک بھی
دیکھا ہے ترا جب سے چھلکتا ہوا ساغر

سورج کی کرن پڑتی ہے جب پانی پہ تیرے
آتی ہے نظر ایک زر و سیم کی چادر

جلتا ہوں شب و روز تپِ غم سے جہاں میں
میں کاش سما جاؤں ترے پانی کے اندر

ناشاد کو یوں گود میں تو پیار سے لے لے
لے بچے کو جس پیار سے آغوش میں مادر

اقوال بھرتری

(ترجمہ منشی تلوک چند محروم، بی-اے)

(۱)

درباں کا یہ فرماں ہو کہ فرصت نہیں اس وقت
مصروف ہیں تنہائی کے افکار میں سرکار
پھر جاؤ، تو کہتا ہے کہ یہ وقت نہیں ہے
ہیں مائلِ آرام طبیعت ہے گرانبار
تقدیر پہ نازاں ہوں، کریں شکرِ خدا ہم
حاصل ہو مہاراج کے دربار میں جب بار

بیہودہ تمنا ہے تری اے دلِ ناداں
کیا فیض تجھے دیگی یہ سرکار، وہ دربار
درگاہ میں کیوں اسکی تو حاضر نہیں ہوتا
شاہوں کا شہنشاہ ہے جو خالقِ غفار
درباں ہے نہ حاجب کوئی دروازے پہ جسکے
سختی سے جہاں پیش نہ آئے کوئی زنہار
واں راحت و آرام کے لٹتے ہیں خزانے
اور دولتِ جاوید کے انبار در انبار

(۲)

عزت میں زوال آگیا اب
اور ہاتھ سے مال جا چکا سب
دیتے نہیں اب دعا سوالی
جانے لگے در سے آ کے خالی
آنکھیں لگے پھیرنے اعزا
پہلو سے جدا ہوئے احبا
ایسے میں اگر ہو عقل یاور
انساں کے لئے یہی ہے بہتر
کہسار میں وہ مقام دلجو
گنگا کرتی ہو پاک جس کو
رہنے کے لئے پسند کر کے
آنکھیں دنیا سے بند کر کے
بس ایک گپھا میں بیٹھ جائے
اور ذاتِ احد سے لَو لگائے

آہ، رواںؔ!

(از قلم بابو کرشن سہائے ہتکاری۔ وحشیؔ کانپوری)

(زمانہ کے نامور شاعر منشی جگت موہن لال صاحب رواںؔ مصنف روح رواں نے بتاریخ ۴ ستمبر سنہ ۳۴ء بوقت ۱۲ بجے دن اس جہان فانی کو خیرباد کہہ دیا ہے۔ موصوف اناؤ کے ایک مشہور وکیل اور اردو کے زبردست شاعر و ادیب تھے۔ اس مرگ ناگہانی سے اردو ادب کو ایک ناقابل تلافی نقصان پہونچا ہے۔ ذیل کی نظم جناب وحشیؔ نے ان کی وفات سے متاثر ہو کر کہی ہے۔ ا۔ ز)

کون گوہر ہے صدف سے جو جدا ہونیکو ہے — کون قطرہ ہے جو دریا میں فنا ہونے کو ہے
حسرتوں کا دل میں کیوں محشر بپا ہونیکو ہے — ساحلِ گنگا پہ یارب آج کیا ہونیکو ہے
کس کی صورت آج نظروں سے نہاں ہونیکو ہے
کون اس بحرِ فنا میں بے نشاں ہونیکو ہے

کون نظروں سے ہماری یوں نہاں ہو کر چلا — توڑ کر بندِ عناصر شکلِ جاں ہو کر چلا
منزلِ ہستی سے گردِ کارواں ہو کر چلا — عالمِ ارواح کو روحِ رواں ہو کر چلا
کون ہے وہ دہر سے جو صورتِ ارماں چلا
سب کو روتا چھوڑ کر گل کی طرح خنداں چلا

آخری جامِ مئے ہستی پیئے جاتا ہے کون؟ — دوستوں کو داغِ مہجوری دیئے جاتا ہے کون
بزمِ اربابِ ادب سونی کئے جاتا ہے کون — ساتھ اپنے ساغر و مینا لئے جاتا ہے کون؟
کون ہم سے پھر نہ ملنے کو جدا ہوتا ہے آج
کس کا ماتم ہے کہ ہر پیر و جواں روتا ہے آج

کس پہ ٹوٹی برقِ جورِ آسمانی ہائے ہائے — کس کو تاکا تو نے مرگِ ناگہانی ہائے ہائے
رحم تجھکو بھی نہ آیا لے جوانی ہائے ہائے — مٹ گئی بزمِ ادب کی شادمانی ہائے ہائے
اب ملیگی دیکھنے کو آہ وہ صورت کہاں — خلق اور اخلاص کی وہ موہنی مورت کہاں

مرنے والے گر نہیں سنتا نہ سن آہ و بکا　　واسطہ اپنی محبت کا مجھے اتنا بتا
تو تو بے احباب اک لمحہ بھی رہ سکتا نہ تھا　　چھوڑ کر ہم سب کو آخر کیسے تنہا چل دیا
کیا ہوا جو دوستوں سے اس قدر بیزار ہے
دیکھنا بھی اک نظر مڑ کر تجھے دشوار ہے

تیرے دم سے گرمیٔ بزم ادب ہر آن تھی　　نظم وہ کہتا تھا تو جو شاعری کی جان تھی
ہر رباعی میں عمر خیام کی سی شان تھی　　الغرض تخئیل تیرے تابعِ فرمان تھی
اب سخن کی بجلیاں محفل میں چمکائیگا کون
خون اک اک شعر پر آنکھوں سے رلوائیگا کون

تو گیا کیا بزم سے لطفِ سخن جاتا رہا　　ساتھ تیرے ارتباطِ روح و تن جاتا رہا
انجمن روتی ہے صدرِ انجمن جاتا رہا　　ہمنوائے بلبل و جانِ چمن جاتا رہا
زندگی کیا جبکہ لطفِ زندگی باقی نہ ہو
ساغر و مینا ہو، محفل ہو مگر ساقی نہ ہو

تیرے اخلاص و محبت کی وہ باتیں یاد ہیں　　غیر کو اپنا بنا لینے کی گھاتیں یاد ہیں
گرمیٔ بزمِ سخن کی اُف وہ باتیں یاد ہیں　　یاد ہیں سب زندگی کی وارداتیں یاد ہیں
ہے وہی محفل مگر اب رونق محفل نہیں
دیکھتا سب کچھ ہوں لیکن دید کا حاصل نہیں

غنچہ و گل، ماہ و انجم سب ہیں تیرے سوگوار　　آج بالکل بے اثر ہے حسنِ فطرت کا نکھار
اس طرح سونا نظر آتا ہے صحن لالہ زار　　جیسے کوئی لوٹ لے کل ساز و سامانِ بہار
دلکشی وہ صبح کے رنگیں تبسم میں نہیں
وہ سرور و کیف موجوں کے ترنم میں نہیں

مرنے والے، تیری کس کس بات کا ماتم کریں　　جوشِ بے پایانِ الفت کو کہاں تک کم کریں
تیری مرگِ ناگہاں پر صبر کیسے ہم کریں　　سچ تو یہ ہے کم ہے تیرا جسقدر بھی غم کریں
اب دعا یہ ہے کہ اے پاکیزہ مشرب ہمنشیں
روح کا مسکن ہو تیرے قصرِ فردوسِ بریں

لطفِ سخن

(حضرت جگر بریلوی)

خلشِ دردِ زندگی نہ گئی
نہ گئی آہ جیتے جی نہ گئی

چارۂ کاوشِ درُوں نہ ہوا
اور دل سے اُمید بھی نہ گئی

طوق و زنجیر کا ہوا ارشاد
میری فریاد جب سُنی نہ گئی

دل کو پتھر بنا لیا ہم نے
پھر بھی اِک لرزشِ خفی نہ گئی

دل کے جلووں میں غرق ہو نہ سکا
نہ گئی میری بے خودی نہ گئی

نہ ہوا بند گریۂ شبنم
گل گلزار کی ہنسی نہ گئی

گلِ خوشبو کی نکہتیں نہ رکیں
خار کی نیشتر زنی نہ گئی

کر دیا دل کو غرقِ بادۂ ناب
جب مصیبت بہت سہی نہ گئی

بخش ڈالا تجھے مقامِ بہار
خوئے شکوہ جگر تری نہ گئی

(جناب جگموہن ناتھ رینہ شوق)

موت کیوں چارہ گر نہیں آتی
شام سے تا سحر نہیں آتی

ہاں نہیں ہو فقط جواب سوال
اتنی سی بات کر نہیں آتی

آج ایسی پلائی ساقی نے
مبتدا کی خبر نہیں آتی

ایک ہچکی میں کام ہو جاتا
وہ بھی اب تا سحر نہیں آتی

کیا کھٹک اب بھی دلمیں رہتی ہے
نیند کیوں رات بھر نہیں آتی

حرم و دَیر جا کے دیکھ لئے
کوئی صورت نظر نہیں آتی

دل سے بھی ہاتھ ہم تو دھو بیٹھے
خیر ہو۔ کچھ خبر نہیں آتی

بہرِ تسکینِ دل کوئی مدبیہ
تجھ کو اے چارہ گر نہیں آتی

دل میں رہتی ہے شوق یادِ خدا
دل سے باہر مگر نہیں آتی

(گنگا دھر ناتھ فرحت کابندی بی۔ اے۔ ایل ایل۔ بی)

اک خلش سی ہے مجھے تقدیر سے
الاماں! اس خارِ دامنگیر سے

عقل عاجز آ گئی تدبیر سے
وہ بھی شاید مل گئی تقدیر سے

حسرتِ نظارہ کی تاثیر سے
پردہ اُٹھا یار کی تصویر سے

شامِ غم کے رونے والے! صبر کر
صبح بھی ہو گی تری تقدیر سے

ادعائے ضبطِ غم کرنا پڑا
تنگ آ کر آہِ بے تاثیر سے

مجھکو دیوانہ سمجھ لیں اہلِ ہوش
کیوں اُلجھتے ہیں مری زنجیر سے

دل نہیں اک آبلہ سینے میں ہے
اس نگاہِ گرم کی تاثیر سے

ہائے رے تدبیر کی ناکامیاں
اور کیا اُمید ہو تقدیر سے

ہوتی ہے تسکین فرحت کچھ نہ کچھ
خوش ہوں اپنی آہِ بے تاثیر سے

(حضرت محشر لکھنوی)

سراپا یاس و فورِ ضعف سے بیٹھا ہوا دل ہوں
کہیں آنے کے قابل ہوں نہ میں جانیکے قابل ہوں

مری روشن خیالی باعثِ افتادگی نکلی
چراغِ حدِ منزل ہوں غبارِ راہِ منزل ہوں

بہت عرصہ ہوا طے ہو چکیں راہیں مجازی کی
وہ وقت آیا خیالِ دوست میں دنیا سے غافل ہوں

خوشا قسمت جگہ اپنی ہے بزمِ لن ترانی میں
حقیقت یہ فرازِ طور پر جلتا ہوا دل ہوں

تعلق اہلِ دنیا سے نہ رکھا اور نہ رکھوں گا
جو سب کا دینے والا ہے اُسی کے در کا سائل ہوں

مری منزل شناسی عاشقی میں کوئی کیا سمجھے
کہیں تو جان آسانی کہیں پر روحِ مشکل ہوں

حیاتِ چند روزہ کے سوانح مختصر یہ ہیں
نہ دیکھا جس نے دنیا کو نظر بھر کے میں وہ دل ہوں

مری ناکامیوں کو پوچھنے پروانہ کیا آتا
غضب ہے شام ہی سے میں فسردہ شمعِ محفل ہوں

اُبل آئے نہ دریا آنسوؤں کا چشمِ گریاں سے
نہ چھیڑ اے ہمنفس نشتر میں دکھتا ہوا دل ہوں

مرا نیرنگِ ہستی ہے دلیلِ تجربہ کاری
کبھی ہوں واعظوں میں اور کبھی رندوں میں شامل ہوں

زمانے کی جفا سہہ کر یہ دولت ہاتھ آئی ہے
فدا حبِ وطن پر ہوں حقیقت آشنا دل ہوں

غمِ فرقت میں جینا معجزاتِ عشق ہیں محشر
مری ہر سانس کہتی ہے کہ میں مشکل پہ مشکل ہوں



چودھری جگت موہن لال رواں ایم اے-ایل ایل بی مرحوم

پیدایش سنہ ۱۸۸۹ء وفات سنہ ۱۹۳۴ء



منشي پيارےلال رونق دهلوي مرحوم

پيدايش سنه ١١١٩ء وفات سنه ١٩٣٤ ع

زمانہ

جلد ٦٣ اکتوبر ۱۹۳۴ء نمبر ۴

برکلے اور اُسکے فلسفہ پر ایک سرسری نظر

(از ڈاکٹر ایس۔ ایم۔ نجم الحسن موہانی)

تمہید اور تعریف فلسفہ انسان اور اُس کی ذہنی جد و جہد کی کوئی مستقل تاریخ موجود نہیں یعنی فلسفہ کی ابتدا کا صحیح زمانہ ہنوز متعین نہیں ہوا ہے۔ تاہم مذہب اور فلسفہ کی جنگ میں ایسے ایسے نامور محقق پیدا ہوئے جن کی کوششوں کو صدیوں تک شرف قبولیت حاصل رہا ہے انھیں میں ایک برکلے ہے جس کا نظریہ یہ ہے کہ موجودات عالم جن اشیاء کا مجموعہ ہے ان پر ہم متعدد طریقے پر نظر دوڑا سکتے ہیں۔ اگر ہمارے تمام نتائج تجربہ اور مشاہدہ کے قیود سے آزاد کر کے دیکھیں جائیں تو معمولی سے معمولی چیز میں جو بات ہر جگہ مشترک نظر آئیگی وہ کیفیت۔ کمیت۔ رنگ۔ جمود۔ وزن۔ بو۔ آواز۔ اشتعال۔ ترکیب۔ ترتیب۔ تحلیل۔ انضمام۔ انتشار۔ ادراک۔ تعدد۔ تجسیم۔ تغیر۔ تمثل۔ تشکل۔ جسامت۔ نفس۔ لف و نشر۔ علت و معلول وغیرہ کے دائرہ سے خارج نہ ہوگی۔ فلسفہ انھیں کے متعلق وسیع ترین کلیات قائم کرنیوالے علم کا نام ہے فلسفہ کی اس مختصر تعریف کے بعد ہم برکلے کی زندگی پر نظر ڈالتے ہوئے اسکے فلسفہ پر تبصرہ کرینگے۔

برکلے اور اسکی زندگی اٹھارھویں صدی عیسوی کو اگر علم کی صدی کہا جائے تو ناموزوں نہ ہوگا۔ یہ صدی آتے آتے اپنے ساتھ ایک ایسا مجدد اور فلسفی لائی جس نے سب سے پہلے علم کلام اور فلسفہ میں مصالحت و مقاومت کا نیا راستہ نکالا۔ ماہیت واجب الوجود اور وحدت و کثرت کے مسائل اور مباحث کا براہ راست تعلق علم کلام اور الٰہیات سے تھا فلسفہ ضمناً اس "نقل" کی جنگ کو "عقل" سے لا بھڑانے میں کوشاں رہا

مگر اسے کوئی کامیابی نہیں ہوئی۔ لیکن سرزمین آئرلینڈ میں ۱۲ مارچ ۱۶۸۵ء کو جارج برکلے تولد ہوا، جس نے نیا محاذ بنایا اور جدید نظامِ فلسفہ (تصوریت) کا تخیل پیدا کرکے آخری فیصلہ کن جنگ چھیڑ دی۔ اس بحث سے قطع نظر کہ وہ اس میں کامیاب ہوا یا ناکام رہا ہمیں یہاں پر صرف یہ دکھانا منظور ہے کہ ایک متکلم و فلسفی کی حیثیت سے اس کا کیا مرتبہ ہے؛

برکلے نے مدرسہ ڈبلن میں تعلیم پائی۔ ابھی وہ فارغ التحصیل نہ ہوا تھا کہ تصوریت پر غور و خوض کرنا شروع کردیا۔ سنہ ۱۷۰۷ء میں کالج سے فرصت پاکر اُس نے علم ہندسہ پر ایک کتاب لکھ ڈالی۔ سنہ ۱۷۰۹ء میں ایک رسالہ "نظریۂ رویت" کے نام سے شائع کیا۔ سنہ ۱۷۱۳ء میں علم المناظرہ پر فاضلانہ اور فلسفیانہ انداز میں دو کتابیں مبادی علم اور مکالمات لکھیں "عقل" و "نقل" کی جنگ کے سلسلہ میں کتب مذکورہ ہنوز لاجواب ہیں۔

برکلے بچپن ہی سے "علم دوست" واقع ہوا تھا۔ ہماری مراد صرف کتابی اور اکتسابی علم سے نہیں ہے بلکہ اُسے ذاتی تجربہ اور مشاہدۂ عینی سے کمال شوق تھا، چنانچہ ایک مرتبہ کا ذکر ہے کہ تقریباً بارہ برس کی عمر میں جب اُس نے کسی مجرم کو پھانسی پاتے ہوئے دیکھا تو اس کو یہ فکر دامنگیر ہوئی کہ پھانسی پانیوالے شخص کی دلی کیفیات کو عملاً معلوم کرنا چاہئیے۔ اُس نے خود اپنی ذات پر اس کی آزمائش کی اور اپنے ہاتھ سے گلے میں پھندا ڈالکر ایک دوست کو ہدایت کی کہ جب مجھ پر عالمِ نزع طاری ہو تو فوراً اس پھندے کو میری گردن سے جدا کردینا۔ اس حرکت کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کی صحت تمام عمر کے لئے خراب ہوگئی۔ مگر اس واقعہ سے یہ ضرور ثابت ہوتا ہے کہ برکلے میں تحقیق و مشاہدہ کا مادہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ اُس نے ممالک یورپ کے بعض حصص کا سفر کرکے مختلف مقامات پر مشاہیر حکما، اور مبصرین سے گفتگو اور تبادلۂ خیالات کیا۔ واپسی پر بمقام ڈیری اُسے ایک اعلیٰ مذہبی عہدہ دیا گیا لیکن تھوڑی ہی مدت کے بعد برکلے اس عہدے سے مستعفی ہوکر شمالی امریکہ چلا گیا جہاں اُس نے وحشی قبائل میں دینِ مسیح کی تبلیغ شروع کی۔ حکومت نے اس صلے میں اُسے سوا سو روپیہ کا مشاہرہ مقرر کردیا اور وہ اسی پر متواتر سات سال تک اپنے فرائض انجام دیتا رہا۔ اخیر میں حکومت نے ایک کوڑی بھی نہ دی تو یہ مفلوک الحال وطن واپس آگیا۔ صلۂ موعودہ کے نہ ملنے کا صدمہ اُسے شکستہ خاطر بنانے کے لئے کچھ کم نہ تھا لیکن وہ اس سے مطلق متاثر نہ ہوا اور حسبِ معمول مطالعۂ کتب و علمی مشاغل میں مصروف ہوگیا۔ سنہ ۱۷۵۳ء میں ایک دن جبکہ وہ کسی کتاب کے مطالعہ میں مستغرق تھا دفعتہً اُس کے قلب کی حرکت بند ہوگئی اور یہ فلسفی بشپ رہگرائے عالمِ جاودانی ہوگیا۔

مشاہیر کی رائے | جیسا کہ مکنٹاش اپنی کتاب فلسفۂ اخلاق میں لکھتا ہے کہ برکلے کی ذات تمام صفات

ومحاسن کی جامع تھی اور اُس کے دشمن بھی اُس کی خوبیوں کا اعتراف کرتے تھے" اُس کے زمانہ کا سب سے بڑا نقاد اٹیربری کا اس کے متعلق قول ہے کہ "برکلے کی ملاقات سے قبل میں اس کا گمان بھی نہ کرسکتا تھا کہ یہ شخص اتنا زبردست عالم و فاضل ہے، مگر انتہائی علمی تبحّر کے ساتھ اس کے مزاج میں فرشتوں سے بھی زیادہ انکسار بھرا ہوا تھا"

مشہور شاعر پوپ (Pope) نے برکلے کی تعریف و توصیف میں لکھا ہے کہ "آسمان کے نیچے خُلق و نیکی کے تمام اوصاف برکلے کی ذات میں مجتمع ہو گئے تھے۔ بلاشبہ برکلے ہمہ صفات موصوف تھا۔ گو تعلیم و تربیت کو بھی اصلاحِ نفس و تزکیۂ اخلاق میں بڑا دخل ہے لیکن برکلے خلقی طور پر بہت نیک طبیعت اور خوش اخلاق واقع ہوا تھا"

ارتقاء فلسفہ برکلے سے قبل یہاں پر فلاسفۂ یورپ کے نظریوں کا مختصر ذکر کچھ بیجا نہ ہوگا، کیونکہ اس سے یہ معلوم ہوجائیگا کہ فلسفہ نے کس حد تک اپنے ارتقائی منازل طے کرلئے تھے اور برکلے نے اسمیں کیا اضافہ کیا۔ لارڈ بیکن یورپ کا اولین فلاسفر سمجھا جاتا ہے، کیونکہ فلسفہ میں "استقرار" کی پابندی کو سب سے پہلے اسی نے لازم قرار دیا جس کے باعث طبیعیات کی دنیا بدل گئی ورنہ اس سے قبل مسائل علمیہ کی تحقیق میں استقرار کی ضرورت تسلیم نہ کیجاتی تھی حالانکہ علوم جدیدہ کی بنیاد "استقرار" ہی پر ہے۔ بیکن کے بعد مجدد فلسفہ ڈیکارٹ کا مرتبہ ہے۔ اصولِ تصفیح یا منطق استقرائی کا یہ بھی بڑا مؤید او مبلغ ہے۔ ذہنیات میں ڈیکارٹ "طریقۂ مثالیہ" (The way of Analogy) سے گریز کرتا ہے، اور اس کے نزدیک محض حواس ظاہری و باطنی پر کلیتہً وثوق و اعتماد سراسر مہمل ہے۔ اس نے ارسطو کے خلاف محسوسات عن الخارج کے وجود سے انکار کیا۔ ڈیکارٹ نے "وجود نفس" اور دلائل خدا" میں جو تقریر کی ہے اسکا خلاصہ حسب ذیل ہے:-

"کوئی شے یہ نہیں جس کے "وجود" پر ہم شک نہ کرسکتے ہوں، اور شک کرنا ہی ذی خیال ہونے کا مترادف ہے۔ وہ "وجود" پر دال ہے، مثلاً یہ کہ "میں ہوں" یا "میں ذی وجود ہوں"۔ ان جملوں کا خیال یا تصور جملہ کی صحت کے علاوہ خصوصیات وجود کا بھی مظہر ہے کہ "میں کون ہوں، کیا ہوں اور کیسا ہوں" پس معلوم ہوا کہ کمال ذہنیہ کا ادراک بھی اس جملہ کے ساتھ نفس ذہن میں مرکوز ہوجاتا ہے۔ اس معلول صورت ذہنیہ کی علت کا ہونا بھی لازمی ہے ورنہ عدم علت کی حالت میں معلول کا وجود ناممکن ہے۔ بدیں دلیل کہ لاشئے سے لاشئے منتج ہوا کرتا ہے تو لازم ہوا کہ اس معلول کی علت کوئی نہ کوئی ذی وجود صاحبِ کمال و قدرت ہے جو ہماتصور نفس ذہن پر منقش ہے لیکن تصور محض اس علت کا وجود ہرگز نہیں۔ لہذا ثابت ہوا کہ ہمارے اپنے وجود کے ماسوا خدا کے وجود کی بھی ہمیں ذہنی طور پر اطلاع ہے اور وہی وجود باری ہماری

ذات کی علت ہے: ڈیکارٹ صرف اپنے ادراک پر وجود نفس اور ذات باری کا قائل ہے۔ واضح رہے کہ ڈیکارٹ یقینیات اور اولیات (A priori truth) کی سرحد سے جس کو حسیات یا وجدانیات کی دنیا کہا جاتا ہے بالاتر نہ جا سکا ڈیکارٹ نے سوفسطائی مذہب فلسفہ کی ابتدا کی مذاہب فلسفہ میں دو مذاہب زیادہ قابل غور ہیں جن کو اصطلاح میں "ثنوئین" اور "موحدین" کہتے ہیں۔ مذہب وحدت کی رو سے عالم کی تشکیل کا مدار صرف ایک شئے پر ہے یا عالم صرف ایک چیز سے پیدا ہے یعنی روح اور بعض کے خیال کے مطابق مادہ کا غیر ضروری تعلق معاصرت ہے۔ اس کے برخلاف "ثنوئین" (Dualist) کہتے ہیں کہ عالم کی ترکیب روح اور مادہ ہر دو کے امتزاج سے ہوئی ہے جو لازم و ملزوم ہیں ڈیکارٹ روح اور مادہ (جسم، ہیولیٰ وغیرہ) کے تضاد پر زور دیتا ہے مادہ میں مختلف خواص مثلاً رنگ۔ بو۔ وزن۔ مزہ وغیرہ ہیں اور امتداد اس کا اصلی جوہر ہے۔ ابعاد ثلاثہ مادہ کا وہ خاصہ ہے جو روح میں کسی حیثیت سے نہیں پایا جاتا علاوہ ازیں روح اور مادہ کے درمیان کوئی شئے مشترک نہیں اسلئے براہ راست ایک کا دوسرے پر اثر و تاثیر یا فعل و انفعال ناممکن ہے لہذا تیسری چیز کا وجود ضروری ہوا جو ان دونوں کے اعمال و خواص کل کی جامع ہو اور وہ شئے ان کا "نفس ذاتی" ہے جس کا مستقر دماغ کے نیچے کا ایک غدود "غدود بنکیہ" ہے اور اس کا خاصہ فکر و ادراک ہے جو روح و مادہ کے ساتھ مشترک الماہیت ہے

مذہب ثنویت کے ممتاز افراد فلاطون۔ ڈیکارٹ۔ لائبنٹز ہوئے ہیں ثنویت کا خاتمہ انیسویں صدی کے شروع میں ہوگیا۔ اور اس کے بعد جو حکما پیدا ہوئے مثلاً اسپنسر۔ جیمس۔ کومٹ وغیرہ وہ روح اور مادہ کے مسئلہ کو فلسفہ سے ہٹکر نفسیات کے ماتحت جانچتے ہیں اس لئے انھیں اس مذہب فلسفہ کا حقیقی پیرو نہیں کہا جا سکتا جس کی بنیاد ڈیکارٹ نے ڈالی تھی۔ ابتک جو کچھ منضبط تحریر میں آیا ہے اس سے ناظرین نے اس کا اندازہ لگا لیا ہوگا کہ مذاہب فلسفہ میں وحدانیت اور ثنویت کی کیا اہمیت ہے مگر انہی اصول پر بعض فروع پیدا ہیں جن کا ذکر شاید اس موقع پر غیر موزوں نہ ہوگا۔

فلسفیوں کے دو مختلف الخیال گروہ ہیں، ایک وہ جو کائنات کی علت محض "مادہ" کو قرار دیتے ہیں (ان کو مادئیین کہا جاتا ہے) دوسرا طبقہ وہ ہے جس کے نزدیک مادہ ہیچ اور اصل شئے "روح" اور مجرد روح ہے۔ یہ "روحانئین" کے نام سے موسوم ہیں۔ برکلے آخرالذکر گروہ کا امام ہے۔ یہاں پر مشہور مادئیین کے فلسفیانہ خیالات کی ترقی کا مختصر ذکر بیجا نہ ہوگا

مادیت کی عمر فلسفہ سے زیادہ نہیں تو اس کے برابر ضرور ہے۔ مادئیین کے تفصیلی عقائد پر کچھ ایسا پردہ پڑا ہوا ہے کہ وہ دنیا سے ناپید معلوم ہوتے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ جن عقائد کی تبلیغ میں قوت اور

حکومت مانع ہوتی ہے ان کا عروج پانا ناممکن ہے مگر ذہنی ترقی کا یہ عجیب معمہ ہے کہ جب کبھی فلسفہ کا عروج ہوتا ہے تو حکومت یا مادی ذرائع کا خاتمہ ہو جاتا ہے، گویا ذہنی ترقی ہمیشہ مادی زوال کا پیش خیمہ ہوتی رہی ہے۔ آپ کو روحانیین کی وسعت کا صحیح اندازہ اسی وقت ہوسکے گا جبکہ آپ کے سامنے مادیت کا میدان بھی موجود رہے۔ سب سے قدیم مادی دیمقرطس یونانی تھا، جس کے عقائد کا خلاصہ یہ ہے کہ بجز مادہ کے اور کوئی شے مستقل نہیں، مادہ قدیم (ازلی) اور لایزال ہے، اسکو فنا نہیں (لایموت)۔ مادہ کے چند خواص ہیں جنمیں سب سے اہم "حرکت" ہے۔ روحانی یا ذہنی کیفیات سے جس خاصہ کو تعبیر کیا جاتا ہے وہ دراصل "حرکت" کا طبعی نتیجہ ہے جو ناقابل تجزیہ ہے۔ مادہ کے غیر مرئی اجزا فضا میں منتشر ہیں جن میں حرکت کے ذریعہ تعمل ہوتا ہے جس کو "حیات" کہتے ہیں اور انھی کا پراگندہ یا پریشان ہو جانا "موت" ہے۔ بقول شاعر

زندگی کیا ہے عناصر میں ظہور ترتیب موت کیا ہے انہی اجزا کا پریشاں ہونا (چکبست)

دیمقرطس یونانی کے بعد مدتوں "مادیت" پر نحوست طاری رہی، آخر کار سترھویں صدی میں ہابس (Hobbes) نے اس کے احیاء کے لئے بہت کچھ کوشش کی۔ ہابس کے بعد ہولیک و لیمیٹری نے مذہب مادیت کو فروغ دیا۔ ان ہر دو کے خیالات کا خلاصہ یہ ہے:-

"حرکت" مادہ کا غیر منفک خاصہ ہے اس کی دو قسمیں ہیں، اولاً یہ کہ کوئی جسم خارجی قوت سے متاثر ہوتا ہو جس کو ہم محسوس کر سکتے ہیں، ثانیاً یہ کہ ایسی حرکت جو ایک ہی جسم کے مختلف ذرات میں از خود غیر محسوس طور پر ہوتی ہے۔ مثلاً ایک آم ہے جو سڑنا شروع ہوتا ہے، اور سڑن کی وہ غیر معلوم و غیر محسوس کیفیت جسکو ہم دیکھ نہیں سکتے تاوقتیکہ حرکت اولیٰ عیاں نہ ہو اسی کو عام طور پر زبان فلسفہ میں شعور۔ ادراک احساس ارادہ۔ کیفیت یا ذہن کہتے ہیں۔ روح ان سے جدا کوئی شے نہیں اس لئے روح کا علحدہ وجود تسلیم کرنا فضول اور غیر یقینی ہے۔"

ہابس اور ولیمیٹری نے روح کے ابطال میں اسی دلیل سے کام لیا ہے۔ ان کی دوسری دلیل یہ ہے کہ "عقل۔ ذکاوت۔ احساس۔ قوت۔ ادراک۔ مزاج وغیرہ میں جو اختلاف ہر ذی روح میں موجود ہے، اسکا باعث صحت۔ توارث۔ اختلاف طبع یا مرزبوم ہے اسی مادی تنوع یا ترکیب کو "روح" کہہ لیجئے۔ اگر روح کا واقعی وجود ہوتا تو ان کا موافقانہ و مخالفانہ اثر اول الذکر پر ہوتا جس کی کوئی علمی شہادت نہیں ملتی"

روحانیین میں اسپنوزا۔ شیلانگ۔ فخٹے اور برکلے قابل ذکر ہیں۔ اسپنوزا قرار دیتا ہے کہ "اصل قائم بالذات صرف خدا ہے جو غیر فانی ہے۔ خدا کے خود دو عروض ہیں، ایک "روحانی" اور دوسرا "مادی" اور وہ ان دونوں میں اس کا جلوہ ہے۔ روح یا مادہ دونوں تخلیق کی قوت سے معرا ہیں، روح یا مادہ

چونکہ منفرد نہیں بلکہ جلوہ باری کے دو مظاہر ہیں اس لئے عالم کو روح اور مادہ سے مرکب ماننا صحیح نہیں
امتداد مادہ کا اور فکر روح کا وصف ذاتی نہیں بلکہ اضافی ہے۔ اوصاف مذکورہ حقیقی اور ذاتی صرف
خدا کے ہیں۔ اسپنوزا وحدت وجود کا قائل ہے مگر خدا کو غیر محدود جانتے ہوئے بھی قابل انقسام ٹھہراتا ہے
شیلنگ اور فختے کے عقائد و افکار برکلے سے ملتے جلتے ہیں، چنانچہ دونوں کی رائے ہے کہ جیسے ہی کوئی
شخص یہ تصور کرتا ہے کہ "میں ہوں" تو اس تصور کا صحیح مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی ہستی کو دیگر اشیاء
سے ممتاز سمجھتا ہے اور انفرادیت اسکا جوہر ذاتی ہے۔ شیلنگ، فختے کی بات پر اتنا اضافہ اور کرتا ہے
کہ ایغو" (Ego) کا وجود غیر ایغو پر تو بہر حال ثابت ہے لیکن اس سے یہ کیونکر لازم ہوتا ہے کہ سابق
الذکر کوئی مستقل ہستی "نہیں۔ ہر دو یقیناً ایک تیسری ہستی یعنی روح کے محتاج ہیں۔ اس نظریہ کو روحانیت
خارجیہ کہتے ہیں کیونکہ شیلنگ خارجی ذہن (ایغو و غیر ایغو کا) روحانیت میں تسلیم کر لیتا ہے۔

تعلیمات برکلے یہاں تک دیگر روحانیین کے آراء کا خلاصہ دیا گیا ہے، اب برکلے کے فلسفہ پر سرسری نظر
ڈالی جاتی ہے جس سے بہ آسانی معلوم ہو سکے گا کہ خود برکلے نے کیا نئی بات پیدا کی اور فی الحقیقت کیا اضافہ
کیا۔ برکلے کی تعلیمات کا خلاصہ یہ ہے:

۱۔ موجودات عالم کے جتنے خواص ممکن ہیں، رنگ، بو، مزہ، شکل، جسامت، وزن وغیرہ سب
مجموعاً و انفراداً اپنے وجود کے لئے اس امر کے محتاج ہیں کہ کسی کے حس و ادراک میں آسکیں
۲۔ موجودات عالم ہیں اس لئے نہیں محسوس ہوتے کہ موجود ہیں بلکہ ہم محض اس بنا پر ان کے
وجود کے قائل ہیں کہ وہ محسوس ہوتے ہیں
۳۔ وجود اشیاء محسوسیت اشیاء کے مرادف ہے۔ جو شئے قطعاً کسی کے حس و ادراک میں نہیں
آسکتی وہ موجود بھی نہیں ہو سکتی۔
۴۔ گویا کائنات خارجی ممکن الوجود ہے، اور نفس مدرکہ اس کے لئے واجب الوجود ہے، وجود حقیقی
نفس مدرکہ کا ہے اور کائنات خارجی محض ایک وجود شبہی یا ظلی رکھتی ہے۔ جب آفتاب نہیں تو
نہ شعاع باقی رہ سکتی ہے نہ سایہ، جب نفس مدرکہ نہیں تو کائنات کا وجود بھی نہیں۔
۵۔ لیکن ظاہر ہے کہ کائنات کے بیشمار اجزاء ایسے ہیں جو کسی نفس انسانی کے ادراک میں نہیں
آتے، پھر ان کا وجود کہاں ہے؟
۶۔ اس کے علاوہ خود نفوس مدرکہ بھی جزو کائنات ہیں، پھر ان کے "وجود" کے ہم کس بنا پر
قائل ہیں؟

۷۔ ان کا وجود ایک "نفس اعظم" کے ادراک میں آتا ہے جو محیط کل، ہمہ گیر، ہمہ دال اور ہمہ بیں ہے۔
۸۔ عام نفوس مدرکہ محدود اور مخلوق ہوتے ہیں لیکن یہ "نفس اعظم" غیر محدود اور غیر مخلوق ہے زمان و مکان کے قیود سے آزاد، فنا اور نقص کے قوانین سے بالاتر اور بقائے دوام و ہمہ جائی کا اجارہ دار ہے
۹۔ عام نفوس مدرکہ اس کے لئے ممکن الوجود ہیں، اور یہ حقیقۃً واجب الوجود۔
۱۰۔ اسی ذات واجب الوجود کو مذہب کی اصطلاح میں "خدا" کہتے ہیں۔

(از مکالمات ص۱۹، ۱۰، مطبوعہ معارف اعظم گڈھ)

برکلے کی تردید میں ڈاکٹر ریڈ، سر ولیم ہملٹن اور مل نے خوب ہی طبع آزمائیاں کی ہیں لیکن حق یہ ہے کہ کسی سے بھی تردید کا حق ادا نہ ہو سکا۔ سب کے سب برکلے کی نازک خیالی اور جدت طبع کی داد دینے کے بجائے یہی کہا کئے "اگر کوئی شخص عالم مادی (ہیولیٰ) کا منکر ہے تو اس کو آگ میں ڈال دو۔" بلکہ ڈاکٹر ریڈ وغیرہ نے منکر ہیولیٰ ہیوم کے لئے ان الفاظ میں سفارش کی ہے کہ "جب ہیوم منکر مادہ ہے تو اُسے چاہیئے کہ وہ اپنے سر کو دیوار پر مار کر تماشہ دیکھے" ان جوابات پر اس کے سوائے اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ "بریں عقل و دانش بباید گریست"۔

یہ بات بالکل واضح ہے کہ تمام حکما مشائیں اور فلاسفۂ یورپ عالم مادی کے مقر تھے۔ برکلے سے پہلے ان کا یقین تھا کہ اجسام میں طول، عمق، لون، صلابت وغیرہ کے علاوہ کوئی شئے "جوہر مجرد" بھی ہے اور طول بالاعراض کے طور سے اس "جوہر مجرد" میں لاحق ہیں۔ بالفاظ دیگر حکماء مشائین جس کو ہیولیٰ کہتے آئے ہیں اور جو اُن کے نزدیک علت مادہ ہے اسی کے متعلق برکلے کو کلام ہے۔ حکماء بالاتفاق یہ تسلیم کرتے ہیں کہ ماہیت ہیولیٰ ایک نامعلوم شئے ہے اور حواس خمسہ اس "جوہر مجرد" کے ادراک میں عاجز ہیں۔ جو حکما "جوہر مجرد" کے قائل ہیں ان کی دلیل یہ ہے کہ "اعراض بغیر کسی ذی حقائق یا بغیر کسی جوہر کے عارض نہیں ہو سکتے لہٰذا کوئی "جوہر مجرد" ان حقائق (یعنی لون۔ صلابت۔ برودت۔ حرارت فعلیہ۔ حرکت وغیرہ) کے لئے ضرور عارض ہے"۔

برکلے اس "موجود خیالی" کا دشمن ہے جو حواس خمسہ کی شہادت سے بے نیاز ہے۔ لطف یہ کہ جن فلاسفروں نے برکلے پر یہ الزام عاید کیا ہے کہ اس کو حواس خمسہ کی شہادت پر وثوق نہیں (حالانکہ برکلے حقائق محسوسات کا ہرگز منکر نہیں بلکہ صرف جوہر حقائق سے جو ایک فرضی اور خیالی چیز ہے انکار کرتا ہے) مثلاً برکلے کے سامنے ایک میز ہو تو وہ عوام کی طرح اس کے ابعاد ثلثہ۔ رنگ۔ چمک۔ بناوٹ کا قایل ہے مگر ان حقایق و صفات کے علاوہ وہ چیز میز سمجھ لی گئی ہے (ہیولیٰ) اور حکماء نے اسے بلا دلیل میز مان لیا ہے

برکلے اس کا قائل نہیں ہے۔ حواس خمسہ حقائق بالا کے مدرک ہیں اور حقائق مذکورہ کسی ذی حقائق سے لازماً وابستہ ہیں یعنی ان حقائق کا جو اعراض ہیں کسی شئے کے لئے عارض ہونا لازمی ہے اور کسی شئے کو ان کی معروض ہونا چاہیئے۔ مثلاً طول وعرض ہمیشہ مرجع ہیں، کسی طویل یا عریض شئے کی طرف۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جو شئے معروض اعراض ہے وہ خود بذاتہٖ کیا ہے؟ یقیناً اعراض ہیولیٰ "نفس ذہن" ہے اور وہ علم انسانی ہے۔ برکلے علم انسانی کو حسیات یا وجدانیات کہتا ہے۔ اس کے مسلک میں "علم" اور "معلوم" درحقیقت ایک ہی چیز ہے۔ برکلے کے نزدیک تمام عالم خارجی کے وجود کا دارومدار وجود "نفس ذہن" پر ہے۔ یعنی اگر خارجی اشیاء کا ادراک نفس ذہن کرے تو انھیں "وجود" ہے ورنہ نہیں، خواہ مدرک ہمارا خاص نفس ذہنی ہو، یا اور کسی ذی وجود (نفس اعظم) کا۔ اشیاء فی الخارج کا وجود نفس ذہن کے ادراک کا محتاج ہے عام اس سے کہ مدرک کسی کا نفس ذہن ہو۔ اس طرح وجود خارجیہ کے لئے نفس ذہن لازم ہوا اور خود نفس ذہن کا وجود غیر معلوم ہے۔ اس طرح "مادہ" و "ہیولیٰ" اس کے نزدیک بے معنی ہیں جس کو مذہب کی زبان میں "خدا" کہا جاتا ہے جو علیم کل ہے۔

رُباعیات

(حضرت جوش ملیح آبادی)

ہاں سوچ سمجھ کے مجھ سے کرنا کوئی بات
بدمست ہوں میں جھوم رہی ہے برسات
لوح و قلم و کرسی و عرش و افلاک
اِسوقت کھڑے ہوئے ہیں باندھے ہوئے ہات

جھومی تاریک رات میرے دل میں
بدمست ہوئی حیات میرے دل میں
ساقی نے پلا کے مے اٹھایا جو رباب
گم ہوگئی کائنات میرے دل میں

یہ وقت ہو وقتِ ملُو ہوائے ساقی
برسات ہے غرقِ رنگ و بُوائے ساقی
دے جام زر، اسوقت کی سوگند تجھے
جسوقت نہ میں ہوں نگاہ تو اے ساقی

تندرستی کے چند اصول

(۲)

(از رائے بہادر ڈاکٹر پرہلاد نراین ماتھر صاحب سول سرجن صوبہ متحدہ)

انسانی زندگی کے لئے سب سے ضروری شے ہوا ہے، چنانچہ ہوا کے بغیر پانچ منٹ بھی آدمی زندہ نہیں رہ سکتا ہے اس کا عملی تجربہ کرکے دکھایا جائے تو قتل کا جرم سرزد ہو۔ لیکن اگر کوئی صاحب چوہے وغیرہ کسی جانور کو ایک بوتل میں بند کرکے ڈاٹ لگا دیں تو جب تک اس میں سانس لینے کے لئے ہوا موجود ہے وہ زندہ رہیگا لیکن اس کے بعد فوراً ہی مرجائیگا۔ پرمیشور نے ایسی ضروری چیز اس طرح عام طور پر عطا فرمائی ہے کہ کوئی جگہ ایسی نہیں ہے جہاں ہوا کافی مقدار میں موجود نہ ہو۔ جو صاحب کواڑ بند کرکے صاف ہوا کو نہیں آنے دیتے وہ پرمیشور کے عطیہ سے ناشکری کے ساتھ محروم رہتے ہیں۔ لیکن کسی چھوٹی سی بند جگہ میں بہت سے آدمی جمع ہو جائیں تو وہاں کی ہوا بہت جلد خراب ہو جائیگی اور وہاں کے رہنے والوں کی تندرستی پر مضر اثر پڑے گا۔ اسکولوں میں بھی اگر ایک ایک کمرے میں زیادہ لڑکوں کو دن بھر رہنے دیا جائے تو انکی تندرستی خراب ہو جائیگی، اس سلئے اسکول کے کمروں کو کشادہ اور ہوا دار ہونے کی ضرورت ہے، جہاں کہیں لڑکوں کی تعداد زیادہ ہو اور روپیہ کم ہونے کی وجہ سے بڑے کمرے نہ بن سکیں وہاں لڑکوں کو کھلے میدان یا برآمدہ میں پڑھانا چاہیئے۔ کھلے ہوئے میدان میں سایہ دار درخت ہونا چاہیئے تاکہ ان کے نیچے بچوں کو تعلیم دی جاسکے اور ان کا احاطہ بھی اتنا وسیع ہونا چاہیئے کہ سڑک کے گرد و غبار سے بچے محفوظ رہیں۔

اگلے زمانے میں جب جنگلوں میں آدمی رہتے تھے تو وہ بہت تندرست رہتے تھے۔ لیکن آجکل شہروں کے تنگ گلی کوچوں میں لوگوں کی تندرستی خراب ہو رہی ہے۔ درحقیقت شہروں کے وہ مکانات جو تنگ گلیوں میں واقع ہیں اور جن کے نیچے کے حصے میں کبھی دھوپ تک کا گذر نہیں ہوتا انسانوں کے رہنے کے قابل نہیں بلکہ کیڑے مکوڑوں کے لائق ہیں، اور اگر وہاں کے رہنے والوں کے لئے صاف ہوادار مکانات میں رہنا نصیب ہو تو وہ اور زیادہ تندرست ہو جائیں۔ اس لئے بڑے بڑے شہروں میں ضرورت ہے کہ گنجان آبادی کے بیچ میں پارک یا باغیچے یا صاف ہوا کے لئے کھلے میدان رکھے جائیں تاکہ وہاں کے باشندوں کی تندرستی خراب نہ ہونے پائے رہنے کے مکانات کشادہ اور اونچی کرسی

ؔ اس مضمون کا پہلا حصہ زمانہ ستمبر [illegible]ء میں شائع ہو چکا ہے۔

کے ہونا چاہیئے۔ سوتے وقت منہ ڈھانپ کر لیٹنا بہت مضر ہے۔ کیونکہ جب ناک اور منہ پر کپڑا ڈھک لیا جائے تو جو ہوا خراب سانس کے ساتھ باہر آئیگی وہی سانس کے ذریعہ اندر جائے گی۔ جو ہوا جسم کے لئے بیکار ہو جاتی ہے وہ سانس کے ساتھ باہر نکلتی ہے اس لئے یہ بیکار ہوا پھر سانس کے ساتھ جسم کے اندر داخل ہوتی ہے تو وہ تندرستی کے لئے ضرور مضر ہوتی ہے۔

دن ہو یا رات جاڑا ہو یا گرمی تندرستی کے لئے صاف ہوا کی ہمیشہ ضرورت ہوتی ہے۔ اسلئے سردی اور گرمی سے بچنے کے لئے کواڑوں کا اس طرح بند کر دینا کہ باہر کی صاف ہوا نہ آسکے تندرستی کے لئے سخت مضر ہے۔ بیشک ہوا کے جھونکے کے سامنے بیٹھنا بھی نقصان رساں ہے۔ دروازے کے کواڑ اس طرح کھولے جائیں کہ باہر کی صاف ہوا بھی آتی رہے اور ہوا کی تیزی و تندی بھی محسوس نہ ہو۔

پانی اور ہوا کے بعد انسان کے لئے سب سے زیادہ ضروری شئے پینے کا پانی ہے۔ پانی صاف ہونا چاہیئے گہرے کنوؤں اور تیز رو دریاؤں کے بیچ دھار کا پانی کنوؤں اور تالابوں کے پانی کی بہ نسبت بہت اچھا ہوتا ہے۔ اتھلے کنوئیں اور گندہ تالابوں کا پانی پینے کے لائق نہیں ہوتا۔ کنوؤں کے آس پاس بھی کسی قسم کی گندگی نہ ہونا چاہیئے اور اُن کی جگت یا مینڈھ ایسی بنوانا چاہیئے کہ باہر کا گندہ پانی کنوؤں کے اندر نہ جاسکے، گندے برتن بھی کنوئیں میں نہ ڈالنا چاہیئے۔ اگر کسی قسم کی گندگی کا شک ہو تو پانی کو نکال کر اور گھڑوں میں ٹھنڈا کر کے پینا چاہیئے۔

غذا۔ جو حصہ جسم کا دن رات کام کرنے میں صرف ہوتا رہتا ہے اُس کے پورا کرنے کے لئے غذا کی ضرورت ہوتی ہے جسم کی حرارت قائم رکھنے کے لئے بھی غذا کی ضرورت ہے۔ چونکہ مختلف اعضاء جسم کے نشو و نما کے لئے مختلف چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے اس لئے ہر شخص کو مختلف چیزیں کھانا چاہیئے۔ انسان کے گوشت بنانیوالے اجزا دال اور گوشت میں زیادہ پائے جاتے ہیں۔ انسان کے جسم میں جو گرمی رہتی ہے اس سے جسم خواہ وہ باہر کتنا ہی سرد ہو ہمیشہ یکساں گرم رہتا ہے، اور جتنی حرکت وغیرہ جسم میں ہوتی ہے اُس میں بھی قوت کی ضرورت ہے جو نشاستہ۔ گھی اور شکر وغیرہ کے استعمال سے حاصل ہوتی ہے۔ نشاستہ۔ گیہوں۔ جو۔ باجرہ۔ چاول۔ آلو۔ شکر قند وغیرہ میں زیادہ مقدار میں پایا جاتا ہے۔ اس لئے روٹی یا چاول کے ساتھ گوشت یا دال کا ملانا ضروری ہے۔ لیکن تجربہ سے معلوم ہوتا ہے کہ دال روٹی کے علاوہ زندگی قائم رکھنے کے لئے پھل اور سبزی کا کھانا بھی ضروری ہے۔ اگلے زمانہ میں جب دُخانی جہاز ایجاد نہیں ہوئے تھے تو بادبانی جہاز مہینوں میں ایک جگہ سے دوسری جگہ پہونچتے تھے اس لئے بعض دفعہ تین تین مہینے زمین نہیں دکھلائی دیتی تھی اور انھیں

چیزوں پر جو جہازوں میں جمع رہتی تھیں گذر کرنا پڑتا تھا۔ چنانچہ اتنے عرصہ تک سبز ترکاری اور پھل وغیرہ کے نہ ملنے سے جہاز کے مسافروں میں ایک بیماری پھیل جاتی تھی جس کو اسکروی (scurvy) کہتے ہیں

انسان کو صرف وہی غذا پکانی چاہیئے جو کچی ہضم نہ ہو سکے۔ اکثر غذاؤں کے زیادہ پکانے سے انکی غذائیت میں بہت کمی ہوجاتی ہے لیکن انھیں اس وجہ سے پکانا پڑتا ہے کہ اگر کسی بیماری کا زہر اس میں داخل ہوگیا ہو تو وہ ضائع ہوجائے۔ مثلاً پکا ہوا دودھ اتنا مفید نہیں ہے جتنا کہ کچا۔ لیکن جبتک وہ جانور جس کا دودھ استعمال ہوتا ہے بالکل تندرست نہ ہو اور وہ برتن جسمیں دودھ دُہا جاتا ہے بالکل صاف پانی سے دُھلا نہ ہو اور دُوہنے والے کے ہاتھ اور جانور کے تھن صابن یا صاف پانی سے نہ دھلے ہوں تو کچا دودھ پینے کے لائق نہیں ہوتا ہے۔ کیونکہ اگر کسی گندگی کی وجہ سے دودھ میں بیماری کا ذرا سا زہر بھی سرایت کر جائے تو جسم میں داخل ہوکر اس سے پینے والے کو سخت نقصان پہونچے گا۔ پکا لینے کے بعد اس کا سب زہر ضائع ہو جائے گا۔ لیکن پکانے کے بعد مختلف چیزوں کے بنانے کے وقت دودھ پر مکھیاں بیٹھیں یا اُسے گندہ ہاتھوں سے چھوا جائے تو وہ پھر خراب ہو جائے گا۔ بشرطیکہ پھر نہ پکایا جائے۔

بازار کی بالائی کی برف میں بھی جس کو لوگ اس قدر شوق سے کھاتے ہیں اکثر دیکھا گیا ہے کہ اسی قسم کے کیڑے موجود ہوتے ہیں جیسے کہ گندی نالیوں کے پانی میں۔ محض اس لئے کہ وہ گندے برتن میں گندے ہاتھوں سے بنائی گئی ہے۔ اسی طرح سے ایک خاندان کے چند بچوں کو موتی جھرا کی بیماری ہوئی تو بعد میں تحقیقات سے معلوم ہوا کہ سب بچوں کو نمش کے پیالوں کے ذریعہ بیماری لاحق ہوئی تھی کیونکہ نمش رات بھر دودھ کے جھاگ اٹھا کر جاڑوں کی اوس میں رکھکر بنایا جاتا ہے اس لئے اس میں گھر کی گندگی کا اثر پہونچنے کا اندیشہ رہتا ہے اور جس شخص نے اس کو تیار کیا تھا اُس کے گھر میں یہ مرض موجود تھا۔ اسی طرح اگر مکھن صاف طریقہ سے تیار نہیں کیا گیا ہو تو اس سے بھی بیماری پھیلتی ہے

اوپر بیان ہوچکا ہے کہ تندرستی قائم رکھنے کے لئے پھل وغیرہ جیسی کچّی چیزوں کا کھانا بھی ضروری ہے۔ لیکن عوام میں پھلوں کی بابت بہت سے غلط خیالات پھیلے ہوئے ہیں۔ مثلاً یہ عام خیال ہے کہ آموں سے پھنسیاں نکلتی ہیں، کھیرے اور بھٹوں سے بخار پھیلتا ہے، تربوز، خربوزے، کھیرے وغیرہ سے ہیضہ پھیلتا ہے۔ مگر ان خیالات کی اصلی وجہ یہ ہے کہ جس موسم میں یہ بیماریاں پھیلتی ہیں اُن دنوں یہ پھل کثرت سے ملک میں پیدا ہوتے ہیں، اور بیماری کی کوئی اور وجہ معلوم نہ ہونے پر وہی چیز جو زیادہ استعمال میں لائی جاتی ہے اُسی طرف لوگوں کا خیال جاتا ہے۔ لیکن اب یہ تحقیق ہوچکا ہے کہ جاڑہ بخار، ہیضہ وغیرہ

اس وقت تک پیدا نہیں ہوسکتے جب تک کہ ان بیماریوں کا خاص زہر جسم کے اندر داخل نہ ہوجائے جس وقت ہیضہ کا مرض پھیلتا ہے ان دنوں بغیر پکی ہوئی چیزوں کا کھانا یا ان چیزوں کا استعمال کرنا جن پر مکھیاں بیٹھتی ہیں اس وجہ سے ٹھیک نہیں کہ مکھیوں کے ذریعہ بیماریوں کا زہر کھانوں میں داخل ہوتا رہتا ہے۔ ان دنوں بازار کی مٹھائی نیز ثقیل و دیرہضم چیزیں مثل کھیرے اور ککڑی وغیرہ سے پرہیز کرنا چاہیئے۔ یہ چیزیں بطور خود ہیضہ پیدا نہیں کرسکتیں۔ ہیضہ کا زہر باہر سے آکر جسم میں داخل ہوتا ہے تو یہ چیزیں بدہضمی پیدا کرکے اسکی پرورش میں مدد دیتی ہیں۔

گیہوں کا چوکر بھی آٹے میں شامل رہنا چاہیئے، کیونکہ گیہوں کا میدہ جس سے حلوا یا بہت سی دوسری مٹھائیاں بنتی ہیں اتنی عمدہ غذا نہیں ہے جیسا کہ گیہوں کا آٹا جسمیں چوکر ہوتا ہے بازار کے بسکٹ یا ڈبل روٹی میں بھی عام طور سے دوکاندار خوبصورتی کے لئے آٹے کے بجائے میدہ استعمال کرتے ہیں۔ اسی لئے بازار کی ڈبل روٹی کوئی عمدہ غذا نہیں ہے جیسی کہ عام طور پر گھر کی معمولی روٹی کیونکہ اس میں آٹا استعمال کیا جاتا ہے۔

دودھ میں ہر قسم کی غذائیت موجود ہے اس لئے وہ سب سے عمدہ غذا ہے اور بچوں کی تو اس سے خوب پرورش ہوتی ہے لیکن بعد کو محض دودھ اس وجہ سے کافی نہیں ہوتا کہ جس قدر دودھ پینے کی ضرورت ہوتی ہے اتنا پینا آسان نہیں۔ حلوے میں صرف حرارت پیدا کرنیوالے اجزا ہوتے ہیں لیکن اس میں گوشت پیدا کرنیوالے اجزا نہیں ہوتے۔ اس کھچڑی میں جس میں گھی اور ثابت پیاز ڈال دی جائے سب ضروری اجزا موجود ہوجاتے ہیں اس لئے وہ بہت اچھی غذا ہے۔ ویسے تو دال روٹی، ترکاری اور گھی (یا دال کی جگہ گوشت) تندرستی کے لئے کافی ہے، لیکن ان کے علاوہ دیگر مقوی غذائیں دودھ دہی انڈے اور خشک میوہ۔ بادام مگری۔ پستہ اور مونگ پھلی وغیرہ بھی ہیں۔ ان کے استعمال سے تندرستی بہت اچھی رہیگی۔ ڈبوں میں بند کیا ہوا منجمد دودھ یا پھل یا مچھلی جو مہینوں تک رکھنے سے خراب نہیں ہوتی دوکانوں پر بکتے ہیں جن کا استعمال جہاز وغیرہ میں یا جہاں تازہ چیزیں نہیں مل سکتیں ضروری ہے لیکن یہ اتنی مفید نہیں ہوتیں جتنی کہ تازہ تیار کی ہوئی چیزیں۔

غذا کو خوب چبا کر کھانا چاہیئے یعنی دانتوں کا کام آنتوں سے نہ لینا چاہیئے

مرچ اور مسالہ بھی بہت تھوڑی مقدار میں استعمال کرنا چاہیئے۔ کیونکہ اس سے بھوک بڑھتی ہے لیکن زیادہ استعمال کرنا اتنا ہی برا ہے جتنا کہ زیادہ شراب پینا۔

کھانا کھانے کے ساتھ پانی بھی کم پینا چاہیئے، دو کھانوں کے درمیان میں جتنا چاہے پی لیجئے۔

لیمونیڈ وغیرہ کے مقابلے میں صاف سادہ پانی کہیں بہتر ہے۔

کھانے کے بعد فوراً ہی سخت جسمانی اور دماغی محنت کرنا مناسب نہیں ہے۔ علٰحدہ علٰحدہ برتنوں میں کھانا بہتر ہے تاکہ کھانے میں ایک دوسرے کا تھوک شامل نہ ہونے پائے کیونکہ تھوک سے ایک سے دوسرے کو تپ دق وغیرہ بیماریاں پیدا ہوتی ہیں۔

اسی طرح ایک ہی حقہ مختلف لوگوں کو نہ پینا چاہیئے جس سے ایک کا تھوک دوسرے کے منہ میں پہونچ سکے۔ تمباکو کا پینا اتنا مضر نہیں ہے جتنا کہ اسکا کھانا۔ دنیا کے منشیات میں سب سے کم نقصان رساں تمباکو ہے، اس سے دماغ کو کسی قدر تسکین بھی ہوتی ہے اس لئے اس کے پینے میں چنداں ہرج نہیں لیکن اور نشیلی چیزیں مثل بھنگ۔ چرس، شراب۔ افیون وغیرہ صحت کے لئے بہت مضر ہیں۔ انھیں ہرگز استعمال نہ کرنا چاہیئے۔

غسل | روزانہ نہانا چاہیئے کیونکہ انسان کی کھال میں ہزارہا سوراخ ہیں جن کے ذریعہ پسینہ آتا ہے۔ جب یہ مسامات میل سے بند ہوجاتے ہیں تو بہت سی جلدی بیماریاں پیدا ہوجاتی ہیں۔ ٹھنڈے یا تازہ پانی سے غسل کرنا تندرستی کے لئے بیحد مفید ہے لیکن کمزور آدمیوں کو نیم گرم پانی سے نہانا بہتر ہے۔ اگر ٹھنڈے پانی سے نہاکر بدن پونچھنے کے بعد گرمی آجائے۔ تو ٹھنڈے پانی سے نہانا ٹھیک ہے لیکن اگر بعد کو سردی محسوس ہو تو سمجھ لینا چاہیئے کہ پانی سے نہانا نقصان کررہا ہے۔

دانت | دانت صاف رکھنا چاہیئے، کیونکہ دانتوں کے درمیان میں اگر کھانے کا کوئی جزو بھی باقی رہیگا تو وہ اور سڑتا اور دانتوں کے لئے نقصان رساں ہوتا ہے اور اگر دانتوں اور مسوڑھوں میں پیپ پڑگئی تو یہ پیپ لعاب دہن کے ذریعہ پیٹ میں پہونچے گی اور مختلف قسم کی بدہضمی وغیرہ کا باعث ہوگی اس لئے ہر دفعہ کھانا کھانے کے بعد دانت ضرور صاف کرلینا چاہیئے۔ اس کے علاوہ روزانہ نیم یا ببول کی داتون یا پسے ہوئے کوئلے سے دانت صاف کرنا چاہیئے۔ اگر برش استعمال کیا جائے تو اس کو روزانہ صاف پانی سے دھولینا چاہیئے اور کبھی کبھی اسے گرم پانی میں بھی اُبال لینا چاہیئے۔ کیونکہ منہ صاف کرتے وقت اس کے اندر اکثر غلاظت رہجاتی ہے جس کی وجہ سے فائدہ کے بجائے نقصان پہونچتا ہے۔ ایک آدمی کا برش بھی دوسرے کو استعمال نہیں کرنا چاہیئے۔

نیند | جسم کے ہر حصہ کو آرام کرنے کی ضرورت ہوتی ہے تاکہ جو قوت کام کرنے میں صرف ہوگئی ہے وہ پھر پیدا ہوجائے۔ پلنگ پر لیٹنے سے ہاتھ پاؤں کے پٹھوں کو آرام ملتا ہے لیکن دماغ برابر اپنا کام کرتا رہتا ہے اور جب دماغ آرام کرتا ہے تو اُسے نیند کہتے ہیں۔ جوان آدمی کو سات گھنٹے اور بچوں کو

آٹھ یا نو گھنٹے سونا چاہیئے اور تو زیادہ نچے تو دن رات ہر وقت سوتے رہتے ہیں۔

ورزش روزمرہ اس قدر ورزش کرنا چاہیئے جس سے پسینہ آجائے اور دوسرے دن کوئی تکان محسوس نہ ہو۔ جو لوگ کھانا زیادہ کھاتے ہیں لیکن کافی طور پر جسمانی محنت یا ورزش نہیں کرتے ان کی توند نکل آتی ہے اور اگر شکر وغیرہ زیادہ کھاتے ہیں تو وہ بذریعہ پیشاب خارج ہو جاتی ہے جس کو ذیابطیس کی بیماری کہتے ہیں۔ گوشت یا دال ضرورت سے زیادہ کھانیوالوں کو یورک ایسڈ (Uric acid) وغیرہ کی بیماریاں مثل گٹھیا وغیرہ پیدا ہو جاتی ہیں۔ جسم کے جس حصے سے کام نہ لیا جائے وہ بھی کمزور پڑ جاتا ہے اس لئے ہر حصۂ جسم سے کام لینا چاہیئے۔ ورزش کرنے سے تمام جسم مضبوط اور ہاضمہ درست رہتا ہے لیکن یہ بھی یاد رہے کہ جتنی غذا کھائی جائے اس سے زیادہ ورزش نقصان کا باعث ہوتی ہے۔ جو شخص صبح سے شام تک کھیت کھودتا ہے اس کی تفریح کتب بینی سے ہو سکتی ہے لیکن جو صبح سے شام تک پڑھنے کا عادی ہوتا ہے اس کی تفریح کے لئے مختلف کھیل مثل کبڈی، ڈنڈ بیٹھک، کشتی، ہاکی، ٹینس، فٹ بال وغیرہ ضروری ہیں۔ جس طرح سے جسمانی ورزش سے جسمانی طاقت بڑھتی ہے اسی طرح دماغی کام کرنے سے دماغ کی قوت بڑھتی ہے اور جس طرح جسمانی ورزش اپنی قوت سے زیادہ کی جائے تو کمزوری کا موجب ہوتی ہے اسی طرح سے اگر کوئی شخص بلا آرام لئے ہوئے دن رات پڑھتا ہی رہے تو اس کی دماغی اور جسمانی دونوں قوتیں کم ہو جائیں گی۔

شادی کم سنی میں شادی نہ کرنا چاہیئے کیونکہ اس سے میاں بیوی خود بھی کمزور ہو جاتے ہیں اور آئندہ نسل بھی کمزور ہوتی چلی جاتی ہے۔ شادی کے وقت لڑکے کی عمر پچیس (۲۵) سال اور لڑکی کی عمر سولہ (۱۶) سال ہونا چاہیئے۔

زمین پر ننگے پاؤں نہ چلنا چاہیئے۔ جہاں آدمی بلا کسی صفائی کے خیال کے پاخانہ پیشاب کر دیتے ہوں وہاں ننگے پاؤں زمین پر چلنے والے کے جسم میں بعض مہلک بیماریوں کے جراثیم داخل ہونے کا اندیشہ ہوتا ہے۔

برتنوں کو معمولی سڑک کی مٹی سے صاف نہ کرنا چاہیئے کیونکہ وہ گندی ہوتی ہے۔ اگر اس مٹی میں کسی کا تھوک یا پاخانہ ملا ہو تو اس سے بہت سی خطرناک بیماریاں پیدا ہو سکتی ہیں۔ برتنوں کو صاف راکھ سے صاف کرنا چاہیئے، کیونکہ اس سے بیماری پھیلانے والے کیڑے مر جاتے ہیں اس لئے برتنوں کی صفائی کے لئے راکھ بہت مناسب ہے۔

ہر جگہ تھوکنا نہیں چاہیئے۔ کیونکہ تھوک میں بیماری کا زہر موجود ہوتا ہے جو چھوٹے چھوٹے ذروں

کی صورت میں سانس کے ذریعہ پہونچکر وہ بیماری پیدا کردیتے ہیں۔

بہت سی بیماریوں سے بچنے کے لئے ٹیکہ لگایا جاتا ہے جیسے چیچک طاعون ہیضہ۔ موتی جھرا بخار

بڑی چیچک سے بچنے کے لئے ہر بچے کو ٹیکہ لگوا دینا چاہیئے۔ کیونکہ اس کی وجہ سے بچے تقریباً پندرہ سال تک اس مرض سے محفوظ رہتے ہیں۔ دیگر بیماریوں کے ٹیکہ کا اثر بہت سال تک نہیں رہتا ہے اس لئے اس کا ٹیکہ ایسے وقت لگوانا چاہیئے جبکہ وہ بیماری عام طور پر پھیلی ہو۔

کیسی ہی مشکلات اور کیسی ہی تکلیفات ہوں فکر کو پاس نہ آنے دینا چاہیئے بلکہ اُن مشکلات کے رفع کرنے کی کوشش کرنا چاہیئے۔ ہمیشہ خوش رہنے سے تندرستی اچھی رہتی ہے۔ جو روپیہ شان وشوکت کے دکھلانے یا شادی اور غمی کی فضول رسمیات میں ہندوستان میں خرچ ہوتا ہے وہ قوم کی تندرستی بڑھانے میں صرف ہونا چاہیئے۔

زمزمۂ تغزّل

(از پروفیسر رگھوپت سہائے فراق۔ ایم۔ اے)

ڈرتا ہوں کامیابی تدبیر دیکھکر
یعنی ستم ظریفی تقدیر دیکھکر

کچھ کرلیا ہے حاصلِ تدبیر دیکھکر
کرلیں گے کچھ نوشتۂ تقدیر دیکھکر

چونکا ہوں دستِ ناز میں شمشیر دیکھکر
خوابِ نظر فریب کی تعبیر دیکھکر

وہ آگئی قضا کوئی آتا رہیگا اب
دیکھیں گے خواب خواب کی تعبیر دیکھکر

اہلِ جنوں کو وسعتیں کچھ اور مل گئیں
دل بڑھ گئے ہیں پاؤں میں زنجیر دیکھکر

ہر اک نفس کو کیوں نہ کہیں مرگِ ناگہاں
زہرابۂ حیات کی تاثیر دیکھکر

اس شب کی داستاں ہوں کہ افسانہ گو کو خود
نیند آگئی ہے صبح میں تاخیر دیکھکر

اصلاح اور بات بگاڑے تو کیا کریں
بے ربطیٔ نوشتۂ تقدیر دیکھکر

ہوتے ہیں بدحواس مگر اس قدر کہاں
میں لُٹ گیا ہوں آپکی تصویر دیکھکر

یہ عہد باندھکر نگہِ مست جھک گئی
اٹھیں گے اک جہان کو تسخیر دیکھکر

آواز عمرِ رفتہ کو دینا کوئی ذرا!
اک بیوفا کو درد کی تصویر دیکھکر

آبِ حیات زہر کو سمجھوں نہ کیوں فراق
اپنے لہو کے گھونٹ کی تاثیر دیکھکر

جناب رونق دہلوی مرحوم

(از منشی مہا لچ بہادر صاحب برق دہلوی بی ۔اے)

دلّی کے مشاہیرِ حال میں جناب رونق کا دم بھی غنیمت سے تھا۔ آپ کے انتقال پُرملال سے سخنورانِ سراپا کمال میں ایک ایسے شاعر کی جگہ خالی ہو گئی جسکا پُر ہونا محال ہے۔ آپ بڑے کہنہ مشق، قادر الکلام اور اعلیٰ پایہ کے سخن سنج تھے۔ استعداد علمی بقدرِ ضرورت تھی لیکن شعر خوب کہتے تھے۔ کلام میں فصاحت اور صفائیِ زبان کے علاوہ چستیِ بندش، بلند خیالی، تصوف و معرفت، فلسفہ اور اخلاق کا رنگ بھی نمایاں ہے۔ شاعری کا ذوق طبعی تھا شعر و سخن کے بچپن ہی سے دلدادہ تھے، ابتدا میں چند غزلیں نواب فصیح الملک بہادر داغ دہلوی کو دکھائیں۔ لیکن مستقل طور پر زانوے ادب مولانا راسخ دہلوی کے سامنے تہ کیا۔ آپ کا مولانا کے ارشد تلامذہ میں شمار تھا بلکہ آپ کو مولانا کا جانشین کہا جائے تو بجا ہے۔ مولانا کے اکثر شاگرد آپ کے فیض سخن سے مستفید ہوتے تھے۔

جناب رونق کے والد بزرگوار کا اسم گرامی منشی جے نراین تھا۔ خود آپ کا نام نامی منشی پیارے لال تھا جیسا کہ اپنی غزل کے ایک مقطع میں شاعرانہ انداز اور دلکش پیرایہ میں اشارہ کیا ہے

رونق کے نام سے تو نہ سمجھا مجھے وہ شوخ ۔۔۔ شرما کے پھر کہا جی تم "پیارے لال" ہو

آپ ماتھر کایستھ تھے، دلّی کے مشہور محلے روشن پورہ کے رہنے والے تھے، اور حق یہ ہے کہ اسم بامسمےٰ روشن خیال اور شاعر شیریں مقال تھے۔ شعر گوئی کا شوق بدرجۂ اتم تھا۔ کثرتِ مشق سے تھوڑے ہی عرصہ میں ایک دیوان موسومہ "رونقِ سخن" مرتب کر کے ۱۹۱۰ء میں شائع کیا تھا جو کافی مقبول ہو چکا ہے۔ اس دیوان میں طرزِ قدیم یعنی عاشقانہ رنگ کی غزلیں ہیں لیکن بمقتضائے سن و سال اب عرصے سے آپ کی طبیعت عرفان و تصوف کی طرف مائل تھی اور بیشتر اشعار اسی رنگ میں ڈوبے ہوئے ہوتے تھے انھی غزلوں کا مجموعہ یعنی آپ کا دوسرا دیوان زیر ترتیب تھا بلکہ کئی جزو کی کتابت بھی ہو چکی تھی کہ موت کے سفاک ہاتھوں نے شیرازۂ حیات منتشر کر دیا، اور کتاب زیور طبع سے آراستہ نہ ہو سکی اور تشنۂ کام اشاعت رہ گئی۔ مرحوم کو جملہ اصنافِ سخن میں دسترس کامل تھی، تاریخ گوئی کا خاص ملکہ تھا فی البدیہہ

مادۂ تاریخ نکال دینا اُن کے لئے ایک معمولی بات تھی غزلوں کے علاوہ نیچرل، اخلاقی اور دھارمک نظمیں لکھنے میں بھی کمال حاصل تھا، شاید ہی کسی اخبار یا رسالے کا خاص نمبر ایسا ہوتا ہوگا جسمیں آپ کا کلام فصاحت التیام زینتِ اوراق نہ ہوتا ہو۔ آپ کے ذوقِ سخن اور شوقِ ادب کا اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ برسوں آپ کے اہتمام سے دہلی میں ماہانہ مشاعرے ہوتے رہے اور کئی مہتم بالشان آل انڈیا مشاعرے بھی ہوئے۔ کئی سال تک رسالۂ کمال دہلی بھی آپ کے زیرادارت نکلتا رہا۔ دہلی اور نواح دہلی کا شاید ہی کوئی بزم ورمشاعرہ ایسا ہوتا ہوگا جسمیں آپ شریک نہ ہوئے ہوں۔ غزل نہایت بلند آواز سے فصاحت کے ساتھ پڑھتے تھے۔ سامعین اور ہمعصروں سے اپنے کمال کی حقیقی داد لیکر اُٹھتے تھے۔ اپنے ہمعصروں میں ممتاز حیثیت رکھتے تھے راقم الحروف کی شاعری کی ابتدا بھی نہ ہوئی تھی کہ جناب رونق کا مشاہیر میں شمار تھا اور ایک زمانہ اُن کے زورِ قلم کا معترف، باایںہمہ نہایت شفقت سے پیش آتے تھے اور جب کبھی سرِراہ ملجاتے تو تازہ کلام سنائے بغیر نہ رہتے۔ افسوس اب اس شان کے لوگ اور پُرانی وضع کے بزرگ کہاں جب سنہ ۱۹۰۹ء سے میں بھی مشاعروں میں شریک ہونے لگا تو بسا اوقات ساتھ ساتھ غزل سرائی اور ہمنوائی کا اتفاق ہوتا رہا، دہلی سے باہر بھی اکثر مشاعروں میں میرا اور مرحوم کا ساتھ رہا۔ نومبر سنہ ۱۹۳۳ء میں ایک مشاعرہ بلند شہر میں مجھ ہیچمدان کی زیرِ صدارت ہوا تھا۔ افسوس! وہ آخری مشاعرہ تھا جسمیں جناب رونق دلی کے دیگر مشاہیر واحباب کے ساتھ غزل سرا ہوئے تھے۔ اس کے بعد ناسازیِ طبیعت کی وجہ سے پھر دہلی یا باہر کے کسی مشاعرے میں شریک نہ ہوسکے، اور آخرکار اپریل سنہ ۳۴ء میں پینسٹھ ۶۵ برس کی عمر میں عالمِ فانی کو خیرباد کہہ گئے۔

مرحوم نہایت منکسر المزاج، متواضع، خلیق اور مرنجاں مرنج آدمی تھے۔ اپنے احباب سے خلوص محبت سے ملتے تھے، ہندو اور مسلمان دوستوں سے یکساں تعلقات تھے۔ تنگدلی اور تعصب سے مبرا تھے۔ اس کا بدیہی ثبوت یہ ہے کہ آپ کے دیوان میں نعتیہ غزلیں بھی موجود ہیں۔ ان خوبیوں کے علاوہ آپ میں ایک عجیب شاعرانہ آن بان بھی تھی اگر کہیں ذرا بھی ناقدریِ کمال کا شبہ ہوتا تھا تو وہاں جاکر بھی نہ ٹھیکتے تھے۔ خودداری کا جذبہ دل میں کوٹ کوٹ کر بھرا تھا۔ نوجوانی کے عالم میں کسرت اور کشتی گیری کا بھی شوق تھا، گویا پہلوانِ سخن ہونے کے علاوہ شہ زور بھی تھے۔ آپ کے بچپن اور شباب کا زمانہ فارغ البالی سے بسر ہوا لیکن پیرانہ سالی میں پے درپے صدمات اور ہجوم افکار نے صحت پر مضر اثر ڈالا لیکن پھر بھی اپنی شگفتہ طبعی سے بشاش رہتے تھے اور کسی پر پریشاں خاطری

کا اظہار نہ ہونے دیتے تھے۔ اخیر عمر میں فکرِ سخن اور رام رنگی دو چیزیں غم غلط کرنے کا ذریعہ رہ گئی تھیں۔ مشقِ سخن کا سلسلہ تا دمِ اخیر جاری رہا۔ "ہم پیر ہو گئے تو طبیعت جواں ہوئی" کی مثل آپ پر صادق آتی تھی۔ مرنے سے چند روز قبل ایک نیچرل نظم "نمودِ سحر" کے عنوان سے لکھی تھی جس کے ایک دو بند نمونۂ کلام کے ہمراہ ذیل میں درج ہیں۔ آپ کے ذوقِ ادب کا یہ عالم تھا کہ بسترِ مرگ پر بھی رسالوں اور اخباروں میں نظموں کا مطالعہ کیا کرتے تھے۔ اُن کی وفات حسرت آیات سے دو دن پہلے میں مزاج پرسی کے لئے حاضر ہوا تو ضیق النفس میں مبتلا تھے، پیٹ پر نفخ تھا، سانس رک رک کر آتا تھا، نقاہت بہت تھی، لیکن پھر بھی پہلا جملہ جو ملاقات کے وقت اُن کی زبان سے نکلا وہ میری تازہ نظم "یادِ شباب" کے متعلق تھا جسے پڑھکر بڑے مسرور اور متاثر ہوئے تھے اور اس کی داد دینے کے لئے بیقرار تھے۔ میں نے بات کا رخ بدلکر کہا کہ آپ کی طبیعت علیل ہے شعر و شاعری کے تذکرے کو بالائے طاق رکھیئے اور کیفیتِ مزاج سے ممنون فرمایئے۔ ہنسکر کہنے لگے "چراغِ حیات تو ٹمٹما رہا ہے لیکن صبح ابھی دور ہے۔" ان استقلال آمیز باتوں سے میری آنکھوں پر پردہ سا پڑ گیا اور میں نے سمجھا کہ یہ ابھی مرنیوالے نہیں اور صحتیاب ہو جائیں گے، مگر افسوس صد افسوس یہ خیال غلط نکلا، زندگی بہت بے ثبات ہے۔ اس دنیا میں موت کے سوا کوئی چیز یقینی نہیں، اُس کے وقت کا بھی کسی کو صحیح علم نہیں، شاید روشن ضمیر عارفوں اور مہاتماؤں کے سوا کوئی اپنے آخری وقت سے آگاہ نہیں ایک دن بعد جب علی الصباح میں ٹہلنے نکلا تو معلوم ہوا کہ پچھلے پہر رونق صاحب سرگباش ہو گئے افسوس زندگی میں اُن کا آخری دیدار بھی نصیب نہ ہوا صرف جنازے میں شریک ہونے کی نوبت آئی۔ جناب رونق مرحوم اپنے حلقۂ احباب میں ہر دلعزیز تھے، اُن کی وفات کا بقدرِ تعلق کم و بیش سب کو صدمہ ہوا اور تقریبًا تمام مشاہیرِ دہلی نے اظہارِ رنج میں نوحے، نظمیں اور قطعاتِ تاریخ لکھے ہیں، کئی ماتمی جلسے بھی ہوئے۔ امرتسر کے ایک رسالہ نے رونق نمبر بھی شائع کیا ہے۔ حضرات منور اور شیدا نے بڑی پردرد نظمیں لکھی ہیں جن کے ایک ایک دو دو بند مع ایک قطعۂ تاریخ وفات درجِ ذیل ہیں

جنابِ رونق نے دو تین لڑکیاں اور تین لڑکے چھوڑے ہیں، لیکن افسوس یہ ہے کہ لڑکوں میں ابھی کوئی اس قابل نہیں کہ نامور باپ کے کلام کو مجتمع کر کے شائع کر سکے اور ان جواہر پاروں کو قدردانوں کے سامنے پیش کرے۔ آپ کی نظموں کا ایک مکمل مجموعہ تیار ہے نیز صوفیانہ غزلوں کا دیوان بھی ترتیب شدہ تشنۂ کامِ اشاعت ہے، اگر کوئی ادبی انجمن، اکیڈیمی یا صاحبانِ ذوق ادھر توجہ کریں تو ایک شاعر سراپا کمال کا کلام اور اُس کی تصنیفِ لطیف تلف ہونے سے بچ جائے۔

قطعہ تاریخ وفات

(از حضرت ادیب لدھیانوی)

بہارِ لالہ زاراں ختم گردید — فروغ و زینت سرو و سمن رفت
دروغ است اینچہ گویم شاعرے مرد — بحقا عندلیبے از چمن رفت
بگفتم مرگِ رونق دہلوی را — دریغا رونقِ بزم سخن رفت

نوحۂ وفات

(از جناب منور لکھنوی)

آ گیا فرق بہارِ سخنِ دلّی میں — پھول مرجھائے ہوئے ہیں چمنِ دلّی میں
ذکر ہے مجمعِ اربابِ فنِ دلّی میں — خاک رونق نہیں اب انجمن دلّی میں
ہو گیا لطفِ بقا خواب و خیال آخر کار
اُٹھ گیا رنگ و نقشِ کمال آخر کار

شعرا افسردہ۔ طلباں برق۔ منور غمگیں — غوث رنجیدہ۔ مدن وقفِ الم۔ زار حزیں
چشم نم ساحر و معجز سے بھی ہیں اہل یقیں — گفتنی حال دلِ کیفی و شیدا کا نہیں
کیوں عزادار نہ ہوں نجمِ و سائل دونوں
دل سے تھے رونق مرحوم کے قائل دونوں

جناب شیدا دہلوی کی نظم کے دو بند

اے دل بزخم تیرِ حوادث شکار شو — اے چشم از تراوشِ خوں اشکبار شو
اے سینہ چوں سیاہیِ شب داغدار شو — اے روح چوں خموشیِ کنجِ مزار شو
حسنِ سخن طراز وہ شیریں دہن نہیں
وہ پیارے لال رونقِ بزمِ سخن نہیں

وہ بے مثال آپ ہی اپنی نظیر تھا — چالیس سال سے وہ مرا ہمصفیر تھا
گویا زبانِ داغ میں رنگ آفریں تھا — وہ یادگار رونقِ روشن ضمیر تھا
دُہرا ہوا ہوں غم سے وہ رنج و محن ہے آج
میری کمر بھی زلفِ شکن در شکن ہے آج

ذیل میں جناب رونق مرحوم کے کچھ اشعار اور ایک دو بند اُن کی آخری نظم نمودِ سحر کے

درج ہیں، ناظرین اپنے اپنے مذاقِ سخن کے مطابق لطف اندوز ہوں۔

طرفہ تھی سیر، عالمِ غفلت میں ہوش تھا ۔۔۔ کھلتے ہی آنکھ جلوہ نہ جلوہ فروش تھا
آئینۂ حیات میں جلوے فنا کے تھے ۔۔۔ مدہوشیوں میں عالمِ ہستی کا ہوش تھا

تصویر کے پردے میں جب حسنِ مجاز آیا ۔۔۔ جو عشق کا مخفی تھا وہ سامنے راز آیا
پیشانیِ عاشق نے جھک جھک کے تہِ در پہ ۔۔۔ سو بار کئے سجدے جب طرزِ نیاز آیا

کچھ نہیں اور یہاں جلوۂ وحدت کے سوا ۔۔۔ کیا نظر آئے نگاہوں کو حقیقت کے سوا
نور آنکھوں میں رہا تیرا تصور دل میں ۔۔۔ ہم نے جلوت میں بھی دیکھا تجھے خلوت کے سوا
پی کے کھل جاتے ہیں اسرارِ حقیقت رونق ۔۔۔ اور کیا شغل ہو جامِ مئے وحدت کے سوا

مری حسرت، مری امید، میری آرزو ہو جا ۔۔۔ دلِ ارمانوں کی دنیا ہے تمنا دل کی تو ہو جا
سخن آرائی میری معنیِ رازِ حقیقت ہو ۔۔۔ لبِ معجز نما بن جا، زباں پر گفتگو ہو جا

رنگِ تصویرِ جہاں کو ترا نقشا سمجھا ۔۔۔ ذرے ذرے کو میں اک حسنِ سراپا سمجھا
راز اس محفلِ ہستی کا بس اتنا سمجھا ۔۔۔ ہے یہ اک منظرِ حیرت جسے دنیا سمجھا
بے خود جلوہ کبھی اور کبھی ہشیار رہا ۔۔۔ کبھی معبود کبھی خود کو میں بندا سمجھا
کھل سکا راز نہ ہستی میں فنا کا دل پر ۔۔۔ فلسفہ زیست کا سمجھا بھی تو میں کیا سمجھا

ہے نظر میں اپنی سنگِ کعبہ و بتخانہ ایک ۔۔۔ راہِ سجدہ دو ہیں لیکن ہے درِ جانانہ ایک
اللہ اللہ گرمیِ سوز و گدازِ حسن و عشق ۔۔۔ بزم میں دیکھا ہے رنگِ شمع و پروانہ ایک
کس کو اے رونق سناؤں داستانِ دردِ عشق ۔۔۔ لاکھ افسانوں سے بڑھ کر ہے مرا افسانہ ایک

جلوے حقیقتوں کے دکھاتی ہے شانِ دل ۔۔۔ مہماں سرائے حسنِ ازل ہے مکانِ دل
دیکھی کبھی نہ لغزشِ پائے نگاہِ شوق ۔۔۔ جلووں نے اس کے لاکھ لیا امتحانِ دل

جہاں تو ہے حقیقت میں وہاں تک
نہ پہنچا طائرِ وہم و گماں تک
تپِ غم کی ہے یہ آتش فشانی
دہن میں ہو گئی شعلہ زباں تک

جادۂ عشق سے اُکھڑے نہ کبھی پائے ثبات
رہے منزل ہی میں صرفِ رہِ منزل ہو کر
عشق میں کچھ نہ دیا ناخنِ تدبیر نے کام
رہ گئی دل کی گرہ عقدۂ مشکل ہو کر
غش ہوئی جاتی ہیں نظریں حسن کی تنویر پر
ہے گماں برقِ تجلی کا تری تصویر پر
جلوۂ دیر و حرم جب ایک ہی آیا نظر
شیخ نے سر رکھ دیا بتخانہ کی تعمیر پر

سبق آموز ہے ہستیِ فانی
بشر اس راز کو اصلا نہ سمجھا
میں ہوں وہ سبزۂ بیگانہ سیرت
کسی کو بھی یہاں اپنا نہ سمجھا
کہوں لطفِ سرودِ بیخودی کیا
میں کیفِ مستیِ صہبا نہ سمجھا

شوخی کا لطف حسنِ تبسم سے مل گیا
ہنسنے سے اُس کے غنچۂ امید کھل گیا
غم کے سوا ہو عشق میں کیا اور جستجو
ٹکڑا جو تھا نصیب کا قسمت سے مل گیا

تصویرِ حسن پھرتی ہے چشمِ خیال میں
جلوہ کسی کا آج اسیرِ نظر ہوا
جبتک رہی خودی نہ ملا خود کا کچھ پتہ
اُس کی خبر ملی مجھے جب بے خبر ہوا

دل جو وابستہ خیالِ سرِ مژگاں میں رہا
نوکِ نشتر کا مزہ کاوشِ پنہاں میں رہا

نیرنگیِ قدرت کے کرشمے ہیں نرالے
رنگ ایک جہاں میں کبھی دیکھا نہ کسی کا

نگاہِ شوق سے کس دن تمہیں حجاب نہ تھا
حیا کے پردے میں روپوش کب شباب نہ تھا
جھپک گئی جو پلک اپنی وقتِ نظارہ
جمالِ یار تھا آنکھوں میں میری خواب نہ تھا
اٹھا کے پردۂ پندار دل سے جب دیکھا
تو حسن و عشق میں رونق کوئی حجاب نہ تھا

ذرے ذرے رہِ عدم میں دہ ہنگوں پھیلا ہوا
منزل کڑی، سفر ہے بڑا، دن ڈھلا ہوا

کیوں اشک گر کے خاک پہ برباد ہو گیا
سانچے میں آنکھ کے تھا یہ موتی ڈھلا ہوا

ہوا ہوں غش جو آئی ہیں نیم جلوے سے
یہ برق طور تھی اسکا جمال تھا کیا تھا

پرتو عارض سے گل جانِ عنادل ہو گیا
تو نے چٹکی میں لیا جس غنچے کو دل ہو گیا

ذرے ذرے میں ہے جلوہ تری یکتائی کا
نور پھیلا ہوا ہر سمت ہے رعنائی کا

اک بیخودی سی چھا گئی دیکھا جو سوئے دل
جلوہ تھا اُس نظر کا تجلی بروئے دل

نمودِ سحر

زیرِ دامانِ فلک ہے جلوۂ نورِ سحر
مل رہی ہے آمدِ خورشید خاور کی خبر

رُوئے شب پر تھا جو غازہ ہو رہا ہے منتشر
اب کہاں تاروں کی وہ افشاں جبینِ چرخ پر

ہو گئی کافور دم میں زینتِ شبہائے تار
کرمکِ شب تاب کا جاتا رہا سارا نکھار

ہو گیا نورِ شعاعِ مہر سے روشن جہاں
ہے طلائی جدولوں سے اب سنہری آسماں

ہر در و دیوار پر ہے شاہدِ خاور ضو فشاں
صبحدم گردش میں آیا جامِ زریں پھر یہاں

صبح صادق سے جہاں میں ہے وہ عالم نور کا
ہر طرف جلوہ نظر آتا ہے برقِ طور کا

کلامِ باسط

وہ گاہِ طور میں تھا اور وہ روپوش تھا
دیکھکر بیخود ہوئے موسیٰ کو اتنا ہوش تھا

[illegible] رفتہ ہو گیا میں عشق میں مانوسِ غم
دیکھنے والے یہ سمجھے دل ہی حسرت کوش تھا

[illegible]شی مَیں نالۂ بلبل کی اے دل کیا کہوں
صورتِ گل باغ میں کوئی سراپا گوش تھا

[illegible]کے آگے آنسوؤں کو پی گیا مَیں بیدریغ
ڈبڈبا آئیں جو آنکھیں یہ وفورِ جوش تھا

[illegible]ی دل چشمِ مے گوں اور میں دیکھا کیا
کس قدر بدمست تھا میں کس قدر مدہوش تھا

[illegible]یں کعبہ میں اُسکو لوگ سب ڈھونڈھا کئے
اپنے دل میں دیکھتے، کب یہ کسی کو ہوش تھا

[illegible]ایہ ہے وہ دیکھیں کب تک اب تاثیر میں
آپ جو کہتے [illegible]

رواںؔ مرحوم اور انکی شاعری

(از بابو بھگوتی سہائے بھٹناگری، بی۔اے۔ایل ایل بی)

چودھری جگت موہن لال صاحب رواںؔ جن کے لئے آج ہم انتہائی حزن و ملال کے ساتھ مرحوم کا لفظ استعمال کرنے پر مجبور ہیں، اُن ذی کمال ہستیوں میں تھے جن کا نام اُردو شعرا کے زمرہ میں ہمیشہ زریں حروف سے لکھا جائیگا۔

مرحوم کے والد کا نام چودھری گنگا پرشاد تھا، قوم کے کایستھ سریواستو دوسرے تھے۔ ۱۴ جنوری ۱۸۸۹ء کو پیدا ہوئے۔ نو برس کی عمر تک والد بزرگوار کے سایۂ عاطفت میں تعلیم و تربیت پائی۔ والد کی وفات پر اپنے بڑے بھائی بابو کنہیا لال صاحب کے زیر نگرانی پرورش و تعلیم حاصل کی۔ ۱۹۱۱ء میں کیننگ کالج لکھنؤ سے بی۔اے اور ۱۹۱۳ء میں ایم۔اے کی ڈگری حاصل کی۔ آپ کیننگ کالج کے ممتاز طلبا میں تھے آپ کا نام اعزازی بورڈ میں ابھی تک درج ہے۔

اس کے بعد کوئی شاہراہ عمل تلاش کرنیکی ضرورت تھی، مختلف راہیں اور متعدد دائرۂ عمل دامن کش ہوئے۔ مگر مرحوم نے ان سب پر وکالت کو ترجیح دیکر ۱۹۱۶ء میں ایل۔ایل۔بی کا امتحان پاس کیا وکالت کو ابتدا ہی سے فروغ حاصل ہونے لگا چنانچہ چند ہی سال کے اندر آپ اوناؤ کے سربرآوردہ وکلا میں شمار ہونے لگے۔

رواںؔ مرحوم کا اخلاق نہایت وسیع تھا، طبیعت نہایت متواضع و حلیم واقع ہوئی تھی، جس کسی کو اُن سے ملنے کا موقع ملتا تھا وہ ان کے اخلاق و منکسر مزاجی کا ہمیشہ گرویدہ ہو جاتا تھا۔ اُردو کی ادبی دنیا انانیت و مخالفت کا سرچشمہ ہے، مگر اُن سے کسی فرد واحد کو کبھی کسی قسم کی شکایت نہ ہوئی اور نہ کسی نے اُن کے کلام کو مخالفانہ نقطۂ نظر سے دیکھنے کی جرات کی، اس کی وجہ محض اُن کے اخلاق کی ہمہ گیری تھی۔

مرحوم کی شاعری کی ابتدا کس طرح ہوئی، اس کے متعلق صرف اتنا معلوم ہے کہ بچپن ہی سے شعر و شاعری کی طرف اُن کی طبیعت مائل تھی۔ "روح رواںؔ" کے مقدمہ میں جناب عزیز لکھنوی نے اس کو یوں واضح کیا ہے، اور لکھا ہے کہ وہ کھیل کود میں بھی اکثر شعر کی صورت میں کچھ تفریحاً کہہ دیتے تھے۔ مثلاً

ذرا گیند میرا اٹھا لائیے		پھٹے جیتھڑے مجھکو دکھلائیے

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا یہ ذوق فطری تھا، تعلیم کے ساتھ ساتھ اس میں ترقی ہوتی گئی۔ قوتِ مشاہدہ و مطالعہ نے اس پر جلا کی۔ طبیعت کی پاکیزگی نے اسے اور سنوارا۔ اور ایک دن ایسا آیا کہ دلی جذبات و احساسات الفاظ کے موزوں جامہ میں مؤثر شعر بنکر نکلے۔ بہر حال رواں فطری شاعر کی حیثیت سے ہر طرح سے ایک نہایت کامیاب شاعر کہلانیکے مستحق ہیں۔ ان کے کلام کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ انھوں نے افراط و تفریط سے ہمیشہ دامن بچائے رکھا۔ اُن کی چشم و نگاہ میں صحیفۂ کائنات کی گوناگوں رنگینیوں میں جو دلکشی نظر آتی ہے وہ عامیانہ مذاق سے بالکل مختلف ہے۔ وہ متانت کے ساتھ فطرت کے رموز و اسرار بے نقاب کرتے ہیں۔ اُن کی رندی و مے پرستی میں شیشہ و قدح، کوزہ و سبو کی بھرمار نہیں بلکہ اسمیں ذوق و شوق اور سوز و گداز کا وہ جامِ آتشیں جھلک رہا ہے جس کا ہر قطرہ روح و قلب کی حسیات مخفیہ کو مشتعل کر دیتا ہے۔ فطرت کے مناظر دیکھنا اور ان کو رنگین و دلکش الفاظ کا جامہ پہنا کر لطفِ زبان کے ساتھ ہی ساتھ مؤثر پیرایہ میں بیان کرنا ان کی خصوصیت ہے۔ ان کی نظر فلسفیانہ بھی تھی اور شاعرانہ بھی، اور انھیں دونوں کا اجتماع ان کے کلام کا طرۂ امتیاز ہے۔ کائنات کا ذرہ ذرہ ایک دنیا ہے۔ مناظر فطرت ہر طرف بکھرے پڑے ہیں۔ ان کو عمیق نگاہوں سے دیکھنا ہر کس و ناکس کا کام نہیں۔ رواں گلستانِ دہر کی ہر سوکھی کلی اور ہر سر سبز و شاداب پھول پر ایک فلسفیانہ نظر ڈالنے کے عادی تھے۔ ان کی شاعری اُن کے مشاہدہ کا رنگین و درس آفریں نتیجہ تھی۔ کلامِ رواں میں جذبات کی تپش اور احساس کی حرارت ہے۔ دل کی بیتابی اور روح کا سوز و گداز ہے ان کے یہاں فطرت انسانی کے بلند و شریفانہ احساسات کی مصوری کی گئی ہے۔ وہ صاحبِ تصانیف بھی ہیں۔ "روحِ رواں" نام سے ان کا ایک مجموعۂ کلام سنہ ۲۲ء میں شائع ہو چکا ہے۔ ہندوستانی اکیڈیمی الہ آباد نے "فریبِ عمل" کے نام سے ان سے ایک انگریزی ڈرامہ کا ترجمہ کرا کر شائع کیا۔ انکی رباعیات کا مجموعہ ادبی مرکز لاہور سے نہایت شان بان کے ساتھ طبع ہوا ہے۔ حال میں وہ ایک مثنوی گوتم بدھ کے نام سے لکھ رہے تھے، افسوس کہ ان کی بے وقت وفات نے اُسے نامکمل رکھا۔ اس مثنوی میں گوتم بدھ کے فلسفہ کو نہایت دلکش پیرایہ میں پیش کیا گیا ہے۔

مرحوم کو جناب عزیز لکھنوی سے تلمذ تھا، وہ اپنے استاد کی انتہائی عزت کرتے تھے "روحِ رواں" مرحوم کا مجموعۂ کلام چار حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلے حصے میں نظمیں، دوسرے میں غزلیں، تیسرے میں قطعات اور چوتھے میں رباعیات ہیں۔ یوں تو ان کی شاعری کی ہر صنف میں کچھ نہ کچھ خصوصیت

اور دلکشی پائی جاتی ہے، مگر سب سے زیادہ کامیابی اُن کو رُباعیوں میں حاصل ہوئی ہے جو اُردو ادب میں ایک گراں بہا اضافہ ہیں۔

میں سب سے پہلے اُن کی بہار آفریں نظموں کی طرف متوجہ ہوتا ہوں۔ "روحِ رواں" میں مختلف عنوانات کے ماتحت نظمیں موجود ہیں اور ہر نظم بجائے خود دلکش ہے۔ ان نظموں کا مطالعہ بتاتا ہے کہ مرحوم کی نظر کتنی عمیق تھی اور وہ قدرت کے کتنے سچے پرستار تھے۔ مرحوم کی نظموں میں رنگیں بیانی اور بلندیٔ خیال کا جو لطف پایا جاتا ہے وہ عام شاعروں کو نصیب نہیں۔ ان کی ایک معمولی نظم "تتلی" ہے جو غالباً طلبا رکے لئے کہی گئی ہے لیکن اس میں بھی ان کا مخصوص اندازِ بیان جھلک رہا ہے۔

نکلے یوسف حسن خود آیا ہے یا بازار میں پڑ گئی ہے جانِ تازہ یا گل و گلزار میں

باعثِ حیرت ہو رنگینی تری۔ ہم کیا کہیں پھول اک اُڑتا ہوا یا باغ چھوٹا سا کہیں

گل و گلزار میں تازہ جان پڑ جانے کی تشبیہ کتنی نادر تشبیہ ہے، اسی طرح اُڑتا ہوا پھول یا چھوٹا سا باغ کہنا بھی کس قدر دلفریب منظر پیش نظر کرتا ہے۔

"شوہر کش حسینہ" ان کی شہرۂ آفاق نظم ہے، اِس نظم میں ایک دلدوز واقعہ کا تذکرہ ہے، ایک حسینہ اپنے شوہر کو قتل کرتی ہے۔ اس قتل کے اسباب و علل سے بحث اور اظہار افسوس کرتے ہوئے فرماتے ہیں:۔

دل میں حسرت روح کو صدمہ، جگر کو بے کلی، حلق پر خنجر، نظر کے سامنے ماہِ مبیں

اس طرح ضدین ہو جائیں بہم قسمت تو ہے دخل کچھ سترِ خدا میں عقلِ انساں کا نہیں

"حلق پر خنجر نظر کے سامنے ماہِ مبیں" محاکات کی بہترین مثال ہے۔ ایک شاعر کی نظر میں میاں بیوی کی باہمی محبت کی جو عظمت ہونا چاہیئے ظاہر ہے۔ ہندوستان کی بیویاں اپنی وفا شعاری اور جاں نثاری کے لئے خاص طور پر مشہور ہیں۔ رواںؔ اس واقعہ کو اجتماع اضداد کہتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ سترِ خدا ہے جہاں عقل کی رسائی نہیں۔ اِسی سلسلے میں آگے بڑھکر یوں عقدہ کشا ہوتے ہیں

راحتِ کونین فطرت کا تبسم ہے فقط اور غمِ دنیا ہے اس فطرت کی اک چینِ جبیں

ایک جگہ معجزۂ انتظار کے تحت میں کیسا پر لطف منظر پیش کرتے ہیں۔ ایک حسینہ خیالِ یار میں محو بیٹھی ہے نامۂ دوست کا انتظار ہے، اضطراب کا عالم ہے اتنے میں ایک کنیز نامہ لیکر آتی ہے۔ نامہ کی آمد کا اثر حسینہ پر کیا ہوتا ہے اس کو صرف ایک شعر میں نظم کرتے ہیں:۔

کھنچ کے چمن سے چہرہ میں روحِ بہار آگئی قلب و جگر کی تازگی سارے مکاں پہ چھاگئی

مسرت کے اظہار میں سیکڑوں اشعار کہے جائیں مگر یہ لطفِ محاکات دشوار ہے۔

روحِ بہار کا چمن سے ھنچکر چہرے میں آجانا تمام جذباتِ مسرت کا واحد ترجمان ہے۔ یہاں پر نفسیات کو بھی ہاتھ سے نہیں دیتے ۔مکان خواہ کتنا ہی دلکش کیوں نہ ہو لیکن مکین کی اُداسی اُسے ویرانے سے بدتر بنادیتی ہے ۔مگر معمولی سا گھر بھی مکین کی مسرت سے رشکِ فردوس بنجاتا ہے ۔اسی مشاہدہ کو کتنے لطف سے کہا ہے "قلب و جگر کی تازگی سارے مکاں پہ چھا گئی"

رامائن کا ایک سبق نظم کرتے ہیں ۔رامچندر جی لچھمن و جانکی جی کے ہمراہ واپس آرہے ہیں، بھرت پیشوائی کے لئے معہ فوج کے موجود ہیں بھرت کی نظر رامچندر جی پر پڑتی ہے تو کیا دیکھتے ہیں :-

دیکھا تو ہے بھبھوت بدن پر لگی ہوئی   سو بار جس پہ صدقے ہو ملبوس قیصری
رونق فزا ہیں داہنے لچھمن جی   بائیں طرف ہیں ہمسر و ہمراز جانکی
[illegible] تھا [illegible] سے
چمکا تھا اور رنگ بدن رنگ خاک سے

بھبھوت بدن پر لگی ہے مگر اس کی دلکشی و عظمت کو یہ کہکر بیان کرنا کہ "سو بار جس پہ صدقے ہو ملبوسِ قیصری" یہ روؔاں کی طبع خوش فکر کا کام تھا بھبھوت کا ذکر اور اس کی فقیرانہ عظمت اس درجہ کہ ملبوسِ قیصری اس پر صدقے ہو۔ رامچندر جی کی جنگل کی زندگی کا پورا پورا نقشہ سامنے رکھدیتا ہے اس کے علاوہ چمکا تھا اور رنگِ بدن رنگِ خاک سے کتنی تحسین و جمیل مصوری ہے۔

بھرت کے نظر آتے ہی رام اُٹھتے ہیں بھرت کو گلے لگاتے ہیں، درد مہجوری کے بھرے ہوئے بھائی ملتے ہیں، اگر ملنے کی مسرت ہے تو ایام جدائی کی یاد بھی ساتھ ساتھ ہے، ان کا کیا حال ہوتا ہے ۔یوں نظم کرتے ہیں

شکایت جو تھی دلوں میں وہ اشکوں سے دھو گئی   [illegible] جو آئے دل کہ زباں بند ہو گئی

جذبات کی فراوانی میں ہر انسان کو کم و بیش ایسا موقع پیش آجاتا ہے ۔مگر اس کا اظہار اس انداز سے کرنا روؔاں ہی کا کام تھا مصرعۂ ثانی ضرب المثل ہونے کے قابل ہے ۔ایک اور چار شعر کی نظم ہے جسمیں شاعر مختلف خوشرنگ پھولوں کو دیکھکر کہتا ہے باغ میں کیسے خوشرنگ پھول کھلے ہیں کاش مجھے بھی ان میں سے ایک ملجاتا مگر اس کے ساتھ ہی اُسے اپنے گلِ سادہ کا خیال آجاتا ہے، یہ گل سادہ کون ہے، اسے ارباب فہم سمجھ سکتے ہیں گلِ سادہ کا خیال آتے ہی فرماتے ہیں ایسا نہو کہ کہیں گل رنگیں سے میرا گلِ سادہ پامال ہوجائے۔ حق حاد میں خدا کا شکر کرتے ہیں اور کہتے ہیں :-

حُسنِ صورت نہ سہی سیرت معقول تو ہے   رنگ خوشرنگ نہیں پھول مرا پھول تو ہے

ان جذباتِ نفیس سے آپ کے شرافتِ نفس کا پتہ چلتا ہے

رواں کی بہترین نظم "غبارہ" ہے، یہ نظم تخیل کی بلندی، جذبات کی لطافت، تشبیہات کی نادر المثالی کا آئینہ ہے۔

ہوا یہ اِک فرسِ شعلہ جست کرکے چلا — کہ کوئی طائرِ زرّیں اُڑان بھر کے چلا
بلندیوں کی طرف مثلِ برقِ طوُر چلا — کمالِ شوق سے دامن میں بھر کے نور چلا
حسین پری کوئی مستِ مئے صبوح چلی — نکل کے قالبِ خاکی سے جیسے روح چلی
ڈھلک کے دیدۂ سالک سے کوئی اشکِ نیاز — چلا ہے بننے کو دامانِ عفو پر ممتاز

ایک ایک مصرعہ پڑھیئے اور لطف اُٹھائیے۔ غبارہ کا دامن میں نور بھر کر چلنا کتنا پُرکیف و دلآویز منظر کشتی ہے۔ اسی طرح اشکِ نیاز کا دامانِ عفو پر ممتاز ہونے کے لیے چلنا وہ پُرکیف استعارہ ہے جسے پڑھکر روح وجد میں آجاتی ہے۔ اشکِ نیاز کی قدر و قیمت اس سے زیادہ اور کیا ہوسکتی ہے کہ دامانِ عفو پر ممتاز ہو، ہستی انسانی و عشقِ الٰہی کے اسرار دلوں کو جتنا بھی مست و بیخود بنائیں کم ہے۔ رواں کا یہ شعر بھی انھیں زندہ رکھنے کے لئے کافی ہے۔ غبارہ جارہا ہے اُسے دیکھتے ہیں اور تہدید کرتے ہیں:-

قدم بڑھائے ہوئے ہاں قدم بڑھائے ہوئے — گدازِ نفس سے دامن مگر بچائے ہوئے
رواں تو ہے سوئے منزل مگر یہ ڈر ہے مجھے — مِری طرح کہیں جلنے سے پہلے جل نہ بجھے

ترغیب کے ساتھ تہدید کا یہ پہلو کتنی عالی دماغی کا ثبوت ہے، غبارہ اپنی منزلِ مقصود کی طرف گرمِ پرواز ہے مگر ممکن ہے کہ گدازِ نفس اُسے منزلِ مقصود تک پہونچنے سے روک لے۔ لہٰذا گدازِ نفس سے دامن بچاکر جانے کی ہد[ایت] کیگئی۔ کس قدر سبق آموز و کس درجہ عبرت خیز ہے جس کی بناء نہیں۔ انسان آلائشوں سے بھ[را ہو]ا ہے۔ مگر جب اپنی منزلِ مقصود کی تلاش میں روانہ ہوتا ہے تو اس کا فرض اولین یہ ہے کہ دنیا و کثافتِ دنیا سے اپنے قلب کو صاف کرلے ورنہ یہی گدازِ نفس اُسے پھر پستی کی طرف کھینچ لائیگا "جلنے سے پہلے جل نہ بجھے"۔ غالبًا مرحوم کی وفات کا فالنامہ تھا۔ رواں بیشک جلنے سے پہلے جل بجھے، ابھی ان کی زندگی اُن کی دلچسپی کے ہر شعبہ کے لئے نہایت ضروری تھی۔

نظموں کے بعد مرحوم کی غزلوں کی باری آتی ہے۔ اِس میدان میں دیکھنا یہ ہے کہ رواں کا فلسفہ حُسن کیا ہے۔ وہ کس نظر سے اسے دیکھتے ہیں اور کہاں تک اس کی عظمت کے قائل ہیں وہ حُسن کو بذاتِ خود محدود نہیں سمجھتے۔ اس کا جلوہ انھیں ہر جگہ نظر آتا ہے۔ فرماتے ہیں:-

گلوں کو پیار نہ کر مجھ کو ڈھونڈھنے والے — کہ میرے حسن کا جلوہ ہر ایک خار میں ہے

قیدِ تعین میں اس طرح حسن کو نظر نواز بنانے کے بعد کہتے ہیں:-

ایک عالم محوِ نظارہ ہے اور وہ پردہ دار گر اسی کا نام پردہ ہے تو وہ پردہ کریں

یہ تمام عالم کیا ہے، جلوۂ یار، یہ مظاہر کس کے ہیں، اُسی کے، وہ ہر شے سے ظاہر ہر رنگ میں عیاں ہے یہ تمام رنگینی و رعنائی اسی کا ظہور ہے۔ اگر کلیوں میں اسکا تبسم ہے تو پھولوں میں اسکی رنگینی ہے، یہ حجاباتِ رنگ و بو خود اس کی ہستی کا پتہ دیتے ہیں اور اس مرکز پر پہونچکر یہ کہنا ہی پڑتا ہے

ایک عالم محوِ نظارہ ہے اور وہ پردہ دار گر اسی کا نام پردہ ہے تو وہ پردہ کریں

اسی فلسفہ کو ایک اور جگہ واضح کرتے ہیں، اور ان کی نکتہ رس نگاہ یہاں ایک اور راز بے نقاب کرتی ہے۔

کہتا تھا چشم شوق سے وہ آفتابِ حسن ہلکی سی اِک شعاع تھی جو انجمن میں تھی

معلوم یہ ہوا کہ یہ تمام مناظر و مظاہر اس آفتاب حسن کی ایک ہلکی سی شعاع تھے۔

یہیں وحدت و کثرت کا سوال پیدا ہوتا ہے۔ اس کو اس طرح صاف کیا ہے:-

ہر ذرہ گا رہا ہے توحید کے ترانے بس ایک رنگ ہستی میں سرمہ در گلو ہوں

حسن کا فیض عام ہے وہ ہر جگہ جلوہ طراز ہے، اس حقیقت کو بیان کرتے ہیں، اور یاس کی تاریکی مسرت کی پر نور شعاعوں سے جگمگا اٹھتی ہے جس سے منظوری و نامنظوری کے دونوں پہلو درخشاں نظر آتے ہیں۔

خدا جانے وہاں منظور ہو کر کیا سعادت ہو جہاں سے فخر کا باعث ہے نامنظور ہو جانا

حسن کی عظمت و رفعت کے سامنے عشق کی ہستی ہی کیا، بشریت معصیت کا دوسرا نام ہے لیکن اس پر بھی حسن نگاہِ لطف سے دیکھیے تو عشق کے مرتبہ کا کیا ٹھکانا۔ عشق اپنی مہجوریوں اور محرومیوں کی وجہ سے حسن کے ادنیٰ ترین التفات پر بھی بلا تعجب کئے نہیں رہ سکتا، مگر پھر بھی تعجب کے ساتھ امید کی بھی ایک دھندلی سی روشنی ہوتی رہتی ہے۔ اس جذبہ کو رواں مرحوم نے کس خوبی سے ادا کیا ہے، فرماتے ہیں:-

کہاں مرا دلِ عاصی کہاں وہ پاک نگاہ یہ تیر اور ہو قسمت میں اس نشانے کی

پاک نگاہ کہکر رواں نے شعر کو جو رفعت دی ہے وہ ان کی پاک نفسی کی شاہد ہے۔

حسن کی نگاہِ ناز عشق کی معراج ہے۔ دراصل تمام رازِ زندگی ہی حسن کی ایک نگاہ ناز میں مضمر ہے:-

عیش و نشاطِ کائنات لطف و سرور برطرف
ضبط ہے رازِ زندگی تیری نگاہِ ناز میں

رواں عیش و نشاط، لطف و سرورِ کائنات کا تھوڑی دیر کے لئے شمار نہیں کرتے۔ ان کا مقصد ہے کہ ان کا ذکر ہی کیا، برطرف کا لفظ رکھکر شعر میں کس درجہ بلاغت پیدا کردی ہے، 'ضبط ہے رازِ زندگی' کی داد نہیں دی جاسکتی۔ یہی تراکیب رواں کے ایک کہنہ مشق شاعر ہونیکی دلیل ہیں۔

مجازی حسن نے شاعروں کو بہت گمراہ کر رکھا ہے، لیکن رواں جلوۂ مجاز کو عین حقیقت سمجھتے ہیں:۔

حسن کی اطاعت بھی اصل میں عبادت ہے
میری بت پرستی میں شان حق پرستی ہے

مذہبی قضیئے ہندوستانی تمدن کا جزوِ اعظم بن گئے ہیں۔ شیخ و برہمن، کعبہ و بتخانہ کے امتیاز نے تفرقہ کا ناگوار ساز چھیڑ رکھا ہے۔ لیکن سب ہماری کم نظری ہے۔ رواں صاف الفاظ میں اس قضیئے کا خاتمہ کرتے ہیں:۔

ہم نہ بتخانے کے بندے ہیں نہ کعبے کے مرید
ہو جہاں نورِ حقیقت سر جھکانا چاہیئے

اب رواں کے دیگر خیالات ملاحظہ فرمائیے۔ اخلاق کی معراج نفس کی پاکیزگی ہے، دنیا میں نیکی بدی، عذاب و ثواب کا امتیاز لازمی ہے۔ مگر اُن گمراہ فلسفیوں کا جو نہ خیر کے قائل ہیں نہ شر کے یہ جواب دیتے ہیں:۔

سُرورِ نفس کی خاطر تو دل کو صاف رکھو
نہیں اگر کوئی انجام خیر و شر نہ سہی

سچ ہے انجام خیر و شر ہو یا نہ ہو، دوزخ و جنت کا وجود فرضی ہی سہی، لیکن یہی کیا کم ہے کہ نیکی کے خیال سے روح کو فرحت ہوتی ہے۔

مرتبۂ فنا کی عظمت محتاجِ بیان نہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ہی اپنی ہستی کا خاتمہ ہو جاتا ہے تو پھر کیا یہی بقائے دوام نہیں اور اس کے حصول کے لئے اپنی ہستی کا خاتمہ ہونا ہی اچھا، کیونکہ جب زیست کا ایک واحد مقصد حاصل ہوگیا تو پھر ہوا و ہوسِ زیست کی کیا ضرورت۔ اس جذبہ کو رواں مرحوم نے کس لطیف پیرایہ میں نظم کیا ہے:۔

یہ کہہ کے ہوگیا پروانہ شمع پر قرباں
وصالِ شعلہ تو ہے، لطفِ بال و پر نہ سہی

جبر و اختیار کا مسئلہ ایک نزاعی مسئلہ ہے، کوئی کہتا ہے کہ انسان مجبورِ محض ہے، کوئی سمجھتا ہے کہ انسان مختارِ کل ہے، کسی کا خیال ہے کہ انسان نہ مجبورِ محض ہے اور نہ مختارِ کل بلکہ بہت سی باتوں میں مختار ہے اور بہت سی باتوں میں مجبور۔ رواں انسان کو مجبورِ محض سمجھتے ہیں:

فرماتے ہیں :-

ترا بخشا ہوا دل اور دل کی یہ ہوس کاری مرا اس میں قصور اے دستگیر عاصیاں کیا تھا

رواں نے اس مجبوری سے فائدہ اُٹھایا ہے اور دستگیر عاصیاں کہکر اس کی رحمت سے فیضیاب ہونا چاہا ہے۔ اس فلسفہ کو حضرت جگر مرادآبادی نے فارسی میں نظم کیا ہے :-

شغل گناہ کردن و رفتن گناہ ماست ذوقِ گناہ دادن و دیدن گناہ کیست

دنیا میں بہت سے گوہر شاہوار دامنِ خاک میں پنہاں ہیں جن پر یا تو لوگوں کی نگاہیں نہیں پڑیں یا دیکھنے کے باوجود کسی نے انکی خوبی پر نگاہ نہیں کی۔ اس کوتاہ نظری اور قدر ناشناسی کی شکایت کرتے ہیں :-

گل ویرانہ ہوں کوئی نہیں ہے قدرداں میرا تو ہی دیکھ لے مرے خلاق حسنِ رائگاں میرا

پھول کا حسن اور یوں رائگاں ہو، یہ صرف نہ دیکھنے کا قصور ہے۔ یہ خیال ایک انگریزی نظم Gray's Elegy سے لیا گیا ہے۔ اور نہایت کامیابی سے گرے کے خیالات کی دلکش ترجمانی کیگئی ہے "A violet or a mossy stone" ان کے علاوہ بہت سے اشعار ہیں جو قابل ہزار ستائیش ہیں، مثلاً :-

سیہ کاری پہ آتا ہے جب انساں کا دل غافل یہ بالکل بھول جاتا ہے کہ کوئی دیکھتا بھی ہے

نہیں سیر آسماں کا بعد دیتے ہو بستی آزادی اسیروں نے تمہارے جو کیا آزاد کیا کرتے

خوشی جو قلب غریب الوطن میں آئی ہے شعاع نور ہے بیت الحزن میں آئی ہے

ہر ایک ذرہ ہے جدّت طراز رنگ بہار جدید موج شراب کہن میں آئی ہے

قطعات میں سے ایک قطعہ ملاحظہ ہو :-

آپ تیار ہیں کرنے کو ہر اک پر احساں شرط یہ ہے کہ کوئی آپ کا نقصان نہ ہو

مجھ کو رحم آتا ہے اس دہر کے نیکوں پہ رواں اتنا گمراہ وفا بھی کوئی انسان نہ ہو

یہ دنیا کے روزمرہ پیش آنیوالے واقعات کا بے نظیر مشاہدہ ہے، وفا کے معنی انسان نے کس قدر غلط سمجھ رکھے ہیں۔ اب ان کی رباعیوں کو دیکھئے جو رواں کا خاص کارنامہ ہیں۔

زاہد نماز و روزہ کا انتہائی پابند ہے، لیکن جتنا ہی وہ نماز و روزہ کا پابند ہے اُتنا ہی اُسکا باطن خوفِ خدا سے خالی ہے۔ ایسی صورت میں عبادت و حاصل عبادت معلوم، رواں فرماتے ہیں :-

انجام کی فکر ہو شریعت یہ ہے جان صرفِ وفا رہے ریاضت یہ ہے

زاہد سے کہو، نماز و روزہ بے سود دل خوفِ خدا کرے عبادت یہ ہے

مذہب رندانہ رباعی کی جان اور شاعر کا ایمان ہوا کرتا ہے۔ ان کے یہاں گناہ کیا جاتا ہے اور لطیف بے باکی کے ساتھ۔

اللہ رے سرورِ مذہبِ رندانہ اللہ رے نورِ جلوۂ جانانہ

آنکھیں جو کھلیں تو ہر گنہ میں دیکھا کعبہ اِک سمت اِک طرف بتخانہ

گناہ بھی نورِ جلوۂ جانانہ سے خالی نہیں، مگر ایسا گناہ کیا آسانی سے کیا جاسکتا ہے، اور اسکی صلاحیت کتنے گنہگاروں کو ہے۔ فرماتے ہیں:۔

مذہب فقط اک ہوس ہے ایمان نہیں باب ایماں کا کوئی عنوان نہیں

نیکی کرنا تو خیر مشکل ہے رواں! بندہ کے لئے گنہ بھی آسان نہیں

ایک دوسری رباعی میں طاعت و تقویٰ کا راز طشت از بام کیا جاتا ہے:۔

طاعت پہ غرور، یہ خودی کیسی ہے سنجیدہ دلوں کی دل لگی کیسی ہے

سر خاک پہ اور دل خدا جانے کہاں مکار، یہ تیری بندگی کیسی ہے

گناہ کیوں کرتا ہوں اس کا سبب بیان کرتے ہیں:۔

مجھ سا حسرت شعار کوئی ہوگا؟ مجھ سا بے اختیار کوئی ہوگا

خوش ہوں کہ گناہ وجہ تو ہے رواں مجھ سا بھی گناہگار کوئی ہوگا

یہ ہے ایک عالی ظرف گنہگار کا سبب گناہ۔ یہاں زاہد و رند کے گناہوں میں کتنا فرق ہے۔ زاہد بندگی کرتا ہے ریاکاری سے جو خود ایک گناہ ہے۔ مگر وہ اس گناہ پر توبہ کرنے کی ضرورت نہیں محسوس کرتا۔ رند ایک کھلا ہوا گناہ کرتا ہے اور اس لئے کہ توبہ کرکے خدائے قدوس کی شانِ رحیمی دیکھے۔ اس لطیف فلسفۂ گناہ کی کیا داد دی جاسکتی ہے

اس کے بعد وہ اپنی ان تمام باتوں کو عاجزانہ طریقہ سے پندار پر محمول سمجھتے ہیں اور کہتے ہیں۔

پندار سے اپنے سوگوار آیا ہوں اعمال سے اپنے شرمسار آیا ہوں

اے بخشنے والے سب گنہگاروں کے مایوس نہ کر امیدوار آیا ہوں

اس کی شانِ کریمی پر کم و بیش سب کو عقیدت ہوتی ہے۔ مگر رواں کا جوشِ عقیدت ملاحظہ ہو۔ فرماتے ہیں

مضطر آیا ہوں، بیقرار آیا ہوں اپنی ہی نظر میں ہوکے خوار آیا ہوں

بخشے گی نہ دیکھوں کیسے رحمت تیری ہشیار کہ میں گناہ گار آیا ہوں

یہ جوشِ عقیدت تمام عمر کی اس عبادت سے افضل ہے جو امید و بیم اور دوزخ و جنت کے خیال سے کی گئی ہو۔

رباعیوں میں جا بجا قدرتی مناظر بھی بہت سلیقہ سے نظم کئے ہیں

کس کی تنویر روحِ انسانی ہے — کس کا جلوہ یہ بزم نورانی ہے
یہ ماہ دو ہفتہ ۔ اور یہ مطلعِ صبح — کس کا رُخسار کس کی پیشانی ہے

جتنے انوارِ حسنِ صورت کے ہیں — سب نغمہ نوازِ بزمِ قدرت کے ہیں
یہ آب و سحاب و برق و باد و باراں — پردے دو چار سازِ فطرت کے ہیں

ایک دوسری رباعی میں عظمت انسانی بیان کرتے ہیں

حالِ دلِ ناصبور کس سے کہئے — افسانۂ برقِ طور کس سے کہئے
جاں منظرِ جلوۂ حقیقت ہے مگر — کہنے کا نہیں شعور کس سے کہئے

تہذیب جدید کی سیہ کاریوں سے تنگ آکر فرماتے ہیں :-

تابع ہمیں عقل کا کئے دیتی ہے — آزادیٔ دل فنا کئے دیتی ہے
تہذیب کی عظمتوں سے ہم باز آئے — فطرت سے ہمیں جدا کئے دیتی ہے

اب ایک رباعی اور پیش کرتا ہوں ، یہ رباعی سوز و گداز عیش و سرور کا مرقع ہے ، دنیا عیش نشاط میں مصروف ہے ، مگر بہت دل ایسے ہیں جو اس کے لئے ترس رہے ہیں۔ شاعر اسے دیکھکر تڑپ اٹھتا ہے اور بیساختہ کہتا ہے۔

مخمورِ سحر ہیں مرغانِ چمن — غنچہ غنچہ ہے زمزمہ خوانِ چمن
سوکھی کلیوں کے پاس بھی ہو کے ذرا — اے بادِ نسیمِ صبح اے جانِ چمن

کتنی حسرت ہے کتنا سوز ہے ، دل تڑپ رہا ہے ، روح بے قرار ، کیا لکھا جائے اور کیا داد دی جائے
یہ رواں مرحوم کے حالاتِ زندگی اور انکے کلام پر ایک مختصر تبصرہ ہے۔ بہت سے قطعات رباعیات و اشعار ایسے ہیں جنکو پڑھیئے اور لطف اٹھایئے۔

دنیا فانی ہے ، ہر چیز کو فنا ہے ، مبارک وہ ہستیاں ہیں جنکو اپنے کارناموں کی وجہ سے زندگی جاوید حاصل ہے۔ رواں مرحوم کا کلام ان کو زندہ رکھنے کے لئے بہت کافی ہے۔ اب آیئے مرنیوالے کا وہ شعر بھی پڑھ لیں جو آج بھی اسکے لئے باعثِ تسکین ہوگا۔

اب یہ ممکن ہے کہ ہو جائے رواں مقبولِ دوست — آج وہ بھی مٹ گیا جینے کا جو الزام تھا

شانتی کی گود

ایک قصہ

(از ٹھاکر چندر بھوشن صاحب)

(۱)

بڑے دن کی تعطیل میں کلکتے کی سیر کرنے کے بعد نوروز کے دن میں بمبئی میل سے الہ آباد کو روانہ ہوا، مطلع صاف نہ تھا، عروس نو کی طرح نئے سال کا سورج منہ دکھانے سے شرماتا تھا، صبح کا وقت ہی سے خلیج بنگال کی تند ہوا اُس کے پیچھے پڑی تھی، آخر کار مقابلہ کی تاب نہ لاکر شرم سے اپنا چہرہ چھپا کر بیچارہ پچھم کے سمندر میں ڈوب گیا، تھوڑی دیر میں ہر طرف اندھیرا چھا گیا۔

جسم کو حرارت پہونچانے کی غرض سے میں نے مغلسرائے میں ایک پیالی چائے لیکر پی، ایک اخبار خریدا اور سکنڈ کلاس میں کمبل سنبھال نیں اخبار دیکھنے لگا۔

مشکل سے دو منٹ ہوئے ہونگے کہ ٹکٹ چیکر ایک بارہ تیرہ برس کی لڑکی کا پیچھا کرتا ہوا میرے کمپارٹمنٹ میں گھس آیا۔ میں نے چونک کر اس اچانک حملہ کی وجہ پوچھی تو معلوم ہوا کہ لڑکی بے ٹکٹ سفر کرنا چاہتی تھی اور ایک مرتبہ اُتارے جانے پر دوسرے درجہ کی گاڑی میں گھس آئی، اس پر میں نے دھیرے سے پوچھا

آپ اسے اُتار کیوں رہے ہیں؟"

"یہ بغیر ٹکٹ سفر نہیں کر سکتی" ٹکٹ چیکر نے کسی قدر تحکمانہ لہجے میں کہا۔

"ہاں ہاں، یہ تو میں بھی جانتا ہوں، اچھا یہ جائیگی کہاں؟"

"الہ آباد جانے کو کہتی ہے"

اُس غریب کی پریشان صورت اور ٹکٹ چیکر کی سخت گیری نے میرے دل میں درد پیدا کر دیا۔ میں نے سکنڈ کلاس کا ٹکٹ اُس کے لئے بنوا کر اُسے اپنے ہی کمپارٹمنٹ میں بٹھلا لیا۔ جب ٹکٹ چیکر چلا گیا اور گاڑی کھسکی تو اخبار ایک طرف رکھتے ہوئے میں نے پوچھا:

"بیٹی الہ آباد تم کس کے یہاں جاؤ گی؟"

برسات کی اُمنڈتی ہوئی کالی گھٹا تیار تھی، صرف چھیڑنے کی دیر تھی کہ پہاڑوں سے ٹکرا کے ہوئے بادل

کی طرح رو رہنے لگی

تھوڑی دیر تک تو میں جواب کا منتظر رہا لیکن اُسے روتے دیکھکر میں نے پھر پوچھا "بیٹی روتی کیوں ہو تمہارے ساتھ تو ہم ہیں۔ جہاں کہوگی پہونچا دیں گے"

اُس نے زور کی سسکیاں لیتے ہوئے کہا "الہ آباد میں میرا کوئی نہیں ہے، میں بھاگی ہوئی جا رہی ہوں"

"تو تم رہو گی کہاں؟ اور کھاؤ گی کیا؟"

"میں نے سنا ہے کہ الہ آباد اور بنارس میں کھانے پہننے کی کمی نہیں"

قومی نشہ کے غرور سے میری آنکھیں مسرور اور ماتھا اونچا ہو گیا، میرا خیال ہزاروں برس پیچھے چلا گیا، آہ! ایک زمانہ ایسا بھی تھا جب ہندوؤں کی مسافر نوازی مشہور تھی۔ معمولی لوگ بھی خود فاقہ کشی کی صعوبتیں برداشت کرکے بھوکے مسافروں کو کھانا کھلانا اپنا دھرم سمجھتے تھے۔ ممکن تھا کسی دوسرے کی زبان سے یہ بھولے بھالے الفاظ سنکر میں ہنس دیتا لیکن اس وقت درد اور محبت کی تصویر بنا ہوا تھا۔ پریم کے اُمنڈتے ہوئے آنسوؤں کو روک کر میں نے کہا "بیٹی تب الہ آباد پریاگ کہلاتا تھا اور بنارس کاشی پوری تھی، اب وہاں کوئی کسی کو نہیں پوچھتا۔ بھیک منگوں کو بھیک بھی مشکل سے ملتی ہے۔ چلو، تم کو ہم اپنے یہاں لے چلیں گے مگر پہلے یہ تو بتاؤ کہ تم گھر سے کیوں چلی آئی ہو؟"

"کل رات دیدی.....

کانوں پر اعتبار نہ کرکے میں نے بیچ ہی میں بات کاٹ کر پوچھا "کیا کہا؟ دیدی!"

"ہاں۔ کل....."

"تو کیا تمہاری شادی بھی ہو چکی ہے؟"

شیشے میں ٹھیس لگ گئی، برسوں کی بند شراب اُبل پڑی۔ بارہ تیرہ سال کی بیوہ۔ بہت دن پہلے وہ دھوا لفظ کا ارتھ جان چکی تھی، چاہے دھوا کی حقیقت اور آئندہ مصائب کا حال اُسے معلوم نہ ہو لیکن اتنا ضرور جانتی تھی کہ بیوہ ہونا بدقسمتی کی بات ہے، جس کے بھاگ پھوٹ جاتے ہیں وہی ودھوا ہوتی ہے بات کی بات میں اُس کا آنچل آنسوؤں سے تر ہو گیا۔ سارا راز کھل گیا۔ زندگی میں اُس کا پہلا غمخوار میں ہی تھا۔ لیکن میں اس کو رُلا کر اپنی ہمدردی کا اظہار نہ کرنا چاہتا تھا اس لئے گفتگو کا رخ بدلنے کی غرض سے میں نے پوچھا "تم میرے ساتھ چلنے کے لئے تیار ہو نہ؟"

"آپ کہاں رہتے ہیں اور آپ کا کیا نام ہے؟"

"میرا گھر تو غازیپور میں ہے لیکن ان دنوں الہ آباد میں ڈپٹی کلکٹر ہوں، میرا نام سریندر بکرم سنگھ ہے

تمہارا نام کیا ہے؟"

"ہمارا نام بالا ہے۔ میں بھی چھتریوں کی اولاد ہوں اور آپ کے ساتھ چلنے پر راضی ہوں لیکن ایک شرط یہ ہے کہ کسی کو خبر نہ ہو۔"

"میری طرف سے خاطر جمع رکھو" یہ کہکر میں پھر اخبار پڑھنے لگا۔

نئے سگریٹ پینے والے نوجوانوں کی طرح دھواں اڑاتا ہوا انجن الہ آباد اسٹیشن پر آکر کھڑا ہوگیا ہم اُتر پڑے، باہر موٹر کھڑی تھی دونوں بیٹھ کر شہر کی طرف روانہ ہوگئے۔

(۲)

اس واقعہ کے پانچویں دن میں کچہری سے واپسی پر ہاتھ منہ دھو رہا تھا، سامنے تپائی پر تازہ اخبار رکھا تھا۔ بالا آسنی پر بیٹھی ہوئی رامائن پڑھ رہی تھی، میری چھوٹی لڑکی پر جا بہ تن رامائن کا ارتھ سننے میں مشغول تھی، ہاتھ منہ دھو کر میں بھی اخبار کے صفحے اُلٹنے لگا کہ میری نگاہ چھٹے صفحہ کی دوسری سرخی پر رُک گئی جس میں لکھا تھا "بیوہ فرار" دو تین دن سے میری آنکھیں اخباروں میں اس قسم کی ہیڈنگ ڈھونڈھ رہی تھیں، میں نے پڑھنا شروع کیا "یکم جنوری۔ شیو سمپت سنگھ کی بیوہ لاپتہ ہوگئی۔ کہا جاتا ہے کہ ٹھاکر صاحب نے آخری عمر میں ایک پانچ سال کی لڑکی سے شادی کی تھی، مگر سات سال بعد پچھلے دسمبر میں ان کی وفات ہوگئی۔ نالائق بھائی اس کو بیچنا چاہتا تھا مگر ٹھاکر صاحب کی بڑی بہن نے اُسے آگاہ کر دیا اور وہ بھاگ گئی"

سر اُٹھا کر میں نے بالا کی طرف دیکھا، آہ ننھی نادان بالا یاس اور مایوسی کی تصویر بنی ہوئی تھی کلی مسکرانا چاہتی تھی مگر بادِ سموم کے جھونکوں نے اُسے عین حالت شگفتگی میں پژمردہ کر دیا تھا۔ میری آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ بالا نے سر اُٹھایا تو مجھے روتا پایا، راز چھپانے کی غرض سے میں نے بالا کو نزدیک بلا کر پوچھا

"بالا تم رامائن پڑھنا جانتی ہو"

"جی ہاں، رامائن تو میں خوب پڑھتی ہوں"

"اور اخبار؟"

"اخبار تو مجھے کبھی پڑھنے کو نہیں ملا، لیکن پڑھ سکتی ہوں، کیوں، کیا کوئی نئی خبر ہے، آپ رو کیوں رہے ہیں؟"

اُس نے نہایت بے رخی اور بیباکی کے ساتھ میرے ہاتھوں سے اخبار لیتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں تو۔ میرا لڑکا ولایت پڑھنے گیا ہے، کبھی کبھی اُس کا خیال آجاتا ہے۔ اچھا میں تم کو ایک دوسرا

[redacted]

اخبار دیتا ہوں۔ اس میں مجھے کچھ اور دیکھنا ہے۔

بالا نے اخبار چھوڑ دیا، لیکن میں نے دیکھا کہ اُس کی آنکھیں بھی ڈبڈبا آئیں، مجھے اپنی بیوقوفی پر بڑا رنج ہوا۔ بالا کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے میں نے کہا "بیٹی آج سے تم کبھی نہ رونا، بھول کر بھی گھر کا خیال نہ کرنا تمہارا گھر یہی ہے۔"

میں نہیں کہہ سکتا کہ میری باتوں میں جادو کا اثر تھا یا کیا مگر میری اس ہمدردی سے بالا کے آنسو تھم گئے۔ چہرہ کا غبار دُھل گیا۔ میں نے دیکھا وہ برسات کے چاند کی طرح نکھرا ہوا تھا۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ اُس پر پانی پھیرا ہوا نظر آتا تھا۔

پربھا سامنے کھڑی تھی۔ میں نے کہا "بیٹی، آج سے تمہیں بالا رامائن پڑھائیں گی۔ ...."

ابھی میں کچھ اور کہنے والا تھا لیکن پربھا نے بیچ ہی میں بات کاٹ دی "بالا بہن آج تین چار دن سے رامائن پڑھاتی ہیں۔ رامائن کی کہانی سناتی ہیں۔ ارتھ بتاتی ہیں اور بڑی بہن کی طرح پیار کرتی ہیں۔"

پچھلا زمانہ ایک مرتبہ پھر آنکھوں کے سامنے آگیا۔ روہنی کی موہنی مورت آنکھوں کے آگے ناچنے لگی۔ آنسوؤں کی باڑھ نے ضبط کے بند کو توڑنا چاہا لیکن میں نے صبر و تحمل سے کام لیا۔ زبردستی ہونٹوں پر مسکراہٹ پیدا کرتے ہوئے میں نے کہا "بیٹی پربھا، آج سے بالا کو بڑی بہن ہی سمجھنا......" پربھا پھر بیچ ہی میں بول اُٹھی "اور جب بہن آجائیں گی تب بھی میں انھیں بہن ہی سمجھوں"

اب کلیجہ پر ایک زور کا گھونسا سا لگا۔ آہ پربھا نے گزرتے ہوئے زمانہ کی یاد بار یاد دلاکر مجھے رُلا دیا۔ روہنی مرگئی تھی، پربھا کے پوچھنے پر ماں کہہ دیتی کہ وہ ننھیال گئی ہے۔ معصوم پربھا کو کیا خبر تھی کہ ہم جیسے بڈھے جھوٹ بولتے ہیں، وہ تو اپنی طرح سب کو سچا جانتی تھی۔ کھانے کی چیزوں میں سے وہ ہمیشہ روہنی کے لئے کچھ نہ کچھ رکھ دیتی، اور شاید پربھا کے بار بار یاد دلانے ہی سے روہنی کی یاد ہمارے دلوں میں تازہ تھی۔ معصوم بچوں کے ایک ایک لفظ میں جادو کا اثر ہوتا ہے لیکن اُن کو سننے کے لئے کان اور سمجھنے کے لئے دل چاہیے۔ اس وقت میری آنکھوں کا پیالہ لبریز ہو چکا تھا محض چھلکنے کی دیر تھی۔ بالا اور پربھا کو میں اپنے سامنے سے ہٹا دینا چاہتا تھا، تپائی پر دوسرا اخبار اُٹھا کر دیتے ہوئے میں نے بالا سے کہا "بیٹی بالا، اس کو لیجاؤ اور اس کی تصویریں پربھا کو دکھلاؤ۔"

اتنا کہکر میں نے اپنا سر نیچا کر لیا۔ نہیں معلوم بالا اور پربھا کب چلی گئیں۔

روہنی کی یاد اور بالا کی مصیبتوں نے مجھے خوب رُلایا، اس کے بعد معلوم نہیں کب مجھے نیند آگئی۔

(۳)

شام کا وقت تھا، حسب معمول کچہری سے لَوٹ کر ہاتھ منہ دھونے کے بعد سر جھکائے ہوئے میں اخبار کے صفحے اُلٹ رہا تھا، سامنے بالا اور پربھا ماسٹر صاحب سے انگریزی پڑھ رہی تھیں، تھوڑی دُور پر اردلی کھڑا تھا۔ دفعتہً کانا پھوسی سُنکر میں نے سر اُٹھایا تو سامنے تار گھر کے چپراسی کو کھڑا پایا، مجھے دیکھکر اُس نے سلام کرکے میرے ہاتھ میں ایک لفافہ رکھ دیا، مَیں نے اُسے کھولکر دیکھا تو اس مضمون کا تار تھا "پٹنہ کلکٹریٹ - درشن کئے مُدت ہوگئی، کل الہ آباد آؤنگا۔ شاردا" مَیں پھولا نہ سمایا، گھر میں جاکر شاردا کی ماں کو خوشخبری سُنائی اور پربھا اور بالا سے کہا۔ اس خوشی میں ماسٹر صاحب کو بھی رخصت کیا اور خود کمرہ کی صفائی میں مشغول ہوگیا، بالا نے کُرسیاں، میز، کھڑکیوں میں لگے ہوئے شیشے صاف کئے پربھا نے بھائی کی کتابیں۔ قلم۔ دوات درست کرکے قرینہ سے میز پر لگا دیے، یہاں تک کہ ساری رات انھیں تیاریوں میں ختم ہوگئی، صبح ہوتے ہی میں نے صاحب بہادر کے پاس رخصت اتفاقیہ کی عرضی بھیجدی اور ضمیر احمد خاں صاحب کو شاردا کو لینے کے لئے اسٹیشن بھیجدیا

میں اپنے خاص کمرے میں بیٹھا ہوا بچھڑے ہوئے شاردا کو گلے لگانے کے لئے بیقرار ہو رہا تھا جب کسی موٹر کے ہارن کی آواز سڑک سے سنائی دیتی تو میرا دل دھڑکنے لگتا، اُٹھکر دیکھنے کو جی چاہتا لیکن پھر یہ سوچکر کہ نوکر چاکر اس بیقراری پر ہنسیں گے، جیوں کا تیوں بیٹھ جاتا اسی اثنا میں مَیں نے کتنی ہی بار پریم وتی کو دروازہ پر آ آکر لوٹتے دیکھا تھا جس طرح نیا روزہ دار چاند دیکھنے کے لئے بیقرار ہوتا ہے اسی طرح وہ شاردا کو سب سے پہلے دیکھنے کا شرف حاصل کرنا چاہتی تھی مگر جہاں تک مجھے یاد ہے وہ اندر ہی تھی کہ موٹر ہارن بجاتی ہوئی کمپاؤنڈ میں داخل ہوئی چپراسی نے اشارہ کیا مَیں کمرے سے باہر نکل آیا، دیکھا شاردا اور ضمیر دونوں میری طرف بڑھے چلے آرہے تھے اور مجھے دیکھتے ہی شاردا دوڑ کر میرے قدموں پر گر پڑا۔ میرا دل بھی بھر آیا اور غرور سے سر اُونچا ہوگیا اور مجھے یقین ہوگیا کہ ولایتی تعلیم کا یہ ہرگز منشا نہیں کہ والدین کی خدمت نہ کرو یا طرز معاشرت تبدیل کردو۔ بہرحال میں نے شاردا کو اُٹھا کر گلے لگا لیا، پریم وتی جھانک رہی تھی، دوڑ کر اس سے لپٹ گئی، ماں بیٹے دونوں رونے لگے، پربھا بھائی کا ہاتھ پکڑ کر کھڑی ہوگئی، بالا ابھی غیر مانوس تھی کونے میں کھڑی رہی۔ لیکن یہ کیفیت دو ہی ایک گھنٹے رہی اس کے بعد دونوں ہِل مِل گئے۔

عید کا چاند تھوڑی ہی دیر تک دکھائی دیتا ہے، خوشی کی گھڑیاں منٹوں میں گذر جاتی ہیں، شاردا کو آئے ہوئے دو ہی دن گذرے تھے، ماں نے اُسے آٹھ برس کے بعد دیکھا تھا، وہ اپنے اکلوتے بیٹے کو اتنی جلد رخصت

کرنے کے لئے تیار نہ تھی، مگر اب شاردا کالج کے طالب علم نہ تھے وہ ایک ذمہ دار افسر ہو گئے تھے۔

دن بھر دوستوں میں ہنسی مذاق کی باتیں ہوتی ہیں۔ رات کو سارا کنبہ اکٹھا ہوا۔ شاردا کے چہرے سے اُداسی مترشح تھی، عزیزوں سے جدائی کا خیال شاق ہو رہا تھا، ماں پُرنم آنکھوں سے بار بار انھیں دیکھ رہی تھی اور میری بیقراری بھی بڑھ رہی تھی۔

شاردا پربھا کو ساتھ لیجانے پر آمادہ تھے، اور پربھا بالا کو لیجانے کے لئے مصر تھی، گھر سُونا ہونیوالا تھا۔ صبح ہوئی، ادھر تاریکی روشنی سے گلے مل رہی تھی، ادھر میں سیہ بخت شاردا کو رخصت کر رہا تھا، اُدھر آفتاب عالمتاب آشیانۂ مشرق سے نکلا، اِدھر ہماری قسمت کا سورج ہمارے لئے غروب ہو رہا تھا۔ افسوس یہ ہماری آخری ملاقات تھی۔ پھر ہم نے شاردا کی صورت نہ دیکھی۔ آہ، اس وقت اگر یہ معلوم ہوتا کہ قسمت ہمیشہ کے لئے شاردا کو ہم سے جُدا کر رہی ہے تو شاید جی بھر رو تو لیتے، مگر کبھی کسی کا ارمان پورا ہوا ہے؟

(۴)

عید کا ایک دن خوشی سے گذر تا ہے، محرم کا پورا عشرہ رنج میں بسر ہوتا ہے، شاردا کو پٹنہ گئے تقریباً تین برس ہو چکے تھے، مگر ابتک اُن کا کوئی خط میرے پاس نہیں آیا، اس کی وجہ ہم دونوں کی لڑائی تھی۔ کوئی خاص واقعہ ہوئے بغیر میں خط لکھنا ضروری نہیں سمجھتا۔ بعض اوقات لوگ میری ہنسی اُڑاتے ہیں اور مجھے بخیل سمجھتے ہیں، لیکن مجھے بخل کا الزام گوارا ہے لیکن یہ فضول خرچ اور دردسر منظور نہیں شاید شاردا بھی اس معاملہ میں میرا معتقد تھا۔ بہرنوع مجھے تین سال کے بعد شاردا کو خط لکھنے کا ایک سنہرا موقع ہاتھ آیا۔ اُن کی شادی ابھی تک نہ ہوئی تھی۔ پریم وتی تو طالب علمی ہی کے زمانہ میں اُن کی شادی کرنا چاہتی تھی مگر میں ابتک ٹالتا رہا تھا مگر اب کوئی وجہ مانع نہ تھی

مہادیو سنگھ سراتھو کے مشہور رئیس تھے، موروثی جائداد بھی وافر تھی اور سرکار سے "راےصاحب" کا خطاب ملا تھا، شاردا کی شادی کے لئے مہینوں سے تقاضا کر رہے تھے۔ جہیز میں کافی رقم ملنے کی امید تھی میں نے زبان دیدی۔

ٹھاکر صاحب کو رخصت کرتے ہی میں قلم دوات لیکر خط لکھنے بیٹھ گیا۔ خط کس طرح شروع کروں میں یہی سوچ رہا تھا کہ یکایک کمرے میں کسی کے آنے کی آہٹ ہوئی، میں نے سر اُٹھا کر دیکھا تو پربھا گود میں ننھا سا بچہ لئے ہوئے کھڑی تھی۔

مجھے قارون کی دولت مل گئی۔ سوچا شاردا آئے ہونگے اور خط نہ لکھنا پڑے گا۔ اُسکا پالاگن

قبول کرتے ہوئے میں نے کہا "آؤ بیٹی، یہ بچہ کس کا ہے"

"بھابی کا" بچے کے رخساروں کا بوسہ لیتے ہوئے پربھا نے کہا۔

"کیا؟ بھابی کس کو کہتی ہے" میں نے بے ساختہ پوچھا۔

"ارے بالا بھابی اور کون" کہتے ہوئے پربھا نے بچے کو چپٹا لیا۔

یہ سنکر مجھے بہت تشویش ہوگئی۔ بات تو سمجھ میں آگئی کہ شاردا نے بالا سے شادی کرلی ہے اور درحقیقت میں بھی یہی چاہتا تھا، بلکہ ایک مرتبہ پریم وتی سے اس کا ذکر بھی کرچکا تھا، اس نے مجھے اس کا یہی جواب دیا کہ تم عیسائی تو نہیں ہوگئے ہو۔ اس کے بعد پھر مجھے اس معاملہ میں بات چیت کی ہمت ہی نہیں ہوئی کیونکہ گھریلو معاملات میں اسی کی بادشاہت تھی۔ میں نے ڈرتے ڈرتے پربھا سے پوچھا "اور شاردا کہاں ہے؟"

"وہ نہیں آئے، ہم کو اور بالا کو بدلو کے ساتھ بھیج دیا ہے، خود ایک مہینہ کی چھٹی لیکر اس ہفتہ کے اخیر میں آئیں گے"

"بدلوا اور بالا کہاں ہیں؟"

"بالا اماں کے پاس ہیں، بدلو باہر کھڑا ہے"

"اچھا ماں کے پاس جاؤ"

پربھا اندر چلی گئی۔ میں فکر میں پڑگیا۔ بظاہر حال تو میں بدھوا بیاہ کا بڑا حامی تھا، اور دوسرے لوگوں کی بدھواؤں کے ساتھ شادی ہوتے دیکھکر بہت خوش ہوتا تھا لیکن خود اس میدان میں قدم رکھنے کی ہمت نہ تھی۔ کوئی کپڑا بین کر کھانا نہ تھا کہ کھانے لگے اور ریفارمر مشہور ہوگئے - اس کے لئے قربانی اور جاں نثاری کی ضرورت تھی۔

پریم وتی کا ڈر تھا۔ گھر میں جاؤں یا نہ جاؤں۔ میں اسی لیس و پیش میں تھا کہ بدلو نے کمرہ میں آکر سلام کیا۔

"بدلوا بچہ کی شادی کب ہوئی اور یہ لڑکا کب پیدا ہوا؟" میں نے پوچھا۔

"سرکار بھوا کوئی آڑھائی برس"

"خود ہی یہ شادی طے کی تھی یا اور کسی نے؟"

"سرکار ہم نوکر چاکر یہ کا جانیں، صاحب ایک کھت آپ کے واسطے دہن ہیں" یہ کہکر بدلو نے جیب سے ایک لفافہ نکالکر میرے سامنے رکھدیا، اسے کھولکر دیکھا لکھا تھا: ۔

"پتا جی! ولایت میں نہ میں نے مانس کھایا اور نہ شراب چھوئی۔ آئی۔ سی۔ ایس ہونے پر بھی طرز معاشرت میں کسی طرح کی تبدیلی کرنا میں نے وضعداری کے خلاف سمجھا۔ مگر شادی کے معاملے میں ولایت کی فرود نقل کرنا چاہتا ہوں۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ایک مرتبہ آپ نے کہا تھا شاردا اپنی شادی خود کریگا اس لئے میں نے اپنی شادی کرلی۔ کس سے؟ یہ بتانے کی ضرورت نہیں، آپ خود جان جائیں، مجھے یہی شادی پسند آئی۔ خواہ آپ اسے انگریزی تعلیم کی برکت کہیں خواہ میری نالائقی سمجھیں لیکن اس بارے میں ہمارے شاستر، وید میرے موافق ہیں۔ ہاں مجھ سے ایک قصور ضرور ہوا ہے کہ مجھے آپ کو اطلاع دینی چاہیئے تھی لیکن جب پسند کا معاملہ ہے تو پھر کسی کی اجازت کی ضرورت نہیں، آپ خود اپنے دل سے پوچھیں۔ اگر میں آپ کو آگاہ کر دیتا تو کیا میں اپنی آرزو پوری کر سکتا۔ خیر جو ہوا سو ہوا اب معافی چاہتا ہوں۔ بچوں کی غلطیاں نظر انداز کرنا باپ کا فرض ہے۔ ہو سکا تو اسی ہفتہ کے اخیر میں ایک مہینہ کی چھٹی لیکر آؤنگا۔ فقط شاردا۔"

شاردا نے میرے منشا کا کام کیا تھا۔ مجھے خوش ہونا چاہیئے تھا، لیکن میری عجیب حالت ہو رہی تھی۔ ماتھے پر پسینہ آ گیا تھا۔ پریم وتی کے خوف سے گھر جانے کی ہمت نہ ہوتی تھی، دن بھر تو ٹالتا رہا مگر شام کے کھانے کے لئے اندر جانا پڑا۔ پریم وتی بالا کو سخت سست سنا رہی تھی۔ میرے پہونچتے ہی آنکھیں نکالکر بولی: "اور ولایت بھیجو، مدت سے رٹ رہی تھی کہ شادی کر دو شادی کر دو، اگر کر دی ہوتی تو آج یہ نوبت نہ آتی۔ میں نے اُسی دن کہا تھا کہ چاہے پربھا پٹنہ چلی جائے مگر بالا کو نہ جانے دونگی تب نہیں مانا اب برادری کو کیا منہ دکھاؤ گے؟" 1

بالا سر نیچا کئے زہر کے گھونٹ پی رہی تھی، پربھا رو رہی تھی۔ جیوں تیوں آدھا پیٹ کھا کر میں باہر نکل آیا۔

اُس دن سے میرا یہی معمول ہو گیا کہ دن بھر اُلو کی طرح چھپا رہتا شام کو کھانے کے لئے اندر جاتا آدھا پیٹ پریم وتی کے لعن طعن سے بھر جاتا، آدھے پیٹ کھا کر نکل آتا، بالا پر جو کچھ گذر رہی تھی اُسے اُس کا دل جانتا ہوگا لیکن اُس نے چوں تک نہ کی۔ شاید یہ اُس کے صبر اور تحمل کی آخری آزمائش تھی میرا گھر اُس کے لئے غمکدہ تھا، گھر میں مہری کے برابر بھی بالا کی عزت نہ تھی۔ وہ کوئی چیز چھو نہ سکتی تھی۔ ایک دن ڈرتے ڈرتے بیچاری نے میرے پاؤں پکڑ کے کہا "آخر اس میں میرا کیا قصور ہے؟" اتنے میں پریم وتی بڑبڑاتی ہوئی نکل آئی "خبردار ہم کو مت چھونا وہی پاپی آئے تو اُسے چھونا خبردار!" بالا کیا کرتی دل مسوس کر رہ گئی، مجھے بڑا شاق گذرا آنکھوں میں آنسو بھر آئے پریم وتی سے کہا "دیکھو! بالا سے جو کچھ کہو گی وہ برداشت

کرینگی، لیکن شاردا سے کچھ نہ کہنا وہ ...."

پریم وتی جل گئی، بات کاٹکر بولی "واہ رے تم اور شاردا۔ اس کو تو میں نے صاف صاف لکھدیا ہے کہ تمہارے آنے کی ضرورت نہیں، شرم ہو تو چلو بھر پانی میں ڈوب مریں......."

میرا دماغ پراگندہ تھا، پریم وتی کہتی جارہی تھی لیکن مجھے کچھ سنائی نہ دیتا تھا، ناچار باہر نکل آیا پاس کے ڈر سے میں بالا کے ساتھ ہمدردی بھی ظاہر نہ کرسکا۔ اگر پریم وتی کی مرضی کے خلاف کچھ بولتا تو وہ کچا ہی کھا جاتی۔

سرِ اجلاس ہزاروں پر میرا رعب تھا لیکن بیوی پر رعب جمانا کوئی آسان بات نہ تھی۔

بالا نازوں کی پالی ہوئی تھی، مگر خدا معلوم اسے اس قدر برداشت کی طاقت کہاں سے آگئی، پریم وتی کی زبان تیر کی طرح چلتی تھی مگر بالا نے اپنا جگر پتھر کا بنا لیا تھا، جب کبھی پتھر سے چنگاریاں نکلتیں تو آنسوؤں کی باڑھ اُنھیں فوراً بجھا دیتی۔

(۵)

ہفتہ کا آخری دن تھا، سارا کنبہ شاردا کی راہ دیکھ رہا تھا، کوئی سخت سُست سنانے کے لئے، کوئی معاف کرنے کے لئے، کوئی دل کا بخار نکالنے کے لئے۔ چاروں طرف خاموشی طاری تھی۔

پٹنہ سے آنیوالی آخری گاڑی نکل گئی، سڑکیں آدمیوں سے بھر گئیں، موٹروں کے ہارن نے کان کے پردے اُڑا دیئے مگر میری موٹر دکھلائی نہ دی۔ فکر و تشویش نے دل میں ایک تلاطم سا برپا کر رکھا تھا اور دل خود بخود بیٹھا جاتا تھا۔ سچ ہے ہونے والی بات پہلے ہی کھٹکنے لگتی ہے ...

موٹر دکھلائی دی لیکن خوش ہونے کے بجائے دل بیٹھنے لگا، ایک روز اسی موٹر کو دیکھکر میں پھولا نہ سماتا تھا لیکن آج اُس سے ڈر معلوم ہوتا تھا۔ وہ جم دوت کی طرح تیزی سے بڑھی آرہی تھی، باہر کھڑے رہنے کی ہمت نہ ہوئی تو بچوں کی طرح گھر میں گھس گیا...

بدلو کا بھائی سندھو ہاتھ میں ایک لفافہ لئے کھڑا تھا، پاس ہی تھوڑی دور پر بالا بیٹھی تھی اُسکا بچہ زمین پر لیٹا ہوا تھا آنکھوں سے آنسو ٹپک رہے تھے، پران ناتھ آنیوالے تھے معلوم نہیں کیوں آسکے سندھو نے لفافہ میری طرف بڑھایا، میں نے ڈر کے مارے ہاتھ سمیٹ لیا اور وہ زمین پر گر پڑا دل کڑا کر کے میں نے اُسے اُٹھایا، پھاڑ کر پڑھا اور ایسا پڑھا جو آج تک نہیں بھولا، آہ خط کیا تھا موت کا پروانہ تھا "سمجھ لیجئے میں نہیں ہوں، اگر آپ بھی میرا منھ نہیں دیکھنا چاہتیں تو میں دکھلانا بھی نہیں چاہتا، مگر بالا کا جی نہ دُکھنے پائے، وہ بیکس بے قصور ہے، بس رخصت اور ہمیشہ کیلئے رخصت شاردا" میرے چہرے کا رنگ اُڑ گیا، سر چکرانے لگا، پھر کیا ہوا مجھے معلوم نہیں، ہاں تھوڑی دیر کے بعد

ہوش آنے پر معلوم ہوا۔ بالا میرا پاؤں پکڑے کہہ رہی تھی "ہائے۔ ہم ابلاؤں کا دنیا میں کوئی نہیں۔ ہماری قسمت میں کوفت اور جلن کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ خیر میں بھی وہیں جارہی ہوں جہاں ظالم آسمان کا کوئی قابو نہیں۔ آپ میرے لئے غم نہ کریں۔"

میرے پاؤں چھوڑکر بالا آگے بڑھی۔ بچہ گود سے الگ تھا۔ ماں کو جاتے دیکھکر رونے لگا۔ وہ بجلی کی طرح بچے پر ٹوٹ پڑی، اُسے اُٹھاکر چھاتی سے لگاکر کہنے لگی "بیٹا میں تمھیں کس پر چھوڑ چلوں۔ میں جانتی ہوں لوگ تمھیں جس نام سے پکاریں گے۔ میں تم کو بھی اپنے ساتھ ہی لیچلوں گی۔" پرکرتی بالکل ساکت تھی، ہر طرف خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ میں پتھر کی مورت بنا کھڑا تھا۔ بالا گود میں بچہ لئے آگے بڑھی جارہی تھی۔

وہ باغیچے کے پھاٹک تک پہونچی۔ ہم میں سے کوئی اُسکی دلجوئی کے لئے نہ اُٹھا۔ ہماری بے اتفاقی نے نرگس کا دل پگھلا دیا۔ اُس نے عشق پیچاں کو آنکھ ماری۔ قریب تھا کہ وہ ہاتھ بڑھاکر اُسے پکڑلے مگر ہوا نے اُسکو بھی روک دیا، کہا "جانے دو، اُسے 'شانتی کی گود' میں جانے دو۔" افسوس چمن کے پودے غمخواری کے لئے تیار تھے لیکن ہم انسان خاموش۔

بادلوں کی تاجپوشی کا جشن تھا، اِندر نے پانی برساکر آسمان کے اطلسی فرش کو صاف ستھرا بنادیا تھا مُدبرانِ فلک نے ہوا کو پنکھا جھلنے کا حکم دے رکھا تھا۔ جھلیاں مبارکبادی کی نوبتیں بجارہی تھیں۔ پانچ بجے، ہماری نظروں سے بچکر مشاطۂ قدرت کے ہنرمند ہاتھوں نے شاہزادوں کو ارغوانی پوشاک پہنائی، ساری زمین زعفران کا کھیت بن گئی۔

بالا چلی جارہی تھی، دُور سے مَیں نے دیکھا اُسکی ساری کیسری رنگ کی ہوگئی تھی، مجھے ہوش آگیا۔ آسمان پر نہ تو بادلوں کی تاجپوشی تھی نہ کوئی جشن تھا بلکہ بالا بہتی ہوئی جارہی تھی، کیسری رنگ کی ساری زیب تن کئے، ہاتھ میں شانتی کی تلوار لئے بہادر راجپوت عورتوں کی طرح وہ دربار ابد میں رسوم قبیحہ کے خلاف ودھواؤں کا استغاثہ دائر کرنے جارہی تھی۔ ہم مجبور تھے لیکن قدرت نے جوہر کے سارے سامان اُس کے لئے مہیا کردیے تھے

شاردا کو میں کھوچکا تھا اب بڑھاپے کی آخری امید بالا کی اکلوتی سنتان کو بھی کھونے والا تھا مجھ سے نہ رہا گیا۔ پاگلوں کی طرح چیختا ہوا بالا کے قدم چومنے کے لئے دوڑا لیکن میں گر پڑا اور بیہوش ہوگیا۔

تنقیدِ کتب

حقیقت جاپان[1]

اِس کتاب کے فاضل مصنف کو لکچرار اُردو و فارسی کی حیثیت سے جاپان میں نومبر ۱۹۳۳ء تا نہایت نومبر ۱۹۳۴ء تقریباً سترہ ماہ رہنے کا اتفاق ہوا۔ اس عرصے میں جاپان کی سیر و سیاحت اور جاپانیوں سے میل جول کی بدولت اُن کی روزمرّہ کی زندگی کے جو تاثرات آپ کے دل پر ہوئے اُنھیں آپ نے اِس کتاب میں دلنشین پیرایہ اور صاف ستھری زبان میں تحریر کر دیا ہے۔ یہ کتاب محض سفرنامہ نہیں ہے بلکہ جاپانیوں کی روزمرہ زندگی کے گہرے مطالعہ کا نتیجہ ہے، جس کے لئے فاضل مؤلف کی محنت و کاوش قابل داد ہے۔ اس کتاب کے دو حصّے ہیں پہلے حصہ میں دہلی سے براہ بمبئی ٹوکیو تک کا سفرنامہ اور جاپان کے قابل دید مقامات وغیرہ کی سیر ہے۔ دوسرے حصہ میں جو زیادہ محنت اور کاوش کے ساتھ لکھا گیا ہے، جاپان کے جغرافیائی حالات، موسمی تغیرات، قومی و نسلی خصوصیات، جزائر جاپان کی تاریخ، جاپان کی معاشرت، جاپانی فنون، جاپانی زبان کی خصوصیات، جاپانی ادبیات، مذاہب و عقائد، حکومت و سیاست، ملکی مدافعت و تحفظ، مقبوضات و نوآبادیات، تعلیم، کھیل تماشے صنعت و حرفت و تجارت معہ اعداد و شمار اور آخر میں سیاحوں کے لئے مفید ہدایات درج کئے گئے ہیں۔ گویا یہ کتاب جاپان کی ایک مختصر سی تاریخ ہے جسے لکھکر فاضل مؤلف نے زبان اُردو پر احسان کیا ہے ہمارا خیال ہے کہ جاپان پر ایسی مفصل اور جامع کتاب اُردو زبان میں موجود نہ تھی۔ فاضل مصنف نے جاپانی معاشرت میں جو باتیں اپنے ملک کے لئے مفید سمجھی اُس کی طرف اہل وطن کو توجہ بھی دلائی ہے۔ متعدد تصاویر سے کتاب کی دلچسپی میں خاصہ اضافہ ہو گیا ہے۔ بہرحال کتاب پرائیوٹ اور پبلک کتبخانوں میں رکھے جانیکے قابل ہے

تذکرۂ ریختہ گویاں[2]

سیّد فتح علی خاں حسینی الرضوی شہر گردیز واقع افغانستان کے رہنے والے تھے۔ اگرچہ اُن کے والد محمد شاہ بادشاہ دہلی کے زمانہ میں لشکر شاہی کے بخشی تھے لیکن فتح علی نے علائق دنیا سے بے نیاز ہو کر

---

[1] مؤلفہ شیخ بدرالاسلام صاحب فضلی بی اے بی ٹی (علیگ) سابق لکچرار اُردو و فارسی ٹوکیو اسکول آف فارن لینگویجز۔ ۳۹۲ صفحات طباعت۔ کتابت۔ کاغذ نفیس۔ مجلد۔ قیمت ساڑھے تین روپیہ۔ ملنے کا پتہ: انجمن ترقی اُردو، اورنگ آباد دکن۔

[2] مؤلفہ سید فتح علی حسینی گردیزی۔ مطبوعہ ٹائپ۔ قیمت سوا روپیہ۔ ملنے کا پتہ: انجمن ترقی اُردو، اورنگ آباد دکن۔

گوشۂ قناعت اختیار کیا اور اس قدر زہد و ریاضت میں زندگی بسر کی کہ آپ صوفیا اور مشائخ میں شمار ہونے لگے۔ فارسی کے اچھے شاعر تھے مگر اردو میں غالباً مشقِ سخن نہیں کی، ورنہ اپنے تذکرہ میں اپنا کلام ضرور درج کرتے۔ ۱۲۲۴ھ میں انتقال فرمایا۔

گردیزی نے یہ تذکرہ ۱۱۶۶ھ میں مرتب کیا۔ اُس وقت تک بعض تذکرے اردو شعرا کے لکھے جا چکے تھے جن کے جواب میں سید صاحب نے یہ تذکرہ لکھا۔ تذکرہ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ سید فتح علی میر کے "نہیں بلکہ" سودائی" تھے ورنہ خدائے سخن میر تقی میر کا تذکرہ کُل پانچ سطروں میں لکھکر صرف ایک شعر انتخاب کلام میں نہ دیتے۔ حالانکہ مرزا رفیع السودا کے تذکرہ اور انتخاب کلام میں اُنھوں نے تقریباً ایک جزو وقف کر دیا ہے۔ یہ اٹھانوے شعرائے اُردو کا ایک مختصر تذکرہ ہے جسمیں باوجود ادعائے جدت واجتہاد اپنے پیشرو تذکرہ نویسوں کی تقلید و اتباع سے کام لیا ہے۔ تذکرہ میں اس قدر اختصار و ایجاز سے کام لیا گیا ہے کہ اڑسٹھ شاعروں کو ایک یا دو یا زیادہ سے زیادہ چار سطروں میں اُڑا دیا ہے۔ تذکرہ میں پچیس شاعر ایسے بھی ہیں جن کا حال میر کے تذکرہ میں نہیں ملتا۔ چونکہ گردیزی نے یہ تذکرہ اپنے ہمعصر شاعروں کا لکھا ہے اسلئے خواہ مختصر سہی مگر وہ محقق ضرور ہے، اور اسی میں اس کتاب کی قدر و قیمت ہے۔ مولوی عبدالحق نے اپنے فاضلانہ مقدمہ کے ساتھ یہ کتاب شائع کرکے ادب و تاریخ اُردو پر احسان کیا ہے۔ یہ نسخہ حوالجات کی کتب میں رکھے جانے کے قابل ہے۔

پیامِ سالک[1]

پنڈت دینا ناتھ مجبورؔ دہلوی اُردو کی ادبی دنیا میں کسی تعریف و تعارف کے محتاج نہیں ہیں، کیونکہ آپ اس سے پیشتر شریمد بھگوت گیتا کا منظوم اُردو ترجمہ المعروف "مخزن اسرار" شائع کر چکے ہیں اب آپ نے 'پیامِ سالک' کے نام سے "اِشٹاوکر گیتا" کا منظوم اُردو ترجمہ بھی مع تفسیر شائع کیا ہے۔

جس طرح مہا بھارت کے زمانہ میں شری کرشن جی اور ارجن کے مکالمہ کا نتیجہ بھگوت گیتا کی صورت میں رونما ہوا تھا اُسی طرح مہا بھارت سے بھی قرنوں پہلے سیتا جی کے پدر بزرگوار راجہ جنک اور مہا منی اشٹاوکر کی گفتگو سے "اِشٹاوکر گیتا" وجود میں آیا تھا۔

فاضل مترجم نے پہلے سنسکرت کے اصلی اشلوک پھر ترجمہ، اسکے بعد اُردو میں اشلوکوں کی تفسیر کی ہے۔ گویا یہ ترجمہ و تفسیر ایک دو آتشہ بادۂ معرفت کا خم ہے۔ نمونہ کے طور پر سولھویں اشلوک کا ترجمہ

---

[1] مرتبہ پنڈت دینا ناتھ مدن مجبور بی۔ اے دہلوی۔ قیمت عہ، اکبرو پیہ۔ ملنے کا پتہ: پنڈت دینا ناتھ مدن مجبور بی۔ اے اکاؤنٹنٹ پنشنر۔ لال حویلی محلہ چوڑیگراں۔ دہلی۔

وتفسیر ملاحظہ ہو۔ اصلی سنسکرت اشلوک درج کرکے پنڈت جی ترجمہ لکھتے ہیں:-

"درحقیقت سب کے اندر اور باہر جلوہ گر   ایک نور پاک ہے" تو دُور کرو وہم نظر"

پھر اس کی شرح یوں فرماتے ہیں کہ ایک نورِ ذات بیشمار اور گوناگوں شکلوں میں آشکارا ہے، اس لئے جزو کل کا امتیاز قابل تسلیم نہیں، اصل سے بےخبر رہکر فرع کا متلاشی ہونا انسان کی کم نگاہی کی دلیل ہے وسیع النظری ذریعۂ نجات ہے۔

کتاب کی فہرست ابواب میں ہر اشلوک کا موضوع بھی درج کردیا گیا ہے۔

خیالات مہاتما گاندھی (حصۂ اول و دوم)

ملک کے نامور محب اور خیرخواہ پادری سی۔ الف اینڈریوز کے نام نامی سے کون ہندوستانی واقف نہیں۔ آپ ہندوستان کے مخلص دوست اور مہاتما گاندھی کے مداح اور معتقد ہیں۔ جنوبی افریقہ میں مُدتوں گاندھی جی کے ساتھ رہے اب بھی آپ وقتاً فوقتاً مہاتما جی کو امداد دینا اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ یہ کتاب انگریزی زبان میں انھیں پادری صاحب کی تصنیف تھی جو مدت ہوئی یورپ میں شائع ہو چکی ہے۔ بعدازاں مصر میں اسکا ترجمہ عربی زبان میں ہوا اور اب ہندوستان میں کسی صاحب نے جنکا نام کتاب پر درج نہیں ہے اسے اُردو کا جامہ پہنایا ہے۔ اس میں مہاتما گاندھی کے فلسفہ مقصد حیات اور سیاسی مطمح نظر سے سیر حاصل بحث کی گئی ہے اور گاندھی جی کی تحریروں، تقریروں اور گفتگوؤں کے کافی اقتباسات بھی درج کردیے گئے ہیں۔ پہلا حصہ مذہبی ماحول سے اور دوسرا حصہ تاریخی ماحول سے تعلق رکھتا ہے۔ دونوں میں مذہبی، سیاسی، معاشرتی اور اجتماعی مسائل پر گاندھی جی کے خیالات و معتقدات بیان کئے گئے ہیں۔ کتاب پڑھنے کے قابل ہے، دونوں حصوں کا حجم ۵۱۲ صفحات۔ قیمت سوا روپیہ فی حصہ۔

جرمنی کی قومی بیداری

اس کتاب کو دراصل ایک غیر جرمن مصنف نے جرمنی میں مدتوں رہکر اور جرمن قوم و ملک کے حالات و واقعات کا مطالعہ کرنیکے بعد جنیوا سے فرانسیسی زبان میں شائع کیا تھا۔ بعد میں اسکا انگریزی زبان میں ترجمہ کیا گیا اور اب انگریزی سے ترجمہ در ترجمہ ہوکر منشی امیر حسن صاحب کے طفیل اُردو میں طبع ہوئی ہے۔ اس میں ہٹلر کی سوانحعمری، نیشنل سوشلسٹ تحریک کی ابتدا و فروغ

لہ ملنے کا پتہ، رفعت یار خاں کلیم بلڈنگ، تیسری منزل، مومن پورہ بمبئی نمبر ۱۱

کہ ملنے کا پتہ، امیر حسن، مدن والا بلڈنگ دوسرا مالہ کمرہ ۴۳ پرسل روڈ بمبئی ۸ - قیمت بارہ آنہ

اس کے داخلی وخارجی اسباب، یہودیوں کا اخراج جرمنی کی خارجہ پالیسی وغیرہ پر سیر حاصل اور سبق آموز بحث کی گئی ہے۔ اور چونکہ تبصرہ نگار ایک بے تعصب شخص ہے اس لئے اس کے تاثرات وخیالات قابل اعتماد ہیں۔ جو حضرات جدید جرمنی کی حالت اور اس کی داخلی وخارجی پالیسی سے آگاہی حاصل کرنا چاہتے ہیں اُن کے لئے اس رسالہ کا مطالعہ مفید اور دلچسپ ہوگا۔ اس میں ہٹلر، ہنڈنبرگ، نازی مظاہرہ، قدیم وجدید جرمن قومی پرچم کی فوٹو کی تصویریں بھی دیدی گئی ہیں۔

ساحلِ بحر کے سنگریزے[1]

Pebbles on the Sea-Shore.

یہ تینتالیس ۴۳ صفحہ کا چھوٹا سا رسالہ چودھری عبدالغنی صاحب بی، اے۔ سندیلوی کے چند انگریزی مضامین اور ایک درجن دلچسپ انگریزی نظموں کا دلآویز مجموعہ ہے۔ حصہ نثر دو ۲ حصوں میں منقسم ہے۔ پہلے حصہ کا تعلق ہندوستان کی تحریک نسواں سے اور دوسرے حصہ کا دیہاتی زندگی سے ہے، زبان سلیس اور شستہ ہے، کہیں کہیں ماہرین فن کے اقوال بھی نقل کئے گئے ہیں، تیسرے حصہ میں چند شگفتہ نظمیں ہیں، نظم موسومہ "قدرت کے کھیل" یا God in Playful Mood میں فلسفۂ خیام سے بہت کچھ استفادہ کیا گیا ہے، اور دو ۲ بند کی مختصر نظم "حیاتِ مختصر" تو اس قابل ہے کہ اسے ہر نوجوان حفظ کرکے اپنا دستور العمل بنالے۔ یہ رسالہ قاضی عزیزالدین احمد صاحب بالقابہ دیوان ریاست دتیا کے اسم گرامی سے معنون ہے۔ قیمت ایکروپیہ زیادہ معلوم ہوتی ہے۔

تہذیب عمل[2]

فاضل مؤلف نے اس چھوٹے سے رسالہ میں اکثر ۱۰۰ مختلف موضوعات پر مختصر مضامین لکھے ہیں، ایجاز سے اس قدر کام لیا گیا ہے کہ ہر صفحہ پر ایک مضمون آگیا ہے۔ اور پھر بھی متعلق مضمون تقریبًا تمام ضروری باتیں آگئی ہیں۔ مضامین کا انتخاب بھی قابل قدر ہے، کیونکہ ان کا تعلق انسان کی عملی زندگی سے ہے۔ نفسیات انسانی پر زیادہ زور دیا گیا ہے۔ ہمارے خیال میں یہ کتاب مدارس کے طلبار کے لئے مفید ہوگی اسکا حجم ۱۰۰ صفحات ہیں کاغذ عمدہ مگر چھپائی خراب ہے

جمال الدین افغانی[3]

سید جمال الدین افغانی سے اسلامی دنیا کا بچہ بچہ واقف ہے، آپ عالم باعمل بزرگ اور بڑے

---

[1] ملنے کا پتہ۔ چودھری عبدالغنی صاحب بی۔ اے۔ سندیلہ ضلع ہردوئی۔

[2] مؤلفہ ملک محمد باقر تسیم رضوانی۔ قیمت ۱۰ آنہ۔ ملنے کا پتہ: دفتر تذکرہ گجرات پرنٹنگ پریس گجرات۔ پنجاب

[3] قیمت آٹھ آنہ ملنے کا پتہ: مکتبہ جامعہ ملیہ قرول باغ دہلی۔

انشا پرداز و مقرر تھے۔ یہ مختصر رسالہ انھیں کی سوانحعمری ہے جسے ایک فاضلانہ مقالہ کی صورت میں ۲۱- فروری ۱۹۳۲ء کو قاضی عبدالغفار صاحب نے جامعہ ملیہ دہلی کی اُردو اکیڈیمی کے دوسرے جلسہ میں پڑھا تھا، اور جو بالاقساط رسالہ ’جامعہ‘ میں شائع ہو چکا ہے۔ اب کارپردازانِ مکتبۂ ملیہ نے اسی مقالہ کو رسالہ کی صورت میں شائع کردیا ہے۔

افلاسِ ہند

پروفیسر جی۔ فنڈلے شیراز ایم۔ اے۔ ایف۔ ایس۔ ایس۔ پرنسپل گجرات کالج نے انگریزی زبان میں ہندوستان کے حالات، اسکی مفلسی و ناداری اور اس کے مختلف وجوہ و اسباب پر ایک کتاب لکھی تھی جسے مسٹر راغب حسن صاحب نے اُردو میں ترجمہ کرکے پیش کیا ہے۔ اس رسالہ میں ہندوستان کے افلاس، قحط، صنعت و حرفت، محصولات اور بین الاقوامی تجارت پر بحث کیگئی ہے۔ مضمون اگرچہ خشک اور غیر دلچسپ ہے لیکن مفید اور سبق آموز ضرور ہے۔ جن حضرات کو معاشیات سے دلچسپی ہے وہ اس رسالہ کا ضرور مطالعہ کریں۔ ڈاکٹر ایس۔ این۔ اے جعفری ایل۔ ایل۔ ڈی، بار ایٹ لا، ڈپٹی ڈائرکٹر شعبۂ معلومات عامہ حکومت ہند کی طرف سے شائع کیا گیا ہے

ڈاکٹر فلپ نے جو سامیتی زبانوں کے عموماً لیکن علوم و ادبیاتِ عربیہ کے خصوصاً ماہر اور پروفیسر ہیں پرنسٹن یونیورسٹی کے کتبخانہ سے عربی کے ایسے قدیم اور نایاب پانچ ہزار نسخے تلاش کئے ہیں جن کی نظیر دنیا کے کسی کتبخانہ میں نہیں ملسکتی۔ ان کتابوں میں وہ کتب بھی ہیں جو دوسری صدی ہجری میں یونانی زبان سے عربی میں ترجمہ کی گئی تھیں۔ ایک کتاب علم نجوم پر ہے جو سلطان صلاح الدین فاتح بیت المقدس کے کتبخانہ کے واسطے لکھی گئی تھی۔ کتاب کی لوح پر طلائی حروف میں سلطان صلاح الدین کا نام درج ہے اور قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ سلطان مذکور نے اس کتاب کا بہ نفسِ نفیس مطالعہ فرمایا تھا۔ ان کتابوں میں عرب قدیم کے فنِ موسیقی کے متعلق بھی ایک نسخہ ہے جس کے مطالعہ سے عرب جاہلیت کے اصلی گانوں اور موسیقی کا صحیح حال معلوم ہوجاتا ہے۔ علاوہ بریں ایک عجیب و غریب عربی فرسنامہ بھی ہے جو ملک الناصر سلطان مصر کے لئے لکھا گیا تھا، اسمیں گھوڑوں کی قسمیں اُنکی شناخت خوبیاں، عیوب، شہسواری کے قاعدے، گھوڑدوڑ کے ضابطے، گھوڑوں کے امراض اور انکے علاج لکھے ہیں۔ لیکن اس مجموعہ میں سب سے زیادہ نادر و نایاب نسخہ قرآن کا ہے جو پہلی صدی ہجری میں لکھا گیا تھا۔ اس قرآن کے اوراق چمڑے کے ہیں اور رسم الخط کوفی ہے جو بآسانی پڑھا جاسکتا ہے۔ اس قرآن کے دیکھنے سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جوں جوں قرآن کی آیتیں نازل ہوتی گئیں وہ ٹکڑوں پر لکھی جاتی رہیں۔

تنقید تیھارتھ پرکاش

ہمارے دوست پروفیسر سنت پرشاد مدہوش ایم اے نے تیھارتھ پرکاش کی تنقید پر جو کہ مکری سحر صاحب نے زمانہ میں لکھی تھی ایک مفصل مراسلہ ہمارے پاس بھیجا ہے جو ہم درج ذیل کرتے ہیں تاکہ تصویر کا دوسرا رخ بھی ناظرین کے پیش نظر ہو جائے (ا-ز)

محترم ایڈیٹر صاحب "زمانہ"

کسی تصنیف پر تنقید کرنے سے پہلے نقاد کو مصنف کے مفہوم اور نظریوں کو سمجھ لینا چاہیئے، افسوس کہ آپ کے قابل قدر پرچے کے اگست نمبر میں صاحب جی مہاراج دیال باغ آگرہ کی تصنیف تیھارتھ پرکاش پر جناب اقبال ورما سحر کی جو تنقید شائع ہوئی ہے اُس میں جناب سحر اس فرض کے سرانجام دینے سے قاصر رہے ہیں۔ مجھے افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ جہاں قابل نقاد نے دلیل سے بھی کام لیا ہے وہاں منطق کا خون کر دیا ہے اور جہاں رائے زنی کی ہے وہاں عجیب الطرپن سے جو چاہا کہہ دیا۔ مجھے آپکی شان انصاف پسندی سے امید ہے کہ آپ مجھے بیانات مذکورہ بالا کی توضیح کی اجازت دینگے، تاکہ تصنیف زیر تنقید کے متعلق غلط فہمیوں اور غلط بیانیوں کی تصحیح ہو جائے۔ قابل نقاد تحریر فرماتے ہیں کہ:-

"غرض اس مت میں شبد کا بہت بکھان ہے، اور کان آنکھ بند کرکے اسی کو سنتے ہوئے ابھیاس کرنے کی ہدایت کی گئی ہے، اگرچہ بقول مصنف وہ اصلی یعنی روحانی آوازیں نہیں ہیں"

مصنف نے تو یہ بیان فرمایا ہے کہ وہ آوازیں جو آنکھ کان بند کرکے سنائی دیں اصلی یعنی روحانی آوازیں نہیں ہیں اور انکا سننا سُرت شبد ابھیاس نہیں ہے مگر افسوس قابلِ نقاد یہ سمجھے کہ انھیں آوازوں کے سننے کی ہدایت کیگئی ہے۔

ایک اور مقام پر قابل نقاد رقم طراز ہیں:-

"معلوم ہوتا ہے کہ وہی لہر آتم دھارا ہے جسکا نام رادھا ہے اور جو سوامی مرکز سے نکلتی ہے۔ سوامی کا ارتھ مالک سمجھا جائے تو یہ لفظ ناموزوں نہیں معلوم ہوتا مگر یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ دھارا کو رادھا کیوں کہا گیا جبکہ اس طرح اصلی لفظ کا مفہوم ہی جاتا رہتا ہے فاضل مصنف نے جو تشریح صفحہ ۲۹ پر کی ہے وہ تسلی بخش نہیں، ہمارا تو یہی خیال ہے کہ یہ نام پہلے گورو صاحب کی اہلیہ محترمہ سے منسوب ہے جنکا نام رادھا جی تھا۔ جیسا کہ مصنف نے بھی صفحہ ۳۱ پر تسلیم کیا ہے"

"رادھا سوامی" نام کی بابت مصنف نے تو یہ بیان کیا کہ یہ نام لغوی معنی کے اعتبار سے مرکب نہیں ہے بلکہ یہ نام انسانی بولی میں نقل اس روحانی آواز کی ہے جو آفرینش کے عمل ہونے پر کل مالک مخزن روحانیت اور اُسکی

روحانی دھار سے پیدا ہوئی" مخزن کی ہلور سے "سوامی" شبد اور آدچیتن دھار سے "رادھا" شبد ظاہر ہوا" اب حضرتِ نقاد زبردستی یہ مطلب سمجھ لیتے ہیں کہ "اگر سوامی کا ارتھ مالک سمجھا جائے . . . . . لفظ کا مفہوم ہی جاتا رہا" جبکہ اس مذہب کے موجد اور اس نام کے اول اول ظاہر کرنیوالے یعنی سوامی جی مہاراج نے خود اس نام کی وجہ تسمیہ وہی بتائی جو ہم اوپر بیان کر چکے ہیں اور مصنف نے اس بارے میں اقتباس بھی ان کی تصنیف سے پیش کر دیا۔ تب اس حالت میں حضرت نقاد کا یہ فرمانا کہ یہ نام سوامی جی مہاراج کی اہلیہ محترمہ کا ہے کہاں تک جائز ہے وہ زیادہ سے زیادہ یہ کہہ سکتے تھے کہ ہم اس بیان کے قائل نہیں کہ یہ نام انسانی بولی میں نقل روحانی آواز کی ہے جو کہ آفرینش کے عمل ہونے پر ظاہر ہوئی۔

مصنف کے اس بیان کی تردید میں کہ نرمل چیتن دیش (یعنی خالص روحانی عالم) میں پرلے اور مہاپرلے کا گذر نہیں اس لئے اسکے سب لوک لافانی یعنی ابناشی ہیں فاضل نقاد نے یہ منطق پیش کی ہے کہ:-

"اس کے متعلق اسی قدر کہنا کافی ہونا چاہیئے کہ آغاز و انجام لازم و ملزوم ہیں اور ہر بناؤ میں بگاڑ بھی ہے"

نقاد کا یہ دعویٰ مادی اور تین ناپوں کی اشیاء کے مشاہدہ پر مبنی ہے، پس دلیل یہ ہوئی:-

مادی اور تین ناپوں کی اشیاء میں آغاز و انجام لازم و ملزوم ہیں اور ہر بناؤ کا بگاڑ ضروری ٹھہرا ہے

نرمل چیتن دیش خالص روحانی عالم ہے اور تین ناپوں سے بیرون اور مادیت سے پاک ہے۔

لہٰذا نرمل چیتن دیش بھی فانی ٹھہرا اور اس کے لئے بھی آغاز و انجام لازم ملزوم ٹھہرے۔

اصولِ منطق جاننے والے سوائے اسکے اور کیا کہہ سکتے ہیں کہ سوال از آسمان جواب از ریسماں۔

قابل نقاد نے رادھاسوامی مذہب کا عقیدہ بھی مختصراً بیان کرنے کی کوشش کی ہے، آپنے تحریر فرمایا ہے:

"اس مت کا عقیدہ ہے کہ رادھاسوامی مالک کل کا نام ہے، اور اس کا مقام ست لوک ہے جس میں نرمل چیتن دیش یا دیال دیش بھی شامل ہیں"

بہت خوب! اس مت کا عقیدہ ہے کہ رادھاسوامی (کل مالک) کا مقام رادھاسوامی دھام دیال دیش یعنی نرمل چیتن دیش کا پہلا مقام ہے اور ست لوک دیال دیش یعنی نرمل چیتن دیش کا چوتھا مقام ہے۔ محرر صاحب کو معلوم ہونا چاہیئے کہ ست لوک نرمل چیتن دیش میں واقع ہے نہ کہ نرمل چیتن دیش ست لوک میں

بات یہ ہے کہ ست لوک اور نرمل چیتن دیش کی فوقیت کے متعلق جو دلیل دی گئی ہے وہ حضرتِ نقاد کی سمجھ میں نہیں آئی۔ دوسرے یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ یہ عقیدے کا معاملہ ہے جو چاہے ان بیانات کو عقیدتمندانہ نظر سے پڑھے یا غیر عقیدتمندانہ نگاہ سے دیکھے۔ قابل نقاد تحریر فرماتے ہیں:-

"سب دیوتاؤں اور اوتاروں رشیوں منیوں اور شاستر وغیرہ کی ہستی ادنیٰ قرار دینے کے بعد ان کے

بتلائے ہوئے سمت: نجات (مکتی) کے وسائل کس طرح قابل تقلید قرار دیے جاسکتے ہیں۔"

معلوم نہیں اُن سے یہ کس نے کہہ دیا کہ رادھا سوامی مذہب میں مذکورہ بالا وسائل کی بحیثیت نصب العین تقلید کی جاتی ہے۔ بلکہ یہ کہا گیا ہے کہ وہ وسائل ایک حد تک مفید اور معراج روح کا ذریعہ ہو سکتے ہیں مگر جو نصب العین پیروان رادھا سوامی مذہب کا ہے اس کے حصول میں وہ معین و معاون ہے۔

قابل نقاد تحریر فرماتے ہیں:

"مالک کو چیتنا روحانیت کا مخزن تصور کر کے اس سے مادہ کا ظہور پذیر ہونا سمجھ میں نہیں آتا۔ نیز یہ تحریر فرماتے ہیں کہ مادہ کا چیتن ذی حس ہونا اور بھی سمجھ میں نہیں آتا۔"

مادہ کو جڑ چیتن سنت مت میں اس معنی میں نہیں کہا گیا کہ اس میں چیتنا قطعی نہیں ہے بلکہ وہ روح کے مقابلہ میں جڑ چیتن کہا گیا ہے۔ مادہ میں ادنیٰ درجہ کی چیتنا (Latent form) میں موجود ہے۔ اب اس سے حضرتِ نقاد یہ نتیجہ کیسے نکال سکتے ہیں کہ مادہ کو ذی حس کہا گیا ہے۔ اُن کی دوسری دقت کے متعلق عرض ہے کہ سنت مت کے عقیدہ کے بموجب رچنا کے اندر جو کچھ موجود ہے وہ چیتنا کے درجوں کی کمی و بیشی کا اظہار ہے۔ مختلف درجوں کی روحانیت آفرینش سے پہلے مرتب نہ تھی وہ رچنا کے ظہور پذیر ہونے پر مرتب ہوگئی اور کمترین درجہ کی چیتنا مادہ کی شکل میں متشکل ہوگئی۔ مالک کو چیتنا روحانیت کا مخزن تصور کر کے مادہ کا ظہور پذیر ہونا قابل نقاد کی سمجھ میں نہیں آیا۔ غالباً اب اس توضیح کے بعد چیتنا کے درجوں میں کمی و بیشی کا ہونا ممکن تصور کر کے ان کی دقت حل ہو جائے۔

قابل نقاد رقمطراز ہیں:

"گورو کے تعلق سے صفحہ ۱۵۵ و صفحہ ۱۵۶ پر یوگ درشن کا ایک سوتر درج ہے جس کا ترجمہ یہی ہے کہ جو منشیہ اپنے میں ستیہ کو پرتشٹھت (قائم) کر لیتا ہے اسکی وانی (بات) میں یہ سامرتھ آ جاتا ہے کہ وہ جو کچھ کہتا ہے پورا ہو جاتا ہے اسے قابل مصنف نے سادھو بچن پلٹے نہیں پلٹ جائے برہمنڈ کی تائید میں پیش کیا ہے۔ مگر فی زمانہ ایسے مہاتما ناپید معلوم ہوتے ہیں۔"

حضرت نقاد کا یہ فرمانا کہ فی زمانہ ایسے مہاتما ناپید معلوم ہوتے ہیں، یہ ظاہر کرتا ہے کہ انہیں یہ معلوم کرنے کی اہلیت ہے یعنی وہ خود غیب داں تو درشی پرش ہیں، ورنہ ایک نابینا کو یہ کہنے کا کیا حق ہے کہ آسمان پر اسوقت بادل چھائے ہوئے ہیں یا مطلع صاف ہے، زیادہ سے زیادہ وہ یہی کہہ سکتا ہے کہ مجھے علم نہیں کہ مطلع صاف ہے یا ابر آلود۔ غرض وہ صرف اپنی لاعلمی کا اعلان کر سکتا ہے مگر کوئی مثبت یا منفی بیان کسی ایسے منظر کے متعلق جسکا تعلق مشاہدہ عینی سے ہے نہیں دے سکتا۔

(پروفیسر سنت پرشاد مرہوش (ایم۔ اے)

عالمِ نسواں

روس کی عورتوں نے اپنے ملک کی سیاسی مصروفیات کے علاوہ صنعت و حرفت اور زراعت وغیرہ میں بھی پورا پورا حصہ لینا شروع کر دیا ہے۔ زار کی حکومت میں عورتوں کو شہری حقوق در کنار جائداد کے متعلق بھی حقوق حاصل نہ تھے۔ لیکن اس وقت ڈیڑھ لاکھ عورتیں روس کے سرکاری دفاتر میں ذمہ داری کے ساتھ اپنے فرائض انجام دے رہی ہیں۔ کمیونسٹ پارٹی میں تین کروڑ ممبر درج رجسٹر ہیں جس میں عورتوں کی تعداد پچاسی لاکھ ہے۔ ۱۹۳۲ء میں سترہ لاکھ بیس ہزار سات سو عورتیں کارخانوں اور دوکانوں میں کام کرتی تھیں۔ مشین سازی، پارچہ بافی، دوا سازی، انجنیری، ڈاکٹری، ڈرائیوری وغیرہ میں مردوں کی بہ نسبت عورتیں زیادہ ترقی کر رہی ہیں۔ چنانچہ اس وقت پچیس ہزار سے زیادہ عورتیں موٹر ڈرائیور ہیں۔ ٹکنیکل اسکولوں میں بہتر ہزار آٹھ سو سے زیادہ عورتیں تعلیم پا رہی ہیں۔ روس کی عورتوں میں تحصیل علم کا اس قدر شوق ہے کہ ۱۹۳۲ء میں اسی لاکھ ناخواندہ عورتوں نے لکھنا پڑھنا سیکھا۔ بہر حال گو روس کی عورتیں تعلیمی ڈگریوں کی چنداں پروا نہیں کرتیں لیکن تمام ہنر اور فن سیکھنے کی از حد شایق ہیں۔

جاپان کی عورتیں روسیوں سے بھی سبقت لے گئی ہیں اور وہ تعلیم، صنعت و حرفت اور تجارت میں حصہ لینے کے علاوہ ملکی سیاسیات اور معاشرتی اصلاحات میں بھی سرگرم حصہ لے رہی ہیں۔ چنانچہ کچھ عرصہ ہوا ٹوکیو میں آل جاپان وومن سفریج تحریک کا ایک زبردست جلسہ ہوا تھا جس میں ملک کی سولہ زنانہ انجمنوں نے متفقہ طور پر ان امور پر غور کیا کہ بحالات موجودہ عورتوں کے حقِ ووٹ کو کس طرح ترقی دی جائے۔ اور حکومت میں عورتوں کی آواز کس طرح مؤثر بنائی جائے۔

آل جاپان وومنز ایسوسی ایشن وہاں کی پارلیمنٹ سے بیویوں کی ناقابلیت کے متعلق قانونی دفعات منسوخ کرانے کی جد و جہد کر رہی ہے، وہ فسخ نکاح اور اولاد کے بارے میں بھی عورت و مرد دونوں کو ایک ہی طرح کے اختیارات حاصل ہونے کی طرف ہے اور بیویوں کو خاوند کی جائداد کا وارث بنائے جانے کی کوشش کر رہی ہے۔ جاپان میں ۱۹۳۶ء سے خاتون وکیلوں کو وکالت کرنے کی اجازت دیدی گئی ہے۔

جرمنی کے موجودہ پریسیڈنٹ اور چانسلر ہر اڈولف ہٹلر نے حکم دیا ہے کہ ہر سال کم از کم تین لاکھ لڑکیوں کی شادی کرائی جائے اس کیلئے گورنمنٹ کیطرف سے پندرہ کروڑ مارک کا قرضہ دینا بھی منظور کیا گیا ہے۔

آجکل آریا کنیا مہا ودیالیہ بڑودہ کی بیس لڑکیاں بحیثیت گرل گائڈس جنوبی افریقہ کی سیر و سیاحت کر رہی ہیں، یہ لڑکیاں ایک خاص وردی پہنے ہوئے خنجروں سے مسلح ہیں، ان میں سے چار لڑکیوں نے پچھلے ماہ جوہانسبرگ میں مسٹر ڈی پنیری رابرٹس میئر بلدیہ کی صدارت میں انگریزی اور گجراتی زبانوں میں فصیح و بلیغ تقریریں کرکے مس میو کی کتاب "مدر انڈیا" کا مضحکہ اڑایا۔ ان گرل گائڈس کا جنوبی افریقہ کے اکثر مقامات میں پرتپاک خیر مقدم کیا گیا ہے۔

ٹوکیو (دارالحکومت جاپان) میں لڑکیوں کو امور خانہ داری کی تعلیم دینے کے لئے ایک خاص اسکول جاری کیا گیا ہے، جسمیں زیادہ تر وہ لڑکیاں داخل کیجاتی ہیں جن کی شادی ڈیڑھ یا دو برس بعد ہونے والی ہوتی ہے۔ اس مدت میں ان لڑکیوں کو اس قابل بنا دیا جاتا ہے کہ وہ ازدواجی زندگی میں قدم رکھتے ہی اپنے فرائض خوش اسلوبی کے ساتھ ادا کر سکیں۔ اس اسکول میں کھانا پکانا، سینا پرونا، گھر کی آرائش و زیبائش، مہمانداری کا سلیقہ اور احباب سے ملنے جلنے کا طریقہ وغیرہ سکھایا جاتا ہے۔

پچھلے دنوں آل انڈیا ویمنس کانفرنس کا ایک جلسہ مسز حامد علی صاحبہ کی صدارت میں منعقد ہوا جسمیں راجکماری امرت کنور کی تحریک پر یہ ریزولیوشن پاس کیا گیا کہ لوکل بورڈوں صوبجاتی کونسلوں اور اسمبلی کے انتخابات میں عورتوں پر جو قیود عائد ہیں وہ سب دور کر دی جائیں۔

ہندوستانی مستورات کی ترقی کی خاص خبریں یہ ہیں:۔

امینہ خاتون جو جبلپور میونسپلٹی کے چیرمین کی اہلیہ ہیں وہیں کی میونسپل کمشنر منتخب ہوئیں۔ ظہور النسا بیگم ایم اے، ہیڈ مسٹرس زنانہ اسکول گوشا محل حیدرآباد زنانہ ہائی اسکول ورنگل کی لیڈی پرنسپل مقرر ہوئی ہیں۔ مسز درروید، بائی گپتا پرنسپل میونسپل اینگلو ورنیکولر گرلس اسکول لکھنؤ انگلستان اور اٹلی میں تعلیم کے طریقوں کا مطالعہ کرنے کے بعد واپس آگئی ہیں۔ مس شبھ وتی شرمابی۔ اے، بی ٹی بنت ڈاکٹر آسارام شرما آریہ گرلس اسکول شملہ کی ہیڈ مسٹرس مقرر ہوئی ہیں۔ مس جیٹھی کرپلانی پہلی خاتون ہیں جو انتخاب میں سب سے زیادہ ووٹ حاصل کرکے کراچی کارپوریشن کی ممبر منتخب ہوئی ہیں۔ شریمتی کیلا بھا گوپائی ڈیسائی پہلی خاتون ہیں جو ڈسٹرکٹ بورڈ بھڑوچ کی ممبر منتخب ہوئی ہیں، آپ ڈسٹرکٹ اسکول بورڈ کی وائس چیرمین بھی ہیں۔

دیوالی کی رات

(از پرنسپل رام پرشاد کھوسلہ ایم۔ اے)

اماوس کی اندھیری رات میں کیا ہی اُجالا ہے | جدھر دیکھو نظر آتی اُدھر ہی دیپ مالا ہے
بھرا مصنوعی تاروں سے شبِ یلدا کا داماں ہے | اندھیری رات گویا بن گئی بزمِ چراغاں ہے
دیا جو ہے وہ گویا دیدۂ گردوں کا تارا ہے | دوالی نے زمیں پر اِن ستاروں کو اُتارا ہے
کبھی ہستی کی چوسر ہے لگا تو جو لگاتا ہے | کوئی دم میں نہ چوسر ہے نہ نردوں کا ٹھکانا ہے
جو سچ پوچھو امیروں کے لیئے آئی دوالی ہے | غریبوں کیلئے جیسی تھی ویسی رات کالی ہے
اُنھیں کیا اس سے گر ہے روشنی سارے زمانے میں | گذرتی عمر ہے جن کی سدا تاریک خانے میں
ہے جن کی جیت دنیا میں اُنھیں کے گھی کے جلتے ہیں | جو بازی ہار بیٹھے ہیں کفِ افسوس ملتے ہیں
ہو جن فاقہ زدوں کو رات دن تشویش کھانے کی | انھیں توفیق ہو کیسے دیا بتی جلانے کی
شبِ تیرہ کے پردے میں وہ عمریں کاٹ دیتے ہیں | جو غم قسام دیتا ہے اسی کو بانٹ لیتے ہیں
یہ منظر دُور کر سکتا ہے آشفتہ سری ان کی | حجابِ چشمِ اشک افشاں ہے تیرہ اختری ان کی
کوئی سر لکشمی کے سامنے اپنا جھکاتا ہے | تو دھن دیوی کی کوئی آرتی کرتا ہے، گاتا ہے
ہے روشن ہر گلی کوچہ ہوا ہے ہر مکاں روشن | کئے ہیں دیپ مالا نے زمین و آسماں روشن
ہوا گھر گھر چراغاں، کوبکو ہے روشنی تیری | نظر افروز عالم چار سو ہے روشنی تیری

دوالی ہے ذرا دیکھو تو ان جلتے چراغوں کو
پھر اے ناشاد گن لینا تم اپنے دل کے داغوں کو

کلامِ جوش

میں دل بیچتا ہوں جگر بیچتا ہوں

(از حضرت جوشؔ ملیح آبادی)

لٹیرو! میں داغِ جگر بیچتا ہوں
بہ نرخِ خزف تاج زر بیچتا ہوں

جہاں سنگریزوں پہ گرتے ہیں گاہک
وہاں جنسِ لعل و گہر بیچتا ہوں

جہاں قند داں جمع ہیں تلخیوں کے
وہاں قند و شہد و شکر بیچتا ہوں

جہاں خار و خس کی خریداریاں ہیں
وہاں موجِ گلہائے تر بیچتا ہوں

پرستاریاں ہیں جہاں ظلمتوں کی
وہاں نورِ شمس و قمر بیچتا ہوں

جہاں دردِ دل کا مخالف ہے عالم
وہاں دردِ دل کا اثر بیچتا ہوں

جہاں جستجوئے سکونِ حضر ہے
وہاں آرزوئے سفر بیچتا ہوں

جہاں سات پردوں میں رہتی ہے جرأت
وہاں جذبۂ پردہ در بیچتا ہوں

جہاں ہر کبوتر ہے قانع قفس میں
وہاں دولتِ بال و پر بیچتا ہوں

جہاں دست و پا شل ہیں پسپائیوں میں
وہاں تیغِ فتح و ظفر بیچتا ہوں

جہاں ترکِ یک مو بھی ممکن نہیں ہے
وہاں خواہشِ ترکِ سر بیچتا ہوں

جہاں اُنس ہے تنگ دامانیوں سے
وہاں وسعتِ بحر و بر بیچتا ہوں

چھپا کر ردیف و قوافی کے اندر
میں دل بیچتا ہوں جگر بیچتا ہوں

گدا ہوں، مگر وہ گدائے غنی دل
کہ تاج و کلاہ و کمر بیچتا ہوں

صدا دو کہ بازارِ نوعِ بشر میں
متاعِ روحِ بشر بیچتا ہوں

نہ ہوگا کوئی مجھ سا بھی تیرہ قسمت
کہ بازارِ شب میں سحر بیچتا ہوں

کوئی مشتری ہو تو آواز دیدے
میں کمبخت جنسِ ہنر بیچتا ہوں

سخن کے ہیں یوں تو بہت جوشؔ تاجر
مگر میں برنگِ دگر بیچتا ہوں

غزل

از حضرت جوشؔ ملیح آبادی

وہ سیہ بخت کن الفاظ میں فریاد کرے ۔۔۔ جس کو تو رحمت و لطف سے برباد کرے
کب سے کونین کو ٹھکرائے ہوئے بیٹھا ہوں ۔۔۔ شاید انصاف ترا حسنِ خدا داد کرے
اے صبا خدمتِ سلطاں میں ادب سے کہنا ۔۔۔ کہ گدایانِ سرِ راہ کو بھی یاد کرے
اب یہ عالم ہے کہ ہر ذرہ ہے سرگرمِ سخن ۔۔۔ کاش تو بھی لبِ رنگیں سے کبھی ارشاد کرے
کس کو بھیجوں کہ کہے یارِ برافروختہ سے ۔۔۔ کہ مجھے اپنی غلامی سے نہ آزاد کرے
مدحتِ حضرتِ ساقی پہ ہوا ہوں مامور ۔۔۔ کہ دو تسبیح مری عالمِ ایجاد کرے
جس کو تم بھول گئے یاد کرے کون اس کو ۔۔۔ جس کو تم یاد ہو وہ اور کسے یاد کرے
خلوتِ ناز کی لایا ہے خبر اے ہمراز ۔۔۔ عالم الغیب تری غیب سے امداد کرے
لبِ رنگین کہ ہے سرچشمۂ صد شادی و نوش ۔۔۔ کیا عجب ہے کہ دلِ جوشؔ کو بھی شاد کرے

رُباعیاتِ محرومؔ

(۱)

ہے تیرے کرم پہ انحصارِ ہستی ۔۔۔ رحمت تری باعثِ بہارِ ہستی
حکمت تیری ہے اے حکیمِ مطلق! ۔۔۔ ذروں سے بنا دیا حصارِ ہستی

(۲)

ادبار کا گھر کہ جائے اقبال ہی دہر ۔۔۔ جیسا نظر آتا ہے بہرحال ہے دہر
کیوں زشتیِ دہر پر ہے برہم اتنا ۔۔۔ ناداں! ترا آئینۂ اعمال ہے دہر

(۳)

تجھ کو لئے رزق اگر پریشانی ہے ۔۔۔ اے دل! تیری یہ محض نادانی ہے
وہ دیکھ فلک پہ بادلوں کے انبار ۔۔۔ سامانِ حیاتِ عالمِ فانی ہے

ترانۂ شباب

(از جناب گرسرن لال ادیب لکھنوی)

حیات مستعار پر گماں نہیں ہے خواب کا
وجودِ کائنات پر نہیں ہے شک سراب کا
اثر ہے میری روح میں فروغ آفتاب کا

یہ سچ ہے جائے عیش یہ جہانِ آب و گل نہیں
مگر جو اہلِ ہوش ہیں کبھی شکستہ دل نہیں
ورق اُلٹتے رہتے ہیں حیات کی کتاب کا

کسی کی مدح کا نہیں ہے میرے دل میں کچھ خیال
اگر ہو کوئی نکتہ چیں تو اسکا بھی نہیں ملال
خیال دل میں ہے تو بس ضمیر کے عتاب کا

مآل سے غرض نہیں نظر ہے میری فرض پر
حدودِ آس و یاس ہوں دور سے بھی دور تر
نہ آرزو ثواب کی نہ خوف ہے عذاب کا

ہو انقلابِ دہر سے مجھے ہراس کس لئے
تغیرات سے ہو دل اسیرِ یاس کس لئے
میں خود بھی ایک ذرہ ہوں جہانِ انقلاب کا

شراب تلخ ہی سہی مگر ہے اس سے کیا ضرر
خوشی ہو یا غم و الم رہوں میں مست سر بسر
شراب کی ہوس نہ ہو اثر رہے شراب کا

نہ ذکر سیلِ اشک ہے نہ قصہ ہائے درد و غم
نہ شکوہ ہائے چرخ ہیں نہ داستانِ پُر الم
ادیب تیری نظم کیا ترانہ ہے شباب کا

درسِ نیاز

(از منشی گنگا دھر ناتھ صاحب فرحت کانپوری بی۔اے۔ایل ایل۔بی)

دل تڑپتا ہے مرے دوست تری فرقت میں
اور اضافہ ہے شب و روز مری وحشت میں

لوٹ لے لوٹ لے ہنے دولتِ عشرت حاضر
پھونکدے پھونکدے سامانِ سکونِ خاطر

چھین لے مجھ سے مرے خواب کی سب شیرینی
لوٹ لے میری تمناؤں کی سب رنگینی

لوٹ لوٹ لے آنکھوں کی یہ چھائی ہوئی نیند
چھین لے چھین لے برسوں کی بیتائی ہوئی نیند

کردے پامال مرے گلشنِ امید کے پھول
پھونکدے برق صفت خرمنِ امید کے پھول

لوٹ لے دیدۂ پر آب کے سارے موتی
چھین لے شوق سے خود ہم سے ہمارے موتی

کردے برباد مچلتے ہوئے ارمانوں کو
قیدِ زنجیر میں رکھ شوق سے دیوانوں کو

اُٹھتی ہے بحرِ تمنا میں جو موجِ سیمیں
دل کے داغوں میں تڑپتی ہے جو برقِ رنگیں

وادیٔ دل میں جو دریائے تحمل ہے رواں
سینۂ صبر میں مستور ہے جو سوزِ نہاں

جس قدر جذبِ کشش جلوۂ ایثار میں ہے
جس قدر باڑھ غمِ عشق کی تلوار میں ہے

جس قدر عشق میں ہی جوش، محبت میں خمار
تیرے قدموں پہ تصدق، تری الفت کے نثار

کردے برباد مری زیست کے ہر پہلو کو
لوٹ لے روح کے سرمایۂ رنگ و بو کو

توڑ دے باغِ تمنا کا طلسمِ رنگیں
پھینکدے بادہ گلگوں کا ایاغِ زریں

کردے آنکھوں سے رواں شوق سے جوئے گلگوں
کہ ہے تمثیلِ قیامت مرا قلبِ محزوں

چھین لے شوق سے مجھ سے تو مرا نقدِ وجود
ختم کردے، ترے قربان، مرا شغلِ سجود

جانِ جاں شوق سے مجھ سے مری دنیا لے لے
دل ہے قربان ترے، روح بھی صدقے تیرے

گو یہ ہے کہ مری جاں کے پڑے ہیں لالے
تیرا دیوانہ ہوں میں، تو ہی مجھے اپنا لے

قیدِ الفت سے چھڑا کر مجھے آزاد نہ کر
دیکھ ہاں اسطرح مٹی مری برباد نہ کر

میرے مالک، مرے رہبر، مرے آقا، مری جان
میرے خالق، مرے مرشد، مرے مولا، مری جان

کردے مفقود مجھے عشق کے صحرا میں کہیں
غرق کردے تو مجھے حسن کے دریا میں کہیں

ذرہ صحرا میں پہنچ جائے تو صحرا ہو جائے
قطرہ دریا میں جو مل جائے تو دریا ہو جائے

میں ہی رہ جاؤں نہ باقی رہے ہستی میری
نہ رہے جام نہ مینا، نہ یہ مستی میری

تجھ میں ایسا میں سما جاؤں کہ تو ہو کے رہوں
رنگ اڑ جائے کچھ اس طرح کہ بو ہو کے رہوں

کلام آرزوؔ

از حضرت انور حسین صاحب آرزو لکھنوی

چاہ میں بے چین جی کو بھی انھیں کا جانئے
کون ہوتا ہے کسی کا کس کو اپنا جانئے

آنکھ سے جو دیکھے اور کچھ نہ منہ سے کہہ سکے
جانئے اندھا اب ایسے کو کہ گونگا جانئے

چاہ اک لمبی سڑک پڑ گیا سرا اور کیا دھرا
اس جگہ جو پاؤں اٹھے اسکو پہلا جانئے

دھیان انکا ساتھ جی کے چین جی کا انکے پاس
کہئے اب اپنا کسے کس کو پرایا جانئے

پاس وہ بیٹھے ہیں اور ہے جی کی بے چینی وہی
چین اب بھی کیوں نہیں پڑتا اسے کیا جانئے

سانس اکھڑی اور چلتے پھرتے تنکے ڈھیر ہیں
کوٹ کو لوہے کے مٹی کا گھروندا جانئے

ہر برائی سے بچائے رکھتی ہے اتنی سی بات
آرزو ہر ایک کو اپنے سے اچھا جانئے

زندگی

(از مسٹر جگدیش سہائے سکسینہ بی-اے-ایل ایل بی)

عالم ایجاد میں اے زندگانی کیا ہے تو
جو کبھی کھلتا نہیں وہ راز سربستہ ہے تو

کس طرح دونوں میں باہم یہ شناسائی ہوئی
میں ترا عاشق ہوا تو میری شیدائی ہوئی

کب دیا تو نے مے ہستی کا پروانا مجھے
کیا خبر کیسے ملی یہ نعمت عظمیٰ مجھے

جانتا ہوں یہ کہ تو مجھ سے جدا ہو جائیگی
محفل عشرت کبھی بزم عزا ہو جائیگی

---

۱ حضرت آرزو لکھنوی عرصہ سے خالص اُردو کے حامی ہیں۔ یہ اشعار آپ کے ادبی معیار کا بہترین نمونہ ہیں

مہارانا پرتاپ کی یاد

(از جناب وششٹہ پرشاد صاحب فدا بی۔ اے)

اے فخرِ روزگار! اودے سنگھ کے سپوت! تجھ سے جہاں میں زندہ ہوئی شانِ راجپوت!
غیرت کی نذر ہو گئی تیری تمام عمر! مردانگی کا تو نے دیا عمر بھر ثبوت!

کندہ تھے دل پہ "حسرتِ چتوڑ" کے حروف کھانے کو دوڑتے تھے زر و سیم کے ظروف
کہتا تھا بار بار یہی جوشِ انتقام لعنت ہے ایسے کھانے پہ، اس زندگی پہ تُف!

مجبور تھا وہ دردِ دلِ لخت لخت سے محروم تھا وہ دشت نشیں تاج و تخت سے
ایسا ہوا نہ ہوگا کوئی مستقل مزاج جنگ آزما تھا گویا وہ بیدادِ بخت سے

کی تیغ ہلدی گھاٹ پہ اُس نے جو بے نیام اُڑتی رہی سروں پہ سحر سے وہ تا بشام
مچھلی کی طرح تیرتی تھی سیلِ خوں میں وہ برپا کئے رہی صفِ دشمن میں قتلِ عام

پرتاپ سا وہ عزم کہاں آج ہند میں وہ آن دھرم کی ہے نہ وہ لاج ہند میں
کثرت سے آ رہے ہیں نظر ہم کو مان سنگھ خود غرضیوں کا آج تو ہے راج ہند میں

پرتاپ پھر سے ہند میں آئے خدا کرے بہر وطن جئے تو برائے وطن مرے
گردن رکھے جو دھرم کی خاطر فراز تر مر جائے اور دم نہ کسی غیر کا بھرے

علمی خبریں اور نوٹ

اس وقت ہندی زبان اور دیوناگری رسم الخط کو اطرافِ ملک میں رواج دینے کی بڑی کوشش ہو رہی ہے۔ دیوناگری حروف نسبتاً آسانی سے سیکھے جا سکتے ہیں اور اکثر مقامات میں ان کی ترویج کا باقاعدہ انتظام بھی کیا گیا ہے۔ چنانچہ اس وقت بنگال کے علاوہ ملک کے دوسرے صوبوں میں بھی ہندی کا خاصہ رواج ہو رہا ہے، اور بعض صوبہ واری زبانیں دیوناگری حروف میں لکھی جانے لگی ہیں۔ جنوبی ہند میں جہاں مرہٹی۔ تلنگی۔ پالی۔ کنڑی اور ملایالم وغیرہ کے علاوہ بہت کم لوگ ہندی جاننے والے ہیں اب متعدد اسکولوں اور کالجوں میں ہندی پڑھانے کا خاص انتظام کیا جا رہا ہے۔ مدراس میں ہندی پرچار سبھا کے نام سے ایک باضابطہ انجمن اس کے متعلق اعلیٰ پیمانہ پر کام کر رہی ہے، اس نے پچھلے تین سال کے اندر چونسٹھ ہزار روپیہ ہندی زبان کی اشاعت پر صرف کیا ہے، اس کی طرف سے دو سو اساتذہ لوگوں کو ہندی پڑھا رہے ہیں، دس ہزار سے زائد لوگوں کو امتحانات لیکر مختلف سندیں عطا کی گئی ہیں۔ اور دو لاکھ سے زائد ہندی ریڈریں مفت تقسیم ہو چکی ہیں۔ انجمن کی طرف سے تامل تلنگی۔ کنڑی اور ملایالم زبانوں کے جاننے والوں کیلئے پچیس ہزار الفاظ کی ایک ہندی ڈکشنری بھی تیار کر رہی ہے۔

قدردانانِ ہندی کی توجہ جدید مطبوعات کی خریداری کیطرف بھی خاص طور پر مبذول رہتی ہے جسکی وجہ سے پچھلے دس سال کے اندر ہندی کتابوں کی تعداد میں قابل قدر اضافہ ہو گیا ہے اور اچھی کتابیں ہاتھوں ہاتھ فروخت ہو جاتی ہیں تو ان کے مصنفوں اور پبلشروں دونوں کی حوصلہ افزائی ہوتی ہے اور انھیں محنت کرنے اور روپیہ لگانے میں دریغ نہیں ہوتا۔ ہندی کتابوں کی ظاہری شکل و صورت میں غیر معمولی ترقی بھی اسی وجہ سے ہے۔

غیر زبانوں کی بہترین تصانیف کو ترجمہ کے ذریعے ہندی میں منتقل کرنے کا کام بھی بڑی سرگرمی سے ہو رہا ہے۔ مثلاً فارسی ادب کی تمام مشہور تصانیف مثل رباعیات خیام، گلستان سعدی۔ کریما وغیرہ سب کا ہندی میں ترجمہ ہو چکا ہے، اردو کے نامور شعرا کے کلام بھی قدردانانِ ہندی کے لئے دیوناگری حروف میں شائع ہو چکے ہیں۔ غرض ہندی ادب کے حامی اسکی توسیع و ترقی کے لئے ضروری کوشش و مالی ایثار سے دریغ نہیں کر رہے ہیں۔

اُردو کی حالت دگرگوں ہے، یہاں شور و شر، نالہ و فریاد، لمبے لمبے دعووں، سخت سست باتوں

کی تو کوئی کمی نہیں، لیکن اہل قلم کی حوصلہ افزائی کی کسیکو پرواہ نہیں۔ نادار مصنفین کی امداد کا بھی کوئی انتظام نہیں۔ نئی کتابوں کی خریداری و سرپرستی کا بھی کوئی خیال نہیں، اچھی اچھی اُردو کتابیں سالہاسال مصنفوں اور پبلشروں کے پاس یوں ہی پڑی رہتی ہیں، خاص و عام کسی کو قدردانی کی فکر نہیں معمولی حیثیت کے لوگوں کی بے توجہی کی کیا شکایت کی جائے۔ متمول معززین بھی اُردو ادب کی توسیع و ترقی سے غافل ہیں، ذی حیثیت قدردانانِ اُردو میں کتنے اصحاب ہیں (ہماری مراد عہدیداران سرکاری، ججان و دیگر افسران اعلیٰ بلند مرتبہ وکلاء اور متمول تاجروں سے ہے) جو اُردو کتابوں اور رسالوں پر باقاعدہ طور سے پچیس تیس روپیہ سالانہ صرف کرنا ضروری خیال کرتے ہیں؟ مشاعروں میں لوگوں کا ہجوم دیکھ لیجئے، پبلک تقریبوں میں لمبے لمبے دعوے سن لیجئے، اخباروں میں فضول شکایتوں کے دفتر پڑھ لیجئے، کوئی صاحب اسی کا رونا رو رہے ہیں کہ اغیار اُردو کے گلے پر چھری پھیر رہے ہیں، کسی کو یہ شکایت ہے کہ اُردو کی صورت مسخ کیجا رہی ہے، کوئی صاحب اُردو کی حفاظت میں جان دینے پر آمادگی ظاہر کرتے ہیں، کسی کو یہی خبط ہے کہ جہانتک ممکن ہو اُردو میں فارسی عربی کے الفاظ بھر دیے جائیں، غرض جتنے منہ اتنی باتیں مگر کام کی بات ایک نہیں سنائی دیتی۔ حال میں، مولوی عبدالحق صاحب سکریٹری انجمن ترقی اُردو نے البتہ اُردو کی پیمائش کی تجویز پیش کرکے ایک نہایت اہم اور ضروری کام اپنے ہاتھ میں لیا ہے۔ اس سلسلے میں اُنھوں نے بہت سے سوالات قائم کرکے ملک کے ہر گوشے سے اُن کے مفصل جوابات طلب کئے ہیں۔ استفسارات یہ ہیں:

(۱) آپکے ضلع میں سرکاری و امدادی مدرسوں کی جنمیں اُردو کی تعلیم دیجاتی ہے کیا تعداد ہے؟ (۲) جن مدارس میں اُردو پڑھائی جاتی ہے اُنکے طلبا کی کیا تعداد ہے؟ (۳) یہ تعلیم کس درجہ تک ہوتی ہے؟ (۴) ان مدرسوں میں اُردو کا جو نصاب مروج ہے اُسکی نسبت آپکی کیا رائے ہے؟ (۵) غیر سرکاری مکتبوں نیز قدیم طرز کے عربی فارسی مدرسوں کی کیا تعداد ہے جن میں اُردو پڑھائی جاتی ہے یا اُردو ذریعۂ تعلیم ہے اور ان مدرسوں کے طلبا کی کیا تعداد ہے (۶) آپ کے ضلع یا شہر میں ڈسٹرکٹ و میونسپل بورڈ، سرکاری و نجی کتبخانوں کی جن میں اُردو کتابیں موجود ہیں، کیا تعداد ہے؟ (۷) آپکے شہر میں اُردو کی ترقی کے لئے کوئی انجمن یا دارالمطالعہ قائم ہے؟ (۸) اُردو نظم کی ترقی کے لئے مشاعروں کا باقاعدہ انتظام ہے؟ اگر ہے تو مشاعرے قدیم طرز کے ہوتے ہیں یا ان میں کچھ اصلاح کیگئی ہے؟ (۹) اُردو کے چھاپہ خانوں اور اُردو کے رسالوں و اخباروں کی تعداد اور اُنکی حالت کیا ہے نیز چھپائی کے علاوہ کیا اُردو ٹائپ کی چھپائی پسند کیجاتی ہے؟ (۱۰) آپ کے یہاں میونسپل اور ڈسٹرکٹ بورڈوں کی روئدادیں اُردو میں لکھی جاتی ہیں یا دوسری زبان میں (۱۱) آپکے یہاں عدالتوں میں درخواستیں اُردو میں زیادہ گذرتی ہیں یا ہندی میں، پٹواری کے کاغذات آپ کے یہاں اُردو میں لکھے جاتے ہیں یا ہندی میں؟ (۱۲) آپکے یہاں کوئی ایسا مصنف موجود ہے یا گذرا ہے جس نے اُردو تصنیف

نظم یا نثر کے ذریعے سے اُردو ادب کو فروغ دیا ہو یا دوسرے طور پر اُردو زبان کی ترقی اشاعت میں کوشش کی ہو۔
اس کا نام اور اس کے حالات لکھئے۔

ہم کو امید ہے کہ قدرشناسانِ اُردو اِن سوالات کے صحیح اور مفصل جوابات صاحب موصوف کی خدمت میں بھیجکر اپنے فرض سے سبکدوش ہونگے۔ ہمارے صوبۂ متحدہ میں یہ خدمت پراونشل مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے قابل و مستعد جائنٹ سکریٹری مولانا نظامی بدایونی صاحب (ایڈیٹر ذوالقرنین بدایوں) کے سپرد ہوئی ہے۔ چنانچہ اُنھوں نے اس کام کو باقاعدہ شروع کر دیا ہے بلکہ اس وقت تک تقریباً تیس ضلعوں سے جوابات بھی فراہم کر لئے ہیں، ہم کو یہ معلوم کرکے بڑی خوشی ہوئی ہے کہ مولوی عبدالحق صاحب اس تحقیقات کے سلسلے میں ملک کا دورہ بھی کر رہے ہیں اور عنقریب ہی مدراس۔ گجرات کاٹھیاواڑ اور بنگال تشریف لیجانے والے ہیں۔ ہم اس مفید تحریک کا تہِ دل سے خیر مقدم کرتے ہیں اور اس کی کامیابی کے لئے دست بدعا ہیں، لیکن بہتر ہوتا اگر یہ تحقیقات کسی فرقہ وارانہ تحریک سے علیحدہ ہو کر کیجاتی۔ اُردو کی اصلی ترقی اُسی وقت ہو گی جب اس کے حامی اسکو کسی خاص مذہب یا فرقہ یا تہذیب سے منسوب کرکے نہیں بلکہ ہندو مسلمانوں کی مشترکہ زبان سمجھکر اور ہندوستان کی ملکی زبان کی حیثیت دیکر اسکی ترویج و ترقی کی کوشش کرینگے۔ بعض احباب جس تنگ نقطۂ نظر سے اُردو کو دیکھنے کے عادی ہو رہے ہیں وہ بالآخر اس کے تنزل کا باعث ہوگا کیونکہ تنگ نظری کوتاہ اندیشی یا خود بینی سے کبھی کسی تحریک کو نفع نہیں پہونچتا

اس بارے میں عام نقطۂ خیال میں زبردست تبدیلی کی اشد ضرورت ہے۔ کیا اچھا ہو اگر بعض نامور خیر خواہانِ اُردو کے مشورے کے بموجب اسکا نام اُردو کے بجائے ہندوستانی زبان رکھدیا جائے کیونکہ صرف نام ہی سے نہیں بلکہ ہر حیثیت سے اس کو ہندو مسلمانوں کی مشترکہ زبان سمجھنے ہی پر اس کی ترقی ہو سکے گی۔ روزمرہ بول چال اور تحریر میں آسان و عام فہم الفاظ کو دقیق و مشکل فارسی اور عربی الفاظ پر صریحاً ترجیح دینا ہوگی۔ مثلاً بقول بعض مدیر جب خوشی کا لفظ موجود ہے تو مسرت بولنے اور لکھنے کی کیا ضرورت ہے۔ یاد رہے کہ جس قدر کوئی زبان عام سمجھ سے بالاتر ہوتی جائیگی اُس کے استعمال کرنے اور سمجھنے والوں کا دائرہ محدود ہوتا جائے گا

اُردو کو کسی دوسری زبان کے مدمقابل قرار دینے کی بھی ضرورت نہیں ہے۔ ہندوستان جیسے وسیع براعظم میں کئی زبانیں ایک ساتھ زندہ رہکر ترقی کر سکتی ہیں اور کسی زبان کے خیر خواہوں کی یہ خواہش کہ اس کے سوائے کوئی اور زبان ترقی نہ کر سکے محض خام خیالی ہے۔ بین الاقوامی ضروریات اور سیاسی اغراض کے لحاظ سے انگریزی زبان کا درجہ بہت بلند ہے، اور جہاں تک ہم غور کر سکے ہیں کوئی دیسی زبان اُس کی برابری نہیں کر سکتی دراصل ملک میں، تعلیم یافتہ جماعت کی مشترکہ زبان انگریزی ہی ہو سکتی ہے۔ لیکن برادرانِ وطن آسانی سے انگریزی کے علاوہ کم سے کم دو اور ملکی زبانیں سیکھ سکتے ہیں۔ ہندی اُردو کا فرق تو زیادہ تر رسم الخط کا فرق ہے، بول چال دونوں کی ایک ہے

اور ایک ہی رہنا چاہیئے، تحریر میں بھی بہت کم فرق ہونا چاہیئے۔ جیسے اور جینے دو اسی اصول پر ہندی اُردو دونوں ساتھ ساتھ ترقی کر سکتی ہیں، ان میں باہمی رقابت کی ضرورت نہیں ہمارا خیال ہے کہ ہندوستان خاص اور صوبۂ متحدہ کے ہر شخص کو جو تعلیم یافتہ کہلانیکا دعویدار ہے ان دونوں زبانوں میں کافی مہارت ہونا چاہیئے، اس سے دونوں کو فائدہ پہونچے گا۔ باہمی تعلقات شگفتہ رہیں گے، ملکی اتفاق و یگانگت میں ترقی ہوگی۔

غرض حامیان اُردو کو بلند نظری۔ اُلوالعزمی اور حب الوطنی کو مدّ نظر رکھکر ایثار، مستعدی اور یکجہتی کے ساتھ کام کرنے کی ضرورت ہے۔

آخری ہفتۂ ستمبر میں چودھری جگت موہن لال رواں کی اچانک موت اُردو ادب کے لئے ایک دردناک سانحہ ہے۔ آپکی عمر مشکل سے پینتالیس ۴۵ سال کی تھی۔ بظاہر تن و توش سے جوان معلوم ہوتے تھے، وکالت میں اچھا فروغ حاصل ہو گیا تھا۔ دنیائے شاعری میں بھی اُن کا سکہ رواں تھا معاصرین اسکو قدر کی نگاہوں سے دیکھتے تھے اُنکی شاعری محض لفظی گورکھ دھندا نہیں ہوتی تھی کیونکہ انھیں انسانی جذبات کی تہہ تک پہونچنے کا ملکہ حاصل تھا وہ دل و دماغ دونوں کی کیفیتوں سے واقف قلب کی واردات سے آشنا اور روحانی آرزوؤں سے بخوبی آگاہ تھے۔ قدرت نے انھیں درد آشنا دل، حق پسند دماغ اور نکتہ رس نگاہ عطا کی تھی۔ اُن کی طبیعت موزوں اور فطرت نیک تھی۔ ان کی معلومات وسیع اور مطالعہ عمیق تھا، ظاہر پرستی سے انھیں واسطہ نہ تھا۔ وہ حقیقت شناس واقع ہوئے تھے، اُن کا معیار زندگی بلند اور مسلک صلح کل تھا، جس نے ایک دفعہ بھی ان سے ملاقات کی ان کے انسان دوستی، خوش اخلاقی اور مہمانداری کا قائل ہو گیا۔ طالبعلمی کے زمانے ہی سے وہ اُردو شاعری کے دلدادہ تھے، ماہران فن اور قدردانانِ سخن کو شروع ہی سے انکی ذات سے بڑی بڑی امیدیں تھیں آپکی مختصر زندگی میں یہ امیدیں بہت کچھ پوری ہوئیں۔ آپکی نظمیں، غزلیات اور رُباعیاں سب اپنے رنگ میں فرد اور ادبی حیثیت سے قابل قدر ہیں۔ آیندہ نسلیں بھی آپ کی شاعرانہ بلند پروازیوں کی داد دینگی لیکن اسوقت آپ کی جوانمرگ سے دوست آشنا سبھی غمزدہ ہیں۔ آئندہ نسلیں بھی اس سانحہ پر خون کے آنسو بہائینگی۔ سب سے بڑا قلق یہ ہے کہ سر ایڈون آرنالڈ کے طرز پر آپ مہاتما گوتم بدھ کی سوانحعمری پر ایک ضخیم مثنوی لکھ رہے تھے جسکو افسوس آپکی ناوقت موت نے تکمیل تک پہونچنے نہ دیا۔ اس کے علاوہ آپ رامائن و مہابھارت کے خاص خاص واقعات کو بھی اپنے دلپذیر پیرایہ اور مثنوی کی مقبول عام صورت میں اردو میں پیش کرنا چاہتے تھے۔ تاریخ اور فلسفہ سے آپ کو گہری دلچسپی تھی، اور اُردو زبان اور اس کے

شاعرانہ نکات پر آپکو عبور کامل حاصل تھا۔ آپکی یہ مثنویاں اردو ادب کی بہت بڑی کمی کو پورا کر دیتیں۔ مگر ہوتا ہے وہی جو منظور خدا ہوتا ہے۔ مشیت ایزدی یہی تھی کہ رواں صاحب کے شاعرانہ منصوبے بھی ادھورے رہ جائیں۔ چکبست نے بھی رامائن شروع کی تھی مگر پوری نہ کر سکے، سرور جہان آبادی نے کالیداس کے ڈرامے اردو میں منتقل کرنا چاہے تھے مگر قضا نے مہلت نہ دی۔ اب رواں بھی اپنا کام ناتمام ہی چھوڑ کر چل بسے اس سانحہ کا جس قدر ماتم کیا جائے کم ہے، موجودہ عہد کے شاعروں میں رواں کا درجہ بہت بلند تھا۔ "زمانہ" کے بہت پرانے قدردان تھے اس پر ہمیشہ ان کی نظر عنایت رہتی تھی، اور سچ یہ ہے کہ "زمانہ" اُن کے احسانات سے کبھی سبکدوش نہیں ہو سکتا اُن کی بہترین نظمیں اسی ناچیز رسالہ میں شائع ہوئی ہیں۔ اُن کی وفات سے "زمانہ" کی بزم سخن سونی ہو گئی ہے اور دنیائے شاعری میں آج ہم کو ایک سناٹا سا محسوس ہو رہا ہے، ادب اُردو کو اس سانحہ سے جو نقصان پہونچا ہے اسکی تفصیل مشکل ہے اور تلافی تو ممکن ہی نہیں ہے۔ اہل خاندان اور عزیزوں کو آج دنیا تاریک نظر آرہی ہے مگر انسان ایسی مصیبتوں میں آنسو بہانے کے سوا اور کر ہی کیا سکتا ہے۔ خداوند تعالیٰ آپکی روح پُرفتوح کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے اور پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ افسوس!

لائی حیات آئے۔ قضا لے چلی چلے
اپنی خوشی نہ آئے نہ اپنی خوشی چلے

افسوس ستمبر میں لکھنؤ کے مشہور شاعر نواب مرزا محمد عسکری خاں صاحب بلیغ کا بھی انتقال ہو گیا آپ ایک کہنہ مشق، خوش فکر اُستاد اور باوضع نیک نفس بزرگ تھے، اخلاق و تواضع کے پتلے تھے محلہ نوازگنج میں دولت خانہ تھا، ۵ ستمبر کو انتقال فرمایا۔

"اصلاحِ ادب" کے عنوان سے اُردو الفاظ کا صحیح اور برمحل استعمال کی تشریح میں حضرت نشتر جالندھری نے جو قابل قدر اور سبق آموز مضامین لکھے ہیں جن کو اب آپ "نشتر ادب" کے نام سے کتابی صورت میں شائع کرنے والے ہیں۔

اعلیحضرت نظام دکن کے صاحبزادۂ دوم شہزادہ معظم جاہ نے سات سو غزلوں کا اپنا دیوان مرتب کر لیا ہے، جو اب نواب فصاحت جنگ بہادر جلیل کے ملاحظہ کے بعد طبع ہوگا۔ اس دیوان کا دیباچہ ہز اگزالٹڈ ہائینس نظام، بنفس نفیس قلمبند فرمائیں گے۔ ہم نے بعض غزلیں جو دیکھی ہیں وہ ہر اعتبار سے بہت بلند پایہ اور جانِ تغزل ہیں۔

زمانہ

جلد ۶۳ نومبر ۱۹۳۴ء نمبر ۵

ریختی کے دو شاعر

(از مولوی نظام الدین حسین، ایڈیٹر ذوالقرنین بدایوں)

اُردو ادب کی نشو ونما سے پہلے ہندوستان کے پڑھے لکھوں کا اوڑھنا بچھونا فارسی تھا، عدالتی زبان فارسی تھی، خط و کتابت فارسی میں ہوتی تھی، فنِ شعر کا مذاق رکھنے والے فارسی ہی میں دادِ سخن دیتے تھے۔ لیکن اسی کے ساتھ جیوں جیوں زبان اور معاشرت پر ہندوستان کی آب و ہوا کا اثر ہوتا گیا فارسی کے ساتھ ساتھ اہلِ علم اور اہلِ ذوق اُردو زبان میں شعر کہنے لگے۔ اور فارسی زبان میں ایسی اُردو شاعری کا نام ریختہ رکھا گیا۔ ریختہ کے لفظی معنی ہیں گرا ہوا یا بکھرا ہوا۔ مطلب یہ تھا کہ فارسی سے ٹپک کر اُردو کا کلام ظہور میں آیا۔ اور رفتہ رفتہ فارسی گو شعرا اُردو کلام پر فخر کرنے لگے۔ مثلاً مرزا غالبؔ کو جنھیں اپنے فارسی کلام پر ناز رہا ہے یہ کہنا پڑا۔

ریختہ کے تمھیں اُستاد نہیں ہو غالبؔ! کہتے ہیں اگلے زمانہ میں کوئی میرؔ بھی تھا

یہ وہ زمانہ تھا جس کو ریختہ کے شباب کا زمانہ کہا جا سکتا ہے۔ اسی زمانہ میں "ریختی" نمودار ہوئی یا یوں کہئے کہ ریختہ کو چاند سی دلھن ملگئی، اور چڑھتی جوانی میں چٹ منگنی پٹ بیاہ کی ٹھہر گئی کہنے والے کہتے ہیں کہ جس طرح نظمِ اُردو کے آدم کا وطن دکن ہے اسی طرح حسنِ اُردو کی حوا ریختی نے بھی وہیں جنم لیا ہے۔ پُرانے تذکرے یعنی شاعری کی قدیم تاریخیں بتاتی ہیں کہ ریختہ کا موجد ولیؔ اور ریختی کا ایجاد کرنیوالا ہاشمی دکھنی ہے جو نصرتیؔ کا ہمعصر تھا جس کا ایک شعر مشہور ہے۔

رہنا گر مجھکوں دیتے ہو کردوگی گھر میں جادا ۔۔ اگر مجھ ہووے گی فرصت صبح پھر آونگی چھوڑو

مجھکوں" تجھ ہو وینگی فرصت ۔ یہ پرانی بول چال ہے، عورتوں کا قدیم لہجہ ہے جس میں بناوٹ کا لگاؤ نہیں ، "پھر آونگی چھوڑو" ایک خوش چین عام عورت کے جذبہ کی جیتی جاگتی بولتی چالتی تصویر ان الفاظ میں ہے۔ سو منہ ہزار باتیں، کوئی کہتا ہے ریختی سید انشا کی طبع زاد ہے، سید انشا کہتے ہیں کہ اسکا سہرا سعادت یارخاں رنگین کے سر ہے، کوئی الاپتا ہے کہ ہندوستان میں ریختہ سے پہلے ریختی موجود تھی۔ بھاشا اور سنسکرت کی شاعری میں عورت مرد سے عشق جتاتی ہے اور اسکی بیوفائی پر تیوراتی ہے یہی ریختی کی شان ہے، مگر بھاشا میں سے پتہ چلتا ہے کہ یہ زبان کے دونوں پتلے سرزمین دکن پر تیار ہوئے، رنگین و انشا نے ریختی کے قالب میں روح پھونکی، حالی صاحب نے اسکو اللہ اللہ آتیں سے بالا شاعروں کے صدقہ سے ریختہ ریختی دونوں اس لائق ہوگئے کہ ایک شاہی درباروں، مردانہ صحبتوں کو گرمائے، دوسری اپنی ہنس مکھ صورت کو محلات اور عام عورتوں کی طرز معاشرت کا آئینہ بنائے۔ غرض جوڑ سے جوڑ مل گیا۔ تھوڑے دنوں میں اسکی گود بھر گئی، زچہ گیریاں، سہاگ، لوریاں پیدا ہوئیں، جن کے نغموں سے گھر کے گھر گونج اٹھے۔ ریختی کی ایجاد سے موجد کی یہ غرض نہ تھی کہ وہ گھروں کی ڈھکی چھپی باتیں بکھان ڈالے، خانگی قصے دہرائے، انکی منشا یہ تھی کہ عورتوں کی بولی ٹھولی غیر زبانوں کی تتر بتر سے بچ جائے، آج نہ محلات کا نام باقی ہے نہ اگلے چوچلے ہیں، نہ ساتوں پریوں کی ماننے والیاں، نہ شاہ دریا، شاہ سکندر، میاں صدر جہاں کا دم بھرنے والیاں ہیں۔ نئی تعلیم نے شیخ سدو، زین خاں کو دل سے بھلا دیا ہے، اٹھتی ہوئی نسلوں نے بیٹھک کا رواج اٹھا دیا ہے۔ پھر بھی پرانی زبان کے الفاظ، بیگماتی محاورے ابھی تک زندہ ہیں، آجکل کی زنانی تقریروں اور نسوانی مضامین میں انھیں کی بو آتی ہے۔ سعادت یارخاں رنگین جو سید انشاء اللہ خاں کے دستار بدل بھائی تھے آپس میں ایک جان دو قالب تھے۔ سید انشا پر رنگین کی چھاؤں پڑ گئی تھی، وہ ریختی کہتے تھے اور خوب کہتے تھے، اور یہ رنگ ان پر ایسا چڑھ گیا کہ علم عروض کے وزن میں بھی اس کو قائم رکھا، اور مفاعیلن مفاعیلن کی جگہ پری خانم پری خانم کہنے لگے۔ انشا نے دریائے لطافت میں نورن نامی کٹنی اور میر غفور غنچی کی جو گفتگو لکھی ہے وہ صاف بتاتی ہے کہ ان دونوں میں ریختی کی طرف پہلے کس نے رخ کیا۔ بی نورن کہتی ہیں "اجی آؤ میر صاحب، تم تو عید کا چاند ہوگئے ہو، دلی میں آتے تھے تو دو دو پہر بیٹھے تھے، ریختہ پڑھتے تھے، لکھنؤ میں تمھیں کیا ہوگیا کہ کبھی صورت نہیں دکھاتے، ایکے کربلا کتنا میں نے ڈھونڈا کہیں تمھارا اثر آثار معلوم نہ ہوا، ایسا نہ کیجیو کہیں آٹھوں میں بھی نہ چلو تمھیں علی کی قسم آٹھوں میں ضرور چلیو"۔ میر صاحب اس کے جواب میں تمام اساتذہ کو آڑے ہاتھوں لیتے ہیں

بُرا بھلا کہتے ہیں۔ حضرت انشا کے متعلق یہ فرماتے ہیں "میر انشاء اللہ خاں ہمارے میر ماشاء اللہ خاں کے بیٹے آگے بیرزادے تھے، ہم بھی گھوڑے کو جاتے تھے۔ اب چند روز سے شاعر بن گئے۔" رنگین کا نام آتے ہی اُن کے بدن میں آگ لگ جاتی ہے۔ بھلا کر یہ کہتے ہیں "اور سنیئے سعادت یار طہماسپ کا بیٹا انوری ریختہ آپ کو جانتا ہے، ایک قصہ کہا ہے، اس مثنوی کا نام دلپذیر رکھا ہے، رنڈیوں کی بولی اس میں باندھی ہے، کوئی پوچھے کہ تیرا باپ رسالدار مسلّم، بیچارا برچھی بھالے کا ہلانے والا تیغے کا چلانے والا تھا تو ایسا قابل کہاں سے ہوا شہدپن جو بہت مزاج میں آگیا ہے تو ریختہ کے تئیں چھوڑ کر ایک ریختی ایجاد کی ہے، اس واسطے کہ بھلے آدمیوں کی بہو بیٹیاں پڑھکر مشتاقِ سخن ہوں، بھلا یہ کلام کیا ہے :-

ذرا گھر کو رنگیں کے تحقیق کر لو یہاں سے ہے کئے پیسے ڈولی کہارو

مرد ہو کر لکھتا ہے ع

"کہیں ایسا نہ ہو کمبخت میں ماری جاؤں"

اور ایک کتاب بنائی ہے اُس میں رنڈیوں کی بولی لکھی ہے جس میں اُڑتی چیلیں، اوپر والا چاند، اُجلی جوئیں وغیرہ" اس مکالمہ سے پایا جاتا ہے کہ انشا نے رنگین کی فرمایش سے ریختی لکھی۔ راقم مضمون نے دونوں کے ریختی کلام کو مرتب کرکے رنگین و انشا کے نام سے طبع کرایا ہے[1]۔ دونوں اُستاد اپنے فن میں کامل تھے۔ ان دونوں کی زندگی کے مختصر حالات دلچسپی سے خالی نہیں۔

سعادت یار خاں رنگین | بڑے شوخ مزاج ظریف۔ بذلہ سنج، روتوں کو ہنسانے والے، مرزا طہماسپ بیگ خاں کے پیارے بیٹے تھے، اُن کے باپ ساٹھ برس کی عمر میں روم سے ہندوستان آئے۔ اُمرا کی ملازمتوں کے بعد اُنھوں نے شاہی دربار تک رسائی حاصل کی۔ تلوار کی طرح قسمت کے دھنی بھی تھے۔ چند روز میں تقدیر نے یاوری کی، خود امیر بن گئے۔ شاہی دربار میں اعزاز بڑھا، لمبے چوڑے خطاب پائے۔

رنگین کی پیدایش قصبہ سرہند میں ہوئی، مگر دہلی میں تربیت حاصل کی، بچپن سے آخر دم تک دہیں چین چان سے زندگی گذاری۔ سپہگری میں چاق چوبند تھے اور یہ فن باپ سے وراثت میں ملا تھا۔

تلمذ | شاعری میں حضرت حاتم سے تلمذ تھا، چلبلی طبیعت پائی تھی، ذہانت اُن کو اُستاد کے سامنے بھی چپ چاپ نہ بیٹھنے دیتی تھی۔ اگر شعر میں کوئی بات یا اصلاح میں کچھ کسر رہ جاتی تو موقعہ پر نہ چوکتے۔ آپ مجالس رنگین میں تحریر فرماتے ہیں "حسب معمول شاہ صاحب کے تکیہ میں حاضر ہوا۔ آپ نے فرمایا آج رات کو یہ مطلع کہا ہے :-

[1] یہ مجموعہ رنگین و انشا کے نام سے موسوم ہے اور بقیمت ۸ نظامی پریس بدایوں سے ملتا ہے۔

"سر کو جھکا ہے کبھو سینہ کبھو کوٹتا ہے رات ہم ہجر کی دولت سے مزا لوٹتا ہے"

ابتدا سے میرے مزاج میں چالاکی بہت تھی شعور کم تھا، اپنی نادانی سے گستاخانہ بول اُٹھا کہ اگر مصرعۂ ثانی اس طرح ہو تو اچھا ہے ع

"ہم نے شب ہجر کی دولت کا مزا لوٹا ہے"

شاہ صاحب بہت خوش ہوئے، میرا ہاتھ پکڑ کر اپنی طرف کھینچا، اور فرمایا، آفریں، آفریں، ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات، ماشاءاللہ تمھاری طبیعت بہت ترقی کرے گی، مشق نہ چھوڑنا۔ اُن کے دوستوں میں سے ایک شخص بولے کہ صاحبزادہ اُستاد کے سامنے یہ گستاخی زیبا نہ تھی حضرت نے پھر فرمایا کہ مضائقہ کیا ہے، واللہ میں دیوان میں اسی طرح لکھونگا۔

رنگین کی ریختہ گوئی | قادر الکلام شاعر تھے، ہر رنگ میں کچھ نہ کچھ کہا ہے مگر ان کی ظریفانہ نظمیں، ہجویں ریختی عام طور پر مقبول ہے، جس کا سبب یہ ہے کہ ظرافت کی کرمیاں اپنے سامنے کسی رنگ کو نہیں جمنے دیتیں، آسان پسند اشخاص اعلیٰ درجہ کے کلام کی قدر نہیں کرتے۔ ہزلیات کی ڈگر۔ ریختی کا فن اُنھوں نے اوباشوں، کنچنی بازوں، قحبہ خانوں سے حاصل کیا تھا، دیوان کے دیباچہ میں یہ تحریر کرتے ہیں کہ "چندمدت جو اس وضع پر اوقات بسر ہوئی تو اس عاصی کو ان کی اصطلاح اور محاورے پر نظر ہوئی۔"

رنگین اور جان صاحب کی ریختی میں فرق | صاحبِ تذکرہ خمخانۂ جاوید رنگین کی ریختی پر یہ رائے دیتے ہیں کہ "زبان کے معاملہ میں رنگین اپنا جواب آپ ہے چونکہ ریختی کا موجد ہے اس لئے سخن کے قاعدۂ کلیہ کے مطابق اس کی ریختی کی ابتدائی حالت میں سادگی کے جوہر باقی ہیں اور وہ جان صاحب کی ریختی کی طرح سرتاسر فحش نہیں ہے۔" اگر لکھنؤ میں جان صاحب نہ ہوتے تو ریختی کا فن ادھورا رہ جاتا۔ رنگین اور جان صاحب کی ریختی میں یہ فرق ہے کہ رنگین نے آسان تشابیہ، سادہ استعارے برتے ہیں خیلاؤں کے جذبات اور خیالات کو سادگی سے ادا کیا ہے۔ جان صاحب نے اس میں ضلع جگت کا جزو شامل کر دیا ہے، مثلاً:۔

قندوالوں کے محلہ میں گئی تھی مصری کھا کے ٹھوکر جو گری پاؤں کا گٹا ٹوٹا

غریب جان صاحب لکھنؤ کے مذاق سے مجبور تھے، وہ زبان کے ساتھ ضلع جگت کا بھی لحاظ رکھتے تھے اس شعر میں قند کی وجہ سے مصری اور گٹے کو لائے ہیں۔ قدیم شعرائے لکھنؤ میں ایسے لوگ گنتی کے ہونگے جو اس وبائے عام میں مبتلا نہ ہوں۔ رنگین اور انشاء کے ہاں ایسا اہتمام نہیں۔ وہ برجستہ

محاورات، صاف ستھری زبان برتتے ہیں، اگر صنائع اور بدائع ہیں بھی تو اتنے جتنا آٹے میں نمک دال میں ہینگ۔ یہ غلط ہے کہ جان صاحب کی ریختی میں تمام اشعار فحش ہیں، انتخاب کرنے سے اچھے اچھے شعر بھی ملتے ہیں اسلئے ہمارے بعض دوستوں کا دیوانِ جان صاحب کی اشاعت پر ناک بھوں چڑھانا عبث ہے۔ دیوان جان صاحب ہو یا دیوان رنگین، یہ اردو ادب کے برکات ہیں اور زمانۂ موجودہ کا ادیب ان پر اعتراض کرکے درجۂ کمال پر نہیں پہونچ سکتا۔

تصانیف | رنگین کے چار دیوان ہیں، ریختہ۔ بیختہ۔ آمیختہ۔ انگیختہ۔ ان کے علاوہ ان کی سوا پانچ کتابیں اور ہیں، مثنوی ایجاد رنگیں۔ اخلاقی پند و نصائح میں اپنے رنگ کی پہلی کتاب ہے۔ فرسنامہ میں رنگین نے گھوڑوں کا علاج اور انکی خصوصیات درج کی ہیں۔ مجالس رنگین میں تمام شعراء کو آڑے ہاتھوں لیا ہے۔ مثنوی دلپذیر کی بندش چست، ترکیب دلکش، زبان سادہ ہے، اس کی روانی اور سلاست شعراء معاصرین میں ضرب المثل بن چکی ہے۔ پانچویں کتاب ہزلیات کا دیوان ہے جس میں نوک جھونک، چھیڑ چھاڑ، پھکڑبازی، ہجو سب کچھ موجود ہے۔ شیطان کی مدح میں ایک قصیدہ لکھکر طبیعت کا زور دکھایا ہے۔

رنگین جمادی الثانی ۱۲۵۱ھ میں ہمیشہ کیلئے دنیا سے رخصت ہو گئے، اسّی برس کی عمر پائی۔

سید انشاء اللہ خاں انشاء | حکیم ماشاء اللہ خاں مصدر دہلوی کے بیٹے تھے، ان کے بزرگ نجف اشرف سے ہندوستان میں آئے تھے۔ کچھ لوگ یہ کہتے ہیں کہ آپ صحیح النسب سادات سے تھے جو سمرقند سے کشمیر اور کشمیر سے دلی آکر آباد ہو گئے تھے۔ سید ماشاء اللہ خاں دربار شاہی میں طبیب تھے، خاندانی اعتبار سے بڑے ناک والے تھے، دلی اور لکھنؤ دونوں جگہ ان کی شرافت کو مانا جاتا ہے۔ اس خاندان میں پردہ کی یہاں تک پابندی تھی کہ مستورات کے کپڑے یا گھر میں دھوئے جاتے یا جلا دیے جاتے، دھوبی کو نہیں دیے جاتے تھے، خدا کے فضل سے گھر میں سب کچھ موجود تھا، دروازے پر اٹھارہ ہاتھی جھومتے تھے۔ اس خاندان کے اکثر لوگ ایسے گذرے ہیں جن کی سواریوں کے ساتھ طبل و نقارہ ہوا کرتا تھا۔

پیدائش | سید انشاء مرشدآباد بنگال میں پیدا ہوئے جہاں انکے والد نواب ناظم کی سرکار میں عہدہ دار تھے۔

تعلیم و تربیت | عربی۔ ترکی۔ فارسی میں دستگاہ حاصل تھی۔ فارسی زبان کی شاعری ایرانیوں سے ملتی جلتی ہے[۱] لڑکپن میں علم موسیقی سے ذوق تھا۔ کانیہ حفظ کرتے تھے اور اُسکے جملوں کو ستار پر بجایا کرتے تھے

---

[۱] دیوان جان صاحب نظامی پریس بدایوں میں دو مرتبہ نہایت آب و تاب کے ساتھ چھپ چکا ہے، دوسرے ایڈیشن میں ان کا مہذب کلام بھی شامل ہے۔ قیمت عمر

[redacted]

فنِ سخن میں اپنے والد کے شاگرد تھے، جن کا یہ شعر مشہور ہے :-

خدا کرے کہ مرا مجھ سے مہرباں نہ پھرے جہاں پھرے تو پھرے پر وہ جانِ جاں نہ پھرے

دلی کے دربار شاہی میں داخلہ آپ مرشد آباد سے دلی آئے، یہ وہ زمانہ تھا جبکہ دلی کا بادشاہ شاہ عالم بقول پروفیسر آزاد مرحوم "شطرنج کا بادشاہ رہ گیا تھا، لٹی پٹی سلطنت برلے نام بادشاہت رکھتی تھی"۔ بذلہ سنجی، شوخی، ظرافت، شاعری کی شہرت نے ان کو دربار شاہی تک پہونچا دیا، پھر کیا تھا چند ہی روز میں شاہ عالم کے دل میں اپنا گھر بنا لیا، مزہ دار چٹکلوں نے تمام درباریوں کا رنگ پھیکا کر دیا، ہنستا ہنسانا صحت کے لئے مفید ہے، بادشاہوں امیروں کو ہنسی دل لگی کے بغیر کھانا ہضم نہیں ہوتا، پھر شاہ عالم کس طرح گھڑی دو گھڑی کی جدائی گوارا کرتے اور اُن کو اپنی نگاہوں سے دُور رکھتے۔

شاعرانہ جنگ سید انشار کی طبیعت میں ظرافت اور شوخی تھی خداداد پھر پرانی لکیر کے فقیروں کا رنگ جمتا تو کیونکر گو میر و سودا کا وقت نہ تھا مگر اُن کے زمانہ کی ترکیبیں اور بندشیں زندہ تھیں۔ نئی چیز میں قدرتی کشش ہوتی ہے، سید انشا کی چلبلاہٹ نے طبیعتوں میں گدگدی پیدا کر دی، پھڑکتا ہوا کلام دلوں میں چٹکیاں لینے لگا۔ آخرکار شاعرانہ حسد نے کارفرمائی کی، اور مرزا عظیم بیگ شاگرد سودا سے شاعرانہ جنگ چھڑ گئی۔ مرزا مرحوم نے بحر رجز میں غزل لکھی تھی مگر کچھ اشعار بحر رمل میں لکھ مارے، انشار کو ہجو کا موقع ہاتھ آیا ان کی اچھی طرح خبر لی گئی، دو دو پانی ہونے کے بعد لوگوں نے بیچ میں پڑ کر صلح کرا دی، کچھ دنوں کے بعد سید انشار دلی سے لکھنؤ آ براجے۔

لکھنؤ کے شاہی دربار میں داخلہ آپ نے جب لکھنؤ کی سرزمین پر قدم رکھا تو مرزا سلیماں شکوہ کا زمانہ تھا، شاعروں میں مصحفی کا طوطی بول رہا تھا۔ انشار کے انوکھے خیالات اور نرالی بندشوں نے سلیماں شکوہ کو اپنا والہ و شیدا بنا لیا۔ مصحفی کی پیری نہ چلی وہ انھیں سے اصلاح لینے لگے۔ نواب سعادت علی خاں کے عہد میں انشار کی ظرافت کا شباب تھا، انھوں نے اپنی درباداری اور چٹکلوں سے ہزاروں آدمیوں کو فائدہ پہونچایا۔ لکھنؤ میں میر علی مرثیہ خواں علم موسیقی سے واقف اپنے گھر میں مجلس کرتے تھے، نواب سعادت علی خاں نے اُن کو پڑھنے کے لئے طلب کیا، وہ نہ گئے، اُن کی طرف سے نواب کا دل بُرا ہو گیا۔ اڑتے اڑتے میر صاحب کو بھی خبر ہو گئی اور دکن جانے کی تیاریاں کرنے لگے۔ انشار کو جب یہ معلوم ہوا کہ میر صاحب اپنا اختر بختر ملا شجرہ باندھ کر روانہ ہونا چاہتے ہیں، اُن کے بھتیجے بھانجے ساتھ جا رہے ہیں تو انشا کمر باندھ کر دربار میں پہونچے، سعادت علی خاں نے حیران ہو کر پوچھا کہ خیر باشد پھر کیوں آئے، اُنھوں نے ایک غزل پڑھی جسکا ایک شعر یہ ہے :-

دولت بنا ہو اور سعادت بنی رہے　　یارب بنے بنی میں ہمیشہ بنی رہے

پھر کہا "حضور! اغلام جو اس وقت رخصت ہو کر چلا تو دل نے کہا کہ اپنے دولہا دولھن (عروس سلطنت) کو تو دیکھ لوں، حاتھی بارہ ابرن، سولہ سنگھار سے سجی تھی، سر پہ جھومر وہ کون مولوی دلدار علی صاحب، کانوں میں جھمکے، وہ کون دونوں صاحبزادے، گلے میں نولکھا ہار، وہ کون خان علامہ غرض اس طرح چند زیوروں کا نام لیکر کہا کہ حضور غور جو کرتا ہوں تو ناک میں نتھ نہیں، دل دھک سے ہو گیا کہ اللہ سہاگ کو قائم رکھے، یہ کیا۔ نواب نے پوچھا کہ پھر وہ کون، کہا "حضور! میر علی" بعد اس کے مفصل کیفیت بیان کی۔ نواب نے ہنسکر کہا "ان کی دور اندیشی بیجا ہے، میں ایسے صاحب کمال کو فخر لکھنؤ سمجھتا ہوں" غرض سید انشا، ترقی کا پروانہ اور پانچسو روپیہ کا خلعت لیکر وہاں سے واپس ہوئے۔ اسی طرح انھوں نے بہت لوگوں کے کام نکالے۔

لکھنؤ کے معرکے لکھنؤ کے زمانہ قیام میں مصحفی سے بگاڑ ہو گیا، دونوں طرف سے ہجویں کہی گئیں، مصحفی بڈھے تھے انشا نوجوان تھے، اس پر شوخ مزاج انکا مقابلہ کس طرح ہوتا، پہلے مصحفی کے شاگردوں نے ایک سوانگ نکالا اور ایک ہجو کہکر اس کے اشعار پڑھتے ہوئے انشار کی طرف آئے۔ انھیں ایک دن پہلے علم ہو چکا تھا، انھوں نے اپنا مکان آراستہ کیا، امرائے شہر اور اپنے یاروں کو بلایا، خوانوں میں شیرینی، کشتیوں میں گلوریاں سجائی گئیں، حریفوں کا مجمع قریب آیا تو اسکا استقبال کیا گیا، ساتھ میں تعریفیں کرتے، سبحان اللہ، واہ واہ، آفریں کہتے اپنے مکان پر لائے، سب کو بٹھایا خاطر تواضع میں کوئی بات اٹھا نہ رکھی، ہجو دوبارہ پڑھوائی گئی ہنس بولکر عزت و احترام سے رخصت کیا ادھر وہ رخصت ہوئے ادھر جھٹ سے ہجو کا جواب تیار ہو گیا، ایک جم غفیر برات کی صورت میں ترتیب دیا گیا، لوگوں کو ہجویں تیار کر کے دیں، کچھ ڈنڈوں پر پڑھتے جاتے تھے، کچھ ہاتھیوں پر بیٹھے تھے، ایک ہاتھ میں گڈا ایک ہاتھ میں گڑیا، دونوں کو لڑاتے اور زبانی ہجو پڑھتے جاتے تھے جسکا ایک شعر یہ ہے۔

سوانگ نیا لایا ہے دیکھنا چرخ کہن　　لڑنے کو آپ آئے ہیں مصحفی و مصحفن

ان معرکوں میں امرا نے انشار کا ساتھ دیا اور حریف کے سوانگ کو کوتوال سے کہکر رکوا دیا۔

درباری لطائف درباری لطائف بیشمار ہیں جن کو ہم طوالت کی وجہ سے نظرانداز کرتے ہیں، نمونہ کے طور پر ایک لطیفہ لکھتے ہیں:۔

نواب سعادت علی خاں نے ہزاری روزہ رکھا اور حکم دیدیا کہ کوئی نہ آنے پائے، جب سید انشار وہاں پہونچے تو چوبدار نے کہا "آج حکم نہیں ہے" آپ مالک ہیں" انھوں نے ایک نہ سنی کمر کھولکر دستار

سر سے باندھی اور دوپٹہ عورتوں کی طرح اوڑھکر ناک پر انگلی رکھکر کہا۔

ایسی گرمی میں نہ رکھ اے مری پیاری روزہ بندی رکھ لیگی ترے بدلے ہزاری روزہ

نواب یہ سنکر ہنس پڑے، اُنھیں جو کچھ کہنا سننا تھا کہ سُنکر چلے آئے۔

تصانیف کلیاتِ انشا ایک عجائب خانہ ہے۔ جس میں رنگ برنگ کی چیزیں دکھائی دیتی ہیں غزلیات میں روانی و شیرینی ہے۔ صفائی زبان قادر الکلامی کی دلیل ہے۔ قصائد میں شکوہ الفاظ نازک خیالی، فکر کی بلند پروازی دکھائی ہے، اور ان میں بھی اپنا رنگ نہیں چھوڑا ہے۔ اُردو زبان میں شعر کہتے کہتے یہ کہتے ہیں کہ شاہِ ایران تجھ سے یہ کہتا ہے وہیں سے فارسی شروع کر دیتے ہیں اسی طرح عربی، ترکی میں شعر کہکر برج کی بھاشا، پنجاب کے جنگ سیالے اور جاٹوں کی زبان بول کر قصیدہ کو چوں چوں کا مربّہ بنا دیتے ہیں۔ مثنوی مولانا روم کے طرز میں ایک مثنوی لکھی ہے۔ لیکن تمسخر سے اس موقع پر بھی نہیں چوکے ہیں ظریفانہ حکایات کو معرفت اور تصوف کا لباس پہنانا چاہا ہے۔ مرغ نامہ میں مرغ بازی کے قواعد لکھتے لکھتے ٹھٹول کر جاتے ہیں طلسمات کے نسخوں کو نظم کر رہے ہیں۔ لیکن اس میں اپنی رائے کا پچھلا لگا کر تمام محنت کو اپنے ہاتھوں سے ملیا میٹ کرا دیتے ہیں۔ دریائے لطافت قواعد اُردو کی پہلی کتاب ہے۔ مگر قواعد بیان کرتے کرتے جب تمسخر کرتے ہیں تو یہ خشک مضمون بھی کشتِ زعفران بن جاتا ہے۔ ایک داستان نثر اُردو میں ایسی لکھتے ہیں جس میں عربی فارسی کا ایک لفظ بھی نہیں آنے پایا۔ دیوان بے نقط ہے۔ رباعیاں پہیلیاں، خدا جانے کیا کیا لکھا ہے، ہجو کہنے پر آتے ہیں تو انسانوں کو چھوڑ کر کھٹمل۔ مچھر۔ پسّو کی ہجو کہہ دیتے ہیں۔ پھر طرّہ یہ ہے کہ ہندوستان کی مختلف زبانوں پر قادر ہیں، کبھی پوربی۔ پنجابی بول رہے ہیں، کبھی مرہٹی اور بنگالی میں بات چیت کر رہے ہیں۔ تذکرہ نویسوں کی رائے ہے کہ اگر وہ تمسخر کو چھوڑ دیتے تو اپنے زمانے کے انوری۔ خاقانی اُردو کے امیر خسرو ہوتے۔ مثنوی میں ایک انگریزی حکایت کو نظم کیا ہے، جس میں چنچل پیاری ہتھنی کے واقعات لکھے ہیں۔

وضع قطع پڑھنے کا انداز دُنیا جہان سے نرالا تھا، ان کا مشاعرہ یا دربار میں جانا قیامت بپا ہونا تھا، ایک طرف ادب سے سلام کرتے ہیں تو دوسری طرف منہ پھیر کر مسکرا رہے ہیں، کسی کا منہ چڑا دیا ہے تو وہ ان کی ظرافت سے تھرا رہا ہے، ہمیشہ نئے نئے بھیس بدلتے رہتے ہیں کبھی آدھی داڑھی اُڑی ہوئی ہے، کبھی مقطع، کبھی چار ابرو کا صفایا۔

ایسے باکمال نے ریختی کیوں کہی ظرافت کے رنگ میں ڈوبنے، ریختی کہنے کا سبب یہ ہے کہ عیش کے

دن تھے، سلطنت کا اقبال تھا، ہر شخص خواہ وہ غریب ہو یا امیر مسخرے سے خوش ہوتا تھا۔ اودھ کے شاہی دربار میں معمولی نظموں پر بیش قیمت صلہ دیا جاتا تھا۔ سید انشا، ریختی نہ کہتے تو کیا کرتے جبکہ فرمانروائے وقت کی طبیعت ہنسی مذاق کی طرف مائل تھی۔ یہاں بیتاب کا یہ قول ادب کی کسوٹی پر کسنے کے قابل ہے کہ "انشا کے فضل و کمال کو شاعری نے کھویا اور شاعری کو سعادت علی خاں کی مصاحبت نے ڈبویا"۔ اسی وجہ سے گمان غالب ہے کہ ریختی کا دیوان انشا نے لکھنؤ میں ترتیب دیا ہوگا۔ اگرچہ ریختی کی بنیاد دلی میں پڑ چکی تھی۔

انشا کا انجام زمانہ کی تلون مزاجیاں انسانوں کو ایک حالت پر نہیں رہنے دیتیں، آخر کار انشا کی شوخ مزاجی نے ان کو دربار سے علیحدہ کر دیا۔ قتیل کے رقعات سے پتہ چلتا ہے کہ وہ ۱۲۲۵ھ میں موقوف ہو کر خانہ نشین ہو گئے تھے۔ تذکرہ نویسوں نے حضرت انشا کا انجام لکھتے ہوئے قیاس کی بلند پروازی سے عجیب و غریب واقعات کے طوطی بنا بنا کر اڑائے ہیں مگر کسی تاریخ یا قدیم تذکرہ میں کہیں بھی یہ درج نہیں ہے کہ وہ جوگیوں کا لباس پہنکر خاک کے ڈھیر پر بیٹھے رہتے تھے۔ اور اُن کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرتے تھے۔

وفات اس ظریف و بذلہ سنج شاعر نے ۱۲۳۳ھ (مطابق ۱۸۱۷ء) میں انتقال کیا۔ بسنت سنگھ نشاط نے قطعہ تاریخ کہا جسکا آخری مصرعہ یہ ہے ؎

عمر فی وقت بود انشا گفت

مصحفی بھی اس کی دردناک موت سے متاثر ہوئے اور یہ کہے بغیر نہ رہ سکے:

یاد ہے مرگِ قتیل و مردنِ انشا مجھے ‏ مصحفی کس زندگانی پر بھلا میں شاد ہوں

ضروری تصحیح

"زمانہ" بابت ستمبر و اکتوبر ۱۹۳۲ء میں زیر عنوان "حفظانِ صحت کے چند اصول" جو مضمون شائع ہوا ہے ہمیں افسوس ہے کہ اس میں صاحب مضمون کا نام غلطی سے بجائے "رائے بہادر ڈاکٹر مہر نرائن ماتھر سول سرجن" کے "ڈاکٹر بہادر نرائن" درج ہو گیا ہے جو غلط ہے۔ ناظرین کرام تصحیح فرمالیں۔

[redacted]

تغیراتِ شخصیت

(مسٹر آئی۔ بی سکسینہ ایم۔ اے (آنرس)

پاک طینت روح کے علاوہ ایک شخص اُن سب اشیاء کا مجموعہ ہے جسکو کہ وہ اپنا کہہ سکتا ہے اُسکا جسم دماغ اسکی پوشش اور اسکے ارد گرد کی چیزیں۔ اسکی تہذیب لیاقت یا اسکی تعلیم۔ یہ تمام باتیں ملکر اس مقولہ کو ثابت کرتی ہیں کہ انسان اس سے کہیں زیادہ ہے جیسا کہ عام لوگ اسکو تصور کرتے ہیں۔ اگر اسکے ذاتی شوق میں کچھ تغیر ہوتا ہے تو وہ اُس اختلاف کو تھرما میٹر کی طرح فوراً خود بخود ظاہر کر دیتا ہے۔ کیونکہ انسان اپنے احساس کے مطابق دنیوی کاموں سے دلچسپی رکھتا ہے۔ اس احساس کی ایک دوسری صورت اور ہے جسکا ہمکو علم ہی نہیں ہوتا۔ ہم درد محسوس کرتے ہیں ہمکو فوراً اسکا علم ہو جاتا ہے لیکن کچھ ایسے بھی تغیرات دماغ میں ہوا کرتے ہیں جن سے ہم بالکل بے بہرہ ہو جاتے ہیں مثلاً روزمرہ زندگی میں ہم اپنے قدیمی دوست و احباب کا نام اکثر بھول جاتے ہیں بہت غور و خوض کے بعد نام یاد آتا ہے اس نام کی تلاش ہماری باطنی قوت ہمارے دماغ میں کیا کرتی ہے اور اسی طرح جب ہم کسی دوسرے کام میں مشغول ہوتے ہیں تو وہ نام دفعتاً سوجھ جاتا ہے جب یہ قوت عروج پر ہوتی ہے تو ہم اکثر اپنے میں ایک تغیر محسوس کرتے ہیں۔ اگر یہ تغیر بڑے طور کا ہوتا ہے تو ہماری شخصیت کا ڈھنگ بھی بڑا ہو جاتا ہے۔

شخصیت کا تغیر و تبدل عجیب و دلچسپ واقعہ ہے جسکے بارے میں مختلف لوگوں کی مختلف رائیں ہیں ہندوستان میں اگر کسی کی شخصیت میں یکایک تغیر ہو جاتا ہے تو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اسپر بھوت اور ہمزاد کا اثر ہے اُسکا مشکل سے مشکل امتحان لیا جاتا ہے۔ اور پھر آیتوں اور سیاروں کے ذریعہ اسکے مزاج کو طبعی حالت میں لانے کی کوشش کیجاتی ہے اہل ہند اس وہم کے پکے معتقد ہیں میرا چشم دید واقعہ ہے کہ ایک دفعہ نمونیا کے ایک مریض کو اسقدر جسمانی تکالیف دی گئیں کہ وہ چند گھنٹوں کے بعد ہی راہی ملک بقا ہوا امریکہ و انگلستان اور یورپ کے دیگر ممالک میں معالج اس معاملہ کی کافی چھان بین کر رہے ہیں اور اس مرض کے رفع کرنے میں کافی کامیابی بھی حاصل کر چکے ہیں۔ اس مضمون کے دیگر پہلوؤں پر غور کرنے سے قبل اُسکے چند دلچسپ واقعات تحریر کئے جاتے ہیں۔

ڈاکٹر ریگر (Dr. Rieger) ایک مریض کے بارے میں تحریر فرماتے ہیں کہ ستر سال سے اسکی زندگی میں

تغیرات ہوتے رہے کبھی وہ جیل میں اور کبھی پاگل خانے میں رکھا گیا لیکن ہر تغیر کیساتھ اُسکو اپنی گذشتہ زندگی کا علم نہیں رہتا تھا۔ اُن کا قول ہے کہ اسکے قبل مجھکو کسی شخص کے ذریعے سے ایسا عجیب و غریب تجربہ نہیں ہوا تھا۔ اس مریض کے متعلق یہ کہنا دشوار تھا کہ آیا اسمیں قوت ادراک یا حافظہ تھی بھی یا نہیں! انسان کو بذات خود ایسی حالت میں خیال کرنا تو بالکل ناممکن ہے۔ اُسنے آخری دفعہ نیون برگ (Nuinberg) کے مقام پر چوری کی تھی لیکن اسکو کچھ علم نہ تھا! اسکو عدالت اور ہسپتال میں حاضر ہونا پڑا۔ مگر اُسے یہ علم نہ تھا کہ وہ وہاں کیوں لایا گیا

ڈاکٹر الیگزنڈر (Dr. Alex. Canon) کینن لینسٹ (Lancet) اخبار میں ایک خاتون کے بارے میں تحریر فرماتے ہیں کہ تیرہ سال کے سن ہی سے اُسکو (Meningitis) دماغ کے پردے پر ورم کی شکایت ہو گئی تھی اور اسی زمانہ سے اسکی شخصیت میں تغیر ہونا شروع ہوا شخصیت کی میعاد کبھی کم اور کبھی بیش ہوتی رہی۔ اور سولہ مرتبہ تغیرات ہوئے جنمیں سے بعض حسب ذیل ہیں۔

۱۔ وہ اپنے کو "شئے" کہتی تھی۔ قوت حافظہ سے محروم تھی اور کھڑی نہیں ہو سکتی تھی۔

۲۔ وہ اپنے کو اولڈ نک (Old Nick) کہتی تھی۔ تیز طبع اور پُر از شرارت تھی۔

۳۔ وہ بہری اور گونگی تھی اور مرض بیہوشی میں مبتلا ہو جاتی تھی۔

۴۔ وہ لفظوں کا اُلٹا تلفظ اور ہجے کرتی تھی۔

۵۔ وہ بہت ہی خوف زدہ رہتی تھی۔

۶۔ وہ خود کو "عمدہ شئے" (Good Thing) کہتی تھی۔ وہ فرمانبردار اور طالب علم تھی لیکن کچھ لکھ پڑھ نہ سکتی تھی۔

۷۔ وہ خود کو حسین اور ٹام کی دلربا (Tom's Darling) یا خوفناک ظالم چیز کہتی تھی۔

۸۔ وہ خوبصورت تندرست اور دوشیزہ سے نوجوان ہو گئی۔ وہ خانگی کام بھی کرنے لگی۔ اور ٹائپ رائٹنگ (Type writing) سیکھنے کی بہت مشتاق تھی۔

ایک اور بھی عجیب و غریب واقعہ ڈاکٹر ریگر (Dr Reiger) نے تحریر فرمایا ہے۔

وہ پیچھے کی جانب سے لکھتی تھی اور کتابوں کو الٹا کر کے پڑھتی تھی۔ اسکو اگر ڈیر (Dear) لکھنے کو کہا جاتا تو وہ رائڈ (Raed) لکھتی۔ ضرب کرنے کی طاقت اسمیں مکمل تھی۔ اگر اسکو ۱۲۵۳ اور ۷۹ جمع کرنے کو کہا جاتا تو وہ کاغذ کو الٹ دیتی اور ۲۳۲ لکھتی۔ ایک کلنڈر (Calender) دکھلانے پر اُسنے کہا کہ ہاں ہندسے اور اعداد ٹھیک ہیں لیکن میں مہینہ کا نام نہیں بتلا سکتی جب وہ اُلٹا گیا تو مہینہ کا نام ٹھیک معلوم ہونے لگا۔ مگر اعداد اور ہندسے غلط ہو گئے۔ یہی حال نقشہ اوقات ریلوے

(Time Table) دکھلانے پر ہوا اُسنے اسٹیشنوں کے نام پڑھنے کے لئے اُسکو الٹ لیا۔ گر گاڑی کے پہونچنے کے اوقات اسکو معلوم ہوئے۔ گر جاگھر ہیں، وکتاب الٹی رکھتی تھی۔ اُس سے جب دریافت کیا گیا کہ ڈیون (Devon) کے کیا بجتے ہیں تو وہ بتا نسکی لیکن جب پھر پوچھا گیا کہ ناؤ ڈ (Nooed) کے کیا بجے ہیں تو اُسنے فوراً ڈیون (Devon) کے بجے بتلا دیئے۔

ایسا ہی ایک عجیب واقعہ ڈاکٹر ویئر مچل (Dr. Weir Mitchel) نے بھی لکھا ہے۔ میری رینالڈس (Mary Renolds) ایک کاہل و غمگین لڑکی تھی۔ ایک روز وہ اپنے حسب معمول صبح ہونے پر بھی ایسی غفلت کی نیند میں سوتی رہی کہ جگانا مشکل ہو گیا۔ ۱۸ یا ۲۰ گھنٹے ہونے کے بعد وہ اٹھی مگر وہ عالم لاعلمی یا مدہوشی میں تھی۔ قوت حافظہ کا پتہ نہ تھا۔ اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ دنیا میں پہلی دفعہ آئی ہے اور ہر کام کو پہلی دفعہ کر رہی ہے۔ وہ اپنے عزیزوں و اقربا کو حتیٰ کہ اپنے والدین کو بھی نہ پہچانتی تھی۔ اور نہ انکو اپنا مانتی تھی۔ اُسنے انکو کبھی پہلے شاید دیکھا تھا۔ اور نہ جانتی تھی اور نہ انکی بابت اسکو کچھ علم تھا۔ تعلیم کا پہلا سبق اُسے یہ سکھنا تھا کہ وہ اُن لوگوں سے کیا نسبت رکھتی ہے۔ اور انکے لئے اسکے کیا فرائض ہیں۔ دوسرے سبق میں اسکو پھر سے لکھنا پڑھنا سکھایا گیا۔ غمگین ہونیکے بجائے اب وہ از حد خوشدل تھی۔ اسی طرح پانچ ہفتہ گذر نیکے بعد وہ ایک دن پھر اپنی طبعی حالت پر آگئی۔ اُسکو اس تغیر کا ذرا بھی علم نہ تھا۔ چند ہفتوں کے بعد اسکی حالت پھر تبدیل ہو گئی اور دوسری شخصیت اختیار کر لی۔ اسی طرح کچھ مدت کے بعد اسکی حالت یکے بعد دیگرے کبھی پہلی طرح کبھی دوسری طرح ہو جایا کرتی۔

متذکرہ بالا حالتوں میں انسان کی دوسری شخصیت پہلی شخصیت کے مقابلہ میں ترجیح پاتی ہے۔ اس لئے پہلی شخصیت بہ تنزل ہو جاتا ہے۔ لیکن کبھی کبھی دوسری شخصیت میں دماغی حالت پہلی شخصیت کی دماغی حالت سے بہتر ہو جاتی ہے۔ (ہپناٹزم) یعنی عمل تنویم سے بھی یہی نتیجہ حاصل کیا جا سکتا ہے۔ گہری نیند میں سو جانیکے بعد ایک شخص کی موجودہ زندگی کے تمام حالات اسکے دماغ سے غائب کئے جا سکتے ہیں اور وہ بالکل ہی نیا شخص بنایا جا سکتا ہے۔ اسی طرح اسکے خیالات کی پریشانی اور دماغ کی بے ترتیبی دور کیجا سکتی ہے اور وہ پھر اپنی معمولی شخصیت میں لایا جا سکتا ہے۔ اس تبدیل کا احساس اسوقت ہوتا ہے جب کہ ہم اپنے گذشتہ حالات و کارناموں پر غور کرتے ہوئے اپنی شخصیت میں کچھ تغیر پاتے ہیں۔ ان حالتوں میں ہپناٹزم کے ذریعے سے بہت لوگوں کا کامیاب علاج کیا گیا ہے۔ اسیوجہ سے موسیو جینٹ نے (M. Janet) اسی بنیاد پر اصول قائم کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ اگر ایک بیہوشی کے مریض کے دماغ سے کسی خاص خیال کو ہٹا دیا جائے تو اسکے ساتھ ہی ساتھ تمام باتیں جو اُس خیال کے متعلق ہوتی ہیں فراموش ہو جاتی ہیں۔ ایک نوجوان مریض مسمیٰ لوئی ینجم (Louis V) کے حالات کو خوب غور کرنے کے بعد ایم ایم بُروَن اور بیورو (M.M. Burron & Burot) نے ایک بےنظیر کتاب لکھی ہے۔ ۱۸ ابرس کی عمر میں اُسکو

ایک کیڑے نے کاٹ لیا تھا جس کی وجہ سے اُسکے دونوں پیر مفلوج ہو گئے تھے ۔ اس زمانہ میں وہ بہت نیک اور شریف مزاج تھا لیکن ایکدن جب فالج سے شفا ہو گئی تو وہ اپنی تمام باتوں کو بھول گیا ۔ اسکی زندگی میں کئی بار ایسے واقعات ہوئے ۔ کتاب کے مؤلف فرماتے ہیں ۔ کہ ان ناولوں کا سبب بہت آسان اور صاف ہے ۔ وہ یہ ہے کہ انسان کے جسم و دماغ میں بہت ہی زبردست تعلق ہے اسلئے ایک حالت بغیر دوسرے کے علم کا بیان کرنا ناممکن ہے ۔ ڈاکٹر ایگر ۔ [illegible] ۔ (D) کی متذکرہ بالا لڑکی کے بارے میں یہ کہتے ہیں کہ دماغی خرابی کی وجہ سے وہ لڑکی بہری اور گونگی ہو گئی اور اسکے دماغ پر ایسا اثر پڑا کہ وہ لکھنا پڑھنا بھول جاتی تھی ۔

افسوس صد افسوس کہ ہندوستان میں ان بیکسوں کا علاج ہی نہیں کیا جاتا ۔ اور نہ انکی طرف کوئی توجہ دیجاتی ہے ۔ بکثرت ایسے مریض ملتے ہیں جنہیں تغیر شخصیت ہونیکی وجہ سے ایک غیر معمولی تبدیلی ہو جاتی ہے جسے اہل ہند آسیب سمجھتے ہیں اور اسی کے مطابق علاج کرتے ہیں ۔ اسمیں بھی شک نہیں کہ ہمارے یہاں اس مرض کے معالج بھی بہت کم ہیں ۔ اور جو موجود بھی ہیں انھیں اتنی فرصت نہیں ملتی جو ان بیماریوں کی جانچ کریں ۔ اس علم کے ماہروں کو لازم ہے کہ ایسے وقت میں وہ ان غریبوں کی مدد پوری طور سے کر کے نیک نامی حاصل کریں ۔

زندگی

(از ہری کرشن سکسینہ ۔ بی ۔ اے ۔ سی ۔ ٹی ۔ منشی کامل)

عاشقانِ غم کی عالم میں کہاں ہے زندگی
یہ نکیں وہ ہیں کہ جن کی لامکاں ہے زندگی

صیدِ ظلماتِ اجل ہے بندۂ حرص و ہوا
بیخودی میں ورنہ نورِ جاوداں ہے زندگی

پاس آنے دے نہ تو اپنے خودی کو بھول کر
ورنہ صیدِ کشمکش کی نیم جاں ہے زندگی

رفتہ رفتہ بامِ رفعت پر پہونچ ہی جائے گا
شوقِ صادق کیلئے اک نردباں ہے زندگی

بہرِ نظارہ فقط چشمِ بصیرت چاہیئے
بسطِ عالم میں مکینِ لامکاں ہے زندگی

زندگی ہے زندگی گر حل ہے رازِ زندگی
ورنہ اِک افسانۂ سود و زیاں ہے زندگی

حضرت صدرؔ لکھنوی کی تاریخ گوئی

(از منشی بشیشور پرشاد منورؔ لکھنوی)

منشی لچھمن پرشاد صاحب صدرؔ کے حالاتِ زندگی "زمانہ" ماہ جون ۱۹۳۲ء میں شائع ہو چکے ہیں۔ افسوس اس کے دو ماہ بعد ہی قدرت نے اُن کے فیضانِ سخن سے دنیائے ادب کو ہمیشہ کے لئے محروم کر دیا۔ جناب صدرؔ کی وفات ایک ایسے اہلِ کمال کی وفات تھی جس کی جگہ مشکل سے پُر ہو سکے گی۔

آپ کو فنِ تاریخ گوئی میں خاص کمال حاصل تھا اور ہندوؤں میں صاحب رائے صاحب آنجہانی کے بعد آپ ہی کو اس فن میں اس قدر کامل دستگاہ حاصل ہوئی۔

میں ذیل میں اس دعوے کے ثبوت میں جناب صدرؔ کی اُن معرکہ آرا تاریخوں سے ناظرین زمانہ کی ضیافت طبع کا سامان مہیا کرونگا جو ممدوح نے وقتاً فوقتاً اردو و فارسی زبان میں اکثر واقعات پر ارشاد فرمائی ہیں۔ یہ تاریخیں اُردو ادب کے جواہر پارے ہیں جن کے محفوظ رہنے سے آئندہ خاص خاص واقعات کے سالِ ظہور کا آسانی سے پتہ مل سکتا ہے۔

میرے خیال میں جناب صدرؔ کی ارشاد کردہ تاریخوں کی مجموعی تعداد پچاس ہزار سے کم نہ ہوگی ان میں سے اکثر تو مختصر تاریخیں ہیں اور بعض مفصل اور طولانی بھی ہیں۔

جناب صدرؔ کو عرصے تک میرے ہی ساتھ دلی میں رہنے کا اتفاق رہا اسلئے مجھے معلوم ہے کہ انھوں نے یہ تمام عرصہ یا تو مطالعہ کتب یا اپنے کلام کے انتخاب میں صرف کیا۔ اسی سلسلے میں اپنی تاریخوں کے مجموعہ پر بھی نظرِ انتخاب ڈالی اور آخری مسودہ جو آپ کے ہاتھ کا لکھا ہوا میرے پاس محفوظ ہے اُنھیں وہ تاریخیں درج ہیں جنھیں آپ نے پسند فرما کر بقائے دوام کا مستحق قرار دیا۔[1]

میں نے جو تاریخیں اس مضمون کے لئے منتخب کی ہیں وہ کسی نہ کسی لحاظ سے خاص اہمیت رکھتی ہیں بعض میں فنی خوبیاں ہیں بعض واقعات کے اعتبار سے اہم ہیں اور بعض مشہور و معروف ہستیوں سے متعلق ہیں

[1] جناب صدرؔ نے انتخابِ صدرؔ کے آغاز میں خود اس کے بارے میں لکھا ہے۔ انتخابِ صدرؔ کی تاریخ مشہور فارسی مصرع "قیاس کن ز گلستانِ من بہارِ مرا" اور ایک مصرع کے تتمہ کے ساتھ مصرع "ایں سعادت بزورِ بازو نیست" سے نکالی ہے۔

جناب صدر اپنی اُردو غزلیات کے مجموعہ موسومہ "چمنستانِ سخن" مجموعہ قصائد اور مجموعہ تواریخ کی جداگانہ ترتیب خود ہی فرما گئے ہیں، ان کے علاوہ چند مثنویاں بھی ہیں جن میں موصوف کی ندرت پسند طبیعت نے عجیب عجیب صنعتیں پیدا کی ہیں۔ افسوس ان میں سے کوئی مجموعہ ابھی تک کتابی صورت میں شائع نہیں ہوسکا۔ اور اگر یہ ادبی جواہرات کچھ عرصے یوں ہی پڑے رہے تو دیگر باکمال شاعروں اور ادیبوں کی طرح مرحوم کا کلام بھی دست برد زمانہ کا شکار ہو کر طاقِ نسیاں کی زینت بنجائیگا۔

مرحوم نے اپنے کلام کو نہایت محنت و جانکاہی کے ساتھ مرتب فرمایا تھا مگر اسکی اشاعت کی حسرت دل ہی دل میں لیکر چلے گئے۔ افسوس "اے بسا آرزو کہ خاک شدہ"۔

قناعت و گوشہ نشینی، استغنا مرحوم کی زندگی کی نمایاں خصوصیتیں تھیں، چنانچہ آپ نے ۱۹۲۷ء میں خسوفِ کامل یعنی پورے چاند گرہن کے موقعہ پر ایک تاریخی قطعہ کے سلسلہ میں اس کی طرف اشارہ کیا ہے، اسمیں مادۂ تاریخ مصرعۂ ذیل سے نکلتا ہے:-

عجیب خسوف تھا جسمیں مہ تمام چھپا

دیگر اشعار ملاحظہ ہوں:-

مرے کمال سے واقف نہیں ہیں بعض احباب ہے شاید اُن کی نظر سے مرا کلام چھپا
غزل، قصیدہ، مخمس، مسدس و قطعات چھپی ہے صدر کی ہر شے نہیں یہ نام چھپا
مَیں فارسی میں بھی اُردو کی طرح کہتا ہوں بہت چھپا ہے بہت سے مرا کلام چھپا
خدا کے فضل سے دیوان بھی مرتب ہے نہیں وہ چھپتا ہے جبتک ہے لاکلام چھپا
ملا کے شہ نے مجھے اپنی تاج پوشی میں دیا جو رتبہ نہیں نزدِ خاص و عام چھپا
سند عطا ہوئی، تمغا عطا ہوا مجھکو نہیں کسی سے بھی میرا یہ احترام چھپا
بہت فضول نہ بک صدر بزہ گو خاموش یہی ہے خوب رہے دہر میں جو نام چھپا

لہ راقم کے پدر بزرگوار حضرت آثمؔ مرحوم کو بھی اس قسم کی عزت حاصل ہوئی تھی۔ جناب صدر نے اس سعید موقعہ پر جو قصیدہ لکھا تھا اُس کے آخری شعر سے تاریخ برآمد ہوتی ہے۔

شعر آخر میں لکھے دو مادے تاریخ کے دونوں ہیں بے تعمیہ بے تخرجہ ہم مرتبہ
جب ملے اک دوسرے کے مہملات و معجمات دوستوں کا پھر ہوا آپس میں توام مرتبہ
عیسوی میں اک عدد کم اور سمت میں فزوں بس برابر ہوگیا دونوں کا باہم مرتبہ
سکہ زر بر سیم حیدر از فضل ربِ جن و انس جارج پنجم قیصرِ ہندوستاں ہم مرتبہ

۱۱ و ۹ پہلا مصرعہ از مصرعہ کامل ۱۹۱۲ ... احروف معجم ۹۳ ... حروف مہملہ دوسرا مصرعہ سمت بکرمی از مصرعہ کامل ۲۷۶ ... از حروف معجمہ ۱۰۹۱ از حروف مہملہ

بابت نومبر ۱۹۳۳ء

ردیف کی مشکلات کے باوجود کس قدر صفائی اور سلاست کے ساتھ آپ نے اپنے متعلق تمام حقیقت حال بیان کی ہے۔

جب پہلی مرتبہ نواب سر محمد احمد سعید خاں صاحب نواب چھتاری ہوم ممبر صوبہ متحدہ گورنری کے عہدۂ جلیلہ پر فائز ہوئے تو جناب صدر حیات تھے آپ نے اس تقریب میں یہ لاجواب تاریخ ارشاد فرمائی ہے:-

نکو [illegible] ابتدائے منصب از رئیس چھتاری نیک — سپاس از لیکہ زیبد لے صدر ایزد ارض و آسماں را

از اول [illegible] اولوالعزم در صوبہ [illegible] الفتہ — گورنری اوّلاً مبارک محمد احمد سعید خاں را

اس تاریخ کے ہر مصرعہ کے اعداد سے ۱۹۳۳ء پیدا ہوتا ہے

علیا حضرت ملکہ وکٹوریہ قیصرۂ ہند کی تاریخ وفات میں مرحوم کے دل و دماغ کی کاوش ملاحظہ ہو:-

اے فلک اے ظالم اے بدخو [illegible] — ہر چہ از دست تو بر عالم جفا شد ہائے ہائے

یک جہاں [illegible] تجھ [illegible] — ساخت گیتی نظیر کربلا شد ہائے ہائے

اے ستمگر [illegible] جور [illegible] — ہر کسے در حسرت و غم مبتلا شد ہائے ہائے

از [illegible] آئین [illegible] — من نمی دانم چرا اے بدخو ترا شد ہائے ہائے

اے جفا جو [illegible] ستم [illegible] — شیوۂ تو مردم آزاری چرا شد ہائے ہائے

قیصرۂ وکٹوریہ کو [illegible] تاج و تخت — ایں چہ کردی کشتی بزیر خاک پا شد ہائے ہائے

وائے [illegible] — کاں دو تاریخ وفاتش برملا شد ہائے ہائے

بہ یکشنبہ [illegible] بیست [illegible] — تمام ازیں دہر امپرس وکٹوریا شد ہائے ہائے

۱۹۰۱ء ۱۹۰۱ء

استاد فصیح الملک حضرت داغ دہلوی کی تاریخ وفات یہ ہے:-

جہاں استاد داغ دہلوی حیف — ز دنیا عزم گلزار ارم کرد

فصیحے بود در گیتی [illegible] — [illegible] پیش او سر تسلیم خم کرد

دلم [illegible] لوح [illegible] — سنین رحلتش باید رقم کرد

[illegible] کلک صدر زار و غمگین — مزار داغ ہندی مرتسم کرد

جناب صدر کی اہلیہ محترمہ ایک مرتبہ پلیگ کے عارضہ میں مبتلا ہوئیں لیکن فضلِ کریم سے صحت یاب ہو گئیں۔ اس واقعہ کی کیسی اعلیٰ تاریخ ارشاد کی ہے۔-

پلیگ را سر دیا قطع کردہ صدر نوشت

رسیدہ بود بلائے ولے بخیر گزشت

۱۹۰۷ء

ایک مرتبہ دریائے گومتی میں سخت طغیانی آئی، صنعت زبر و بینات میں آپ کو اس کا مادہ لفظ "طغیانی" سے ہاتھ آیا، فرماتے ہیں:-

بشہر لکھنؤ در آخر ماہ صفر ناگہ ز طغیانی چو آب گومتی گردید طوفانی
پئے تاریخ ہجری ہاتف غیبی بمن گفتا بگو در بینات وہم ز بر اسے صدر طغیانی
۱۳۰۹

اکتوبر ۱۹۱۰ء میں ایک عظیم ٹڈی دل بلائے بے درماں کی طرح چاروں طرف آسمان پر چھا گیا اس واقعہ کی کیسی دلچسپ تاریخ ہے:-

اتفاقاً بہ ماہ اکتوبر شد ملخ ہا پدید بیش از بیش
ہر کس از صدر خواست از من سال سر ملخ سر بریدہ کردم پیش
۱۹۱۰ء

تین بار لفظ ملخ کہنے سے ۲۰۱۰ اعداد برآمد ہوتے ہیں اسمیں سے ۱۲۰ اعداد کا تخرجہ کس قدر خوبصورتی سے کیا گیا ہے یعنی اسمیں سے حرف میم کے اعداد لفظ ملخ سے خارج کر دیے گئے ہیں۔ صنعت کی صنعت ہے اور واقعہ کا ایک دلچسپ طریقۂ اظہار بھی "سر ملخ سر بریدہ کردم پیش" کتنا اچھوتا خیال ہے۔

مظفر الدین شاہ قاچار شاہ کجکلاہِ ایران کے جلوس کا مادۂ تاریخ "مظفر الدین" نکالا تھا۔
۱۳۰۲

راقم الحروف کے چھوٹے بھائی بشن پرشاد مقدہ کے یہاں دوسرے فرزند کی ولادت پر جناب صدر نے کیا خوب تاریخ فرمائی تھی، افسوس یہ بچہ اب زندہ نہیں ہے۔

ز گلستان مقدہ دوبارہ گل بشگفت

۱۹۲۵ء میں عالیجناب مہاراجہ سر کرشن پرشاد بہادر کو دوبارہ وزارت عظمیٰ شاہ دکن کا فخر حاصل ہوا تو اس تقریب کے سلسلے میں بھی متعدد تواریخ فرمائی گئیں جنمیں سے یہ تاریخ خاص طور پر ممتاز ہے۔

باز مہاراجہ بکرسیِ وزارت بنشست (۱۹۲۵ء)

جنگ جرمنی کے بعد ترکی و برطانیہ کے درمیان جو صلحنامہ ہوا اسکا سال تاریخ یہ ہے:-

باز صلح خسروِ ہند است با سلطانِ روم
۱۹ ۶ ۲۳

مہارانا بھوپال سنگھ والیِ ریاست اودے پور کا سال جلوس یہ ہے:-

(۱) دل و جاں کو کیا خوش آپ نے فرماں روا ہو کر ۱۹۳۰ء

(۲) خوشی سے آپ کو فرماں روا ہونا مبارک ہو (اسمیں ایک عدد کا تعمیہ ہے)

شاہ غلام رسول جو ایک باکمال اور خدا رسیدہ بزرگ تھے، ان کے وصال کی تاریخ کیا خوب کہی ہے۔ ہر مصرعہ سے تاریخ نکلتی ہے۔

زاں سالکِ یگانہ غلام رسول شاہ — نزدیکِ راہِ معرفت و وجد وحال شد

[illegible] ۱۹۲۰ء — [illegible]

از دہر چار شنبہ دہم چارم رجب — شد شیخ دیں بیارِ حقیقی وصال شد

۱۲۷۰ — [illegible]

ایک بزقصاب کا سالِ وفات ملاحظہ ہو۔

گشت مذبوحے بسا طورِ فنا

۱۸۰۵ء [illegible]

سابق سلطان اودھ واجد علی شاہ کی وفات پر جنابِ صدر کی طبع رسا نے کیسی کیسی لاجواب تاریخیں کہی ہیں:-

ہزار حیف کہ واجد علی شہ جم جاہ — سفر نمود ازیں خاکداں بسوے جناں

بحرف معجمہ بنوشت صدر سالِ مسیح — گزیدہ سیرِ ارم اخترِ ثریا شاں

برفت از دہر چوں سلطانِ عالم — جہاں ویرانہ شد، آباد تربت

پے تاریخ لوحِ مرقدِ لے صدر — خرد گفتا۔ منور باد تربت

برفت از دہر چوں واجد علی شاہِ سکندر فر — پے تاراج دلہا لشکر حزن و ملال آمد

بحرفِ معجمہ شد سنوی تاریخ دو صورت — ہزار و ہشت صد ہشتاد و ہفت، اعدا بسال آمد

۱۸۸۷ء

والیِ دریا شاہِ اودھ کا دم میں کام تمام ہوا — حیف کہ جورِ فلک سے آخر سب کا عیش حرام ہوا

سنوی ہجری کیلئے تھی صدر جو بزمِ دلگداز آہ — سالِ اٹھارہ سے ستاسی شہرِ عزا، الہام ہوا

منشی جواہر سنگھ صاحب جوہر کا نام نامی دنیائے سخن میں مشہور ہے۔ آپ ہفت دیوان شاعر اور مرزا غالب کے ہمعصر تھے اور اُردو اور فارسی میں آپ کا فضل و کمال ضرب المثل ہے۔ خواجہ وزیر سے اُردو میں شرف تلمذ حاصل تھا اور علامہ گل محمد ناطق مکرانی مغفور سے فارسی میں۔ جناب جوہر کے حالات و کلام شعرائے مختلف تذکرات میں مختصراً درج ہیں۔ صاحبِ خمخانۂ جاوید نے ان کے لئے کئی صفحے وقف کئے۔ آپ گھوڑے سے گر کر راہگرائے عالمِ جاودانی ہوئے تھے۔ جنابِ صدر نے آپ کی وفات پر بھی کئی تاریخیں لکھیں چنانچہ ان میں سے ایک تاریخ درج ذیل ہے:-

شاعرِ سحر بیاں بود جواہر سنگھ آہ — از جہاں رفت و بجنت شدش آباد رواں

صدرِ غمدیدہ ہمیں مصرعۂ تاریخ نوشت — جوہر از اسپ بیفتاد و رواں شاد رواں

۱۳۱۱ھ

میڈیکل کالج لکھنؤ کی تعمیر کے موقع پر فرمایا:-

آمد ایں جا چو شاہزادۂ ویلز — قائم ایں درسگاہ طب گردید

زد رقم صدر عیسوی تاریخ — یادگاریست بے نظیر و جدید

۱۹۰۵ء

اُردو خوب و زیبا ہے یادگارِ عظیم

مولانا محمد ہادی عزیز لکھنوی کے دولتکدہ کی تعمیر پر کیا خوب تاریخ فرمائی ہے:۔

دولت کدۂ عزیز آباد بخیر است

اس کے علاوہ "عشرت سرائے عزیزؔ" اور "فردوس بر روئے زمین است" سے بھی تاریخ ہجری برآمد ہوتی ہے۔ شیعہ دار الیتامیٰ لکھنؤ کی تعمیر کی بھی کئی تاریخیں لکھی ہیں:۔

شیعہ دار الیتامیٰ مبارک ۱۳۴۵ھ

مسعود انام شیعہ دار الایتام "

ہے شیعہ یتیم خانہ نیکو انجام "

شیعہ یتیم خانہ مقام بزرگ ہے ۱۹۲۶ء

برادری کے ایک ہونہار نوجوان مسٹر سکھدیو پرشاد سکسینہ بی اے۔ ایل ایل۔ بی کی وفات کے بعد موصوف کے والد نے ایک مکان ان کی یادگار میں تعمیر فرمایا اور جناب صدر سے اس کی تاریخ کہنے کی فرمایش کی۔ چنانچہ آپ نے مصرعۂ ذیل لکھا:۔

دریغ از پدر یادگارِ پسر

برادری میں ایک صاحب لالہ گنگا پرشاد کے یہاں گائے کا بچہ پیدا ہوا، بطور مزاح جناب صدر نے یہ مادۂ تاریخ نکالا:۔

خوب بچہ ہے خوبصورت گاے

۱۹۱۹ء / ۱۳۳۸ ہجری

اپنے استاد مکرم قبلہ رائے خیراتی لال شگفتہ کی وفات پر جو مرزا تسنیم دہلوی کے ارشد تلامذہ میں سے تھے کیا خوب تاریخیں لکھی ہیں:۔

قبلہ و کعبہ شگفتہ اوستاد بجناں رفت و غم شد پابوس

صدر بارو سے ام سال نوشت حضرت اقدس واعلیٰ افسوس

یا

گفت لبیک بہ اجلِ اجمل ہائے استاد شگفتہ اے وائے

صدر تاریخ وفاتش بنوشت وائے استاد شگفتہ اے وائے

زبان فارسی کے بے مثل مغفور سید محمد صادق عرف آغا حاذق کی وفات حسرت آیات پر کس قدر عقیدت آمیز تاریخ ارشاد فرمائی:۔

برفت از جہاں وائے سید محمد — کہ بود ست نامی بآغائے حاذق
یگانہ بس مہرباں بود بر من — زلطفم نیامد سراپائے حاذق
دل ناصبورم بہ ہر گونہ برزن — چو دید انگانست جویائے حاذق
رقم کرد صدر حزیں سالِ فوتش — الٰہی بود در ارم جائے حاذق

۱۳۲۶ھ

زمانہ بابت جون ۱۹۳۲ء کے مضمون میں میں نے لکھا تھا کہ حضرت آغا حجر کے لکھنؤ سے ریاست رامپور چلے جانے کے بعد جناب صدر اپنا فارسی کلام خواجہ عزیز الدین مرحوم عزیز کشمیری لکھنوی کو دکھاتے رہے جناب عزیز کے کمالاتِ فن کا آج تک ایک زمانہ قائل ہے، ایک فاضل جید اور استاد باکمال تھے اور مستند شعرا میں شمار تھا۔ ان کی وفات حسرت آیات پر جناب صدر نے فرمایا :-

کنوں وحیدِ زمن خواجہ عزیز الدین — سفر نمود ز دارِ فنا چو ناگاہاں
نوشت صدر حزیں مصرعِ سنین وفات — عزیز مصر کمالات آہ شد پنہاں

۱۳۴۳ھ

دیگر

ناگہاں کرد عزیز آہ جہاں را پدرود — کس بتشیراز و صفاہاں نبود ثانی او
صدر غمدیدہ رقم زد پے تاریخ وفات — رفت روشن زبانِ دری افتاد فرو

۱۳۴۳ھ

رائے بہادر منشی پراگ نراین بھارگو مرحوم کی تاریخ وفات "جناب رائے بہادر چار بار بگو

۱۹۱۶ء

"دو بار رائے بہادر پراگ نراین" میں فرمائی گئی تھی۔

۱۹۱۶ء

میرے والد مرحوم جناب افق لکھنوی کی وفات کا مادۂ تاریخ ملاحظہ ہو۔

برہنہ سر ہو گئے احباب لکھا سال فوت — دہر سے وہ بلبلِ باغِ معانی اُٹھ گیا

سن فصلی میں مادۂ تاریخ "منشی دوار کا پرشاد افق" میں تھا۔ اس کے علاوہ "حیف منشی دوار کا پرشاد افق ہمعصرِ من" اور "بود منشی دوار کا پرشاد افق معنی شناس" سے سال عیسوی ۱۹۱۳ء برآمد ہوتا تھا۔

۱۹۰۳ء کا ذکر ہے کہ صاحب عالم شاہزادہ مرزا سلیماں قدر بہادر خلف شاہ امجد علی شاہ بادشاہ اودھ کو ایک مقدمہ میں فتح حاصل ہوئی۔ جناب صدر نے اس کی یہ تاریخ نکالی :-

فارسی :- لافتیٰ الا علی لاسیف الا ذوالفقار

اردو :- مبارک فتحمندی ہو برائے صاحبِ عالم

معلوم ہوتا ہے کہ کسی زمانہ میں جناب صدر کو راجہ درگا پرشاد صاحب مرحوم (متخلص بہ مہر) تعلقدار سندیلہ کی ملازمت کا بھی شرف حاصل ہوا تھا کیونکہ ایک تاریخ میں فرماتے ہیں :-

تاریخ ملازمت بنام والا ست بادانش وجود راجہ درگا پرشاد

ہز اکسلنسی مہاراجہ سرکشن پرشاد باتقابہ کو جب اعلیٰحضرت نظام دکن میر محبوب علی خاں کے زمانہ میں خلعت وزارت حاصل ہوئی تو آپ نے فرمایا:۔

مبارک شاد کو اعلیٰ وزارت
۱۳۱۹ھ

بیگم صاحبہ بھوپال جب حج بیت اللہ سے واپس آئیں تو اپنے ہمراہ غلافِ کعبہ بھی لائیں جناب صدر نے اس کی تاریخ "امیدِ جہاں غلافِ کعبہ" میں نکالی۔
۱۳۲۲ھ

۱۹۰۷ء کی سیاسی تحریک کے سلسلہ میں لالہ لاجپت رائے مرحوم اور سردار اجیت سنگھ جلاوطن کرکے برہما بھیجدیے گئے تھے، ان کی رہائی پر جناب صدر نے یہ لاجواب تاریخ فرمائی

لاجپت رائے واجیت سنگھ ہوے داخل ہند — کشن و بلرام جیسومت کی سرن میں پہونچے
لاجپت رائے واجیت سنگھ ہوے داخل ہند — یہی تاریخ مری بزمِ سخن میں پہونچے
۱۹۰۷
وہ سیمی تھے یہ ہیں بے سرا دا سمت — آج غربت زدہ اصحاب وطن میں پہونچے

۱۹۰۷ء میں امیر حبیب اللہ خاں غازی افغانستان کی تشریف آوری ہند کے موقع پر جناب صدر نے ان کا یوں استقبال کیا:۔

بعہد لارڈ منٹو وائسرائے ہند باشوکت — شہ کابل حبیب اللہ خاں آمد بہندستاں
دو تا تاریخ نذر میہمان و میزباں کردم — ضیافاتِ حبیبی۔ جشنِ قاآن عظیم الشاں
۱۳۲۴ھ ۱۹۰۷ء

مندرجہ ذیل قطعہ کے ہر مصرعہ میں تاریخ ہے:۔

بہ اہلِ ہند را ممنونِ خود کرد — شہِ کابل افادت دستگاہے
سنینِ مقدمش ایں باشد از صدر — حبیب اللہ خاں دیندار شاہے

ہز اکسلنسی لارڈ ہارڈنگ وائسرائے و گورنر جنرل ہند جب فضل ایزدی سے بم کے حملہ سے بال بال بچ گئے تو جناب صدر نے فرمایا:۔

خوب دشمن سے بچے زندہ گورنر جنرل
۱۹۱۲ء
یا:۔ شفا پائیں حضور، ارباب کیں اپنا کیا پائیں

۱۹۱۷ء میں سلسلۂ تحریک سیاسی ڈاکٹر اینی بیسنٹ مرحومہ، مسٹر آرنڈیل اور مسٹر واڈیا کو حکومت نے نظربند کردیا تھا۔ اُن کی رہائی پر جناب صدر نے مصرعۂ "عدل قیصر سے نظربندوں کی آزادی ہوئی" تاریخی مصرعہ کہا۔

اسی طرح بعض اور تاریخیں قابل غور ہیں، طوالت کے خوف سے عبارت آرائی سے اجتناب کیا جاتا ہے:-

تاریخ فتحیابی حکومت برطانیہ بمقابلہ جرمنی

بے دل از میدان شدند اعدا سپر انداختہ ۱۹۱۸ء

جابج پنجم شاہ والا جاہ نے پائی ظفر

عدوے سیہ زا پر جابج پنجم نے ظفر پائی

تاریخ صلحنامہ برطانیہ وجرمنی:-

شد بعد فتح صد شکر بالفعل صلحنامہ ۱۹۱۹ء

تاریخ تقرر لارڈ سنہا آف رائے پور بہ عہدۂ گورنری

از ملک شایاں خطاب لارڈ سنہا یافتہ ۱۹۱۹ء

تاریخ رئیس الاحرار مولانا محمد علی و شوکت علی کی رہائی کے موقع پر

محمد علی شاد و شوکت علی خوش ۱۹۲۰ء

تاریخ وفات فدائے وطن پنڈت موتی لال نہرو (اس تاریخ کے چوتھے اشعار نہایت رقت انگیز ہیں)

لکھی صدر نے نجاں نے عیسوی تاریخ خوب ہو گئی بے وقت موتی لال نہرو کی وفات ۱۹۳۱ء

اس میں دو عدد کا تخرجہ صدر نیجاں سے کیا ہے۔

تاریخ وفات لالہ سریرام ایم۔اے مصنف خمخانۂ جاوید:-

احبا کو ہے اب شیون کدہ خمخانۂ ساقی ۱۹۳۰ء

سب کو ماتم کدہ خمخانۂ جاوید ہوا ۱۹۳۰ء

تاریخ وفات مہاراجہ صاحب محمود آباد (بہ تمیز یک عدد)

در جناں رفت مہاراجہ محمود آباد۔ ۱۳۵۰ھ

(بہ تخرجہ یک عدد)

اٹھا جہان سے صد افسوس اک امیر کبیر ۱۳۵۰ھ

دلی میں ایک بندر بجلی کے تار سے پھنسکر مر گیا اسکی تاریخ "قضا کا تار تھا" میں ہے۔

تاریخ فتحیابی شاہ نادر خاں بہ بچہ سقہ

یافتہ بر بچہ سقہ فتح نادر بادشاہ

ادیب معروف مسٹر حامد علی خاں بیرسٹر لکھنوی کی وفات کا سال "جناں شد منزل حامد علی خاں" ۱۳۴۹ھ میں ہے۔

تاریخ وفات مسٹر سی۔آر۔داس:۔ "دار الفنا سے اٹھ گئے سی۔آر۔داس"

تاریخ وفات شیر پنجاب لالہ لاجپت رائے مرحوم ؎

(۱) از روے الم بغور صدر انیے سال بنوشت کہ لالہ لاجپت رائے دریغ ۱۹۲۸ء

(۲) غم سے منہ عبارت کا اترا صدر نے لکھا یہ سال دم میں اک حسرت کدہ عبارت ہوا بے لاجپت ۱۹۲۸ء

تاریخ وفات مولانا محمد علی:۔

(۱) چو رفت از دار فانی بے سر انکار بنوشتم بہ لندن داد جاں آں جوہر شمشیر حریت

(۲) "زیں مکاں رفت بفردوس رئیس الاحرار" ۱۹۳۱ء

(۳) "حاج محمد علی رفت بجنت" ۱۳۴۹ھ

(۴) شد محمد علی بخلد افسوس ۱۳۴۹ھ

(۵) جاں داد بشہر لندن او آہ دریغ

تاریخ وفات سر الگزینڈر مڈیمین بہادر گورنر صوبہ متحدہ:۔ "مغفرت ہو جناب عالی کی" ۱۹۲۸ء

تاریخ وفات شہید قوم جتیندر ناتھ داس:۔ "نہ ہے بخت ان کو مر کے زندۂ جاوید ہونا تھا" ۱۹۲۹ء

تاریخ وفات مسیح الملک حکیم اجمل خاں صاحب:۔ "آہ اجمل خاں وآہ شانِ مسیحائے زمن" حکیم صاحب کی وفات پر اور بھی متعدد تاریخیں ہیں۔

تاریخ وفات علیا حضرت نواب سلطان جہاں بیگم بھوپال:۔

"شد سوے جناں رحلت سلطانِ جہاں والے" ۱۳۴۸ھ

"سلطان جہاں رفتہ بجنت" ۱۳۴۸ھ

تاریخ وفات سید جالب ایڈیٹر ہمدم

"سوئے فردوس رفت جالب افسوس" ۱۳۴۹ھ

"فات لیثق طاب ثراہ" ۱۳۴۹ھ

"مرد لائق بمرد طاب ثراہ" ۱۳۴۹ھ

تاریخ وفات ہز ہائی نس نواب سر حامد علی خاں بہادر: الی رامپور

(اردو) ہوا جو بیدل زمانہ نے صدر لکھی تاریخ سال رحلت کہ مسند آرائے رامپور اب مقیم خلد بریں ہوا ہے ۱۳۴۹ھ

(فارسی) رقم زد صدر از روے الم سال — بر دائے ولیے سر حامد علی خاں ۱۳۴۹ھ

۱۹۲۹ء میں لارڈ ارون پر جو حملہ کیا گیا تھا اسکے سلسلے میں کیا خوب تاریخ فرمائی ہو:-

حملہ دشمن کردہ بر ہزاکسلینسی وائسرائے — حیف نشد آں لعین در قدرت حق مرگ فریست

صدر و ہمچو نوشت از مصرع استاد سال — ہم نگہباں را قوی تر ہست اگر دشمن قوی است
۱۹۲۹ء

پنڈت برج نراین چکبست کی تاریخ وفات کے مادے حسب ذیل ہیں:-

"شد ازیں خطہ و سرمست پے حب وطن"
۱۹۲۶ء
"ز عالم ہاے شد چکبست پنڈت برج نارائن"
۱۹۲۶ء
"گئے آہ غربت سے باغ جناں میں"
۱۹۲۶ء

آنریبل پنڈت گوکرن ناتھ کی وفات کے بعد جسٹس پشیشر ناتھ سری واستو کے تقرر کا مادہ سال کیا خوب نکالا ہے:-

"آج سے مسٹر پشیشر ناتھ جسٹس ہو گئے"

سوامی شردھانند جی کے قتل کی تاریخ علامہ ہر گوپال تفتہ کے ایک مشہور مصرعہ میں دریافت کی ہے:-

چو افزودم بالا ہجستہ ایں تاریخ حاصل شد
محبت کربلاے ہست باید شد شہید اینجا
۱۹۲۶ء

استاد مکرم جناب نظر مرحوم کی وفات کا مادۂ تاریخ "حیف بُد او شاعر کامل نظر"

جناب صدر کی وفات کے چند ماہ قبل عالیجناب خان بہادر نواب سر مزمل اللہ خاں بہادر رئیس بھیکم پور کی نظر عنایت اُن کی طرف ہو گئی تھی۔ نواب صاحب موصوف کو بھی حضرت صدر کی طرح آغا حجر ایرانی سے شرفِ تلمذ حاصل ہے چنانچہ آپ نے کئی ماہ تک جناب صدر کی مالی اعانت فرما کر ان کی کس مپرسی کے زمانہ میں برادرانہ دستگیری فرمائی۔ اس سلسلے میں جناب صدر نے ایک قطعہ تاریخ فارسی زبان میں نواب صاحب کی خدمت میں ارسال کیا تھا، ملاحظہ ہو:-

برادرے چو محمد مزمل اللہ خاں — نکرد مادر گیتی بنا فرید خداے

نوشت صدر بہمچو سنین الطافش — گرفت دست چنانم کہ تا فتم نہ زپاے
۱۹۳۲ء

مذکورہ بالا تواریخ زیادہ تر وفات کے متعلق ہیں، شادی و خوشی نیز دیگر تقاریب کے سلسلے میں بھی بیشمار تاریخیں ہیں جو زیادہ تر والیان ریاست کے جلوس وغیرہ سے متعلق ہیں۔ اکثر قصائد ایسے ہیں جن کے ہر مصرعہ سے تاریخ نکلتی ہے۔ مگر بخوفِ طوالت یہاں نظر انداز کیجاتی ہیں۔ نواب بھوپال

کے جشن جلوس پر آپ نے جو تاریخ فرمائی تھی وہ زمانہ کے اوراق کی زینت ہو چکی ہے، اس کے ہر مصرعہ سے تاریخ نکلتی ہے۔

جناب صدر نے اپنے فرزند اکبر کی وفات کے سلسلے میں متعدد تاریخیں لکھی ہیں اور ان میں مرثیہ کا رنگ کوٹ کوٹ کر بھرا گیا ہے، ان تاریخوں کا مجموعہ "یادگار بیکا پرشاد" کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ اس لئے ان کا انتخاب غیر ضروری سمجھا گیا۔

آخر میں میں بھی اپنی دو تاریخیں درج کرتا ہوں جو جناب صدر کی وفات حسرت آیات کے موقع پر تصنیف کی گئی تھیں تاکہ یہ مضمون کسی حد تک بجائے خود مکمل ہو جائے۔

گریم کہ شد ز دارِ فنا ارتحالِ صدر — باقی است در جہاں سخنِ لازوالِ صدر
صدرش ز مرگِ لختِ جگر ریش ریش بود — پایاں نہ داشت قلزمِ حزن و ملالِ صدر
قدرش نہاں نہ بود نگاہِ ادیب را — داند خال خال بہائے کمالِ صدر
در حیرتم کہ لوح جبینش چہ کندہ بود — دارد ہزار پہلوئے حسرت مآلِ صدر

شد سر بریدہ چوں اجل امروز بہر سال
گو کس بگفت، وائے غمِ انتقالِ صدر
۱۹۳۲ء

اس طرح جذبۂ پنہاں ہے منور ظاہر — ٹھیس سی دل میں اک ایذائے غمِ صدر سے ہے
فکر کیا اور کریں جب نہ ٹھکانے دل ہو — سالِ تاریخ جواں وائے غمِ صدر سے ہے
۱۳۵۱ھ

فکرِ معصوم یا مقدس کلیاں

یہ چھوٹی تقطیع میں ایک جزو کا مختصر رسالہ ہے جس میں ایم انیسہ صاحبہ دہلوی دختر جناب حکیم محمود علی خاں صاحب ماہر فراشخانہ دہلی کی حمد و نعت میں چند نظمیں ہیں جو مسلمان بچوں اور بچیوں کے پڑھنے کے لئے اچھی ہیں۔ شائقین حکیم محمود علی خاں صاحب ماہر فراشخانہ دہلی سے طلب فرمائیں

راجیندر پرساد صدر کانگریس

(از مسٹر سچدانند سنہا بیرسٹر ایٹ لا۔ ایڈیٹر "ہندوستان ریویو" سابق ممبر مال گورنمنٹ صوبہ بہار[1])

"اگرچہ اُن کے شاندار کارنامے، حیرت انگیز قابلیت اور غیر معمولی فصاحت سبھی ہماری تعریف کے مستحق ہیں لیکن درحقیقت اُن کی عظمت کا انحصار محض ان باتوں پر نہیں ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ عوام اُن سے بخوبی واقف ہیں، وہ جانتے ہیں کہ انھیں ان کے ساتھ کیسی گہری ہمدردی ہے اور اُن کے دل میں اس فرض کے ادا کرنے کی خواہش کے علاوہ اور کوئی بات نہیں ہے کہ وہ عوام ... مفاد کو ایمانداری کے ساتھ ترقی دیں اور خواہ وہ کسی خاص مسئلہ پر صحیح رائے قائم کریں یا غلط (سہو و خطا تقاضائے بشریت ہے جس سے کوئی شخص بری ہونے کا دعویٰ نہیں کر سکتا)، لیکن لوگ تمام و کمال جانتے ہیں کہ ان کی نیت ہمیشہ نیک اور خیالات پاکیزہ ہوتے ہیں اور ... ... ستبازی اور دیانتداری سے عوام کی خدمت کرنا چاہتے ہیں۔"

اِن الفاظ میں برطانیہ کے نامور لارڈ چانسلر وائیکاؤنٹ سیلبورن نے ایک یادگار موقعہ پر مدبر اعظم ولیم ایورٹ گلیڈاسٹون کی پبلک خدمات کا ذکر کیا تھا۔ یہی الفاظ آج غیر معمولی مناسبت کے ساتھ بابو راجیندر پرساد کے کیرکٹر اور پبلک خدمات کے متعلق وہ لوگ استعمال کر سکتے ہیں جن کو راقم الحروف کی طرح سالہا سال ان کے حالات سے نہ صرف ایک ترک موالاتی کانگریسمین کی حیثیت سے بلکہ زندگی کے مختلف پہلوؤں میں بخوبی واقفیت حاصل ہے۔ اس مضمون میں موصوف کے محاسن و معائب کی ایک سچی قلمی تصویر پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ کیونکہ میں سمجھتا ہوں کہ جتنی صحیح تصویر کھینچونگا اُتنی ہی زیادہ اُن کی تعریف کر سکونگا۔

(۲)

راجیندر پرساد انڈین نیشنل کانگریس قائم ہونے سے ایک سال قبل یعنی ۳۔ دسمبر ۱۸۸۴ء کو پیدا ہوئے تھے۔ آپ شمالی بہار کے ضلع سارن کے ایک معزز کالستھ خاندان کے رکن ہیں آپ کے باپ منشی مہادیو سہائے زمیندار تھے۔ راجیندر پرشاد اُن کے پانچویں اور سب سے چھوٹے

[1] صاحب موصوف نے اس مضمون کو انگریزی میں لکھکر عنایت فرمایا ہے۔ اسکا اُردو ترجمہ دفتر "زمانہ" میں ہوا ہے اور ترجمہ کی پوری ذمہ داری ایڈیٹر پر ہے۔

بیٹھے ہیں۔ اس وقت صرف ان کی بڑی ہمشیرہ موجود ہیں۔ چند ہی ماہ ہوئے کہ آپ کے بڑے بھائی مہیندر پرساد کا جو آپ کو باپ کی طرح چاہتے تھے انتقال ہو گیا۔ آپ اس ناقابل تلافی صدمے سے بہت زیادہ متاثر ہوئے۔ مہیندر پرساد ایک مشہور و ممتاز قومی کارکن تھے۔ انھوں نے کوآپریٹیو (امداد باہمی) تحریک اور بنکنگ کے سلسلے میں صوبہ کی مفید اور شاندار خدمات انجام دیں اور اپنے والد کی وفات (۱۹۰۷ء) کے بعد سے راجیندر پرساد کی تعلیم و تربیت میں گہری دلچسپی لی۔ چنانچہ راجیندر پرساد کو زندگی کے مختلف شعبوں میں اور ایک قومی کارکن کی حیثیت سے جو کامیابی حاصل ہوئی وہ بہت کچھ انھیں برادر مرحوم کی بدولت ہے۔

۱۸۹۳ء میں جب راجیندر پرساد چھپرہ اسکول میں داخل ہوئے تو بہار کا صوبہ بنگال ہی میں شامل تھا، اس لئے راجیندر پرساد کا یہ بڑا کارنامہ سمجھا جاتا ہے کہ ۱۹۰۲ء میں کلکتہ یونیورسٹی کے امتحان انٹرینس کے کامیاب طالبعلموں میں وہ سب سے اول پاس ہوئے۔ اس سے پہلے کسی بہاری طالبعلم کو یہ قابل قدر امتیاز حاصل نہیں ہوا تھا اس لئے قدرتاً بہار میں اسکا بڑا چرچا ہوا۔ میں نے بھی ہندوستان ریویو میں اس کامیابی کا ذکر کرتے ہوئے پیشین گوئی کے طور پر لکھا تھا کہ:-

"امید ہے کہ یونیورسٹی میں بھی وہ اس امتحان کی کامیابی کا اعلیٰ معیار قائم رکھ سکیں گے۔ دیکھئے آئندہ انھیں کیا کیا ترقیاں نصیب ہوتی ہیں۔ زندگی بجز ہندوستانیوں کے لئے بڑے سے بڑا جو منصب حاصل کرنا ممکن ہے وہ ان کی دسترس سے باہر نہ ہونا چاہئے۔ خدا کرے کسی روز وہ اپنے صوبہ کے ہائیکورٹ جج پر متمکن ہوں، اور ان کی تقرری کا پروانہ اس وقت آئے جب وہ مسٹر جسٹس چندرا وارکر کی طرح نیشنل کانگریس کے اجلاس کی صدارت کر رہے ہوں۔"

یہ پیشین گوئی حرف بحرف پوری ہوئی لیکن اسکا وہ حصہ جو ججی کے متعلق تھا۔ اس وجہ سے پورا نہ ہو سکا کہ آپ تحریک نان کوآپریشن میں شامل ہو گئے۔

انٹرنس کے بعد راجیندر پرساد پریسیڈنسی کالج کلکتہ میں داخل ہوئے۔ انٹرمیڈیٹ امتحان میں بھی وہ سب سے اول پاس ہوئے اور ۱۹۰۶ء میں وہ تیسری مرتبہ بی۔اے کے امتحان میں سب سے اول نمبر پر کامیاب ہوئے۔ اس کے بعد ۱۹۰۸ء میں وہ انگریزی کے ایم۔اے۔ اور لا کلاس میں داخل ہو گئے۔ ۱۹۰۹ء میں ایم۔اے۔ پاس کر لیا لیکن بی۔ایل کی ڈگری ۱۹۱۰ء سے پیشتر نہ لے سکے۔ اس طرح ان کی تعلیمی زندگی ختم ہو گئی اور کلکتہ سے واپس آکر مظفرپور کے گریر کالج...

میں پروفیسر ہوگئے، اس جگہ انھوں نے قریب ایک سال کے کام کیا۔ سنہ ۱۹۰۹ء کے آخر میں وہ ہائیکورٹ میں دکالت کی تربیت حاصل کرنے پھر کلکتہ گئے۔

طالب علمی کے زمانہ میں بھی راجیندر پرساد کتاب کے کیڑے نہ تھے اور کالج میں علمی مباحثوں وغیرہ میں ہمیشہ ممتاز حصہ لیتے رہتے تھے۔ یونیورسٹی جاکر انھوں نے سنہ ۱۹۰۶ء میں 'بہاری کلب' کے نام سے ایک انجمن قائم کی تاکہ کلکتہ میں بہاریوں کے لئے مل بیٹھنے کی ایک جگہ ہو جائے۔ اور جو طالب علم بہار سے دارالحکومت کلکتہ میں تعلیم کی غرض سے آئیں اُن کو قیام وغیرہ کے انتظام میں سہولت ہو۔ درحقیقت اسی کلب کی بنیاد پر آئندہ چلکر بہار اسٹوڈنٹ کانفرنس کی تحریک قائم ہوئی۔

گریجویٹ ہونے کے بعد ہی سے راجیندر پرساد سیاسی کاموں کے دلدادہ ہوگئے۔ چنانچہ جب تقسیم بنگالہ کی مخالفت اور سودیشی کی حمایت کا ایجی ٹیشن شروع ہوا تو کلکتہ کے بہاری طالب علم بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے، اور راجیندر پرشاد اس جدوجہد میں دل وجان سے شریک ہوگئے، نتیجہ یہ ہوا کہ تعلیم میں ہرج ہوا اور ایم۔ اے میں ایسی شاندار کامیابی حاصل نہ ہو سکی جیسکی انکی ذات سے توقع تھی۔

لیکن اس نقصان سے ملک کو نفع پہونچا۔ اور بنگال کے زندہ دل جوانوں کے میل جول سے جو تجربات راجیندر پرساد کو حاصل ہوئے وہ بہار میں طالبعلموں کی تحریک قائم کرنے اور اسکی رہنمائی کرنیکے کام آئے۔ چنانچہ انھیں کی کوشش سے ستمبر سنہ ۱۹۰۶ء میں پٹنہ کالج ہال میں مرحوم سید شرف الدین صاحب (جج ہائیکورٹ کلکتہ و پٹنہ) کی صدارت میں بہاری اسٹوڈنٹ کانفرنس کا پہلا اجلاس کامیابی کے ساتھ منعقد ہوا۔ بعد کو یہ کانفرنس دوسرے صوبوں میں اس قسم کی تحریکوں کا پیش خیمہ ثابت ہوئی اور بہار اور دوسرے صوبوں کے بڑے بڑے نامور محبان وطن اس کے پریسیڈنٹ ہوئے۔

" راجیندر پرساد ان دنوں ممالک غیر جاکر اپنی تعلیم کی تکمیل کرنے کی فکر میں تھے مگر وہ اس میں کامیاب نہ ہوئے اور یورپ نہ جاسکے لیکن اس کے بائیس سال بعد سنہ ۱۹۲۸ء میں انھیں پریوی کونسل میں مشہور مقدمۂ برما کے پیروی کے سلسلہ میں انگلستان جانے کا موقع ملا تو انھوں نے دیگر ممالک یورپ کی بھی سیر سیاحت کی۔ انھوں نے رومن رولینڈ سے بھی ملاقات کی اور آسٹریا جاکر جنگ کے خلاف پروپیگنڈے میں مصروف ہوگئے۔ اس سلسلے میں مقام گراز (Gratz) کے ایک جلسۂ عام میں حامیان جنگ نے آپ پر ایسا شدید حملہ کیا کہ جان کے لالے پڑگئے۔ آپ کو شدید جسمانی چوٹیں لگیں جن سے ہفتوں کے بعد صحت حاصل ہوئی۔

شروع ۱۹۰۵ء میں جب مسٹر گوکھلے انجمن خادمانِ ہند Servants of India Society میں نوجوان بہاریوں کو بھی شامل کرنے کی فکر میں تھے تو کسی نے ان کو راجیندر پرساد کا نام بتلا دیا چنانچہ مسٹر موصوف نے راجیندر پرساد کو ملاقات کے لئے بلایا۔ حسب توقع راجیندر پرساد اس سوسائٹی میں شریک ہونے کو شوق سے تیار ہو گئے چنانچہ انھوں نے اپنے بڑے بھائی کو اس کے متعلق ایک مفصل خط لکھکر اپنی دلی خواہش کا اظہار کیا، لیکن ان کے بھائی صاحب کو اجازت دینے میں بہت پس و پیش ہوا اسلئے مسٹر گوکھلے سے زبانی بات چیت ہونے کے باوجود بھی راجیندر پرساد کو پونا جانے کا ارادہ ترک کرنا پڑا۔ اب یہ سوچنا فضول ہے کہ راجیندر پرساد اس سوسائٹی میں داخل ہو کر کون کون سے کار نمایاں کرتے۔ لیکن جو خط انھوں نے اپنے بھائی کو سوسائٹی میں داخل ہونے کی اجازت مانگنے کے واسطے لکھا تھا وہ اس قدر اعلیٰ خیالات اور شریفانہ جذبات سے بھرا ہوا ہے اور اس سے خود راجیندر پرشاد کی شخصیت اور اُن کے دلی خیالات کا پورا پتہ ملتا ہے اسلئے یہاں اس طولانی تحریر کے بعض اقتباسات درج کرنا بیجا نہ ہوگا۔

"بھائی جان! آپ جانتے ہیں کہ میں ایک جذباتی آدمی ہوں، اسی لئے آپ سے دوبدو گفتگو نہیں کر سکتا ایک اہم اور اعلیٰ تر مقصد مجھے اپنی طرف بلا رہا ہے آپ کو اس مشکل اور پریشانی میں چھوڑنا میرے لئے بڑی ناشکری کی بات ہے، لیکن میں آپ سے بتیس کروڑ اہل وطن کے لئے قربانی کرنے کی درخواست کرتا ہوں ذاتی حیثیت سے میرے لئے مسٹر گوکھلے کی سوسائٹی میں شامل ہونا کوئی ایثار کا کام نہیں ہے، کیونکہ مجھے اس قسم کی تربیت ملی ہے کہ بڑی یا بھلی جیسی حالت میں پڑجاؤں اسی سانچے میں اپنی زندگی ڈھال سکتا ہوں۔ میری معاشرت بھی اس قدر سادہ رہی ہے کہ مجھے اپنے آرام و آسایش کے لئے کوئی خاص ساز و سامان درکار نہیں، جو کچھ سوسائٹی سے ملیگا وہی میرے لئے کافی ہوگا۔ لیکن میں اس بات کو کسی طرح نہیں مان سکتا کہ آپ کو اس میں ایثار سے کام نہ لینا پڑے گا آپ نے میری ذات سے جو جو امیدیں قائم کر رکھی ہیں، وہ سب دفعتاً خاک میں مل جائیں گی۔ مگر اس چند روزہ زندگی میں دھن دولت عہدہ اور عزت سبھی آنی جانی چیزیں ہیں جس قدر دولت بڑھتی جائیگی اُسی قدر اُس کی ضرورت بھی زیادہ ہوتی جائے گی، اور گو بعض لوگوں کا خیال ہے کہ مال و زر سے آدمی کو آرام و اطمینان میسر ہوتا ہے لیکن جاننے والے جانتے ہیں کہ خوشی یا مسرت کوئی خارجی چیز نہیں ہے۔ اسکا تعلق انسان کے دل سے ہوتا ہے چنانچہ ایک غریب آدمی جس کے پاس صرف چند روپئے ہیں امیر آدمی سے جس کے پاس لاکھوں کروڑ ہیں زیادہ مطمئن ہوتا ہے۔ پھر افلاس اور غریبی کو حقارت سے کیوں دیکھا جائے ہو دنیا کے بڑے بڑے آدمی

غریب ہی ہوتے ہیں، اور انھیں شروع شروع میں بڑے بڑے ظلم و ستم برداشت کرنا پڑے ہیں، لیکن ان کے ستانے اور ظلم کرنیوالے خاک میں مل گئے۔ ان کا کوئی نام و نشان بھی باقی نہیں، مگر ان مظلوموں اور ستم رسیدہ لوگوں کی یاد کروڑوں آدمیوں کے دلوں میں زندہ ہے۔ زندگی میں اگر کبھی مجھے کوئی تمنا تھی تو یہ کہ میں اپنے ملک کی کوئی خدمت کرسکوں۔ مہاتما بدھ اور مہاویر جین کیا آج کسی کو گوکھلے جیسا اعزاز و رسوخ حاصل ہے اور کیا وہ غریب آدمی نہیں ہیں؟"

یہ الفاظ نوجوان راجیندر کو لکھے ہوئے چوتھائی صدی ہوگئی، لیکن آج پچاس سال کی عمر میں بھی وہ ان الفاظ کو پہلے سے کہیں زیادہ زور کے ساتھ دہرا سکتے ہیں۔ اسی فطری جذبۂ ایثار اور بے نفسی کی بدولت راجیندر پرشاد سے ایسے ایسے کام انجام پائے ہیں جو ان سے بدرجہا زیادہ عقل و فہم والے آدمیوں سے نہیں ہو سکے۔

آج سنہ ۱۹۳۴ء میں بھی وہ سنہ ۱۹۱۰ء کی طرح انتہا درجہ کی سادہ زندگی بسر کر رہے ہیں، گوشت سے انھیں سختی کے ساتھ پرہیز ہے، منشیات سے انھیں کبھی کوئی واسطہ ہی نہیں رہا، غرض وہ انتہائی سادگی کے ساتھ زندگی بسر کر رہے ہیں، سادی غذا، سادہ لباس اور سادہ زندگی یہی اُن کا شعار ہے۔ انکی صحت کمزور رہتی ہے، دمہ کی پرانی شکایت ہے، سول نافرمانی کی تحریک میں سرگرم حصہ لینے کی وجہ سے انھیں بہت سی جسمانی تکلیفیں اور اذیتیں بھی برداشت کرنا پڑی ہیں، انھیں سب باتوں کی بدولت آج راجیندر پرساد ہندوستان کی پبلک لائف میں اپنے کمزور و نحیف جثہ کے باوجود ایک زبردست طاقت اور اخلاقی عظمت کے مالک نظر آرہے ہیں اور اُن لوگوں میں جنھوں نے اپنی زندگیاں ملکی خدمت کے نذر کردی ہیں ان کا درجہ بہت بڑا اور بلند ہے۔ ملک میں اس وقت واقعی سچے، پُرخلوص محبان وطن اور حقیقتاً بے لوث و بے نفس کارکنوں کی تعداد اتنی محدود ہے کہ آپ اُنگلیوں پر شمار کر سکتے ہیں، لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ اس مختصر جماعت میں راجیندر پرساد کو بہت اونچی پوزیشن حاصل ہے۔

(۳)

راجیندر پرساد نے سنہ ۱۹۱۱ء میں کلکتہ ہائیکورٹ میں پریکٹس شروع کی اور مارچ سنہ ۱۹۱۶ء تک وہیں رہے۔ اسکے بعد جب پٹنہ میں ہائیکورٹ قائم ہوگیا تو وہ بھی یہاں چلے آئے۔ کلکتہ میں اُن کی پریکٹس بہت اچھی تھی۔ اور اُن کا شمار ہونہار وکلا میں ہونے لگا تھا۔ سنہ ۱۹۱۵ء میں اُنھوں نے ماسٹر آف لاز کا اعلیٰ امتحان دیا اور درجہ اول میں پاس ہوئے۔ پٹنہ ہائیکورٹ میں کام شروع کرتے ہی ان کی پریکٹس بڑھنے لگی، اور نہ صرف اُن کے روزافزوں مؤکل ہی، بلکہ اُن کے ہم پیشہ وکلا اور جج صاحبان

بھی اُنھیں عزت و وقعت کی نظر سے دیکھنے لگے تھے۔ درحقیقت سینیئر وکلا اور اہل معاملہ راجیندر پرساد سے زیادہ اور کسی جونیئر کی قدر نہیں کرتے تھے۔ اور اگر وہ پریکٹس جاری رکھتے تو اب تک یقیناً پٹنہ ہائیکورٹ کے جج ہو گئے ہوتے، اور "ہندوستان ریویو" کی پیشین گوئی حرف بحرف پوری ہو جاتی۔ لیکن ملکی حالات کی کچھ اور ہی صورت ہو گئی اور اب معاملہ دگرگوں ہے۔

پٹنہ ہائیکورٹ میں پریکٹس شروع کرنے کے بعد ہی اُن کی نہ تھکنے والی قوتِ عمل پٹنہ یونیورسٹی کے مسودۂ قانون کی مخالفت میں ظاہر ہوئی، جسے سر سنکرن نائر مرحوم ممبر تعلیم گورنمنٹ ہند نے ستمبر ۱۹۱۶ء میں امپیریل کونسل میں پیش کیا تھا۔ راجیندر پرساد اِن دنوں بہار پراونشل ایسوسی ایشن کے جائنٹ سکریٹری تھے۔ اُنھوں نے اپنے احباب کی امداد و اعانت سے پریس اور پلیٹ فارم پر بڑے شد و مد کے ساتھ اسکی مخالفت میں پروپیگنڈا کیا، اور جب تک اس کے نامناسب دفعات کی معقول ترمیم نہ ہو گئی اُنھوں نے اطمینان کی سانس نہیں لی۔ ۱۹۱۷ء میں جب پٹنہ یونیورسٹی قائم ہوئی تو وہ سینٹ کے ممبر مقرر ہو گئے۔ چند دنوں میں وہ سنڈیکیٹ کے بھی ممبر منتخب ہوئے۔ اور اس حیثیت سے اُنھوں نے فیس میں کمی۔ کورس کی تخفیف اور ہندی اور صوبے کی دوسری زبانوں کو ذریعۂ تعلیم بنانے کی سرگرم کوشش کی ۔ ان کی بعض تجاویز منظور بھی ہو گئیں ، اور اگر تحریک نان کوآپریشن کی وجہ سے وہ یونیورسٹی سے اپنا قطع تعلق نہ کر لیتے تو یقیناً اُن کی دوسری تجویزیں بھی منظور ہو جاتیں بہرحال یونیورسٹی میں سرکاری اور غیر سرکاری دونوں طبقے کے ہم جلیس اُن کی بڑی قدر کرتے تھے اور سینیٹ کو اُن کے قطع تعلق سے جو نقصان پہنچا اُسے سب لوگ عرصہ تک محسوس کرتے رہے اس طرح گو وہ پٹنہ یونیورسٹی کے وائس چانسلری کے اعزاز سے محروم رہے، لیکن چند ہی دنوں بعد بہار ودیا پیٹھ میں (جو پٹنہ کی قومی یونیورسٹی ہے) یہی پوزیشن اُنھیں حاصل ہو گئی اور وہ کئی سال تک اسکی رہنمائی کرتے رہے۔ آخر گورنمنٹ نے سول نافرمانی کے انسدادی کارروائیوں کے سلسلے میں اسکی عمارت ضبط کر لی۔

(۴)

اس کے بعد وہ واقعہ پیش آیا جو بہار کی تاریخ میں معاملہ چمپارن کے نام سے مشہور ہے۔ اپریل ۱۹۱۷ء میں مہاتما گاندھی چمپارن کے کسانوں کی شکایتوں کی تحقیقات کرنے بہار آئے مگر اُنھیں گرفتار کر کے اُن پر مقدمہ چلایا گیا۔ گو بعد میں وہ رہا کر دئے گئے۔ راجیندر پرشاد نے اس موقعے پر اپنی خدمات گاندھی جی کو پیش کیں۔ اور آخر تک ساتھ رہے۔ جب بہار گورنمنٹ نے دیکھا کہ اس تحقیقات کی وجہ سے عوام میں بڑا جوش و خروش پیدا ہو گیا ہے تو اُس نے کل معاملہ کی تفتیش کے لئے خود ایک سرکاری

کمیٹی مقرر کردی اور گاندھی جی کو بھی اسکا ممبر نامزد کردیا۔ اس تحقیقات کا نتیجہ کسانوں کے موافق نکلا اور گورنمنٹ نے بہار و اڑیسہ کی قانونی کونسل میں قانون مزارعین چمپارن ۱۹۱۷ء پاس کرکے کسانوں کی اکثر شکایات رفع کردیں۔

راجیندر پرساد کیلئے گاندھی جی کے ساتھ ملکر کام کرنے کا یہ پہلا موقعہ تھا مگر ان کی آئندہ زندگی پر اس کا بہت گہرا اثر پڑا۔ تاہم ۱۹۱۹ء کے فسادات پنجاب کے رونما ہونے تک (جس کی وجہ سے ملک بھر میں سخت ہلچل مچ گئی تھی) راجیندر پرساد پرانے آئینی طریقوں ہی پر کام کرتے رہے، چنانچہ ۱۹-۱۹۱۸ء کے جاڑوں میں اُنھوں نے حقوق ووٹ اور تقسیم فرائض کے متعلق سرکاری کمیٹیوں[ہ] کے روبرو بہار پراونشل ایسوسی ایشن کی طرف سے شہادت دی۔

۱۹۱۹ء میں جب رولٹ ایکٹ کے خلاف ایجی ٹیشن پھیلا تو راجیندر پرساد نے بھی نامناسب قوانین کی خلاف ورزی کرنے کے عہدنامے پر دستخط کردیئے، اور بہار میں اس تحریک کے پھیلانے کے لئے گرمجوشی سے کام کرنے لگے۔ مگر اُن دنوں پنجاب میں مارشل لا کے نفاذ، جنرل ڈائر کے کارنامہ جلیانوالہ باغ، اور واقعات ترکی کی بدولت ہندوستان کے پولیٹیکل ٹمپریچر کا پارہ بہت چڑھ رہا تھا اور ۱۹۲۰ء میں پٹنہ کے ایک جلسہ عام میں راجیندر پرساد بھی ایک پُرجوش تقریر کے دوران میں یہ اعلان کردیا کہ اگر کلکتہ میں ہونیوالی کانگریس مہاتما جی کا تجویز کردہ پروگرام نان کوآپریشن منظور کرلے گی تو وہ بھی اُس میں شامل ہو جائیں گے۔ چنانچہ اس کے متعلق رزولیوشن پاس ہونے کے بعد ناگپور کانگریس میں اس کی تصدیق و منظوری کا انتظار کئے بغیر اُنھوں نے اپنی وسیع اور نفع بخش پریکٹس معطل کردی، اور پٹنہ یونیورسٹی سینٹ سے مستعفی ہوگئے۔ اُس وقت سے لیکر ابتک راجیندر پرساد صوبہ بہار میں کانگریس کے سب سے بڑے رہنما اور ہندوستان میں ترک موالات اور سول نافرمانی کے سب سے بڑے حامی و پیشوا ہیں۔ سخت مالی نقصانات اور جسمانی تکالیف کے باوجود بھی وہ اپنے عقیدے پر قائم ہیں۔ گو پچھلے انتخابات اسمبلی میں اُنھوں نے کانگریسی اُمیدواروں کی امداد کی۔ کئی سال تک وہ کانگریس کے جنرل سکریٹری اور ورکنگ کمیٹی کے ممبر رہ چکے ہیں۔ ۱۹۳۲ء میں وہ کانگریس کے صدر منتخب کئے گئے تھے مگر گورنمنٹ نے اِس اجلاس کو پوری میں منعقد ہی نہیں ہونے دیا اور خود راجیندر پرساد اُس وقت جیل خانہ میں تھے ابتک وہ تین مرتبہ جیل خانہ جا چکے ہیں، دو بار چھ مہینہ

ہ Franchise and Divison of Function Committees

اور تیسری مرتبہ پندرہ ماہ کے واسطے۔

(۵)

بہرحال راجیندر پرساد جیل ہی میں تھے جب ۱۵۔ جنوری ۱۹۳۴ء کو بہار کا خوفناک زلزلہ آیا۔ اسکے دو ہی دن بعد وہ رہا کر دیئے گئے اور رہائی کے بعد سے ابتک آپ لکھوکھا مصیبت زدہ بھائیوں کی امداد و اعانت میں رات دن مصروف ہیں۔ اس کارِ خیر میں بہت سے آدمیوں نے آپکا ہاتھ بٹایا ہے۔ لیکن انھیں کا دم تھا کہ پندرہ ماہ کی قید سخت سے چھوٹنے کے بعد ہی انھوں نے اس بارِ عظیم کو اپنے سر لے لیا۔ کسی بیرونی اثر یا قوت کی امداد لئے بغیر بیچ گویا جادو کے زور سے بہار کی امداد کے لئے اٹھائیس لاکھ سے زائد روپیہ جمع کر لیا۔ یہی عظیم الشان کارنامہ ایسا ہے جس کی بدولت راجیندر پرشاد زمانۂ حال کے بہترین لیڈروں میں شمار ہو سکتے ہیں۔ انھوں نے قابلِ تعریف استقلال کے ساتھ مادرِ ہند کی اعلیٰ ترین خدمت انجام دی ہے۔

راجیندر پرساد کا سب سے بڑا وصف یہ ہے کہ وہ یہ نہیں سمجھتے ہیں کہ صرف وہی اور اُن کے ہم خیال لوگ ملک کی عظیم الشان خدمت انجام دے رہے ہیں، وہ بلند حوصلہ اور وسیع الخیال واقع ہوئے ہیں، اپنی وضع پر سختی سے پابند رہتے ہیں۔ ان کے مزاج میں انکسار کو بہت زیادہ دخل ہے، اور وہ ہر شخص سے جو اُن کی امداد پر آمادہ ہو مدد لینے کے لئے تیار رہتے ہیں اسی لیے بہار سنٹرل ریلیف کمیٹی کے پریسیڈنٹ کی حیثیت سے انھیں ہر طبقہ اور ہر سیاسی خیال کے لوگوں سے پوری امداد ملی اور یہ بات اُنکا اور اُن کے شرکار کار کے لئے حد درجہ قابلِ تعریف ہے۔

(۶)

راجیندر پرساد کی دلکش شخصیت اور درویشانہ صفات کے متعلق بہت کچھ لکھا جا سکتا ہے لیکن میں قصداً اختصار سے کام لونگا۔ راجیندر پرساد ہندوستانی قوم پرستوں کے اُس طبقہ کے ممتاز رہنما ہیں جو آئینی کارروائیوں کے خلاف براہ راست عمل کو زیادہ مفید و موثر سمجھتے ہیں، لیکن اُن کی عظمت کسی خاص پارٹی کی تائید کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ وہ سب کے ممدوح ہیں اور سب کے ساتھ ملکر ملک کی خدمت کرنا چاہتے ہیں۔ واقعی ملک کی موجودہ حالت میں محض پارٹی باز شخص، خواہ وہ آئین پسند ہو یا براہ راست عمل کا معتقد، ملکی ترقی کے لئے اپنی تنگدلی، پست خیالی، نارواداری اور جنگجوئی کی وجہ سے خطرناک ثابت ہوگا۔ کسی ایک اصول کی مجنونانہ پیروی کرنا، دوسروں کو جو اپنے ہمخیال نہ ہوں ذلیل و حقیر سمجھنا پارٹی باز شخص کا معمولی شعار ہوتا ہے۔ ایسے لوگ خواہ وہ کتنے ہی دانشمند اور محب وطن کیوں نہ ہوں لیکن

ایک مرتبہ جو خیال اُن کے ذہن میں جاگزیں ہو جاتا ہے تو اس پر حدِّ ضرورت سے زیادہ زور دینے سے انکا ذہن محدود اور نقطۂ نظر تنگ ہو جاتا ہے۔ راجیندر پرساد کی بہت بڑی خوبی یہ ہے کہ پندرہ سال سے زائد کو آپریشن کے جدید پولیٹیکل اسکول کے ساتھ گہرا تعلق رکھنے کے باوجود انھوں نے اپنے دائرۂ نگاہ کو تنگ و تاریک ہونے دیا، نہ اپنی قوتِ فیصلہ میں کوئی کمی آنے دی، اور نہ اپنی ہمدردیوں کو کسی خاص جماعت تک محدود رہنے دیا۔ ممکن ہے کبھی کسی موقعہ پر پارٹی بندی کے اثرات اور قوتیں اُن پر بھی غالب آ گئی ہوں اور وہ غلطیوں کو درست کرنے میں اپنی پوری قوت سے کام نہ لے سکے ہوں، یہ بھی ممکن ہے کہ شاذ و نادر کبھی اُن سے کوئی غلط فیصلہ بھی ہو گیا ہو، لیکن ان واقعات کی تلاش اور چھان بین میں تنگدل معترضوں اور چٹکی لینے والے نکتہ چینوں کے لئے چھوڑتا ہوں۔ خود راجیندر پرساد نے کبھی انسانِ کامل یا فرشتہ ہونے کا دعویٰ نہیں کیا۔ اور کسی پبلک کارکن کے لئے سہو و خطا سے بالاتر ہونے کا دعویٰ کرنا حماقت ہے۔ لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ راجیندر پرساد نے اپنی پرائیویٹ زندگی اور پبلک سرگرمیوں میں ہمیشہ خلوصِ نیت اور دیانتداری کی اعلیٰ ترین مثال پیش کی ہے۔

کلام اعلیحضرت نظام دکن

یہ کیا بلا ہے محبت، کسی کو کیا معلوم
غمِ فراق کی آفت، کسی کو کیا معلوم

کسی کے ذہن میں آئے یہ ہی بہت دشوار
یہ کیسی ہوتی ہے الفت، کسی کو کیا معلوم

عیاں ہے بادۂ صافی کے رنگ سے ساقی
بہار پر ہے جو نزہت، کسی کو کیا معلوم

زباں سے شیخ تبرا کہتے ہیں، مگر مے پر
مٹے ہوئے ہیں جو حضرت، کسی کو کیا معلوم

اگرچہ صورتِ تصویر ہوں خموش، مگر
جو میرے دل کی ہے حالت، کسی کو کیا معلوم

بہار نے خم و جام و سبو میں بھر دی ہے
نظر فریب جو رنگت، کسی کو کیا معلوم

صبا سے پوچھ لے عثماں کہ کیا ہے غنچوں میں
چھپی ہوئی ہے جو نکہت، کسی کو کیا معلوم

جہان آرا کیسے جلی؟

وکرمادت سنگھ ایم۔ اے۔ ایل ایل۔ بی وکیل لکھنؤ

جہان آرا کے نام سے تو بہت سے تاریخ پڑھنے والے واقف ہونگے۔ یہ مغل بادشاہ شاہجہاں کی سب سے بڑی لڑکی تھی۔ شاہی محل میں اسکی پرورش بڑے لاڈ پیار سے ہوئی تھی بچپن ہی سے اسے لکھنے پڑھنے کا بڑا شوق تھا۔ اوائل عمر میں اس نے فارسی و عربی کی کئی کتابیں پڑھ ڈالی تھیں۔ بڑی ہونے پر شاہی محل کی یہ ایک ہوشیار اور تعلیم یافتہ شہزادی ہوئی اپنی والدہ ممتاز محل کے مانند یہ بھی بڑی نیک، رحمدل اور غریبوں پر کرم کرنے والی تھی۔ کوئی بھی غریب و محتاج بلا کچھ پائے شاہی محل سے واپس نہ جانے پاتا تھا۔ اسکا حکم تھا کہ جو بھی غریب یا محتاج شاہی محل میں آ پہونچے وہ بلا کچھ پائے واپس نہ جانے پائے۔ اسیطرح اسکی رحمدلی و غریب پروری سارے شہر میں مشہور تھی۔

جہان آرا بڑی خوبصورت شہزادی تھی۔ شاہی محل میں اپنے زمانہ کی عورتوں میں سب سے خوبصورت اور پڑھی لکھی تھی۔ شاہجہان اسے اپنی جان سے زیادہ چاہتا تھا اور یہ بھی اپنے باپ کی خدمت کرنا اپنا خاص فرض سمجھتی تھی کہتے ہیں کہ جب اسکی ماں ممتاز محل کی موت ہوئی تو شاہجہاں کو بڑا صدمہ پہونچا۔ شاہجہاں ہی نہیں بلکہ تمام دربار اس رنج میں مبتلا رہا۔ مگر شاہجہاں کو اتنا صدمہ پہونچا کہ وہ دن رات ایک کوٹھری میں پڑے پڑے آہ و زاری کیا کرتا تھا۔ مارے غم کے سوکھ کر کانٹا ہوگیا تھا۔ چہرہ زرد پڑ گیا تھا۔ سوائے رنج و غم کے اُسے کچھ کام نہ تھا۔ ایسی مصیبت میں صرف جہان آرا ہی ایک ایسی تھی جو اپنے باپ کے رنج کو دور کر سکتی تھی۔ وہ دن رات اپنے مصیبت زدہ باپ کے پاس بیٹھی رہتی، سمجھاتی، دلاسا دیتی اور ہر حیلہ سے اسکے شکستہ دل کو تسکین دیتی جب کبھی شاہجہاں پر کوئی مصیبت پڑتی۔ جہان آرا ہی اسکی مدد کرتی۔ اور ہمیشہ کامیاب رہتی۔ یہانتک کہ جب شاہجہاں ۷ سال تک آگرہ کے قلعہ میں قید رہا اُس وقت بھی جہان آرا ہی نے اسکی مصیبت میں اُسکا ساتھ دیا۔ اور برابر دکھ بٹایا۔

مگر اتنا سب کچھ ہونے پر بھی کسیکو کیا پتہ تھا کہ جہان آرا کو ایک نئی مصیبت کا سامنا کرنا پڑیگا۔ سچ ہے قسمت کا لکھا کون مٹا سکتا ہے۔ ایسا ہوا کہ ایکدن ۲۶ مارچ ۱۶۴۴ء کو جبکہ جہان آرا اپنے باپ کی خدمت کرکے اُسکے کمرہ سے اپنے کمرہ میں واپس آ رہی تھی یکایک اُسکے لباس کا دامن اُڑ کر راستے میں جو چراغ جل رہے تھے اُن پر گیا چراغ پر دامن کا پڑنا تھا۔ کہ ایکبارگی اُس کا خوبصورت لباس جل اُٹھا۔ اور چونکہ وہ لباس ڈھاکہ کی سب سے

بہترین ململ کا بنا ہوا تھا۔ اور عطر و خوشبودار چیزوں سے معطر تھا۔ اسلئے آگ نے اور بھی زیادہ اپنا کام کیا اور اسکے خوفناک شعلوں نے جہاں آرا کو لپیٹ لیا۔ یہ دیکھ کر اسکی چار باندیاں، جو دو چار قدم پیچھے تھیں۔ بچانے کیلئے آگے بڑھیں۔ مگر بدقسمتی سے اُن چاروں کو بھی اُس خوفناک آگ نے اپنے شعلوں میں لپیٹ لیا۔ اتنے میں محل کے نوکر اُس جگہ آپہونچے اور جہاں آرا اور اسکی باندیوں کو فوراً جلتی ہوئی آگ سے نکالا۔ غرض اس طرح جہاں آرا جل گئی۔ اسکی پیٹھ، اسکا آدھا جسم اور دونوں ہاتھ یہ سب جل گئے تھے۔ اور وہ خود بھی بیہوش ہو گئی تھی جب شاہجہاں نے یہ خبر سنی تو اُسے بڑا صدمہ پہونچا۔ اسی غم میں کئی دن تک دربار بند رہا۔ ہر وقت وہ اپنی پیاری بیٹی کی تیمارداری میں لگا رہتا۔ برابر اسکے بستر علالت کے سرہانے بیٹھا رہتا۔ خود اپنے ہاتھوں اسکی مرہم پٹی کرتا اور اپنے ہی ہاتھوں اُسے کھانا بھی کھلاتا۔ دربار کا کام تو بالکل بند ہی ہو گیا تھا۔ مگر کبھی کبھی ضروری کاموں کی دیکھ بھال ضرور کر لیتا۔ مگر وہ بھی صرف آدھ گھنٹہ۔ اور باقی تمام وقت اپنی بیٹی کی تیمارداری میں صرف کرتا۔

کہتے ہیں کہ شاہجہاں نے اپنی بیٹی کے علاج کیلئے بڑے بڑے حکیم دور دور اور مشہور جگہوں سے بلائے تھے جو شاہی محل میں آکر ٹھہرے رہتے۔ اور برابر اُسکا علاج کرتے تھے۔ علاوہ اسکے شاہجہاں روزمرہ رات کو ایک ہزار روپیہ کی تھیلی اپنی بیٹی کے سرہانے تکیے کے نیچے رکھ دیتا۔ اور صبح ہوتے ہی فقیروں کو تقسیم کر دیتا اور ہر روز شب کو گھنٹوں خدا کی عبادت کرتا۔ اور دعا مانگتا کہ یا پاک پروردگار میری بیٹی کو جلد اچھا کر۔

اس طرح جہاں آرا کو بستر علالت پر پڑے پڑے چار مہینے ہو گئے۔ مگر اُن طبیبوں کے علاج سے کوئی فائدہ نہ پہونچا۔ اور اسکے اچھے ہونے کی کوئی امید باقی نہ رہی۔ اسیوقت جب شاہجہاں نے یہ دیکھا کہ وہ چار باندیاں جو اُسکی لڑکی کیساتھ جلی تھیں۔ اُن میں سے دو تو بالکل اچھی نہ ہو سکیں۔ اور آخر مر ہی گئیں۔ تو اسکی طبیعت اور بھی پریشان ہو گئی۔ اُس دن سے اُسکا دل کسی کام میں نہ لگتا۔ دن رات اسی غم میں مبتلا رہتا۔ یہاں تک کہ کھانا پینا بھی حرام ہو گیا تھا۔ مگر خوش قسمتی سے اُس وقت ایران کا ایک مشہور حکیم ہندوستان آیا ہوا تھا۔ جب شاہجہاں کو اسکے آنے کی خبر ملی تو اُسنے فوراً اسکو بلا بھیجا اور اپنی بیٹی کے علاج کرنے کیلئے محل میں رکھ لیا۔ مگر اسکی بھی دوا سے کوئی فائدہ نہ ہوا پھر بھی اُسکا اور دہلی کے ایک مشہور حکیم ممّانا (Hakim Mummana) دونوں کا علاج جاری رہا۔ مگر بے سود۔ اس ناامیدی سے شاہجہاں اور بھی پریشان ہو گیا۔ اور دن رات یہی سوچا کرتا۔ کہ کہیں سے ایسا طبیب مل جاتا۔ جو اسکی بیٹی کو اچھا کر دیتا۔ خیر خدا نے اسکی سُن لی۔ وقت کی بات ہے ایسا ہوا کہ ایک شخص نے جو شاہجہاں کے دربار میں ملازم تھا۔ جہاں آرا کے اچھا کرنے کا بیڑا اٹھایا۔ شاہجہاں بہت خوش ہوا اور فوراً اسکو اپنی بیٹی کے علاج کی اجازت دیدی۔ کہتے ہیں کہ اس شخص نے بڑی محنت و مشقت سے ایک اچھا اور اکسیر مرہم تیار کیا اور یہی مرہم خود اپنے ہاتھوں جہاں آرا کے زخموں پر لگاتا۔ ساتھ ہی جھاڑ پھونک بھی کرتا۔

خوش قسمتی سے اسکا مرہم واقعی اکسیر ثابت ہوا اور ایسا فائدہ پہونچا کہ جہان آرا صرف دو ماہ میں بالکل اچھی ہو گئی۔ بس اب کیا تھا شاہجہاں یہ دیکھکر مارے خوشی کے پھولا نہ سمایا۔ تمام شاہی محل میں خوشیاں منائی گئیں۔ کئی دن تک برابر جشن رہا۔ اسی خوشی میں شاہجہان نے ۲۵ نومبر ۱۶۴۴ء کو ایک بڑی دعوت کی اور جہان آرا کو دس لاکھ روپیہ کا زیور انعام دیا۔ محل کے سب لوگوں اور سلطنت کے سب افسروں کو بھی انعام دیا گیا۔ صرف فقیروں کو دو لاکھ روپیہ تقسیم کر دیا گیا۔ شہزادوں کو بھی کافی انعام ملا۔ اسمیں سے اورنگزیب کو سب سے زیادہ ملا۔ اس طرح جہان آرا جلی اور بعد میں خدا کے فضل سے اچھی بھی ہو گئی۔

کہتے ہیں کہ جب جہان آرا مری تو یہ کہکر مری کہ میری قبر پر نہ کسی قسم کی سجاوٹ ہو اور نہ اُسپر کوئی مقبرہ تعمیر کیا جائے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ کہ مرنے کے بعد جہان آرا کی میت درگاہ حضرت نظام الدین میں دفن کی گئی۔ مزار پر یہ شعر درج ہے ؎

بغیر سبزہ نپوشد کسے مزار مرا
کہ قبر پوش غریباں ہمی گیاہ بس است

ستم ظریفیِ فطرت

(از مرزا یگانہ لکھنوی)

دیکھوں کب تک گلوں کی یہ تشنہ لبی — فطرت کا گلہ کروں تو ہے بے ادبی
پیاسے تو ہیں جاں بلب مگر ابرِ کرم — دریا پہ برستا ہے زہے بوالعجبی

دُکھ کے دم سے سکھ کا مزہ

ہاں جب ہی مزہ کہ دوست دشمن ہو جائے — ہر پہلوِ خوب و زشت روشن ہو جائے
سکھ میں جو مزہ ہے تو دکھ کے دم سے — سکھ ہی سکھ ہو تو پھر اجیرن ہو جائے

مہذب ملکوں کی شادی

(ایک ڈراما)

(ترجمہ از سلیم حامد رضوی بھوپالی)

"معاف کیجئے" ایک خوش پوش شریف نوجوان نے سر سے ٹوپی اُتار کر مؤدبانہ ایک خاتون سے دریافت کیا "مجھے خیال ہوتا ہے شاید میں اس سے قبل آپ سے کہیں نیاز حاصل کر چکا ہوں؟"

"بلاشبہ" خاتون نے مسکرا کر جواب دیا "ایک بار میری آپ سے شادی ہو چکی ہے"

"ہاں ہاں، یاد آیا، آپ میری دوسری زوجہ تھیں"

"کیا خوب" اُس نے تردید کرتے ہوئے کہا "آپ بھول گئے، میں آپکی پہلی بیوی تھی۔ کم سے کم آپ نے اُس وقت مجھ سے ایسا ہی بیان کیا تھا"

"درست ہے" اب مجھے یاد آیا آپ میری پہلی بیوی تھیں۔ لیکن میں نے آپ سے دوسری بار بھی تو شادی کی تھی؟ مگر کب؟ یہ یاد نہیں؟"

"مجھے یاد ہے آپ نے مونا سے شادی کرنے سے پہلے مجھ سے دوبارہ عقد کیا تھا"

ہاں ہاں آپ کو خوب یاد ہے۔ اس روز تو آپ بہت حسین معلوم ہو رہی تھیں۔ خصوصاً آپکا گون ... اچھا ایک ... میں سوچ رہا ہوں کہ اس روز آپ کا لباس عروسی کس رنگ کا تھا؟

"وہ تو ایک بڑا ناگوں تھا جسے میں اکثر ایسے موقعوں پر پہن چکی ہوں"

"لیکن میں آپ کو ایک اور بات یاد دلانا چاہتی ہوں"

"فرمائیے فرمائیے وہ کیا ہے؟"

"گذشتہ شب آپ نے پھر مجھ سے شادی کرنے کا وعدہ کیا تھا"

"گذشتہ شب کو؟ .... اوں ہوں ... میرا خیال ہے کہ میں نے تو مونا سے ہی تیسری بار وعدہ کیا تھا"

"تو کیا یہ وعدہ پورا ہو گیا؟"

"جی ہاں، آج ہی صبح پھر شادی ہوئی ہے۔"

اچھا ذرا دیکھئے تو وہ کون خاتون جارہی ہے؟ صورت تو کچھ کچھ آشنا معلوم ہوتی ہے۔"

"اُف، اتنی جلد بھول گئے۔ یہ تو کارو ہے، جس سے آپ نے تین ماہ ہوئے شادی کی تھی اور ایک ہفتہ بعد گلو خلاصی حاصل کرلی تھی۔"

"اہاہا۔ آپ نے خوب پہچانا۔۔ اچھا خدا حافظ پھر ملیں گے۔ اس وقت آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی۔۔۔ خدا حافظ!"

رُباعیّات

(از منشی کرشن سہائے صاحب تنکاری وحشی)

اب کوچ کے آتے ہیں نظر سب اسباب
مٹنے کو ہے ہستی مری مانند حباب
مصروف ہوں سامانِ سفر میں اپنے
اب چاہیئے چھوڑیں مجھے میرے احباب

وہ جوشش ہے باقی نہ شبابِ ہستی
اب بند ہی ہونے کو ہے بابِ ہستی
چھیڑوں جو غمِ دل بھی تو کیسے چھیڑوں
بے کیف ہے آہنگِ ربابِ ہستی

اتلافِ معاصی ابھی ہو لینے دیں
دامن سے یہ دھبّے مجھے دھو لینے دیں
مصروف ہوں یادداشتِ گنہ میں اپنے
جی بھر کے احباب مجھے رو لینے دیں

حسن کی قربانی

(از مرزا فدا علی صاحب خنجر لکھنوی)

نہ معلوم کیوں ؟ مجھے تصویروں سے شوق ——— بلکہ عشق ہے۔ حالانکہ میرے احباب اس فن لطیف سے مطلق شغف نہیں رکھتے۔ میرا نشستگاہ یا میری خوابگاہ تصویروں کی زیبائش سے نگارخانہ بنی ہوئی ہے۔ میرے وقت کا وہ حصہ بہترین ہوتا ہے جب گرد وپیش کے واقعات سے بے نیاز ہو کر میں اپنے محبوب ترین مشغل یعنی کسی فرسودہ اور از کار رفتہ تصویر کی نسبت غور کرنے میں مصروف ہوتا ہوں۔ اُسکے اُڑے ہوئے رنگ مٹے ہوئے خد وخال اور بگڑے ہوئے اعضاء وجوارح میں اُسکے ۔ ازہائے زندگی کی جستجو کرتا ہوں۔ پھر ایک فرضی افسانہ گڑھ کے صاحب تصویر سے منطبق کر دینے کے بعد گویا نفسیاتی مسئلہ حل کرنے میں کامیاب ہوجاتا ہوں۔ اُسوقت میرا دل اُس معصوم بچے کیطرح خوش ہوتا ہے جس نے چاند کو مٹھی میں بند کرلیا ہو۔

باوجود اُس قلبی تعلق کے یہ ایک حیرتناک حقیقت ہے کہ مجھے مصوری (تصویر کشی) میں اُتنا بھی دخل نصیب نہیں جتنا آرٹ کے کسی غبی الذہن طالب علم کو ہونا چاہیئے۔ میرے احباب مجھے جب کوئی ہدیہ بھیجنا چاہتے ہیں تو وہ موجودات عالم کے تمام تحائف نظر انداز کرتے ہوئے محض تصاویر پر انتخابی نگاہ ڈالتے ہیں۔ گذشتہ یا موجودہ مصوروں میں کسی ایک کا شاہکار سمجھکر میرا جذبہ احسانمندی خرید لیتے ہیں۔ میں خوش ہوجاتا ہوں ——— اتنا خوش! جیسے کوئی نادر روزگار تحفہ ہاتھ آگیا ہے۔

سرمائی آفتاب کی طلائی شعاعیں، خون میں حیات آفریں تموج پیدا کرنے والی نورانیت سے دنیا کو جگمگا رہی تھیں، موسمی برودت بتدریج زائل ہوچکی تھی۔ میں کتبخانہ میں آرام کرسی پر نیم دراز تھا۔ پاؤں کے قریب آہنی انگیٹھی تھی جس کی آگ کو گل ہوئے عرصہ گزر چکا تھا۔ تاہم کمرہ گرمانے

کے واسطے مزید کوششوں کی ضرورت نہ تھی۔

میں دونوں آنکھیں بند کئے اُس تصویر کے حصول کی تدبیروں پر غور کر رہا تھا جو ڈپٹی عطاءاللہ کے برآمدے میں آویزاں تھی۔ ممکن ہو وہ اُنکی نگاہ میں کوئی وقعت نہ رکھتی ہو مگر میری نظر میں فن نقاشی کا لاجواب نمونہ تھی جسے نا قدری کا شکار رکھنا میرے لئے کرب کا باعث تھا۔

خدا ہی جانتا ہے کتنی دفعہ قلم اٹھا کے رقعہ لکھنے کا ارادہ کیا۔ چند سطریں ضبط تحریر میں لایا۔ پھر کچھ سوچ کر چاک کر ڈالا۔ ڈپٹی صاحب سے زیادہ مراسم نہ تھے شناسائی کی بنیاد ہمسائیگی پر قائم تھی۔ وہ بھی اتنی کہ عید بقرعید کو تہنیت کی رسم ادا کر دیجائے اور بس! اس صورت میں تصویر کی بھیک مانگنا کیسا شرمناک اور کتنا محجوب کن فعل تھا؟ ہنوز کسی قطعی فیصلے تک نہ پہونچا تھا کہ ڈاکیہ کی آمد نے تخیئل کا سلسلہ قطع کر دیا۔ میں نے سر اٹھا کے اسکی طرف دیکھا۔ وہ نیلے رنگ کا لفافہ دے کے واپس گیا۔

خط میرے نام تھا۔ لفافہ پر بمبئی کی مہر دیکھ کر جگموہن کا خیال آگیا۔ بادیٔ بخیر دوست ہمرنگ ہو میری صحبت میں اُسے بھی تصویروں کا شوق ہو گیا تھا۔ میں نے لفافہ چاک کر کے مضمون پڑھا اُس نے طویل خاموشی کی معذرت کرتے ہوئے بے انتہا مصروفیتوں کا ذکر کیا تھا۔ آخر میں جرمانے کے طور پر ایک تصویر بھیجنے کی اطلاع دی تھی جو اتفاقیہ کسی جگہ سے دستیاب ہوئی تھی۔

مجھے جگموہن کے بیگانہ وار تغافل پر کمال غصہ تھا۔ اور بجائے خود تہیہ کر چکا تھا۔ کہ میں اُسے سزا دیئے بغیر صلح نہ کروں گا لیکن اُسنے جس سریع الاثر تدبیر پر عمل کیا اُس نے انتظار پیہم کی تکلیفیں بھلا کر مجھے خوش و راضی کر دیا

محبت نامہ کا جواب تصویر کی وصولیابی پر منحصر تھا۔ شوق نے انتہائی کیفیت طاری کر دی اور میں پارسل کے اشتیاق میں دیدۂ شوق بن کے رہ گیا!

شاید جگموہن نے ساری عمر میں یہی ایک دانائی کی تھی کہ تصویر روانہ کرنے کے بعد اس حساب سے اطلاع نامہ تحریر کیا کہ تھوڑے وقفہ کے بعد دونوں چیزیں ایک ہی دن وصول ہو جائیں مجھے دیر تک منتظر رہنے کی زحمت نہیں اُٹھانا پڑی خط وصول ہوئے مشکل سے تیس چالیس منٹ ہوئے تھے کہ دوسرا پوسٹ مین پارسل لئے آگیا۔ میں نے بہ عجلت رسید پر دستخط کئے اور پارسل کھولنے میں صرف ہو گیا۔

جگموہن کی مرسلہ تصویر ایک جوان جہان خوبرو عورت کی شبیہ تھی۔ جو کسی نقاش کی شوخی قلم کا دلفریب نمونہ تھی۔ نہ جانے اُس پر کیا افتاد پڑی تھی۔ کس بےحس انسان نما جانور کے پالے پڑی تھی۔ کہ اُسکی تمام رعنائیاں بے احتیاطی و ناپُرسی کی نذر ہو کے رہ گئی تھیں! ہرچند جگموہن نے اُس کے درستی کی، کافی کوشش کی تھی تاہم رنگ و روغن میں نمایاں تبدیلی نہ ہو سکی۔ چہرے کی خوبصورتی پر بھی اچھا خاصہ اثر پڑا تھا۔ وہ دلکش نقش و نگار جنہیں مصور کے موئے قلم نے دل لبھانے کا عنصر کوٹ کوٹ کے بھرا تھا کچھ اس بُری طرح مسخ ہو گئے تھے کہ سطحی نظر رکھنے والوں کے لئے اُن میں دلچسپی کا کوئی سامان باقی نہ تھا

اب میری تمام تر کوشش چہرے کو روشن بنانے اور خد و خال کو اُسی حالت پر لانے کے واسطے مخصوص ہو گئی۔ تصویروں کے شوق نے اکثر ماہرین فن سے روشناس کر دیا تھا اور انہیں بعض ایسے بھی تھے جو ہدایت کے مطابق بگڑی ہوئی تصویروں کی رنگ آمیزی کر دیتے تھے

میں نے اُس دن کا دستورالعمل تبدیل کر کے اپنے آپ کو محض اس کام کیلئے وقف کر دیا کہ جس طرح اور جس اُجرت پر ممکن ہو اس تصویر کو درست کرا لیا جائے۔ بعجلت لباس بدلا۔ چھڑی اٹھائی اور مکان سے نکل کھڑا ہوا۔ مصوروں سے گفتگو کرنے میں سارا دن گذر گیا۔ کچھ تو میرے جنون پر قہقہہ مار کے ہنسے کیونکہ اُنکی رائے میں وہ تصویر بالکل ناکارہ ہو چکی تھی۔

معلوم نہیں کہ اختلاف رائے سے میرا عزم کیوں اٹل ہوتا جاتا ہے چنانچہ جسقدر وہ لوگ اس فعل سے باز رہنے کا مشورہ دیتے تھے میرے ارادے میں استقلال کی روح بڑھتی جاتی تھی تا میں نے طے کر لیا کہ اس راستہ میں کتنی ہی مشکلات کیوں نہ پیش آئیں مگر تصویر بنوائے بغیر نہ رہوں گا۔

دن بھر کی دوڑ دھوپ کے بعد ایک نقاش ملا۔ جسکے ساتھ زمانہ نے کچھ بہتر سلوک نہ کیا تھا وہ ناقدری کا شکار تھا۔ ہفتوں پر ہفتے گذر جاتے اور اُسکے دروازے پر کوئی گاہک نہ پھٹکتا اور وہ جہاں کام کی آرزو لے کے جاتا وہاں سے خالی ہاتھ پلٹتا۔

اس نے تصویر دیکھی اور دیر تک دیکھتا رہا۔ پھر اُسکے متعلق جو رائے ظاہر کی وہ بالکل وہی تھی جو میں نے قبل ازیں قائم کی تھی۔ اپنے خیال کی صحیح ترجمانی ہوتے دیکھ کر میرا دل خوشی سے باغ باغ ہو گیا۔ میں نے تصویر اُسکے سپرد کر دی اور وعدہ کیا کہ کچھ اضافہ کے ساتھ منہ مانگی اُجرت

پیش کیجا بنگی بشرطیکہ کام معاہدے کے موافق ہو چکا چوتھے دن ملاقات کا وقت مقرر ہوا اور میں گھر واپس چلا آیا۔

کوئی واقعہ پیش نہ آئے تو چار برس بھی چشم زدن میں گذر جاتے ہیں مگر اس کے برخلاف انتظار کی ایک گھڑی بھی ایسی بھاری ہوتی ہے کہ اُسکا مقابلہ کرنے کو لوہے کا دل اور پتھر کا کلیجہ چاہیئے۔ ایک ایک دن نہیں ایک ایک گھنٹہ بلکہ ایک ایک منٹ گن گن کے بسر کیا۔ ہوشیار ہوں تو تصویر کے تصور میں غرق ہوں، غافل ہوں تو تصویر کے خواب دکھائی دیتے ہیں! خدا خدا کرکے یہ دن بھی ختم ہوگئے وہ ساعت آئی جس کے انتظار میں دل بیقرار تھا۔ باہر جانے کا لباس پہنا تو سہی لیکن نہیں کہہ سکتا کہ سلیقے اور ترتیب کو کہاں تک دخل تھا! گھر سے نکل کے مصور کے مکان کا راستہ لیا۔ ملاقات نہ ہونے کا اندیشہ سہمائے دیتا تھا۔

مصور میرا منتظر تھا۔ تصویر کا کام مکمل ہو چکا تھا۔ اُسنے پیکٹ حوالے کرتے ہوئے اپنی محنت و عرق ریزی کا ذکر کیا۔ میں نے اُسکی باتوں پر توجہ نہ کی اور اجرت و انعام دیکر مکان کو لوٹا۔ تصویر پر اطمینان سے نظر ڈالنے کا شوق ترقی پر تھا۔

مکان پہونچا تو شام ہو چکی تھی۔ کتب خانہ برقی روشنی سے جگمگا رہا تھا۔ میں نے جلدی جلدی تصویر کا پیکٹ کھولا۔ آہ! ایک صاعقہ خرد سوز تھا جو برقی روشنی میں چمکتا ہوا آیا اور نگاہوں کو خیرہ کر گیا۔ حسن بجلی ہے بلکہ اس سے بھی طاقتور چیز! میں اس سے پہلے بے شمار حسین عورتوں کی حقیقی اور مصنوعی تصویریں، دیکھ چکا تھا لیکن ایسا قاتل حسن اس سے پہلے نظر سے نہ گذرا تھا۔

کتنی حسین اور کتنی دلربا ہے؟ آہ! جب دنیا اسکے جلوۂ رنگین سے معمور ہوگی تو نہ معلوم کتنی شخصیتیں ہوں گی جن کے زخم خوردہ قلوب سوزش عشق سے شعلہ زار ہوں گے۔ کتنے مشتاق تھا ایک کافر نگاہ کو ترستے ہوں گے اور —— اور کیا ہی خوش نصیب ہوگا وہ شخص جسنے اس لقعہ انوار کو آغوش شوق میں لینے کے بعد لمحات زندگی کو منور کیا ہوگا؟ بیشک! راتیں اُس کی ہوں گی جس کے بازوؤں پر اُس کے لمبے لمبے پر پیچ و خم سیاہ گیسو بکھرتے ہوں گے اور سکراتی صبحیں اُسی کو نوید مسرت دیتی ہونگی جس کے شبستان عشرت سے یہ نوبہار ناز انگڑائیاں لیتا ہوا برآمد ہوتا ہوگا ——"

آہستہ آہستہ برقی روشنی مدھم پڑنے لگی ہنگامے سکوت کی آغوش میں سوگئے اور ایسا محسوس ہونے لگا جیسے کوئی مخفی طاقت عالم ہست و بود سے دور کھینچے لئے جاتی ہے! دنیا سے جوں جوں بعد ہوتا جاتا تھا اتنی ہی سماعت و بصارت میں تبدیلی ہو رہی تھی۔ اب میری روح عالم اجسام سے بہت دور جا چکی تھی۔ میں خاموش اور پرسکون فضا میں تھا۔ جہاں نور تھا نہ ظلمت! ہر جانب سکوت ہی سکوت طاری تھا۔

شاید جسم و جسمانیات کا باہمی رشتہ قطع ہو چکا تھا۔ آنکھوں میں بصارت تھی مگر اُسیقدر کہ پیکر تصویر کا نظارہ کر سکیں۔ سامعہ بیدار تھا لیکن اتنا ہی کہ ایک روح نواز اور سرور ریز نغمہ سے محظوظ ہو سکے۔ یکایک تصویر کے چوکھٹے کو حرکت ہوئی۔ ایک کاغذی مجسمہ بجلی کیطرح چمک کے باہر آیا! آہ! یہ وہی نامعلوم الاسم دلربا تھی جس کی تصویر نے میرے حواس خمسہ پر جادو سا کر دیا تھا۔ بلوریں جسم پر وہی لباس زیب دے رہا تھا جو نقاشی کے وقت مصور کے موئے قلم نے پہنا دیا تھا۔ اسکا حسن و جمال اور انداز و ادا بہت زیادہ کیف آفریں اور سحور کن تھے۔ نیچی نیچی حجاب آلود نگاہیں چپکے چپکے غارتگری میں مصروف تھیں۔ وہ خراماں خراماں قیامت کو پامال کرتی ہوئی

بولنا چاہا لیکن گویائی کی طاقت سلب ہو چکی تھی اور میں ٹکر ٹکر دیکھنے یا لبہائے لعلیں سے ادا ہونے والے لفظوں کو سن لینے کے سوا کچھ نہ کر سکتا تھا!

دفعتًا فضا گل ریز ہو گئی۔ سکون کو مرتعش کرتا ہوا ایک نغمہ پیدا ہوا۔ محویت زا اور سحور کن ہلکی ہلکی ہوا میں ملے جلے دلآویز جملے آویزہ گوش ہونے لگے۔ آواز باریک تھی بے انتہا سریلی اور دلکش حواس خمسہ سماعت کے سانچہ میں ڈھل گئے اور میں سراپا گوش نصیحت نیوش بن کے رہ گیا!

"آپ کو مجھ بدبخت سے ہمدردی ہے؟ بیشک! بیشک! ہے اور ضرور ہے۔ ہستی کیطرح فنا پذیر خد و خال میں بقا کی سی رنگ آمیزی کرنا ہی ہمدردی کی دلیل ہے ——— آہ گلزار ہستی کی ایک ناشگفتہ غنچے کی روداد غم سماعت کرنے کی تکلیف گوارا فرمایئے گا؟ ——— ضرور ضرور آپ کو سننا چاہیئے۔ یہ قربانی ہے ——— عظیم قربانی! سبق ہے ——— ناگزیر سبق!"

خاموشی ——— سکون ——— سناٹا ——— اور کچھ نہیں! ہاں سنہری حریر میں لپٹا ہوا ایک زیبائی سا پیکر بصیرت نواز تھا۔ شاداب ——— پُرشباب ——— رنگین چہرہ حزنیہ جذبات سے متاثر ہو چکا تھا۔ دل کے اندر منجذب ہو جانے کا احساس پیدا کر نیوالی مخمور آنکھیں خاموش نوحہ گری میں

مصروف تھیں۔ کہ پھر بادۂ سخن کی ترنم ریزیاں شروع ہو گئیں۔ پھر ذوق سماعت مینائے تکلم سے سرشار ہونے لگا۔

"ہاں، تو میرے الم ریز افسانہ کی ابتدا ارض بنگال سے ہوتی ہے۔ تلسی رام پور گنگا کے ساحل پر واقع ہے۔ دریا کے کنارے دیوی دیوتاؤں کے متعدد مندر تعمیر ہیں۔ ان سے ملا ہوا مکانات کا سلسلہ میل سوا میل مربع زمین پر پھیلا ہوا ہے —— آپ سن رہے ہیں؟ شاید میری کہانی بیر ہونے کے باوجود بھی جاذب توجہ ہے۔ کیونکہ آپکی جویائے راز نگاہیں میری ہی طرف لگی ہیں —— سنئے سنئے، قصہ طویل ہے لیکن اختصار ملحوظ رہیگا۔

"تلسی رام پور میں بابو امبکا چرن مقیم ہیں۔ مختصر سی زمینداری ہے اُسکی آمدنی سے خاندان کی بسر ہوتی ہے بھگوان نے اُنھیں سات بچے عطا کئے لیکن ساتوں لڑکیاں

پھر وہی سکوت —— وہی سناٹا —— وہی حسن مستقیم یا ایک نامحسوس عالم اور بس! ——

پھر لبہائے جانبخش متحرک ہوئے اور کانوں کے راستے آبِ حیات کے گھونٹ حلق سے اُترنے لگے۔

"میں بابو صاحب کی چھوٹی اور شاید آخری بیٹی ہوں بچپن کا زمانہ طفلانہ غفلتوں میں گذرا۔ جہاں تک غور کرتی ہوں سارے گھر کی روح رواں میں ہی تھی نہ باوجی کو میری چھ بڑی بہنوں کی شادیاں کرنا پڑیں۔ یہ ایک دلخراش حقیقت ہے کہ ایک لڑکی کی تقریب میں جائداد کا چہارم حصہ خرچ کر دینا پڑتا ہے۔ لڑکے والے پیش قرار رقم کا مطالبہ کرتے ہیں اور جبتک حیثیت سے زیادہ وصول نہیں کر لیتے، برات نہیں لاتے۔ یہی وجہ ہے کہ ہندوستان میں لڑکی کی ولادت تباہی کا پیش خیمہ سمجھی جاتی ہے۔ سنتی ہوں میری پیدائش کے وقت باوجی کی آنکھوں سے آنسو ٹپک پڑے تھے —— خیر! کسی نہ کسی طرح چھ لڑکیوں کی شادی ہو گئی۔ قرض کے بوجھ سے زمینداری دب گئی۔ فراغت نے آنکھیں پھیر لیں اور افلاس کی گھٹاؤں نے گھر گھیر لیا۔ یہی زمانہ میرے عنفوان شباب کا ہے۔

ماما کو شادی کی فکر۔ لڑکی سیانی ہو گئی۔ زمانہ پر آشوب ہے۔ جوان جہان بیٹی کب تک گھر میں بیٹھی رہے؟ باوجی حیران کریں تو کیا کریں؟ جہاں تحریک کیجاتی ہے وہاں حیثیت سے زیادہ جہیز طلب ہوتا ہے۔ کنیادان کیواسطے پھر بھی روپیہ کہاں سے آئے؟ غضب تو یہ ہے کہ اب بھی بھرم دلیا ہی بنا تھا کسی کو کیا خبر تھی کہ ڈھول کے اندر پول ہی پول رہا ہے!

"بسنت کی رُت شروع ہوگئی۔ نوخیز لڑکیوں کے نازک گداز جسموں پر بسنتی سا رِیاں روپ دینے لگیں۔ گاؤں میں عید کی دھوم مچ گئی۔ ہر مکان میں چہل پہل نظر آنے لگی ایک ہمارا ہی کمبخت گھر غم خانہ بنا رہا ـــــ کیوں؟ اس لئے کہ میری اٹھارھویں گرہ لگنے والی تھی جب جب ماتا کے پاس جاتی تو وہ گلے لگا کے پیشانی چومتیں ساتھ ہی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آتے وہ کسی حیلے سے منہ پھیرتے ہوئے مجھ سے اپنا غم چھپانے کی سعی کرتیں اور میرا دل صدمہ کے احساس سے بھر آتا۔ بابو جی کی پاؤں پوجہ کو جاتی تو وہ لمبی ٹھنڈی سانس بھر کے آسمان کو تاکنے لگتے۔

آخر یہ رنجیدگی یہ اضمحلال کیوں ہے؟ میری عقل اس رازِ مخفی اس حقیقت مستور کے دریافت کرنے سے قاصر تھی!"

سالگرہ کا مبارک یا نامبارک دن آگیا۔ مضافات کے دیہات سے عزیز و اقارب تقریب کی شرکت کو آئے سبھوں نے بابو جی اور ماتا سے شادی کا تذکرہ چھیڑا ـــــ برادری میں کوئی لڑکی اس عمر تک بن بیاہی نہیں رہی ہے۔ اپنے پرائے نام دھریں گے۔ لڑکی بدنام ہو جائے گی۔ پھر کوئی بھلا مانس رشتہ قائم کرنے پر راضی نہ ہوگا۔ یہ ہیں وہ خیالات جو بابو جی اور ماتا کے سامنے دہرائے گئے۔ بابو جی نے ٹھنڈی سانس بھری۔ ماتا ساری کا آنچل منہ پر رکھ کر آنسو خشک کرنے لگیں۔ آہ! کنیا دان کرنے کو میرے پاس سرمایہ نہیں۔ گھر ـــــ گرستی ـــــ زمینداری نیلام کر کے بھی لڑکے والوں کا مطالبہ پورا کرنا محال ہے۔ بابو جی اس سے زیادہ کچھ نہ بول سکے اُن کی آواز گلوگیر ہو گئی۔ دونوں آنکھیں اشک ریزی کرنے لگیں۔ چہرہ سُت کر ذرا سا نکل آیا۔ اور ایسا معلوم ہونے لگا جیسے باطنی افکار اندر ہی اندر اُن کی روح کو تحلیل کئے ڈالتے ہیں"۔

"برابر کی کوٹھری سے میں نے یہ باتیں سُنیں۔ سارا چھپا ہوا راز آن کی آن میں منکشف ہو گیا ـــــ ہائے! میں ہی جنم جلی اس رنجیدگی۔ اس تفکر۔ اس بے اطمینانی اور اضطراب کی جڑ ہوں! ـــــ کیا میں اس کا کوئی دفعیہ نہیں کر سکتی؟

خود بخود گوشہ خاطر سے ایک آواز پیدا ہوئی اور غم کی شدت سے کلیجہ شق ہونے لگا کاش! بدنصیب لڑکیوں کی تخلیق نہ ہوئی ہوتی۔ سچ ہے۔ ایشور کی لیلا کون جان سکتا ہے؟ ـــــ مجھ پر والدین کا بڑا حق ہے۔ انھوں نے پال پوس کے بڑا کیا۔ بیماری دکھی میں۔

چارہ سازی اور تیمار داری کی خدمت انجام دی۔ تیوہاروں میں خوشی و خرمی کا سامان فراہم کیا ——— تو کیا مجھ پر اس کی شکر گذاری ——— اس کا اعتراف واجب نہیں ؟ "

"جنم گانٹھ دیئے جانے کا وقت آگیا۔ میں عروس کی طرح سنواری گئی۔ سہیلیوں نے معمول سے زیادہ سنگار پر توجہ صرف کی۔ تھوڑی دیر کے لئے اس خزاں کدے میں خرمی کی لہر دوڑ گئی۔ مرجھائی ہوئی صورتوں پر مسرت کی تازگی نظر آنے لگی۔ عورتوں نے ڈھول پیٹ پیٹ کر شادیانے الاپنا شروع کئے۔

مجھے بخوبی محسوس ہو رہا تھا کہ ان شادیانوں کے عقب میں ماتم کا شور پنہاں ہے وقت آرہا ہے کہ یہ نغمہ شادی نوحہ غم کی صورت میں تبدیل ہو جائے ——— بہر نوع قومی رواج کے مطابق سال گرہ کی رسم پوری کر دی گئی۔ گانے بجانے کے ساتھ کھانے کھلانے کا شغل بھی جاری ہوا۔"

"رات بھیگ چلی۔ آہستہ آہستہ ہنگامہ مسرت میں تخفیف شروع ہوئی۔ نیند کی دیوی نے سارے گھر کو تھپک تھپک کے سلانے کا فرض ادا کیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے سب پر سرور خواب طاری ہوگیا۔ گاؤں کے چوکیدار کتوں کو بھی جھپکی آگئی لیکن میں اپنے خفتہ قوم کی پاسبانی کو بیدار تھی۔

چاندنی خوب کھلی تھی۔ انگنائی میں سفید چادر کا فرش کیا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ میں نے تکیہ سے سر اٹھا کے دیکھا۔ سارا گھر پڑا سو رہا تھا۔ چپکے چپکے اٹھی اور زندگی کے ساتھیوں پر وداعی نظر ڈالتی ہوئی ماتا کے قریب پہونچی۔ وہ غافل تھیں۔ میں عقیدت و احترام کے ہاتھوں سے پاؤں چھوئے۔ پرنام کیا ——— آخری پرنام! آنکھوں سے جلتے جلتے آنسوؤں کے دو قطرے ٹپک پڑے۔

باپوجی بیٹھکے میں محو استراحت تھے۔ وہاں پہونچی ——— باپوجی! آپ کی فکروں کا علاج کرنے جارہی ہوں۔ وہاں! جہاں سے آج تک کوئی واپس نہیں ہوا ہے۔ بیٹھکے سے الٹے پاؤں باہر آئی۔ گھر والے سو رہے تھے۔ گاؤں والے سو رہے تھے۔ فضا خاموش تھی۔ میں نے ندی کا رخ کیا۔ گنگا بتا سینے سر لا پتی بہ رہی تھیں۔ چندرما نے انھیں نقرئی تاروں کی چادر اوڑھا دی تھی۔ میں پختہ گھاٹ کی سیڑھیاں طے کر کے سطح آب کے قریب پہونچ گئی۔ زرکار بسنتی ساری لطیف ہوا

کے جھونکوں میں جھکورے لے رہی تھی۔ لمبے لمبے خمدار گیسوئے مشکیں جنھیں چمکانے اور ملائم بنانے کی کوششیں رہا کرتی تھیں بے ترتیبی کیساتھ پشت و بازو پر بکھر گئے تھے۔ مانگ میں سیندور کی افشاں اور ماتھے پر چاندنی کی ضو دے رہی تھی۔

یکایک میرے دونوں ہاتھ فضا میں پھیل گئے۔ اور بے اختیاری میں زبان پر جاری ہو گیا ——— گنگا میا! داسی کو اس لوک میں سکھ ملنے کی امید نہیں میری منحوم ہستی ماتا پتا کی تباہی و بربادی کا باعث ہے۔ دنیا دار مجھے قبول کرنے سے انکار کرتے ہیں سب طرف سے مایوس ہو کے تمھارے چرنوں میں حاضر ہوئی ہوں۔ تمھیں مجھے گود میں لے کے دکھ درد سے نجات دے سکتی ہو۔

چھاکے کی آواز کے ساتھ ہی نازک نازک لہریں ہاتھ پھیلائے ہوئے لپکیں اور مجھے اپنی پناہ میں لے کے دنیا اور اسکے آلام سے بے نیاز کر دیا۔"

حسین سایہ دھند صلا ہوتے ہوتے پھر پیکر تصویر بن گیا معطل ہو جانے والی قوتیں اپنا کام کرنے لگیں۔ میں نے ہاتھوں کی ہتھیلیوں سے آنکھیں ملتے ہوئے دیکھا۔ وہی لائبریری تھی وہی میں۔ ہاتھوں میں تصویر تھی۔ صرف وقت ایک گھنٹہ کی مسافت طے کر گیا تھا۔

دوسری صبح اخبار میں یہ خبر مندرج دیکھ کر میرے تعجب کی حد نہ رہی۔

"ایک بنگالی لڑکی کی حسرتناک موت"

"بابو ——— زمیندار تلسی رام پور کی چھوٹی صاحبزادی مایا دیوی نے ندی میں ڈوب کے اسلئے خودکشی کر لی کہ اسکے والد اسکی شادی کے واسطے لڑکے والوں کا مطالبہ پورا کرنے سے معذور تھے۔

قول بھرتری

(ترجمہ منشی تلوک چند محروم بی۔ اے)

پروانہ ہے بے ضرر پتنگا ہے شمع پہ جل کے جان دیتا
مچھلی بھی تو عقل سے ہے عاری پھنس جاتی ہے جال میں بچاری
لیکن ہم صاحب خرد ہیں دانائے رموز نیک و بد ہیں
پھر بھی دام ہوس میں پھنسکر
کر لیتے ہیں حال اپنا ابتر

تنقید کتب

مہاراجہ رنجیت سنگھ[1]

پروفیسر سیتارام کوہلی پنجاب کے ایک مشہور ریسرچ اسکالر ہیں اور پنجاب گورنمنٹ کے حکم سے مہاراجہ رنجیت سنگھ کی حکومت کا ریکارڈ مرتب کر چکے ہیں جو "خالصہ دربار ریکارڈ" کے نام سے دو جلدوں میں شائع ہوا ہے۔ اب آپ نے ہندوستانی اکیڈیمی صوبۂ متحدہ کی فرمایش سے مہاراجہ رنجیت سنگھ کے متعلق یہ کتاب لکھی ہے جسمیں آپ نے مہاراجہ موصوف کے زمانہ کی لکھی ہوئی فارسی تاریخوں "ظفرنامہ رنجیت سنگھ" مصنفۂ دیوان امرناتھ "عمدۃ التواریخ" مصنفۂ منشی سوہن لال "تواریخ پنجاب" مصنفۂ بوتی شاہ۔ "فتح نامہ ملتان و پشاور" ہندی مصنفۂ گنیش داس بنگل (جو ہندی زبان کے چھندوں کی شکل میں "آلہا اودل" کے طرز کی کتاب ہے۔) "تواریخ مہاراجہ رنجیت سنگھ" مصنفۂ بھائی پریم سنگھ (پنجابی زبان گورمکھی حروف) اور دیگر انگریزی اور فارسی ہندی کتابوں سے بھی استفادہ کیا ہے۔ انگریزی میں بھی اس نامور سکھ مہاراجہ کے متعلق بہت سی قابل قدر کتابیں موجود ہیں، مگر ان میں ہندوستانی ذرائع سے کوئی فائدہ نہیں اُٹھایا گیا ہے۔

اِس سوانحعمری میں سولہ باب اور چار ضمیمے شامل ہیں۔ انڈکس کے بعد ایک تین صفحہ کا صحت نامہ بھی درج ہے۔ غرض لایق مصنف نے مختصراً سکھوں کی مکمل تاریخ اور مہاراجہ رنجیت سنگھ کے مفصل سوانح حیات بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ پنجاب اور سکھ قوم میں آجتک مہاراجہ رنجیت سنگھ جیسا کوئی اولوالعزم حکمراں پیدا نہیں ہوا ہے۔ رنجیت سنگھ نے ایک معمولی جتھے دار کی حیثیت سے ترقی کرتے کرتے اپنی بےمثل بہادری، حسن تدبیر، حوصلہ مندی، محنت و جانفشانی اور سیاسی حکمت عملی کی بدولت پنجاب میں ایک آزاد و مختار وسیع سلطنت قائم کر لی تھی۔ اس کے حسن سلوک کی بہترین مثال یہ ہے کہ جن سرداروں کے علاقوں کا وہ الحاق کرتا تھا اُن کے گذارہ کے لئے مختصر سی جاگیر اور اپنے دربار میں

---

[1] مؤلفہ پروفیسر سیتارام کوہلی ایم۔اے گورنمنٹ کالج لاہور۔ قیمت چار روپیہ۔ ملنے کا پتہ۔ ہندوستانی اکیڈیمی یو۔پی۔ الہ آباد

منصب عطا کر دیا تھا اور وہ بھی مرتے دم تک اُس کی وفاداری کا دم بھرتے تھے۔ لیکن مہاراجہ کی زندگی کے دو ایک واقعات ایسے بھی ہیں جو پروفیسر کوہلی کی تاویلات کے باوجود ایک عظیم القدر شخص کے شایانِ شان نہیں کہے جا سکتے ہیں۔ مثلاً مہاراجہ رنجیت سنگھ کا اپنی حوصلہ مند ساس رانی سدا کنور کے ساتھ سلوک جو بقول پروفیسر کوہلی

"ہندوستان کی مایۂ ناز عورتوں میں ممتاز درجہ رکھتی تھی۔ اس کی ہستی خالصہ تاریخ میں عموماً اور رنجیت سنگھ کے عروج میں خصوصاً یادگار زمانہ ہے۔ اس خاتون نے لگاتار تیس سال تک پنجاب کی ملکی تاریخ میں نمایاں خدمات سرانجام دیں۔ اسی کی مدد سے رنجیت سنگھ نے اپنے والد کے زمانہ کے دیوان سے اپنی مثل کا انتظام اپنے ہاتھ میں لیا۔ اسی کی وساطت سے رنجیت سنگھ لاہور پر قابض ہوا۔ بعد میں بھی یہ بیدار مغز عورت رنجیت سنگھ کو ہر طرح سے مدد پہونچاتی رہی۔ بڑے بڑے نامور جرنیلوں کے پہلو بہ پہلو میدانِ جنگ میں لڑنا اس کے لئے معمولی کام تھا۔ اپنی ریاست کا انتظام اس خوبی سے کرتی تھی کہ مدبرانِ سلطنت رشک کھاتے تھے۔ رنجیت سنگھ کے عروج کے لئے تو رانی سدا کنور زینہ کی پہلی سیڑھی کے مانند تھی جس کے ذریعہ وہ آخر کار چوٹی پر پہونچکر پنجاب میں خالصہ سلطنت قائم کرنے میں کامیاب ہوا"

مگر اس محسن اور شفیق رانی کے ساتھ مہاراجہ نے یہ سلوک کیا کہ اس کی جاگیر اور مقبوضات ضبط کر لیے جس سے وہ ستلج پار جا کر انگریزوں کی پناہ لینے پر مجبور ہو گئی۔ مگر اس غریب کو وہاں بھی چین نہ لینے دیا گیا، بلکہ بالفاظ پروفیسر کوہلی :-

"مہاراجہ نے رانی کو صلح جو خطوط لکھکر لاہور بُلا لیا اور نظر بند کر دیا۔ ... مصر دیوان چند اور اٹاری والے سرداروں کی سرکردگی میں فوج روانہ کی اور رانی کے کل مقبوضات پر جو ستلج کے اس طرف واقع تھے قبضہ کر لیا۔ سردار جے سنگھ کنھیا کے زمانہ کی جمع کی ہوئی کل دولت، توشہ خانہ اور اسلحہ خانہ مہاراجہ کے ہاتھ آیا۔ قصبہ بٹالہ کنور شیر سنگھ کو بطور جاگیر عطا ہوا اور باقی علاقہ سردار دیسا سنگھ مجیٹھیہ کی گورنری میں صوبۂ کانگڑہ میں شامل کیا گیا۔ رانی سدا کنور باقی عمر کے لئے قلعہ لاہور میں نظر بند کر دی گئی۔"

مشہور و معروف کوہ نور کے متعلق مہاراجہ کا طرزِ عمل معمول سے زیادہ سخت رہا۔ یہ ہیرا شاہ شجاع کے قبضہ میں تھا جس کو گورنر کشمیر نے قید کر لیا تھا اور اس کی بیگمات اور شہزادے لاہور میں مہاراجہ کی پناہ میں آ گئے تھے اور مہاراجہ نے بیگم سے اس ہیرے کے وعدے پر کشمیر پر چڑھائی کر کے شاہ شجاع کو چھڑا لیا اور جب شاہ موصوف کی بیوی نے اس ہیرے کے دینے میں لیت و لعل کیا تو رنجیت سنگھ غضبناک ہو گیا۔ اُس نے اپنے مہمانوں پر اس قدر سختی کی کہ بقول پروفیسر کوہلی :-

"اُن کے مکان پر پہرہ تعینات کردیا گیا اور شاہ شجاع کو سخت اذیت پہونچائی گئی۔"

اس قابل افسوس واقعہ کے متعلق کپتان مرے اور سید محمد لطیف کا بیان یہ ہے کہ "مہاراجہ بہت لالچی تھا، اُس نے خود دیدہ و دانستہ وفا بیگم کو اُس کے خاوند کی زندگی کے متعلق ڈرایا اور یہ امید دلائی کہ اگر وہ اسے کوہ نور دینے کا وعدہ کرے تو مہاراجہ اُس کے خاوند کو فتح خاں کے پنجہ سے صحیح و سلامت چھڑا لائیگا۔ بعد میں طرح طرح کے مصائب دیکر یہ ہیرا اُن سے چھین لیا۔"

بہر حال فاضل مؤلف نے یہ کتاب کافی محنت اور مطالعہ کے بعد لکھی ہے۔ گو واقعات کی زیادہ تر صحت رنجیت سنگھ کے درباری مورخین کے بیانات پر قائم کی ہے جو رنجیت سنگھ کے موافق لکھنے پر مجبور تھے۔

ہم کو یہ بھی افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ اس کتاب میں زبان اور املا کی بہت زیادہ غلطیاں رہگئی ہیں، گو آخر میں صحت نامہ کے ذریعہ بہت سے اغلاط کی تصحیح کردی گئی ہے۔ باینہمہ صفحہ ۳۲ پر خواجہ عبید کا "خواجہ اوبید" ہی رہا۔ کتاب میں مہاراجہ رنجیت سنگھ اور اُس کے دربار کی تصویریں اور آخر میں سکھ سلطنت کا نقشہ بھی ہے۔ کتاب ہر کتب خانہ میں رکھنے کے قابل ہے۔

مخزن الشعرا

یعنی تذکرہ شعرائے گجرات جسے قاضی نورالدین حسین خاں رضوی فائق مرحوم نے جن کی وفات ۱۲۹۸ھ میں ہوئی، فارسی زبان میں مرتب کیا تھا۔ فائق مرزا غالب کے معاصر تھے۔ تذکرے میں گجرات کے سو سے زائد اُردو شاعروں کے حالات اور انتخاب درج ہے، اور اُن کی ترتیب بلحاظ تخلص حروف تہجی پر رکھی گئی ہے۔ اس کے بعض شعرا بارھویں اور زیادہ تر تیرھویں صدی سے تعلق رکھتے ہیں۔ آخر میں مرزا غالب کا ایک خط مرقومہ دوشنبہ ۱۴ جولائی ۱۸۶۲ء بھی درج ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ تذکرہ کی فارسی نثر مرزا کی اصلاح کردہ ہے۔ شروع میں مولوی عبدالغنی کا فارسی مقدمہ ہے جس میں شعرائے گجرات کے حالات پر محققانہ روشنی ڈالی گئی ہے۔ یہ کتاب کمیاب تھی، مگر انجمن ترقی اُردو کے اولوالعزم سکریٹری مولوی عبدالحق صاحب کی کوشش سے چھپ گئی ہے، مولوی صاحب نے ایک محققانہ مقدمہ بھی تحریر فرمایا ہے جسمیں لکھا ہے کہ:-

"یہ قدیم تذکرے گو جدید اصول کے مطابق نہ لکھے گئے ہوں تاہم ضمنی طور پر ان میں بہت سی کام کی باتیں لکھی جاتی ہیں جو ایک ادیب اور محقق کی نظروں میں جواہر ریزوں سے کم نہیں۔"

ہم فاضل مقدمہ نگار کی رائے سے اتفاق کرتے ہیں۔ یہ کتاب حوالہ جات کی کتابوں میں رکھے جانے کے قابل ہے۔ حجم ۲۰۰ صفحات قیمت مجلد عہ۔ ملنے کا پتہ: انجمن ترقی اُردو اورنگ آباد دکن۔

اُردو کی ابتدائی نشوونما میں صوفیائے کرام کا حصّہ

اس کتاب کو انجمن ترقی اُردو کے فاضل سکریٹری مولوی عبدالحق صاحب بی۔ اے نے کمال محنت و ریسرچ کے بعد تحریر فرمایا ہے، اسمیں اکتیس باب ہیں اور خواجہ معین الدین چشتی اجمیری سے لیکر بابا کبیر واس تک ہندوستان کے مشہور و معروف اولیار اللہ، صوفیائے کرام اور بزرگانِ طریقت کے اقوال ملفوظات اور تصانیف کا حوالہ دیکر زبان اُردو کی نشوونما اور مدارج ترقی پر فاضلانہ بحث کی گئی ہے اسکا پہلا باب سب سے زیادہ دلچسپ اور سبق آموز ہے جس میں ایک مولوی اور ایک صوفی کے مسلک کا دلچسپ فرق دکھایا گیا ہے، مثلاً :۔

"مولوی اور صوفی میں یہ فرق ہے کہ وہ ظاہر کو دیکھتا ہے اور یہ باطن کو، وہ لفظ دیکھتا ہے اور یہ معنی کو وہ رسمیات اور تقلید کا پابند ہے، اور یہ اُن سے بیزار ہے، اُس کی نظر بُرائی پر پڑتی ہے، اور یہ بُرے سے بُرے میں بھی بھلائی کا پہلو ڈھونڈھ نکالتا ہے، وہ لعن وطعن سے کام لیتا ہے اور یہ مہر و محبت سے، وہ سختی اور تشدد کرتا ہے اور یہ نرمی و ملائمت، وہ بہت کم معاف کرتا ہے اور اسکا شیوہ درگذر کرنا ہے وہ خودی اور خود نمائی سے بڑا بنتا ہے اور یہ فروتنی اور خاکساری سے دلوں میں گھر کرتا ہے۔ وہ دوسروں کے عیوب کا متجسس رہتا ہے۔ اور یہ اپنے نفس کا محاسبہ کرتا ہے، وہ اپنے علم سے مرعوب کرنا چاہتا ہے اور یہ اپنے عمل سے دوسروں کو لبھاتا ہے:"

مشتاقانِ ادب اور تحقیق و تدقیق کے شائقین کے لئے اس چھوٹی سی کتاب کا مطالعہ بہت مفید ہوگا۔ ہمارے نزدیک اسے لکھکر فاضل مصنف نے زبان اُردو پر بہت بڑا احسان کیا ہے تاریخی حیثیت سے بھی یہ بہت قابل قدر تصنیف ہے۔ حجم ۹۰ صفحات، کاغذ عمدہ، قیمت غالباً ۱۲ار ملنے کا پتہ: انجمن ترقی اُردو اورنگ آباد۔ دکن۔

ریاض عبقری

یہ کتاب روہیلکھنڈ کے مشہور سخنور محمد فاضل صاحب عبقری بریلوی کا مجموعۂ کلام ہے جنکا ۵ مارچ ۱۹۳۳ء کو قلب کی حرکت بند ہو جانے سے اچانک انتقال ہوگیا تھا۔ اب یہ مجموعہ خاص اہتمام سے ان کے فرزند رشید محمد کامل صاحب کامل بریلوی نے مع تصویر مصنف شائع کیا ہے اس کے دو حصے ہیں پہلے حصہ میں مصنف مرحوم کی غزلیات ہیں جنکا مقدمہ جناب راز چاندپوری نے بڑی محنت سے لکھا ہے۔ دوسرے حصہ میں قومی و وطنی نظمیں اور نعتیں ہیں جنمیں کہیں کہیں ہندی زبان کی بھی چاشنی ہے۔ اس حصہ کا مقدمہ مولانا قمر الحسن صاحب قمر بدایونی نے تحریر فرمایا ہے۔ عبقری صاحب پرانی وضع کے بزرگ تھے اور انکے کلام میں امیر مینائی کے زمانہ کا رنگ پایا جاتا ہے لکھائی چھپائی کاغذ عمدہ قیمت ۱۰ ملنے کا پتہ: نظامی پریس بدایوں

عالمِ نسواں

۲۴۔ نومبر کو انجمن خواتین اودھ کی شاخ لکھنؤ کی ایک اہتمام بالستان کانفرنس بارہ دری قیصر باغ میں لیڈی سر لیوا ستو یہ صاحبہ (اہلیہ محترمہ سر جوالا پرشاد سر لیوا ستو یہ وزیر تعلیمات صوبۂ متحدہ) کی زیر صدارت منعقد ہوئی جس میں موصوفہ نے ایک اہم معاشرتی اور قانونی مسئلہ کی طرف توجہ دلائی اور گورنمنٹ سے ایک کمیشن کے تقرر کا مطالبہ کیا جو حق وراثت، ازدواجی حقوق، اور بچوں کی ولایت وغیرہ کے متعلق عورتوں پر سے تمام قانونی رکاوٹیں دُور کرنے کی تدابیر پر غور کرکے مروجہ قوانین میں ضروری ترمیمات کی سفارش کرے۔ چنانچہ یہ تحریک اتفاق رائے سے پاس ہو گئی۔ واقعی جب تک عورتوں کو مردوں کے مساوی حقوق نہ ملیں گے۔ وہ قوم و وطن کی خدمات بخوبی انجام نہیں دے سکتیں۔ مسلمانوں اور عیسائیوں میں طلاق و خلع کا قاعدہ ہے لیکن ہندوؤں میں میاں بیوی کے تعلقات زندگی بھر ختم نہیں ہوتے، خواہ مرد کا برتاؤ کتنا ہی قابل اعتراض کیوں نہ ہو۔ مگر عورت کی گلو خلاصی نہیں ہو سکتی۔ مسلمانوں میں عورتوں کو کسی قدر وراثت کا حق بھی حاصل ہے لیکن ہندوؤں میں یہ بھی نہیں ہے۔ ایسی حالت میں گورنمنٹ کوئی اصلاحی قانون وضع کرے تو بہت مناسب ہوگا۔ اسی قسم کے مطالبات دہلی، بمبئی، کراچی اور دیگر مقامات کی عورتوں نے بھی کئے ہیں۔

آجکل ترقی نسواں کی تحریک کا سب سے خوشگوار پہلو یہ ہے کہ ہماری زنانہ انجمنوں میں مذہب، فرقہ وغیرہ کی عموماً کوئی تفریق نہیں پائی جاتی اور یہ انجمنیں اس قسم کے نامناسب امتیازات و تعصبات سے بالا ہیں۔ ایک ہی انجمن میں یوروپین، ہندو، مسلم اور عیسائی خواتین بہنوں کی طرح ملتی جلتی ہیں اور اس طرح گویا مردوں کو براہ راست اتفاق و اتحاد، محبت و اخوت کا سبق سکھاتی ہیں۔

پچھلے دنوں انجمن خواتین اودھ نے جدوجہد کرکے چندہ فراہم کیا اور اپنی عمارت تعمیر کرالی

اسی طرح کی کوشش ایٹہ لیڈیز کلب کیلئے بھی ہو رہی ہے۔ چنانچہ اس کی عمارت بھی تکمیل کے قریب ہے، جس کی امداد میں مسز ترہبنی کنور چوہری میونسپل کمشنر ایٹہ نے دیگر میونسپل کمشنروں کی تائید و حمایت سے میونسپل بورڈ ایٹہ سے ایک ہزار روپیہ کی رقم طلب کی ہے۔ ایٹہ لیڈیز کلب کی سکریٹری مسز رادھا پیاری ماتھر آنریری مجسٹریٹ بھی ہیں کلب کی عمارت کے لئے بڑی سرگرمی سے چندہ جمع کر رہی ہیں۔

یہ بھی خوشی کی بات ہے کہ ہندوستانی خاتونیں بچوں کی نگہداشت اور حفظانِ صحت کے اصولوں کے مطابق ان کی پرورش کے فرض سے بھی غافل نہیں ہیں۔ چنانچہ اکثر مقامات میں بچوں کی نمائشیں منعقد کر کے صاف ستھرے اور تندرست بچوں کو انعامات بھی تقسیم کئے جاتے ہیں پچھلے دنوں لیڈیز زنانہ پارک لیگ لکھنؤ نے لیڈی ہیلی صاحبہ کی سرپرستی میں بچوں کی نمائش منعقد کی تھی اسکا افتتاح لیڈی صاحبہ موصوفہ نے کیا تھا۔ اس موقعہ پر آپ نے تقریر کے دوران میں اس امر پر خاص زور دیا کہ گو ہندوستانی عورتوں کی ماممتا مشہور ہے لیکن بے ڈھنگی ماممتا سے فائدہ کے بجائے نقصان ہوتا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ محبت کے علاوہ بچوں کی پرورش میں حفظانِ صحت اور اُن کے چال چلن کا لحاظ رکھنا ضروری ہے۔ آپ نے کہا کہ بیبی شو کو محض تماشا یا تھوڑی دیر کی دلچسپی کی چیز نہ سمجھنا چاہیئے، یہ ماؤں کی تربیت گاہ ہے جہاں سمجھدار ماؤں کو بچوں کی پرورش اور رکھ رکھاؤ کی تعلیم حاصل کرنیکا موقعہ ملتا ہے۔ اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ تندرست اور ہونہار اولاد کس طرح پیدا کیجا سکتی ہے۔ اس نمائش میں عمر کے لحاظ سے بچوں کی مختلف جماعتوں میں تقسیم کی گئی تھی۔ درجہ اول کے انعامات کنور رانی جگدیش پرشاد صاحبہ۔ لیڈی سیتا رام اور رانی صاحبہ ریاست منڈی کی طرف سے مقرر تھے۔ کنور رانی صاحبہ لیگ کی مربی اور رانی منڈی اس کی پریسیڈنٹ ہیں۔

دہلی کی انجمن خواتین نے لڑکوں اور لڑکیوں کی مخلوط تعلیم کے لئے موضع چندراول میں ایک اسکول جاری کیا ہے جسمیں ہر ذات اور ہر مذہب کے لڑکے لڑکیاں داخل ہو سکتی ہیں۔ ایک اور اسکول لڑکیوں کو قدیم طرز کے نرت اور موسیقی کی تعلیم دینے کے لئے جاری کیا ہے۔ تیسرا اسکول صنعت و حرفت کا ہے جسمیں ضرورتمند عورتوں کو کام سکھا کر اپنی معاش حاصل کرنیکا طریقہ سکھایا جاتا ہے۔

چوتھا اسکول ہندی کی اعلیٰ تعلیم دینے کے لیئے قائم کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ انجمن کی مختلف کمیٹیاں اپنے اپنے حلقۂ اثر میں اصلاح معاشرت یا سماج سدھار کی خدمات بھی انجام دے رہی ہیں

اکتوبر گذشتہ میں صوبۂ متحدہ کی وومنس کرسچین ٹمپرنس یونین نے شراب نوشی کے خلاف طلسمی لالٹین کے ذریعہ لکچر دیکر پروپیگنڈا کرنے کی تجویز منظور کی ہے۔ تعلیم یافتہ طبقہ میں شراب نوشی کی ترقی کے لحاظ سے یونین نے گورنمنٹ سے بھی درخواست کی ہے کہ ہائی اسکولوں کے طلباء کے لئے ٹمپریس ٹریننگ کا کورس بھی مقرر کیا جائے۔

جائنٹ سلکٹ کمیٹی کی رپورٹ میں عورتوں کے حق رائے دہی کے متعلق جو سفارشیں کی گئی ہیں۔ ان کے بموجب ساٹھ لاکھ سے زیادہ عورتوں کو حق رائے دہی حاصل ہو جائے گا۔ کمیٹی نے سفارش کی ہے کہ صوبجات متحدہ کے شہری حلقوں۔ بنگال۔ بہار اور اڑیسہ اور صوبجات متوسط میں شوہر کی جائداد کی بناء پر عورتوں کو ووٹ کا حق دیا جائے۔ اور پنجاب۔ بمبئی۔ صوبجات متوسط اور آسام میں ہر خواندہ عورت کو حق رائے دہی حاصل ہو۔ اس کے علاوہ فوجی سپاہیوں اور افسروں کی ماؤں اور بیواؤں کو بھی رائے دہی کا حق دینے کی سفارش کیگئی ہے۔

شریمتی جمنا بائی دیبی سنگھ راٹھور بی۔ اے نے جو ہندوستان کی سب سے پہلی راجپوت لیڈی گریجویٹ ہیں۔ ہز ہائینس مہاراجہ گونڈل کی گولڈن جبلی کی تقریب پر ریاست مذکور میں توسیع تعلیم کے لئے تیس ہزار روپیہ کا عطیہ دیا ہے۔

آجکل انگورہ اور استنبول میں پندرہ خواتین مجسٹریٹ، بارہ وکیل، آٹھ ڈاکٹر، پانچ ماہرین علم کیمیا، چار میونسپل کمشنر، بیس یونیورسٹی کی پروفیسر، آٹھ سو کے قریب ٹائپ کار اور سرکاری محکموں میں کلرک، ڈیڑھ ہزار سے زیادہ بنکوں اور اجارہ داریوں کے کاموں میں ملازم ہیں۔ بیس ہزار سے زیادہ لڑکیاں اور عورتیں کارخانوں میں کام کرتی ہیں۔ ٹرکی کے دیگر شہروں میں بھی ہزاروں عورتیں کام کرتی ہیں۔

ریاست ٹراونکور میں نام تپری برہمنوں اور باہر سے آئے ہوئے مسلمانوں کے سوائے اور کسی برادری میں پردہ کا رواج نہیں ہے۔ چنانچہ وہاں کی عورتیں رفاہِ عام کے کاموں میں آزادانہ دلچسپی لیتی ہیں اور تمام ریاست میں لڑکوں اور لڑکیوں کو ایک ساتھ ہی تعلیم بھی دیجاتی ہے چنانچہ اس وقت دو لاکھ چھیالیس ہزار چھ سو لڑکیاں مختلف اسکولوں میں تعلیم پا رہی ہیں۔ جداگانہ انتظام کرنے کی مجبوری ہوتی تو اتنی لڑکیوں کے لئے علحدہ اسکول قائم نہ کئے جا سکتے۔

یورپ میں اس وقت عورتیں ہر میدان میں مردوں سے مقابلہ کر رہی ہیں۔ حال میں فرانس میں مارسیلز کی ہیلین توچر نامی ایک لیڈی نے دو سو چھیاسٹھ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے ہوائی جہاز چلا کر عورتوں کا ہوائی ریکارڈ مات کر دیا۔ مگر افسوس ہے کہ یہ خاتون اٹلی میں ایک ہوائی حادثہ میں فوت ہوگئی ہے

بمبئی کانگریس کے موقعہ پر انتظامات میں مدد دینے کے لئے لیڈی والنٹیروں کا بھی ایک دستہ قائم کیا گیا تھا جس نے نہایت مستعدی، قابلیت اور کامیابی کے ساتھ اپنے فرائض ادا کئے۔

مسز ساوتری کندن آنے میونسپل کمشنر حیدرآباد سندھ کو آنریری مجسٹریٹ مقرر کیا گیا ہے

شریمتی امرت کور نے آسام کے سیلاب زدوں کی امداد کے لئے فنڈ جمع کرنے کے متعلق فاقہ کشی کر کے پرزور اپیل کی تھی جسکا ملک کی طرف سے حوصلہ افزا جواب دیا گیا۔ ڈاکٹر روتھ کیشو کرسٹی کو لندن یونیورسٹی نے ریسرچ اور تحقیقاتی مضمون لکھنے پر پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری عطا کی۔ مسز کملا بائی کبیے ساکن اندور نے برار کی چوتھی سالانہ صوبجاتی نسواں کانفرنس کی صدارت کی۔

بیگم سکینہ فاروق سلطانہ صاحبہ نے کلکتہ ہائیکورٹ کے ایڈوکیٹوں کی فہرست میں اپنا نام درج کرانیکی درخواست کی ہے۔

ماتمِ رواں

(از شاعرِ اعظم حضرت جوشؔ ملیح آبادی)

کیا موت نے تصویر مٹائی افسوس! اک آن میں ہو گئی جدائی افسوس!
ایامِ شباب اور پیغامِ فنا اے عمرِ رواں یہ بیوفائی افسوس!

ولہٗ

اک ایسا صدمۂ جانکاہ پہونچا ہے کہ رہ رہ کر
خود اپنی زندگی کی تلخیوں کو بھول جاتا ہوں
نہ پوچھ اس عزتِ غم کو کہ ہو جاتا ہوں شرمندہ
اگر بھولے سے بھی میں تیرہ قسمت مسکراتا ہوں
کبھی سازِ خرد کی خامشی پر آہ بھرتا ہوں
کبھی زلفِ جنوں کی برہمی پر سر جھکاتا ہوں
نہ جانے کون مضطرب اُٹھ گیا ہے بزمِ عالم سے
کہ اپنے دل کے اندر ایک سناٹا سا پاتا ہوں
فضا تاریک ہو جاتی ہے، تارے کانپ اُٹھتے ہیں
رواںؔ کی موت پر راتوں کو جب آنسو بہاتا ہوں

رباعیات رواںؔ مرحوم

(۱)
حرص و ہوس حیاتِ فانی نہ گئی اس دل سے ہوائے کامرانی نہ گئی
ہے سنگِ مزار پہ ترا نام رواںؔ مر کر بھی امیدِ زندگانی نہ گئی

(۲)
یہ کیا کہا کہ حیاتِ جاودانی کیا ہے پہلے دیکھو جہانِ فانی کیا ہے
اس فکر میں ہو کہ موت کیا شے ہے رواںؔ یہ بھی سمجھے کہ زندگانی کیا ہے؟

جوانی کے ساز و برگ

(از حضرت جوشؔ ملیح آبادی)

کچھ کسک سی دل میں کچھ آنکھوں میں آنسو آبدار
گاہ دردِ بے نوائی گاہ کربِ انتظار

ہجر کی کچھ خشمگیں تاریکیوں کا پیچ و تاب
وصل کی کچھ دلنشیں راتوں کا نورِ ماہتاب

چند وقفے خوشدلی کے چند گھڑیاں جور کی
کچھ تمنائیں شبِ مہتاب و روزِ ابر کی

کچھ دنوں پھیلی ہوئی شامِ بلا کی تیرگی
کچھ شبوں میں پھول سے چہروں کی میٹھی چاندنی

چار دن کو ظلمتِ ہول آفریں گرمِ عتاب
چند لمحے کچھ سنہری کنگنوں کی آب و تاب

کچھ تمناؤں کے انگارے دلِ صد چاک میں
جستجو کی کچھ خراشیں دیدۂ نمناک میں

چند سانسیں ہجر کی چلتی ہوئی تلوار پر
چند نیندیں روح فرسا کروٹوں کی دھار پر

کچھ فراغت کی امنگیں کچھ مسرت کی نمو
زانوؤں کے چند تکیے کچھ فراغت کے سبو

دو گھڑی کے واسطے احباب سے راز و نیاز
چند لمحوں کے لئے گلرنگ ہاتھوں کا گداز

کچھ دلوں بھیگی ہوئی راتوں کا لطفِ بے قیاس
شکریں باتوں کا رس شاداب چہرے کی مٹھاس

کچھ تبسم نرم کلیوں کی طرح کھلتے ہوئے
چند چہرے چودھویں کے چاند سے ملتے ہوئے

ساعدوں کی چند شمعیں عارضوں کے کچھ گلاب
کچھ رخوں کی سرخیاں کچھ مست آنکھوں کی شراب

کچھ خنک لہجوں کی شبنم کچھ ترانوں کی پھوار
کچھ لبوں کا شہد کچھ زلفوں کا عطرِ مشکبار

لطف کے دو ایک دن، تفریح کی اک آدھ رات
اے جوانی! تھی تری لے دے کے اتنی کائنات

پھر بھی تیرا وہ سبک پرواز عہدِ مختصر
خندہ زن ہے آج تک عمرِ مسیح و خضر پر

وقت کی سعیٔ جفا پر بڑھ کے پانی پھیر دے
ان دنوں کے چند لمحے، اے جوانی پھیر دے

ستارے کی خودکشی

(از جناب منوہر لال صاحب طالبؔ چکوالی، بی-اے، ایل ایل بی)

ستارے آسماں کے نیلگوں فضا میں جلوہ گر ۔۔۔ ہجوم میں تھے ہر طرف تو اس طرف تھے منتشر
چمن فلک کا تھا نثار رنگِ انتشار پر ۔۔۔ وفورِ نور داغِ دل بنا تھا غیرتِ قمر
چمک دمک بلا کی تھی غضب کا انتشار تھا
کلی کلی کے رخ پہ رنگِ غازۂ بہار تھا

فلک کی رفعتوں سے اک ستارہ ٹوٹ کر گرا ۔۔۔ کہ نیلگوں فلک سے بحرِ نیلگوں کا رخ کیا
نجانے بحرِ مضطرب کو کب سے انتظار تھا ۔۔۔ مثالِ داغ اپنے سینہ میں اسے چھپا لیا
تلاشِ نا چشمِ جستجو، تلاشِ نورِ حق ہوئی
کہ آرزوئے دیدِ یار گھٹ کے جاں بحق ہوئی

ستارے کی یہ خودکشی مگر مجھے بتا گئی ۔۔۔ کہ سوزِ دل بشر کے حق میں ہے فروغِ زندگی
چمک جہاں میں ہر جہان میں ہے وفورِ سوز کی ۔۔۔ تلاشِ سوزِ دل کو کہنا "خودکشی" ہے ابلہی
نہ کچھ سمجھ سکے مگر فلک کے اس کے ہم عصر
اسی طرح چمک رہے ہیں مقصد کو بھول کر!

گئے ہیں جو بھلا دیا انھیں یہی ملال ہے ۔۔۔ یہی فلک کی چال ہے یہی زمیں کا حال ہے
تلاشِ سوزِ زندگی ہی تابشِ جمال ہے ۔۔۔ فنا ہے یہ وہ جس فنا کا زندگی مآل ہے
مگر غضب! فنا پہ ہے اسے گمانِ زندگی
یہ خیر سے ہے کاروانِ رہروانِ زندگی

قدامت

(از منشی فیاض الدین خاں صاحب فیاض گوالیاری)

سیہ ابر قدامت مطلع مشرق پہ چھایا ہے ۔۔۔ جہاں روشن تھا جن سے اُن ممالک میں اندھیرا ہے
وہ دن آیا کہ مہر ارتقا مغرب سے نکلا ہے ۔۔۔ یہ آج اسکی ہے کل اُسکی ہے اسکا نام دنیا ہے
شکست فاش کھا کر مشرقی فوجیں ہٹیں پیچھے
وہ قومیں بڑھ گئیں آگے یہ قومیں رہ گئیں پیچھے

ہزیمت قوم مشرق کی قدامت کی بدولت ہے ۔۔۔ بُرا ہے حال اُنکا جن کو ماضی سے محبت ہے
یہاں دنیا سے نفرت ہے توکل ہے قناعت ہے ۔۔۔ وہاں ایجاد و علم و ارتقا کا نام جنت ہے
ہم اوج ارتقا سے دُور ہیں پاس قدامت سے
قدم آگے نہیں بڑھتا ہے احساس قدامت سے

قدامت کیا ہے پیری۔ پیری اضمحلال یکسر ہے ۔۔۔ عصا مذہب کا اسکے ہاتھ میں خونریز خنجر ہے
شریعت اسکے مذہب میں عجب فرسودہ دفتر ہے ۔۔۔ کتابوں تک ہے کچھ موقوف کچھ محدود منبر ہے
قدامت کیا ہے؟ راہ عقل کا مسدود ہو جانا
بنی آدم میں جوشش ارتقا مفقود ہو جانا

یہ مانا ہم نے نیکی ختم تھی اگلے زمانہ پر ۔۔۔ مروت۔ وضعداری ختم تھی اگلے زمانہ پر
روش اس وقت جو تھی ختم تھی اگلے زمانہ پر ۔۔۔ مگر کیا ہر ترقی ختم تھی اگلے زمانہ پر؟
قدامت کا جو یہ رنگ خلاف عقل و آئیں ہے
تو مشرق کا گذشتہ دور زریں۔ دام زریں ہے

آتاریگی یہ نشہ صبح کی ٹھنڈی ہوا اک دن ۔۔۔ یہاں والے زمانہ کا نہ دیں گے ساتھ کیا اکدن
رواج و رسم پارینہ مٹیں گے برملا اک دن ۔۔۔ مے کہنہ کو پوچھیں گے نہ رند پارسا اک دن
جوانی پیر میخانہ کی گردن توڑ ڈالے گی ۔۔۔ یہ شیشے پھینک دیگی یہ صراحی پھوڑ ڈالیگی

جوانی کیا ہے احساسِ نمو بیداریِ فطرت — عمل کا ہوش، دل کا جوش، عزم و شوق کی دولت
مجدد کوشش و امکاں، نہ ہونا قائلِ قسمت — سمجھنا مشکلوں کو سہل، غم کو جاننا راحت

سعی ہر گام پر دنیا میں شانِ امتیازی کی
حقیقی رنگ میں تشکیل محبوبِ مجازی کی

یکایک کمسنی کا جاگ اٹھنا لے کے انگڑائی — عمل کی، جوش کی، عزمِ بقا کی کارفرمائی
تبسم غنچۂ دل کا، چمن کی شان برنائی — پکار اٹھنا گلستاں کا "بہار آئی" "بہار آئی"

طلب کی چاندنی راتوں میں سوزِ دل کا بڑھ جانا
سمندر کا سمٹنا، دامنِ ساحل کا بڑھ جانا

رگوں میں خون کے ذرات کا عزمِ جنوں خیزی — ہر اک تصویر میں حسنِ نظر کی رنگ آمیزی
عمل میں جوش، دل میں عزم و ہمت، بات میں تیزی — شکستِ بازوؤں میں، ترانوں میں آہنگِ عرفریزی

قدم آگے بڑھانا اور بڑھا لے کے دنیا کو
بلندی بخشنا پستی کا طعنہ دے کے دنیا کو

جوانی عمر کے اک خاص حصے کو نہیں کہتے — جوانی زندگی کے کچھ زمانے کو نہیں کہتے
جواں دارِ عمل میں دل کے بوڑھے کو نہیں کہتے — جواں ہو جس کا دل بوڑھا ہم ایسے کو نہیں کہتے

عمل کا جوش جس کے دل میں ہے وہ مردِ میداں ہے
وہی دنیا کا محسن ہے وہی انسان انساں ہے

عمل کی قوتیں زائل ہیں افیونِ قدامت سے — رنگو دستِ ترقی خیز کو خونِ قدامت سے
تم اب تک خوابِ غفلت میں تھے افسونِ قدامت سے — بچاؤ لیلیٔ مشرق کو مجنونِ قدامت سے

بہت دن سن چکے فیاضؔ تم ماضی کا افسانہ
اب اپنا حال دیکھو اور سناؤ جی کا افسانہ

جذباتِ منتشر

از منشی بشیشور پرشاد منورؔ لکھنوی

بھر آتا ہے دل آنکھیں ہیں گریاں صبر رخصت ہے — مصیبت میں کسی کو دیکھ لینا بھی مصیبت ہے
ڈالدی خاک نگہباں کی نظر میں دیکھا — لے ہی آیا ہمیں دل آپ کے گھر میں دیکھا
ترے خلوتکدہ کی سیر سے محوِ تحیر ہوں — جو ہے لاکھوں تمناؤں کا مرکز یہ وہ دنیا ہے

شہرِ خموشاں

(از قلم مسٹر رام پرشاد کھوسلہ ایم۔ اے (آکسن) آئی۔ ای۔ ایس۔ ناشاد)

کہاں ہوں میں الٰہی کس قدر سونی یہ بستی ہے
یہاں کے ذرہ ذرہ سے عجب حسرت برستی ہے

غضب کی تیرگی چھائی ہے سناٹے کا عالم ہے
نگاہیں جس طرف اُٹھتی ہیں مایوسی برستی ہے

ہوا کے مضطرب جھونکوں سے شمعیں جھلملاتی ہیں
جہاں کی بے ثباتی پر قضا رہ رہ کے ہنستی ہے

یہاں کے رہنے والوں میں ہے ذوقِ خوابِ خاموشی
یہ کس مے کا خمار ان کو ہے کس بادہ کی مستی ہے

نہ اب سود و زیاں کی فکر ہے واسطہ ان کو
نہ ذوقِ خود ستائی ہے نہ شانِ خود پرستی ہے

تھکے ماندے مسافر کی طرح بیہوش سوتے ہیں
زبانِ حال سے کہتے ہیں یہ انجامِ ہستی ہے

خدا جانے یہاں پر کتنے ارمانوں کا مدفن ہے
مگر دنیا سمجھتی ہے کہ یہ ویران بستی ہے

حقارت سے نہ اِن ڈھیروں کو دیکھ اے دیکھنے والے
کہ ان کا ذرّہ ذرّہ کاشفِ انجامِ ہستی ہے

بری ہیں ساکنانِ گور کبر و ناز ہستی سے
برابر سب کے رُتبے ہیں بلندی ہے نہ پستی ہے

شہیدِ عشق وہ ہستی تجھے اب تو یقیں آیا
کہ ہستی پر ازل سے نیستی کی چیرہ دستی ہے

کھلیں گے گل کبھی اس خاک پر مانا مگر اب تو
جو اس میں چھپ گیا ہے آنکھ اس گل کو ترستی ہے

تو وابستہ ہے کیوں ناشاد سوزِ بزمِ ہستی سے
یہاں بھی ایک دُنیا ہے مزاروں میں جو بستی ہے

نیک انسان

یوں تو رتبے کو ہر اک اپنے بڑھا لیتا ہے
ہے وہی نیک جو غیروں کی دُعا لیتا ہے

غیرِ خونخوار سے واللہ خرِ مسکیں اچھا
کچھ نہ کچھ بار تو لوگوں کا اُٹھا لیتا ہے

(محمود اسرائیلی)

علمی خبریں اور نوٹ

پچھلے مہینہ دولت ایران نے اپنے مشہور عالم قومی شاعر ابوالقاسم فردوسی کی یادگار میں ہزار سالہ جشن جوبلی مناکر اپنی قومی بیداری اور مشاہیر پرستی کا ثبوت دیا تھا، اس جشن میں تقریباً تمام اطراف عالم کے علماء و فضلا مدعو کئے گئے تھے۔ ہندوستان کے چند ادیبا اور اہل قلم نے بھی مشہد (یعنی طوس) پہونچکر مزار فردوسی پر اپنی عقیدت وارادت کے پھول چڑھائے۔ وزیر اعظم ایران اور صدر انجمن آثار ملی نے فاضل مہمانوں کے اعزاز میں پر تکلف اور شاندار دعوتیں دیں۔ مہمانوں نے فاضلانہ تقریریں کرکے فردوسی کے کمالات شاعری پر روشنی ڈالی۔ ان میں موسیو روما سکو پروفیسر لینن گراڈ یونیورسٹی فواد بک پروفیسر استنبول یونیورسٹی آقائی سلجوقی نمایندہ افغانستان، ڈنمارک کے پروفیسر کرسٹنس کی تقریریں خاص طور پر قابل ذکر تھیں۔ اس تقریب کی یادگار میں بمبئی اور کلکتہ کے ادیبوں نے بھی خاص جلسے منعقد کرکے فردوسی کی یہ پیشگوئی بخوبی پوری کردی کہ

پے افگندم از نظم کاخے بلند　　　که از باد و باران نیابد گزند

دارالمصنفین اعظم گڑھ نے کئی مرتبہ ہندوستان کی ایک مکمل اسلامی تاریخ مرتب کرنے کی تحریک پیش کرکے ضروری مصارف کے لئے کم ازکم پانچ ہزار روپیہ کا مطالبہ کیا تھا۔ خوشی کی بات ہے کہ اس اپیل کے جواب میں خان بہادر مولوی محمد حسین خاں صاحب سابق ڈپٹی اکاؤنٹنٹ گورنمنٹ آف انڈیا (مصنف تزک عبدالرحمانی) نے سردست مبلغ پانسو روپیہ دیئے ہیں اور نواب صدر یار جنگ بہادر مولانا حبیب الرحمن خاں صاحب شروانی نے پچاس روپیہ ماہوار کی امداد منظور فرمائی ہے۔ امید ہے کہ ملک کے دیگر علم دوست اہل کرم بھی جلد اس طرف متوجہ ہوکر مہتمان دارالمصنفین کی حوصلہ افزائی فرمائیں گے۔

اس تاریخ کی پہلی جلد لکھنے کا کام مولوی سید ابوظفر صاحب کے سپرد ہوا ہے جو دس پندرہ سال سے ہندوستان کی تاریخ کا محققانہ مطالعہ کررہے ہیں تاریخ کی پہلی جلد میں آغاز اسلام سے خاندان غزنویہ تک کے واقعات درج ہونگے اور پوری کتاب چودہ جلدوں میں مکمل ہوگی۔

دارالمصنفین اعظم گڑھ کی زیر طبع کتابوں میں "افکار عصریہ" عنقریب شائع ہونیوالی ہے۔ مقالات شبلی کا حصہ چہارم بھی جس میں مولانا کے مطبوعہ اور قلمی کتابوں پر تبصرے ہیں نصف سے زیادہ چھپ چکا ہے۔ تو جوہ فرمانروایانِ عرب بھی عنقریب شائع ہوجائے گی۔ تاریخ صقلیہ حصہ دوم کی کتابت ہو رہی ہے۔

امسال علم طب میں تین امریکن ڈاکٹروں مسٹر جی۔ آر مینو پروفیسر آف میڈیسن ہاورڈ یونیورسٹی مسٹر جارج ہائٹ وصیل پروفیسر آف پیتھالوجی راچسٹر یونیورسٹی نیویارک اور مسٹر ولیم مرفی کو نوبل پرائز ملا ہے جنہوں نے مشترکہ طور پر خون کے متعلق ریسرچ کی تھی۔ اس علم کا انعام امریکہ کو دو سال سے مسلسل مل رہا ہے۔

۱۹۳۴ء کا نوبل پرائز لٹریچر میں ایک اطالوی ڈرامہ نویس کو عطا ہوا ہے۔

جنوری ۱۹۳۵ء میں آل انڈیا پیپرز اگزی بشن کی دوسری سالانہ نمائش الہ آباد میں ودیا منڈل الہ آباد کے زیر اہتمام منعقد ہوگی۔ اس میں مفت تقسیم کرنے کے لئے ایک پمفلٹ تیار کیا گیا ہے جس میں ہندوستان میں شائع ہونیوالے تمام اخباروں کے متعلق ضروری معلومات فراہم کی گئی ہیں۔ ہندوستانی اور غیر ملکی اخباروں کے تازہ اور پرانے پرچے بھی اس نمائش میں رکھے جائیں گے۔ ملک میں علمی دلچسپی پیدا کرکے ہندوستانی اخباروں و رسائل کی طرف توجہ لانا اس نمائش کا منشا ہے۔

مولانا اصغر حسین اصغر گونڈوی کا تازہ ترین فارسی و اردو کلام "سرود زندگی" کے نام سے شائع ہوگیا ہے۔ اس کا مقدمہ رائٹ آنریبل سر تیج بہادر سپرو نے اور ایک تقریظ مولانا ابوالکلام آزاد نے لکھی ہے کتاب کی ضخامت آٹھ جزو ہے جو نہایت اہتمام کے ساتھ آرٹ پیپر پر طبع کی گئی ہے۔ قیمت دو روپیہ، شائقین مصنف سے ہندوستانی اکیڈیمی الہ آباد کے پتہ سے طلب فرمائیں

پنڈت بشن نراین حامی اردو کے ایک کہنہ مشق شاعر ہیں جنکا اردو کلام "کلیات حامی" کے نام سے تخمیناً تین سو صفحات پر شائع ہوا ہے۔

منشی مہیش پرشاد صاحب ایم اے مولوی فاضل پروفیسر السنۂ مشرقیہ بنارس ہندو یونیورسٹی کو سیر و سیاحت ایران کے دوران میں رباعیات عمر خیام کا ایک پرانا مستند نسخہ دستیاب ہوگیا تھا چنانچہ اسی ایرانی نسخے کی مدد سے تصحیح کرکے آپنے خیام کی تین سو چھیاسٹھ رباعیوں کا ایک مجموعہ شائع کیا ہے۔



مسیو ا. ے. یم میکدوری سابق دیرکتر مدرسهٔ تعلیم صورهٔ مقصده

زمانہ

جلد ۶۴ — دسمبر ۱۹۳۴ء — نمبر ۶

بہادر شاہ اور غدر ۱۸۵۷ء

(از مولوی سید امیر احمد علوی صاحب ڈپٹی کلکٹر صوبہ متحدہ)

غدر کی عبرت ناک داستان کوچہ و برزن میں مشہور ہے اور اس کے اسباب و علل، واقعات و نتائج پر اُردو زبان میں متعدد کتابیں تصنیف و تالیف ہو چکی ہیں، لیکن ظفر کے سوانح نگار کو اس دلخراش مضمون پر قلم فرسائی سے چارہ نہیں۔ بصد رنج و الم اس افسانۂ غم کے وہ حسرت ناک مناظر مختصر الفاظ میں پیش کئے جاتے ہیں جن کو ہمارے ممدوح سے براہ راست تعلق ہے۔

منحوس ۵۷ء کے آغاز موسم بہار سے دہلی میں حیرت انگیز خبریں مشہور ہو رہی تھیں۔ کوئی کہتا تھا کہ ایران کا کجکلاہ ہندوستان پر حملہ آور ہوگا، کسی کا خیال تھا کہ زار روس ہند کی طرف پیشقدمی کریگا، کبھی خبر اُڑتی تھی کہ امیر کابل بادشاہ دہلی کو اغیار کی حراست سے آزاد کرانے آ رہا ہے۔ کسی دن شہرت ہوتی تھی کہ ٹرکی اور فرانس نے باہم معاہدہ کیا ہے اور وہ شاہ ایران کو ساتھ لیکر ہندوستان کا تختہ اُلٹنے کی فکر میں ہیں۔ بدباطن غل مچاتے تھے کہ لال قلعہ میں اہل فارس کی آمد کا روزانہ انتظار ہے اور حضرت شاہ حسن عسکری ایرانیوں کی فتح و نصرت کے لئے اعمال و ریاضات کی چلہ کشی میں مصروف ہیں۔ ایک دن جامع مسجد کے دروازے پر کسی شریر نے اشتہار چسپاں کر دیا کہ شاہ فارس فوج لئے آ رہا ہے، اور ہندوستان کے مسلمانوں کو اس لشکر کی امداد کرنا چاہیئے۔ عالم ہمہ افسانۂ ما دارد و ما ہیچ۔ سیاسیات سے دلچسپی رکھنے والے نئی نئی خبریں سننے کے مشتاق تھے، اور سامان تفریح کے فراہم کرنیوالے تازہ تازہ

بشارتیں تصنیف کرتے اور اُن کی تشہیر کرتے تھے، البتہ اس پیشین گوئی پر سب متفق تھے کہ عنقریب ایک زبردست انقلاب ہونیوالا ہے جس سے سلطنت برطانیہ کی طاقت ہندوستان میں ختم ہو جائے گی۔

تمام ملک میں یہ افواہ پھیل گئی تھی کہ انگریز رعایا کو جبراً عیسائی بنانا چاہتے ہیں، یہاں کے مراسم اور مذاہب مٹا کر اور تمدن و معاشرت فنا کرکے فرنگی تہذیب رائج کیجائیگی، دیسی ریاستیں سب ضبط کرلیجائیں گی اور انگلستان کا قانون ہمالیہ سے راس کماری تک نافذ ہوگا۔

غرض رعایا دل تنگ تھی اور فوج بدعل کہ اتفاقات قضا و قدر سے اُسی زمانہ میں ایک جدید قسم کے کارتوس آئے جن کو استعمال کرنے کے لئے دانتوں سے کاٹنے کی ضرورت تھی۔ بدمعاشوں نے شہرت دی کہ ان کارتوسوں میں گائے اور سُوّر کی چربی ملی ہوئی ہے اور ان کے رائج کرنے سے مقصود یہ ہے کہ ہندو اور مسلمان دونوں بیدین ہو جائیں اور پادریوں کو تبلیغ عیسویت میں آسانی ہو۔ یہ بے بنیاد خبر سارے ملک میں بجلی کی طرح پھیلی، ہندوستانی فوج اپنے افسروں سے ناراض اور بغاوت پر تیار تھی، اس افواہ نے بارود میں آگ لگادی۔ کارتوسوں کے استعمال سے انکار کر دیا۔ انگریزوں کے ارباب حل وعقد نے تدبر اور دانشمندی سے کام نہ لیا، اپنی سطوت و دبدبہ کے اظہار کے لئے نزاعی کارتوسوں کے استعمال پر اصرار کیا اور ایرانی حکیم کا وہ زریں مقولہ بھول گئے کہ

نہ ہر جائے مرکب تواں تاختن — کہ جاہا سپر باید انداختن

میرٹھ کی بڑی چھاؤنی رعب و داب کے مظاہرہ کے لئے انتخاب کی گئی۔ ۸ مئی ۱۸۵۷ء کو دیسی سپاہی کارتوس قبول کرنے پر مجبور کئے گئے، اُنھوں نے انکار کیا تو منکروں کے سرگروہ حوالات میں بند کر دئے گئے۔ دوسرے دن پریڈ پر ان سرغناؤں کو دس دس برس قید کا حکم سُنایا گیا، اُن کی وردیاں تمام فوج کے سامنے سرمیدان اُتاری گئیں اور بیڑیاں پہنادی گئیں، سپاہی غم وغصہ سے بیتاب ہوئے لیکن اُس وقت کسی نے دم نہ مارا، شام کو بازار میں خبر مشہور ہوئی کہ دو ہزار بیڑیاں بنوائی گئی ہیں اور کل دوسرے انکار کرنیوالے گرفتار کئے جائیں گے۔

صبح ہوئی تو اتوار کا دن تھا اور مئی کی دسویں تاریخ، انگریز افسر عبادت کے لئے گرجاگھر گئے، دیسی فوج بارکوں سے نکلکر جیلخانے پہونچی، قفل توڑے اور قیدیوں کو چھڑالائی، تھوڑی دیر کے بعد بارکوں کے چھپّر جلادیئے اور افسروں کو قتل کرنا شروع کیا، انگریز مرد۔ بچہ۔ عورت۔ فوجی اور غیر فوجی جس پر آنکھ پڑی موت کا شکار ہوا۔ دن بھر میرٹھ میں قتل و غارت کا بازار گرم رہا۔ شام کو باغی فوج دہلی کی طرف روانہ ہوئی۔ بعض انگریز

افسروں نے موقع پاکر دن ہی میں ایک خط کمشنر دہلی کے نام روانہ کردیا تھا جس میں بغاوت کا حال لکھکر اندیشہ ظاہر کیا تھا کہ باغی دہلی کا رُخ کریں گے اور وہاں بندوبست ہونا چاہیئے مگر بدبختی سے یہ خط آدھی رات کو کمشنر کی کوٹھی پر پہونچا۔ صاحب بہادر خواب استراحت میں تھے۔ اُن کو بیدار کرکے خط دیا گیا مگر نیند کے نشے میں خط کون پڑھتا، خط جیب میں ڈالکر سو رہے، صبح ہوئی تو باغی دہلی میں داخل ہوچکے تھے اور پانی سر سے گذر چکا تھا۔

دوشنبہ کے دن ۱۱۔ مئی ۱۸۵۷ء (۱۶۔ رمضان ۱۲۷۳ھ) کو بادشاہ سلامت فریضۂ صبح سے فارغ ہوکر جھروکے میں بیٹھے وظیفہ پڑھ رہے تھے کہ دریا کے پُل کی طرف آگ کے شعلے نظر آئے، دریافت حال کے لئے سوار بھیجے، معلوم ہوا کہ میرٹھ کی فوج باغی ہوگئی، انگریزوں کو قتل کرڈالا، دہلی آرہی ہے۔ گھاٹ کے انگریز حاکم کو مارڈالا ہے اور اُس کے بنگلہ کو آگ لگادی ہے۔

بادشاہ متحیر اور پریشان ہوئے، حکم دیا کہ پل توڑ دیا جائے اور شہر پناہ کے دروازے بند کردئے جائیں تاکہ یہ فتنۂ عظیم شہر میں داخل نہ ہوسکے، اتنے میں سواران باغیہ کشتیوں کے پل سے اُتر کر سلیم گڈھ کے نیچے ہوتے ہوئے قصر شاہی کے پاس آپہونچے، زیر جھروکہ برابر آکر استادہ ہوئے اور حسب قاعدہ سلامی دی۔ ہاتھ جوڑکر عرض کرنے لگے کہ "ہم لوگ آپ کے پاس فریادی آئے ہیں، امیدوار انصاف ہیں، ہم نے اپنی جانیں بیچکر اور سر کٹوا کر کلکتہ سے کابل کے ڈیرے تک چودہ سو کوس میں عملداری انگریزی قائم کرادی اور ہماری استقامت سے تمام ہندوستان پر تسلط ہوگیا، مگر جب کوئی سرکش باقی نہ رہا تو سرکار کی نیت میں فتور آیا، ہمارے دین مذہب کے درپے تخریب ہوئی، ایک قسم کی بندوق ایسی ایجاد کی جسمیں کارتوس دانتوں سے کاٹ کر لگانا پڑے، کارتوس معلوم نہیں کس کس جانور کی جھلی سے منڈھے ہیں۔ ہم لوگوں نے تعمیل حکم سے انکار کیا، نزاع بڑھ گئی، چار مہینہ سے یہ تنازعہ درپیش ہے، حکام میں کمیٹیاں ہوئیں اور ہم لوگوں میں بھی چھپا دوڑ گئیں کہ زیادہ تشدد ہو تو ایک دن ایک تاریخ گویا لاتفاق تمام ہندوستان میں غدر مچادو۔ چنانچہ میرٹھ سے فساد کا آغاز ہوا اور تمام فوج جادۂ اطاعت سے منحرف ہوگئی۔ ہم شبانہ روز میں تیس کوس کی مسافت طے کرکے اس وقت یہاں آئے ہیں تاکہ بادشاہ سلامت ہمارے سر پر ہاتھ رکھیں اور ہمارا انصاف فرمائیں ہم دین پر بگڑ کر آئے ہیں"۔ اس فریاد کا بادشاہ نے جو جواب دیا وہ تاریخی نقطۂ نظر سے نہایت اہم ہے اور اس سے ثابت ہوتا ہے کہ مظلوم ظفر کو سپاہیوں کی نافرمانی سے کچھ تعلق نہ تھا۔

بادشاہ کے اُستاد زادے راقم الدولہ سید ظہیر الدین حسین ظہیر دہلوی اُس وقت خدمت اقدس میں حاضر تھے اور اس گفتگو کے شاہد عینی ہیں۔ اُنھوں نے بادشاہ کا جواب "داستان غدر" میں بیان

کیا ہے جس کے بیشتر الفاظ خود حضرت ظفر کی زبان مبارک سے نکلے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔

جواب

"سنو بھائی! مجھے بادشاہ کون کہتا ہے، میں تو فقیر ہوں، ایک تکیہ بنائے ہوئے اپنی اولاد کو لئے بیٹھا ہوں، بادشاہت تو بادشاہوں کے ہمراہ گئی، میرے باپ دادا بادشاہ تھے جن کے قبضہ میں ہندوستان تھا سلطنت تو سو برس پہلے میرے گھر سے جا چکی تھی۔ میرے جد آبا کے نوکر چاکر اپنے خاوندان نعمت کی اطاعت سے جدا ہو کر رئیس بن بیٹھے، میرے باپ دادا کے قبضے سے ملک نکل گیا، قوت لایموت کو محتاج ہو گئے خصوصاً میرے جد بزرگوار حضرت شاہ عالم بادشاہ غازی کو جب غلام قادر نمک حرام نے قید کرکے نابینا کیا ہے تو پیشواہوں کو طلب کیا گیا تھا اور انھوں نے اس نمک حرام کو کیفر کردار کو پہونچایا حضرت بادشاہ کو قید سے چھڑایا چند سال مرہٹے بادشاہ کی جانب سے مختار رہے۔ مگر بادشاہ کے صرف مطبخ تا بندوبست نہ کر سکے لاچار ہو کر میرے ... نے جانب سلطنت برطانیہ رجوع کی اور انگریزوں کو بلوا کر اپنے گھر کا مختار فرمایا، ملک ہندوستان ان کو تفویض کیا، ان لوگوں نے حسب دلخواہ اخراجات شاہی کا بندوبست کر دیا۔ ملک میں امن و اماں کا ڈنکا بجا دیا، اس روز سے ہم لوگ بعیش و عشرت تمام بسر کرتے چلے آ رہے ہیں۔ لڑائی جھگڑے سے کچھ کام نہیں۔

میں تو ایک گوشہ نشین آدمی ہوں۔ مجھے ستانے کیوں آئے۔ میرے پاس خزانہ نہیں کہ تم کو تنخواہ دوں فوج نہیں کہ تمہاری امداد کروں ملک نہیں کہ تحصیل کے لئے تمھیں نوکر رکھوں میں کچھ نہیں کر سکتا ہوں مجھ سے کسی طرح کی توقع استعانت کی نہ رکھو، تم جانو یہ لوگ جانیں۔ ہاں ایک امر میرے اختیار میں ہے البتہ وہ ممکن ہے کہ میں تمھارے درمیان میں ہو کر انگریزوں سے تمہاری صفائی کرا سکتا ہوں۔ تم ابھی یہیں ٹھہرے رہو۔ میں نے صاحب رزیڈنٹ کو بلوایا ہے، وہ میرے پاس آنیوالے ہیں پہلے میں اُن سے دریافت کر لوں، اُن سے مجھے حال فتنہ و فساد معلوم ہو جائیگا اور خدا چاہے تو میں اس فساد کو رفع دفع کرا دونگا۔"

گفتگو ہنوز ناتمام تھی کہ فریزر صاحب رزیڈنٹ مع قلعدار صاحب کے داخل ایوان خاص ہوئے بادشاہ اُن سے مخاطب ہو کر فرمانے لگے۔

"کیوں بھئی! یہ کیا فتنہ و فساد برپا ہو گیا، یہ مذہب کا جھگڑا کیسا اٹھ کھڑا ہوا، یہ مقدمہ دین و آئین کا ہے، تعصب مذہبی بڑی شے ہے، اس فتنہ کا جلد انسداد ہونا واجب ہے، مبادا ہندوستان میں فتنہ عالمگیر ہو جائے اور لاکھوں آدمیوں کا کشت و خون ظہور میں آئے، یہ لوگ جاہل ہیں، فرقہ سپاہ

حائل ہوتا ہے۔ ان سے تپک کر کام نکالنا چاہیئے۔ ان کو ہدایت کرو کہ یہ لوگ اس فساد سے باز آئیں جائے تعجب ہے کہ تم کو اس معاملہ کی ابتک خبر نہیں۔"

ریزیڈنٹ نے بذاتِ خاص باغیوں کو فہمائش کی مگر کچھ اثر نہ ہوا، ایک سپاہی نے اُسی وقت صاحب بہادر پر بندوق کا فیر کیا مگر قضا نہ تھی بچ گئے، بادشاہ سے عرض معروض کرکے شہر کے بندوبست کے لئے باہر نکلے، باغیوں نے تعاقب کیا اور تھوڑی ہی دیر کے بعد شہر میں قتل و غارت کی آگ مشتعل ہوگئی۔ ریزیڈنٹ بہادر، قلعدار، دیسی عیسائی مارے گئے، دوکانیں لٹیں اور سارے شہر میں شیطان کا راج ہوگیا۔ باغیوں کو رسد کی ضرورت ہوئی اور ملازمین شاہی سے مدد مانگی، امداد کا اقرار اس شرط سے کیا گیا کہ غارتگری اور آتش زنی کا بازار بند کیا جائے، انھوں نے منظور کیا تو شہر میں منادی کی گئی "خلق خدا کی، ملک بادشاہ کا، حکم جہاں پناہ کا۔ کسی پر کوئی ظلم نہ کرے ورنہ ملزم شاہی قرار دیا جائے گا۔" دوکانوں پر پہرہ بٹھا دیا گیا اور شہر میں امن قائم ہوا۔

باغی اپنے حرکات سے کب باز آتے تھے، بنک گھر لوٹ لیا اور فرنگی عورتوں اور بچوں کو گرفتار کرکے اُن کے خون پر آمادہ ہوئے، شاہی ملازموں نے اس خون ناحق سے منع کیا، بصد کوشش اُن بیگناہوں کو شاہی حفاظت میں لیکر قلعہ میں رکھا۔ لال قلعہ میں بھی باغیوں کی عملداری تھی، بادشاہ بالکل بے بس تھے اُن کے صریح حکم کے خلاف یہ سب محبوسان بلا تامل کر ڈالے گئے۔ مرزا مغل، مرزا خضر سلطان وغیرہ شہزادے باغی فوج کے افسر بنائے گئے اور مظلوم بادشاہ کو بجبر و اکراہ ان تمام افعال کی رضامندی دینا پڑی۔ بادشاہ سلامت کے نام سے حکم احکام جاری ہونے لگے، لیکن اُن کے ملازموں کی یہ حقیقت تھی کہ ہر وقت فرشتہ اجل سلامت تھا۔ ظہیر دہلوی لکھتے ہیں کہ "ایک دن ہم لوگ حکیم احسن اللہ خاں کے پاس بیٹھے ہوئے تھے کہ پوربیوں نے آکر ہم کو گھیر لیا اور بندوقیں پاپوں پر کھینچکر کھڑے ہوگئے اور کہا کہ تم سب بیدین ہو، تم کرشٹان ہو۔ انگریزوں کو چٹھیاں لکھتے ہو۔ ہم لوگوں نے حیران ہوکر اُن سے کہا کہ ایک دفعہ ہم سب کو اُڑا دو، روز کے جھگڑے سے تو فیصلہ ہوجائے۔ اُن میں سے ایک دو افسر سمجھدار تھے وہ ساتھیوں کو سمجھا کرلے گئے۔"

بادشاہ کی یہ عزت تھی کہ مہتاب باغ میں ان بدتمیزوں نے اپنے گھوڑے باندھے تھے۔ ایک پوربیا فربہ اندام، پستہ قد، ادھیڑ، پچاس پچپن برس کی عمر کا منھ پر داڑھی گالڑھے کا کرتہ دھوتی بندھی ہوئی سر پر ایک انگوچھا، جال کرچ افسروں کی اُس کے گلے میں پڑی ہوئی عقب حمام کے چبوترے سے دربار میں آیا اور بادشاہ کو سلام کرکے پاس چلا آیا، بادشاہ کا ہاتھ پکڑ کر کہنے لگا "سنو بڑھئو! ہم نے تمھیں بادشاہ کیا" ظہیر دہلوی نے اس کے سینہ پر ہاتھ رکھکر دھکا دیا اور کہا کہ او بے ادب بادشاہوں کے دربار میں اس طرح گستاخی کرتے ہیں!

وہ دو تین قدم پیچھے ہٹ گیا۔ گرتے گرتے سنبھلا اور اُس نے تلوار کے قبضہ پر ہاتھ ڈالا، ظہیر نے بھی تلوار کھینچ لی۔ ایک سید زادہ نے سپاہی کا گلا دبوچا، دوسروں نے ظہیر کو روک لیا، لوگوں نے اُسے دھکے دیکر دیوان خاص کے باہر کردیا۔ بادشاہ نے خفا ہوکر مغلظات گالیاں دینی شروع کیں اور حکم دیا کہ محل کی سواریاں کراؤ اور خواجہ صاحب کو چلو قلعہ چھوڑدو۔ خود سوار ہوکر جالی کے دروازے تک پہونچ گئے تھے کہ اتنے میں سب افسر جمع ہوکر دوڑ آئے اور بادشاہ کی سواری روک لی۔ ہر چند بادشاہ نے چاہا کہ قلعہ سے چلے جائیں مگر وہ کب جانے دیتے تھے، ہوادار لوٹا کر تسبیح خانے کولے گئے۔

غرض قلعہ میں حکومت دراصل باغیوں کی تھی بادشاہ مفت بدنام تھے۔ ایک صادق البیان چشمدید گواہ کا بیان ہے کہ "بادشاہ غریب کا یہ حال تھا کہ حیران پریشان محل میں رہتے تھے، باہر برآمد ہونا چھوڑ دیا تھا، ہر وقت مغموم متالم اور آبدیدہ رہتے تھے، گاہ گاہ وقت شب تخلیہ میں تسبیح خانے میں گھڑی دو گھڑی آبیٹھا کرتے تھے اور اُن نمک حراموں کو بُرا بھلا کہتے تھے۔ ایک دن حضور نے ہم سے مخاطب ہوکر فرمایا کہ تم جانتے ہو آج کل جو سامان ہو رہا ہے اسکا انجام کیا ہونا ہے، حمید خاں جمعدار نے ہاتھ باندھکر عرض کی "حضور ڈیڑھ سو برس کے بعد اقبال یاور ہوا ہے، گئی ہوئی سلطنت پھر واپس آئی ہے۔" بادشاہ نے ارشاد فرمایا "تم لوگ نہیں جانتے ہو جو کچھ میں جانتا ہوں، مجھ سے سُن لو، میرے بگڑنے کا کوئی سامان نہ تھا یعنی بنا، فساد مال، دولت خزانہ ملک و سلطنت وغیرہ ہوا کرتے ہیں، میرے پاس ان میں سے ایک بھی موجود نہ تھی، میں تو پہلے ہی فقیر ہوا بیٹھا تھا،

کس نیاید بخانۂ درویش کہ خراج زمین و باغ بدہ

اب جو بجانب اللہ غیب سے میرٹھ میں آگ لگی اور دلی میں آکر بھڑکی، فتنہ برپا ہوا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ فلک غدار کو میرے گھر کی تباہی منظور ہے۔ آج تک سلاطین چغتائی کا نام چلا آتا تھا اور اب آئندہ کو نام و نشان یک قلم معدوم و نابود ہوجائیگا۔ یہ نمک حرام جو اپنے آقاؤں سے منحرف ہوکر یہاں آکر پناہ گزین ہوئے ہیں کوئی دن میں ہوا ہوئے جاتے ہیں، جب یہ اپنے خاوندوں کے نہ ہوئے تو میرا کیا ساتھ دینگے۔ یہ بدمعاش میرا گھر بگاڑنے آئے تھے بگاڑ چلے، ان کے جانے کے بعد انگریز لوگ میرا اور میری اولاد کا سر کاٹ کر قلعہ کے کنگرے پر چڑھادیں گے اور تم لوگوں میں سے کسی کو باقی نہ چھوڑیں گے۔ اور اگر کوئی باقی رہ جائیگا تو آج کا میرا قول یاد رکھو کہ تم روٹی کا ٹکڑا منہ میں لوگے اور وہ منہ میں سے اُڑ کر دُور جا پڑیگا۔" یہ سخن درد انگیز فرماکر پھر محل میں داخل ہوگئے۔

ان دانشمندانہ اقوال کا اُس فرد جرم سے مقابلہ کیا جائے جو فوجی عدالت کے سامنے مظلوم

بادشاہ پر لگائی گئی تھی تو اہلِ دنیا کی بے اعتباری اور نیرنگ زمانہ کا حیرت انگیز منظر آنکھوں کے سامنے پھر جاتا ہے۔ فاعتبروا یا اولی الابصار۔

بہرحال قوی شہادتوں سے یہ بات بخوبی ثابت ہے کہ غدر کی لڑائیوں سے ہمارے ممدوح کو دلچسپی نہ تھی۔ اس دورِ انقلاب کی تین چار مقتدر ہستیوں کا تذکرہ ضروری ہے، اول تو حکیم احسن اللہ خاں۔ دوسرے مرزا الٰہی بخش، تیسرے بخت خاں اور چوتھے مرزا مغل۔ اول بادشاہی طبیب تھے اور دوسرے بادشاہ کے سمدھی اور رشتہ دار، ان دونوں نے دُور اندیشی اور عاقبت بینی سے انگریزوں سے ساز باز کر کے اُن سے خفیہ نامہ و پیام کا سلسلہ قائم کیا، ادھر بادشاہ کو صلاحیں دیتے اور ادھر قلعہ کی ہر ایک خبر انگریزوں کو پہونچاتے۔ باغیوں کو کئی مرتبہ اُن کے حرکات پر شک ہوا لیکن بادشاہ نے اُن کی اعانت کی۔ ایک بار جوشِ غضب میں حکیم صاحب کا مکان باغیوں نے لوٹ لیا لیکن ظلِ ہمایوں کے طفیل میں جان سلامت رہی۔ بخت خاں ایک انگریزی رسالہ کا صوبہ دار تھا وہ دہلی میں باغیوں کا سرغنہ بنا "لارڈ گورنر" کا خود ساختہ خطاب لیکر تمام سیاہ و سفید کا مختار ہوگیا۔ مرزا مغل بادشاہ کے بیٹے اور فوج کے کمانڈر انچیف تھے لیکن اس قدر لیاقت نہ رکھتے تھے کہ انقلابی فوج کی رہنمائی کر سکیں۔ بخت خاں بدبخت ہو مگر جنگ کی قابلیت رکھتا تھا، ان دونوں اعلیٰ افسروں میں باہم اتفاق نہ تھا، مرزا مغل نادانی سے لارڈ گورنر کی کارروائیوں میں خلل اندازی کرتا تھا۔ باہمی کشاکش نے انتظام بد سے بدتر کر دیا۔ حملہ آوری درگور مدافعت کی بھی قوت نہ رہی، پنجاب کو براہ راست حکومت برطانیہ کے زیرنگیں ہوئے تھوڑا ہی عرصہ ہوا تھا وہاں کی فوج بغاوت کے زہر سے محفوظ تھی، انگریزوں نے اُسی لشکر سے کام لیا، نیپال سے گورکھوں کی مدد لی۔ باغیوں کو شکست دیکر دہلی کے سامنے ایک پہاڑی پر اپنا مورچہ قائم کیا، کہتے ہیں کہ جس دن پہاڑی پر انگریزوں کی توپیں چڑھیں مظلوم بادشاہ نے اپنی عبادت گاہ میں عاجزی اور نیاز سے دعا مانگی:۔

"میں ضعیف و ناتواں کے امتحان کا وقت آپہونچا، خداوندا مجھے صبر و استقلال دے۔ میں اس ابتلا سے عہدہ برآ ہونے کا اہل نہیں، میری شرم تیرے ہی ہاتھ ہے، اِن سنگدل اور بدنصیب سپاہیوں کو عقل دے کہ وہ معصوم بچوں اور بیگناہ عورتوں پر ظلم نہ کریں، میں تیرے سوا کس سے کہوں، تو ہی سب کا حکم اور ہر شے پر قادر ہے۔

شہ چو عجز آں طبیباں را بدید پا برہنہ جانب مسجد دوید

مگر دعاؤں کا وقت گزر چکا تھا، دہلی کا محاصرہ ہوگیا، باغیوں نے قلعہ پر توپیں نصب کیں اور دونوں طرف سے گولہ باری ہونے لگی۔ شہر والے صبح کو انگریزی فوج کے مقابلہ کے لئے نکلتے تھے اور شام کو اپنی تعداد میں کمی کرا کے واپس آجاتے تھے۔ محاصرین کو بھی اپنی قلت محسوس ہونے لگی تھی کہ اُن کے پاس کئی ہزار سوار و پیادہ کی کمک پہونچ گئی، اور ۱۴ ستمبر ۵۷ء کی خونریز لڑائی کے بعد جس میں انگریزوں کے چھیاسٹھ افسر اور گیارہ سو چار سپاہی مجروح و مقتول ہوئے تھے انھوں نے شہر کے ایک حصہ پر قبضہ کر لیا۔ ۱۵ ستمبر سے ۱۸ ستمبر تک شہر کے اندر لڑائی ہوتی رہی مگر ہر قدم پر باغیوں کو شکست ہوتی تھی، یہاں تک کہ ۱۹ ستمبر کو باغیوں کے پاس کوئی مورچہ باقی نہ رہا اور تمام شہر پر انگریزوں کا دوبارہ قبضہ ہوگیا۔

لال قلعہ کے لئے وہ بڑی مصیبت کی رات تھی، بادشاہ نے ارادہ کیا کہ حویلی سے نکل جائیں۔ اُس وقت "لارڈ گورنر" بخت خاں خدمتِ اقدس میں حاضر ہوا اور عرض کی "اگرچہ دشمنوں نے شہر لے لیا ہے لیکن اس سے ہمارا کچھ نقصان نہیں ہوا۔ تمام ہندوستان ہمارے ساتھ ہے اور ہر شخص کی نظر آپ کی ذات گرامی پر ہے، آپ کچھ تردد نہ کریں، میرے ساتھ تشریف لے چلیں میں پہاڑوں میں چھپ کر ایسی مورچہ بندی کرونگا کہ انگریز وہاں کامیاب نہ ہوسکیں گے۔ دہلی پایہ تخت ہے۔ کوئی فوجی قلعہ نہیں ہے اور جنگ کے لئے نہایت نامناسب ہے۔ ہم نے چند مہینے تک شہر کو بچائے رکھا یہی بڑی بات ہوئی، ہم نشیب میں تھے اور انگریز پہاڑی پر، کوئی ناتجربہ کار فوج بھی پہاڑی پر ہوتی تو اُس کو دہلی کا فتح کر لینا کچھ دشوار نہ تھا۔ سب سے بڑی خرابی یہ ہوئی کہ حضور کے صاحبزادے مرزا مغل بہادر فوج کے کمانڈر انچیف بنائے گئے، وہ فنونِ حرب سے ناواقف تھے اور اُن کو معلوم نہ تھا کہ سرکش اور خودسر سپاہیوں کو کس طرح قابو میں رکھا جاتا ہے اور ان سے اطاعت و فرمانبرداری کیونکر قبول کرائی جاتی ہے۔ میری زندگی کا بڑا حصہ فوجی خدمات میں صرف ہوا ہے۔ اگر شاہزادے صاحب میرے انتظامات میں رخنے نہ ڈالتے تو یقیناً انھیں سپاہیوں سے انگریزوں کے کثیر التعداد لشکر کو شکست دیتا۔ مگر اب بھی کچھ نہیں گیا ہے تمام ہندوستانی ریاستیں ہمارے ساتھ ہیں، وہ زبان سے خاموش ہوں لیکن اُن کے قلوب حضور کی مٹھی میں ہیں اگر حضور نے کسی محفوظ مقام پر قلعہ بند ہو کر انگریزوں کا مقابلہ کیا اور لڑائی کا پانسہ پلٹا تو تمام ملک حضور کا ساتھ دے گا۔"

بادشاہ اس تقریر سے متاثر ہوئے اور فرمایا کہ "ہم مقبرۂ ہمایوں جاتے ہیں تم کل صبح وہاں آکر

ہم سے ملو، اُس وقت مناسب جواب دیا جائیگا"

بخت خاں رخصت ہوا تو مرزا الٰہی بخش جو انگریزوں کی طرف سے اس خدمت پر ملعور ہوئے تھے کہ بادشاہ کو باغیوں کے ساتھ ہرگز جانے نہ دیں خدمتِ عالی میں حاضر ہوئے، چناں چنیں کے بعد حرفِ مطلب زبان پر لائے۔ نشیب وفراز سمجھا کر وعدہ کیا کہ "میں انگریزوں سے ملکر تمام معاملات کی صفائی کرا دونگا اور آپ پر یا آپ کی اولاد پر حرف نہ آنے دوں گا بشرطیکہ آپ باغیوں کے ساتھ نہ جائیں۔"

بادشاہ نے ان کو بھی کچھ جواب نہ دیا، صبح سویرے مع بیگمات اور بچوں کے باپ دادا کی حویلی سے باہر نکلے، ہمراہیوں کو مقبرہ ہمایوں کی طرف روانہ کیا اور خود درگاہ حضرت محبوب الٰہی سلطان نظام الدین اولیا میں حاضر ہوئے، حسرت و یاس، خوف و ہراس کا عالم تھا، چند خواجہ سراؤں اور ہوادار کے کہاروں کے سوا کوئی ساتھ نہ تھا، چہرہ زرد تھا اور گرد و غبار سے ریش آلودہ و پراگندہ تھی۔

خواجہ حسن نظامی دہلوی روایت کرتے ہیں کہ اُن کے نانا حضرت شاہ غلام حسن جو آستانۂ درگاہ کے خادم تھے بادشاہ کی آمد کی خبر سنکر خدمت اقدس میں حاضر ہوئے، دیکھا کہ حضور عالی مزار مبارک کے سرہانے بیٹھے ہیں۔ شاہ صاحب نے خیریت دریافت کی، ارشاد ہوا کہ "میں نے تم سے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ یہ کمبخت سپاہی خودسر ہیں اور ان پر اعتماد کرنا غلطی ہے، خود بھی ڈوبیں گے اور مجھکو بھی ڈبوئیں گے، آخر وہی ہوا کہ بھاگ نکلے، بھائی اگرچہ میں ایک گوشہ نشین فقیر ہوں لیکن ہوں اُس خون کی یادگار، جس میں آخر دم تک مقابلہ کرنے کی حرارت رہتی ہے۔ میرے بزرگوں پر اس سے زیادہ آڑے وقت پڑے ہیں اور اُنھوں نے ہمت نہیں ہاری، مگر مجھے تو غیب سے انجام دکھا دیا گیا ہے، اب اس میں شک کی گنجائش نہیں کہ میں تختِ ہند پر تیمور کی آخری نشانی ہوں، مغلیہ حکومت کا چراغ ٹمٹما رہا ہے اور کوئی گھڑی کا مہمان ہے، پھر جان بوجھکر کیوں مزید خونریزی کراؤں۔ اس واسطے قلعہ چھوڑ کر چلا آیا، ملک خدا کا ہے جس کو چاہے دے۔ سیکڑوں برس ہماری نسل نے سرزمین ہند پر بادشاہی کی، اب دوسروں کا وقت ہے، یہ کوئی رنج و افسوس کی بات نہیں۔ آخر ہم نے بھی تو دوسروں کو مٹا کر اپنا گھر بسایا تھا" اس طرز کی حسرت ناک باتوں کے بعد بادشاہ نے ایک صندوقچہ دیا اور کہا "یہ تمھارے سپرد ہے، امیر تیمور نے جب ترکوں کو شکست دی تھی تو سلطان بایزید یلدرم کے خزانہ سے یہ نعمت ہاتھ لگی تھی، اس میں حضور سرورِ کائنات

[redacted]

صلی اللہ علیہ وسلم کی ریش مبارک کے پانچ بال ہیں جو آج تک ہمارے خاندان میں تبرک کی طرح چلے آتے ہیں، اب میرے لئے زمین و آسمان میں کہیں ٹھکانا نہیں، ان کو لیکر کہاں جاؤں تم سے بڑھکر اس امانت کا کوئی اہل نہیں ان کو حفاظت سے رکھنا، یہ میرے دل و دیدے کی ٹھنڈک ہیں جن کو آج کے دن کی ہولناک مصیبت میں اپنے سے جدا کرتا ہوں" شاہ صاحب نے وہ صندوقچہ لیکر درگاہ کے توشہ خانہ میں داخل کر دیا۔ جہاں وہ ابتک محفوظ ہے اور ہر سال ربیع الاول کے مہینے میں تبرکات کی زیارت ہوتی ہے۔

اس کے بعد بادشاہ نے فرمایا "آج تین وقت سے کھانے کی مہلت نہیں ملی، اگر گھر میں کچھ تیار ہو تو لاؤ" شاہ صاحب نے کہا "ہم لوگ بھی موت کے سامنے کھڑے ہیں، کھانے پکانے کا ہوش نہیں، جاتا ہوں جو کچھ موجود ہوگا حاضر کرونگا۔ بہتر ہے کہ حضور خود غریب خانے پر تشریف لے چلیں، جب تک زندہ ہوں اور میرے بچے سلامت ہیں آپ کو کوئی شخص ہاتھ نہیں لگا سکتا" بادشاہ نے فرمایا "آپ کا احسان ہے ایسا کہتے ہو مگر اس بوڑھے جسم کی حفاظت کے لئے اپنے پیروں کی اولاد کو قتل گاہ میں بھیجنا مجھے کبھی گوارا نہ ہوگا۔ زیارت کر چکا، امانت سونپ دی۔ اب دو لقمے سلطان جی کے لنگر سے کھالوں تو مقبرے چلا جاؤنگا، وہاں جو قسمت میں لکھا ہے پورا ہوگا" شاہ صاحب گھر گئے اور وہاں سے بیسنی روٹی اور سرکے کی چٹنی لائے۔ بادشاہ نے تین وقت کے بعد وہ نعمت کھا کر پانی پیا اور خدا کا شکر ادا کرکے مقبرۂ ہمایوں کی طرف روانہ ہو گئے۔

اُدھر مرزا الٰہی بخش انگریزوں سے نامہ و پیام کر رہے تھے، دفتر خبر رسانی کے حاکم اعلیٰ میجر ہڈسن کو لکھدیا تھا کہ میں نے بادشاہ کو بخت خاں کے ساتھ جانے سے روک لیا ہے، کل مقبرۂ ہمایوں میں دوبارہ ملاقات کا وعدہ ہوا ہے۔ جس وقت وہ رخصت ہوں آپ تھوڑی سی فوج لیکر آئیں اور بادشاہ کو گرفتار کرلیں۔ غرض بادشاہ نے مقبرے میں بخت خاں سے آخری ملاقات کی، الٰہی بخش بھی موجود تھے۔ بخت خاں نے بادشاہ کے لیجانے پر اصرار کیا، مرزا نے مخالفت کی۔ بادشاہ نے بخت خاں سے مخاطب ہو کر فرمایا "بہادر! مجھے تیری بات کا یقین ہے مگر جسم کی قوت نے جواب دیدیا ہے اس لئے اپنا معاملہ تقدیر کے حوالے کرتا ہوں، مجھکو میرے حال پر چھوڑدو اور بسم اللہ کرکے یہاں سے جاؤ۔ کچھ کام کرکے دکھاؤ، ہماری فکر نہ کرو، اپنا فرض انجام دو" بخت خاں مایوس ہو کر مقبرے کے شرقی دروازے سے دریا کی طرف چلا گیا اور اپنی باقی ماندہ فوج ساتھ لیکر ایسا غائب ہوا کہ آج تک کسی جاسوس کو اُسکا سراغ نہ لگا۔ معلوم نہیں کہ زمین میں دھنس گیا یا آسمان پر چڑھا، مدتوں اُس کی تلاش جاری رہی

مگر کہیں پتہ نہ چلا۔

جب میجر ہڈسن کو خبر ملی کہ باغی سردار رخصت ہوگیا اور بادشاہ کے پاس کوئی طاقتور حمایتی باقی نہیں ہے تو اُنھوں نے جنرل سے بادشاہ کے گرفتار کرنے کی اجازت طلب کی، اُس وقت بحث پیش ہوئی کہ بہادر شاہ کو زندہ گرفتار کیا جائے یا قتل کر دیا جائے، جنرل صاحب کی رائے تھی کہ ہلاک کر دینا چاہیئے، مگر دوسرے افسروں نے اختلاف کیا کیونکہ اُس وقت تک صرف دہلی پر قبضہ ہوا تھا اور تمام ہندوستان میں فساد کے شعلے ہنوز مشتعل تھے، ایسی حالت میں بادشاہ کا زندہ رکھنا ہی مصلحت تھا۔ اس صلاح مشورے کے بعد میجر ہڈسن مقبرے کے دروازے پر آیا اور بادشاہ کو باہر بلایا زینت محل ہمراہ تھیں اُنھوں نے عرض کی کہ آپ پہلے میجر ہڈسن سے اپنی، میری اور جواں بخت کی جان کی اماں طلب کیجئے تب باہر جائیے۔ بادشاہ نے میجر کے پاس یہی پیام بھیجا اُس نے قبول کر لیا اس قول و قرار کے بعد بادشاہ برآمد ہوئے، پالکی لگائی گئی، اکبر و جہانگیر کا وارث سرکاری ملزم کی حیثیت سے اُس پالکی پر سوار کیا گیا اور گوروں کے پہرے میں دہلی بھیج دیا گیا۔

غدر کا انجام صفر ۱۲۷۴ھ کی پہلی یا دوسری تاریخ کو بادشاہ زینت محل کے مکان میں جو لال کنوئیں کے قریب تھا قید کئے گئے، دوسرے دن مرزا الٰہی بخش نے مخبری کی کہ مرزا مغل، مرزا خضر سلطان اور مرزا ابوبکر وغیرہم مقبرۂ ہمایوں میں پوشیدہ ہیں، میجر ہڈسن اپنے سپہ سالار سے اجازت لیکر سو سپاہیوں کے ساتھ اُن کو گرفتار کرنے روانہ ہوا، تینوں شہزادے مقبرے کے اندر تھے اور اُن کے ہمراہ لفٹننٹ میکڈاول کے قول کے مطابق تین ہزار مسلمان تھے، اور اُن کے علاوہ تین ہزار مسلح سپاہی قریب ہی جھاڑیوں میں موجود تھے۔ ہڈسن اور میکڈاول مقبرے سے نصف میل کے فاصلہ پر ٹھہرے کیونکہ اتنی قلیل جمعیت لیکر مقبرے پر دھاوا کرنا مصلحت نہ تھا۔ شہزادوں کے پاس پیام بھیجا کہ وہ گرفتاری منظور کریں یا انجام مزاحمت کے لئے تیار ہوں۔ آدھ گھنٹے کے بعد شہزادوں کی طرف سے جواب آیا کہ ہماری جانوں کی ذمہ داری کی جائے تو ہم اپنے تئیں حوالے کر سکتے ہیں۔ میجر نے کہا کہ میں یہ وعدہ نہیں کر سکتا۔ شہزادوں کو بغیر کسی شرط کے ہمارے پاس حاضر ہونا چاہیئے۔ اب مقبرے میں باہم گفت و شنید شروع ہوئی، شہزادوں نے کہا کہ تیموری خاندان کے لوگ اس طرح مجبور ہو کر قید نہیں ہوا کرتے۔ تلوار اُٹھاتے ہیں اور لڑتے ہیں، مارتے ہیں یا مر جاتے ہیں۔ دارا شکوہ کو جب اورنگ زیب نے قتل کرنا چاہا اور قاتل قید خانے میں آئے تو دارا ترکاری چھیلنے کی چھری لیکر کھڑا ہو گیا اور کچھ دیر جلادوں سے مقابلہ کرتا رہا، ہم کو بھی دلیرانہ کام کرنا چاہیئے، مرنا تو ہر حال ہی ہے

ہم بہادری کی موت کیوں نہ مریں۔

مرزا الٰہی بخش نے نصیحت کا دفتر کھولا اور ایسے اُتار چڑھاؤ دکھائے کہ اہلِ نصیب شہزادے مقابلہ اور مجادلہ سے دست بردار ہوگئے۔ اور مرزا کے مشورے کے موافق تن بہ تقدیر بغیر کسی شرط کے رتھوں پر سوار ہوکر ہڈسن کے پاس چلے آئے۔

انگریزوں نے اِن مصیبت زدوں کو خونخوار نظروں سے دیکھا اور دہلی کی طرف کوچ کا حکم دیا۔ جب دہلی ایک میل رہ گئی تو رتھوں کو ٹھہرایا اور شہزادوں کو حکم دیا کہ اپنے کپڑے اُتار ڈالیں، بدنصیب بے بس تھے، فرمان کی تعمیل کی، لباس شہزادگی جسم سے جدا کیا اور حسرت سے ہڈسن کی طرف دیکھنے لگے کہ اب کیا کہتا ہے۔ اُن کو خیال تھا کہ شاید اس جگہ سے مقید کرکے پا پیادہ لیجانے کا ارادہ ہے مگر نوشتۂ تقدیر کچھ اور ہی تھا۔ میجر غصہ سے دیوانہ ہوگیا اور اپنے ہاتھ سے شہزادوں کے مقام قلب پر تین تین گولیاں ماریں، مظلوم "ہائے" کہکر گرے اور تھوڑی دیر خاک و خون میں غلطاں رہکر راہیِ عدم ہوئے۔ جب لاشیں ٹھنڈی ہوگئیں تو اُن کو شہر میں لایا اور کوتوالی کے دروازے ایک دن رات سربازار آویزاں رکھا۔ مشہور ہے کہ اِن مظلوموں کے سر کاٹ کر بادشاہ کی خدمت میں بطور تحفے کے ارسال کئے گئے، لیکن اس انسانیت سوز وحشیانہ حرکت کا یقین نہیں آتا، کسی معتبر تاریخ میں یہ حکایت درج نہیں ہے اور غالباً غلط ہے۔

ہڈسن کے اس ظلم پر شریف انگریزوں نے اعتراض کیا، لارڈ رابرٹس نے بھی اسکو خطا قرار دیا جسٹس مکارتھی نے قتل عمد کے برابر سمجھا، مسٹر ڈسریلی نے کہا کہ انگریز افسر نے کانپور کے نانا صاحب کی سی وحشیانہ کارروائی کی۔ مگر اس ستمگاری کے تھوڑے ہی دن بعد وہ لکھنؤ میں عالم باغ کے قریب باغیوں کے ہاتھ سے مارا گیا لہٰذا اُس کے خلاف زیادہ لکھنا مناسب نہیں ہے۔

اس خونریزی کے بعد دہلی میں قتل عام شروع ہوا، جس کی بابت انگلستان کا ایک مؤرخ اسپنسر[1] والپول لکھتا ہے کہ وحشی نادر شاہ نے بھی وہ لوٹ نہیں مچائی تھی جو فتح دہلی کے بعد انگریزی فوج نے جائز رکھی، شارع عام پر پھانسی گھر بنائے گئے اور پانچ پانچ چھ چھ آدمیوں کو روزانہ سزا موت دی جاتی تھی۔ والپول کا بیان ہے کہ تین ہزار آدمیوں کو پھانسی دی گئی جن میں سے اُنتیس شاہی خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ مؤلف قیصر التواریخ لکھتا ہے کہ ستائیس ہزار مسلمان قتل کئے گئے اور سات دن تک برابر قتل عام جاری رہا۔

---

[1] ہسٹورینس ہسٹری آف دی ورلڈ جلد ۲۲ - صفحہ ۱۸۸ و ۱۸۹

غریب بادشاہ زینت محل کی حویلی میں قید تھا، خوراک کے لئے پانچ روپیہ یومیہ ملتے تھے اور اس ظلم وستم کی خبریں روز سُنا کرتا تھا۔

مشتاق تھے جس کے خبر آئی کہ مر گیا وہ جس دوست کو پوچھا یہ سنا قتل ہوا وہ

اس دورِ مصیبت کی یادگار ایک نظم ہے جسکو اداشناس ظفر کی تصنیف بتاتے ہیں مگر اسقامِ کلام پر نظر کر کے بعض نکتہ رس اس کو "حسامی" ایک غیر معروف شاعر کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ اس دارو گیر کی گرم بازاری میں الفاظ کی نشست پر غور کرنیکا کس کو موقع تھا، دل کے جذبات تھے جو زبان پر بیساختہ آگئے اور آج تک دردمندوں کی زبان پر زندہ ہیں۔ وہو ہذا:۔

گئی یک بیک جو ہوا پلٹ نہیں دل کو میرے قرار ہے
کروں اس ستم کا میں کیا بیاں مرا غم سے سینہ فگار ہے
یہ رعایا ہند تبہ ہوئی کہوں کیا کیا اُن پہ جفا ہوئی
جسے دیکھا حاکمِ وقت نے کہا یہ بھی قابلِ دار ہے
یہ کسی نے ظلم بھی ہے سُنا کہ دی پھانسی لاکھوں کو بیگنہ
ولے کلمہ گویوں کے سمت سے ابھی دلمیں اُنکے غبار ہے
نہ تھا شہر دہلی یہ تھا چمن کہوں کس طرح کا تھا یاں امن
جو خطاب تھا وہ مٹا دیا فقط اب تو اُجڑا دیار ہے
یہی تنگ حال جو سب کا ہے یہ کرشمہ قدرتِ رب کا ہے
جو بہار تھی سو خزاں ہوئی جو خزاں تھی وہ اب بہار ہے
شب و روز پھولوں میں جو تلیں کہو خارِ غم کو وہ کیا سہیں
ملے طوق قید میں جب اُنہیں کہا گل کے بدلے یہ ہار ہے
سبھی جا وہ ماتمِ سخت ہے، کہوں کیسی گردشِ بخت ہے
نہ وہ تاج ہے نہ وہ تخت ہے نہ وہ شاہ ہے نہ دیار ہے
جو سلوک کرتے تھے اور سے اب ہیں دیکھو وہ کس طور سے
وہ ہیں تنگ چرخ کے دور سے رہا تن پہ اُنکے تار ہے
یہ وبال تن پہ ہے سر مرا، نہیں جان جانے کا ڈر ذرا
کٹے غم جو نکلے یہ دم مرا، مجھے اپنی زندگی بار ہے

کیا ہے غم ظفر تجھے حشر کا، جو خدا نے پوچھا تو بولنا
ہمیں ہے وسیلہ رسول کا وہ ہمارا حامی کار ہے

قصہ مختصر، ۲۷ جنوری ۱۸۵۸ء کو لال قلعہ میں فوجی عدالت کے سامنے مظلوم بادشاہ کا مقدمہ پیش ہوا۔ شاہجہاں کے ایوانِ خاص میں اُن کا فرزند ملزم کی حیثیت سے پیش کیا گیا اور وکیل سرکار نے حسب ذیل جرائم کی فرد پیش کی:۔

(۱) سراج الدین محمد بہادر شاہ انگریزی کمپنی کے پنشن خوار تھے مگر اُنھوں نے ۱۰ مئی ۱۸۵۷ء اور یکم اکتوبر ۱۸۵۷ء کے درمیان محمد بخت خاں صوبہ دار رجمنٹ توپخانہ اور دوسرے افسران افواج انگریزی کو غدر اور بغاوت کرنے کی ترغیب دی اور اس کام میں امداد کی۔

(۲) بہادر شاہ نے اپنے بیٹے میرزا مغل کو جو انگریزی کمپنی کی رعیت تھے اور دوسرے باشندگان کو جو انگریزی رعایا تھے۔ انگریزی گورنمنٹ کے خلاف ہتھیار اُٹھانے میں مدد دی اور سازش میں شریک ہوئے

(۳) بہادر شاہ نے ۱۰ مئی سے یکم اکتوبر تک باوجود انگریزی رعایا ہونے کے اپنے آپ کو بادشاہ ہند مشہور کیا اور شہر دہلی پر ناجائز قبضہ کر لیا، اور میرزا مغل اور محمد بخت خاں سے سازش کی اور علم بغاوت بلند کیا اور گورنمنٹ سے جنگ کے لئے آمادہ ہوئے، اور گورنمنٹ برطانیہ کا تختہ اُلٹ دینے کی غرض سے ہتھیار بند فوجوں کو دہلی میں جمع کیا اور ان کو لڑنے پر آمادہ کیا۔

(۴) اُنتالیس نفر انگریزوں کو جن میں عورتیں اور بچے بھی شامل تھے قتل کرایا، یا قتل کرانے میں حصہ لیا، اور دیگر انگریزوں اور عورتوں و بچوں کو قتل کرانے میں مدد دی۔ اور والیان ریاست کے نام احکام جاری کئے کہ وہ عیسائیوں اور انگریزوں کو اپنے حدود میں جہاں پائیں قتل کریں اور یہ سب بموجب قانون ۱۶ ۱۸۵۷ء سنگین جرائم ہیں۔

عدالت کا فیصلہ پہلے سے طے شدہ تھا، جلاوطنی کا حکم صادر ہوا اور فوجی پہرے میں ہندوستان سے خارج البلد کئے گئے۔ شہزادہ جواں بخت و زینت محل کے علاوہ چودہ زن و مرد بادشاہ کے ساتھ روانہ ہوئے

جلایا یار نے ایسا کہ ہم وطن سے چلے   بطور شمع کے روتے اس انجمن سے چلے
نہ باغباں نے اجازت دی سیر کرنے کی   خوشی سے آئے تھے روتے ہوئے چمن سے چلے

قیدیوں کا قافلہ جب کانپور سے گزرا تو ایک چشم دید گواہ کا بیان ہے کہ بادشاہ پالکی میں گیروا لباس پہنے بیٹھے تھے، پچیس گورے اُس پینس کے گرد تھے، دو پالکیاں اور ساتھ تھیں جن میں نواب زینت محل اور تاج محل وغیرہ بیگمات تھیں، دو تین گاڑیوں پر شہزادہ جواں بخت وغیرہ دوسرے ہمراہیان تھے اور ان سب

کے خرچ خوراک کے لئے آٹھ روپیہ یومیہ مقرر تھے۔ سچ ہے کہ آئینِ جہاں گاہے چنیں گاہے چناں باشد۔

قیدِ فرنگ اور وفات ۱۸۵۸ء کے ختم ہونے سے پہلے اکبر کا آخری وارث رنگون پہونچا، جہاز سے اترتے ہی گوروں کی حراست میں بندرگاہ سے صدر بازار کے ایک دو منزلہ بنگلے میں گیا جو پرانی گھوڑ دوڑ کے میدان کے قریب موجودہ سڑک "وایل روڈ" پر واقع تھا۔ راوی کا بیان ہے کہ اب اس بنگلے کا نشان باقی نہیں، اُس جگہ پولیس چوکی اور چھاؤنی کے مجسٹریٹ کی کچہری ہے۔ ظفر اور زینت محل کی قبریں بھی اسی احاطے میں واقع ہیں۔

اس بنگلے کے گرد گوروں کا پہرہ ظفر کی زندگی تک رہا اور خرچ آب و نمک کے لئے صرف چھ سو روپیہ ماہوار ملتے رہے۔ اُنھوں نے سرکار انگریزی سے کسی امداد کی استدعا نہیں کی، فاقہ کشی اور غربت کی زندگی گوارا کی لیکن حمیت و غیرت ترک نہ کی۔ زینت محل کے پاس کچھ زیورات باقی تھے اُنھیں کو معاش کا ذریعہ بنایا اور بدنصیب زندگی کی آخری سانسیں افلاس و تنگدستی میں گزار دیں۔ شاعری کا ذوق رنگون میں بھی باقی رہا۔ اُن کی بعض دردناک نظمیں قید خانے کی چار دیواری سے نکلکر دلّی تک پہونچیں اور اب بھی بعض سخن فہموں کے پاس محفوظ ہیں، لیکن وہ نہ تو خود اُن کو شائع کرتے ہیں نہ دوسروں کو اُن کی زیارت سے بہرہ مند ہونے دیتے ہیں۔ مرحوم ایڈیٹر "صلائے عام" دہلی کے پاس ایک نفیس نظم اسی دورِ مصیبت کی تصنیف کسی ذریعہ سے پہونچ گئی تھی اور اُس کے کئی اشعار دلّی والوں کی زبان پر آگئے تھے لیکن باوجود اصرار اور تقاضے کے اُنھوں نے یہ نظم راقم الحروف کو عنایت نہ فرمائی۔ وہ نظم نعت میں بطور مناجات کے تھی اور مدینے میں موت نصیب ہونے کی تمنا کا اظہار تھا۔

کہا جاتا ہے کہ مندرجہ ذیل غزل رنگون کی بیکسی اور کس مپرسی کی یادگار ہے۔ بادی النظر میں شبہ ہوتا ہے کہ زبان ظفر کی نہیں ہے لیکن اُن کے دیوان اول میں بھی ایک غزل اسی طرز کی موجود ہے اور اُس کے چند اشعار حاشیہ[۱] پر درج کر دئے گئے ہیں:-

کون نگر میں آئے ہم کون نگر میں باسے ہیں   جائیں گے اب کون نگر کو من میں ہر لاسے ہیں
دیس نیا ہے بھیس نیا ہے رنگ نیا ہے ڈھنگ نیا   کون آنند کرے ہے واں اور بتے کون اُداسے ہیں

۱؎ (از جلد اول دیوانِ ظفر۔ ردیف نون)

جن گلیوں میں پہلے دیکھیں لوگن کی رنگ رلیاں تھیں   پھر دیکھا تو اُن لوگن بن سونی پڑی وہ گلیاں تھیں
ایسی انکھیاں میچے پڑے ہیں کروٹ بھی نہیں لے سکتے   جن کی چالیں البیلی اور چلنے میں چہل بلیاں تھیں
خاک کا اُن کا بستر ہے اور سر کے نیچے پتھر ہے   ہائے وہ شکلیں پیاری پیاری کس کس چاؤ سے پلیاں تھیں

۲؎ بیگم صاحبہ ڈاکٹر نصیر الدین احمد۔ عصمت سالگرہ نمبر ۱۹۳۲ء

[redacted]

کیا کیا پھلے دیکھے ہم نے پھول ہی پھلواری میں — اب جو ہیں پھول ہیں پھولے اور ہی ان میں باسے ہیں

دنیا ہے یہ رین بسیرا بہت گئی رہ گئی تھوڑی سی — اُن سے کہدو سو نہ جاویں نیند میں جو کہ ندا سے ہیں

حسب ذیل اشعار بھی اُن کے قید زبوں کی یادگار ہیں اور اُن کے جذبات کی صحیح ترجمانی ہے:۔

نہ کسی کی آنکھ کا نور ہوں نہ کسی کے دل کا قرار ہوں — جو کسی کے کام نہ آ سکوں میں وہ ایک مشت غبار ہوں

مرا رنگ روپ بگڑ گیا مرا حسن مجھ سے بچھڑ گیا — جو چمن خزاں سے اجڑ گیا اُسی کی فصل بہار ہوں

پئے فاتحہ کوئی آئے کیوں کوئی چار پھول چڑھائے کیوں — کوئی آ کے شمع جلائے کیوں میں وہ بیکسی کا مزار ہوں

یہ شعر بھی اسی عہد کی حسرت و مصیبت کی تصویر ہے:۔

نہ دبایا زیر چمن اُنھیں نہ دیا کسی نے کفن اُنھیں — نہ ہوا نصیب وطن اُنھیں نہ کہیں نشان مزار ہے

غرض قید خانے کے تنگ و تاریک کمرے میں وہ موت کا انتظار کرتے تھے۔ چہل قدمی یا ہوا خوری کے لئے بہت ہی کم باہر نکلتے اور بیشتر وقت یادِ خدا، تسبیح و استغفار میں صرف کرتے تھے۔ آخر کار اُن کی دعا قبول ہوئی اور نواسی ۸۹ برس کی عمر میں ۷۔ نومبر ۱۸۶۲ء کو قید فرنگ اور قید حیات دونوں سے آزاد ہو گئے

ندا در داد ہاتف بہر سالش — بہادر شاہ از دنیا برفت آہ

ایضاً

چراغ دہلی جلوس کا سال تھا سو اب بھی مطابق اُسکے

سروش غیبی نے سالِ رحلت کہا بجھا یہ چراغِ دہلی

سکرات موت کے وقت سوائے زینت محل، جواں بخت، اُن کی بی بی اور ایک خورد سال بچی کے کوئی موجود نہ تھا۔ حکام کی اجازت سے تجہیز و تکفین کرکے اُسی بنگلے کے احاطے میں دفن کر دیا۔ کچی قبر تھی ایک بیری کا درخت سرہانے لگا تھا اور یا اُسی سے مدت تک مرقد کا نشان رہا۔ زینت محل کچھ عرصے تک اُسی بنگلے میں فروکش رہیں بعد ازاں دوسرے مکان میں حکماً منتقل کی گئیں۔ پابند وضع شوہر کی وفات سے پانچ سال تک اُنھوں نے بھی انگریزی حکومت سے کوئی امداد قبول نہ کی مگر

آنچہ شیراں را کند روبہ مزاج — احتیاج ست احتیاج ست احتیاج

مجبور ہو کر ۱۸۶۷ء سے پانسو روپیہ ماہوار کی پنشن منظور کر لی اور اسی قدر وظیفہ مرزا جواں بخت کا بھی مقرر ہو گیا۔ شہزادے نے غربت و بیکسی میں بمقام مولمین (ملک برما) ۱۸۸۴ء میں انتقال کیا۔ آج تک قبر کا پتہ نہیں چلا ہے۔

غم نصیب زینت محل محلاتی عیش و عشرت کا غم و اندوہ سے کفارہ ادا کرنے کے بعد ۱۷ جولائی ۱۸۸۶ء

کو دنیا سے رخصت ہوئیں اور پرانے بنگلے کے احاطے میں مظلوم شوہر کی قبر کے پاس دفن کی گئیں۔ وہ احاطہ ایک یوروپین مسٹر ڈاسن کو جن کا برما کی مشہور ڈاسن بنک کمپنی سے تعلق تھا ٹھیکہ پر دیدیا گیا۔ صاحب بہادر کو مزار پر فاتحہ پڑھنے والوں اور چراغ بتی کے لئے خادموں کی آمدورفت ناگوار ہوئی مقبرے کا راستہ بند کر دیا۔ مرقدِ مبارک کے ایک طرف ٹینس کھیلنے کا میدان تھا اور دوسری طرف گھوڑے سدھانے کا چکر۔ چند روز میں قبروں کا نشان بھی ناپید ہو گیا اور روشن ضمیر ظفر کی پیشین گوئی پوری ہوئی۔

پسِ مرگ قبر پر اے ظفر کوئی فاتحہ بھی کہاں پڑھے
وہ جو ٹوٹی قبر کا تھا نشاں اُسے ٹھوکروں سے اُڑا دیا

بیسویں صدی کے آغاز میں ایک عقیدت مند پرستار ملک وملت عبد السلام نام دہلی مرحوم کے آخری تاجدار کا مزار تلاش کرتے ہوئے بہزار مشکل اس احاطے میں داخل ہوئے تو بیری کا درخت موجود تھا واقف کاروں نے نشان دیا کہ اسی درخت کے قریب بادشاہ اور انکی بیگم کی قبریں فرض کر لینا چاہیئے غیر تمند وفاکیش نے حکومت برما سے خط وکتابت کی، اخباروں میں مضامین لکھے، ہندوستان سے لیکر لندن تک دردمندوں کے قلوب زخمی کر دیئے تب اس مقام پر ایک کتبہ انگریزی زبان میں نصب کیا گیا جس کا ترجمہ حسب ذیل ہے،

"دلی کا معزول بادشاہ بہادر شاہ ۔۔ نومبر ۱۸۶۲ء کو رنگون میں مرا اور اس جگہ کے قریب دفن ہوا"

چند ماہ کی مزید کوشش کے بعد اسی پتھر پر زینت محل کی تاریخ وفات بھی کندہ کر دی گئی۔ کئی سال کی مسلسل سعی بلیغ سے یہ حاصل ہوا کہ گورنمنٹ نے مسلمانان برما کو قبر کا نشان دوبارہ بنانے کی اجازت دی اب دونوں قبروں کو ملا کر ایک تعویذ بنا دیا گیا ہے، لوہے کا کٹہرا اور ٹین کا سائبان ہے۔ بہادر شاہ کے پوتے سکندر بخت قبر کی مجاوری کرتے ہیں اور مسلمانوں کو فاتحہ خوانی کے لئے آمدورفت کی اجازت ہے۔ اس غریب شہزادے کا ذریعہ معاش سوائے نذر و نیاز کے کچھ نہیں ہے۔

ظفر احوال عالم کا کبھی کچھ ہے کبھی کچھ ہے
کہ کیا کیا رنگ اب ہیں اور کیا کیا پیشتر یاں تھے

محدود ہے جہل سے محبت میری
کثرت میں چھپی ہوئی ہے وحدت میری
کل عالم محسوس ورائے احساس
کس درجہ وسیع ہے قرابت میری

جوش

اِصلاح دیہات اور اُس کا پروگرام

۳

(از شیخ سعید الدین احمد محکمہ کوآپریشن۔پنجاب)

زمیندار کی موجودہ اقتصادی پستی ہر کس و ناکس پر روز روشن کی طرح ظاہر ہے۔ مگر یہ کس قدر قابلِ افسوس مقام ہے کہ ابھی تک وہ خوابِ خرگوش میں مبتلا ہے، اور اس نے ابھی تک ان ذرائع پر غور ہی نہیں کیا جن کے ذریعہ سے موجودہ مالی مشکلات سے اسے نجات حاصل ہو سکتی ہے۔ اگر ہندوستانی دہقان نے اپنی موجودہ معاشی حالت کو بہتر بنانے کے لئے کوئی ذرائع اختیار نہ کئے تو اس کی حالت بد سے بدتر ہو جائیگی اور شاید اسے وہ دن دیکھنا پڑیگا جب اسے نہ پیٹ بھرنے کو ٹکڑا اور نہ تن ڈھانکنے کو کپڑا میسر آئیگا۔

زمیندار کی حالت صرف اسی طرح بہتر ہو سکتی ہے کہ وہ اپنی زندگی کے ہر شعبہ کی اصلاح کرے اور جس طرح بن پڑے جلد از جلد موجودہ صورت حالات سے نجات حاصل کرے۔ قیمتوں کے گرجانے سے جن آلام و مصائب کا زمیندار کو سامنا کرنا پڑتا ہے وہ معمولی نہیں ہیں۔ یہی باتیں اقوام کی تباہی و بربادی کا باعث ہوتی ہیں۔ انھیں تکالیف کی بدولت قومیں قعر ذلت کی عمیق ترین گہرائیوں میں جا پڑتی ہیں۔ معاشیات کے نقائص اور مالیات کی کمزوری بادشاہوں اور بڑی بڑی سلطنتوں کیلئے بھی مضر ثابت ہوتی ہیں۔ جب ملک کی مالی حالت ہی مستحکم نہ ہوگی تو حکومت کا نظام کس طرح قائم رہ سکیگا۔ بہرحال اقتصادی مشکلات ملک کے لئے پیامِ مرگ کے بمنزلہ ہیں، لہذا ہمارے لئے اس وقت سب سے زیادہ اہم یہی مسئلہ ہے کہ جس طرح ہو سکے اس اقتصادی کشمکش سے نجات حاصل کریں، ورنہ ملک کو مزید تکالیف کا سامنا کرنا پڑیگا جس کا اثر زمیندار پر نہایت ہی بُرا ہوگا۔

ملکی رہنماؤں نے موجودہ اقتصادی مشکلات کا حل دیہات کی اصلاح و ترقی قرار دیا ہے۔ لہذا ہر ایک ملکی بھائی کا اولین فرض ہے کہ اصلاحِ دیہات کی کشتی کو ساحلِ مراد تک پہنچانے کی پوری طرح کوشش کرے۔ کیونکہ جس وقت اصلاح دیہات کا کام صحیح معنوں میں شروع ہو جائیگا اقتصادی مشکلات خود بخود کافور ہو جائیں گی۔

ہم نے گذشتہ مضامین میں اصلاح دیہات کے پہلے اصول پر بحث کرکے بتایا تھا کہ گاؤں کی پیداوار اور صنعت کس طرح بڑھائی جا سکتی ہے اور اس سے ملک کو کیا فائدہ پہنچ سکتا ہے آج ہم اصلاح دیہات کے دوسرے اصول کا ذکر کرینگے۔ جو یہ ہے کہ فضول خرچی سے پرہیز کیا جائے ہندوستان ایسا ملک ہے جہاں ہر موقعہ پر فضول خرچی کیجاتی ہے۔ شادی ہو یا غمی مرنا ہو کہ جینا، تقریب ہو یا تیوہار، عید ہو یا محرم، ہولی ہو یا دسہرا، غرض ہر موقعہ پر کچھ نہ کچھ فضول خرچی ضرور کی جائیگی۔ وہ تیوہار تیوہار ہی نہیں اور کوئی تقریب تقریب ہی نہیں جس میں فضول خرچی نہ کی جائے۔ بعض اوقات اس قدر قابل شرم رسومات کا مظاہرہ کیا جاتا ہے جو ناقابل بیان ہیں میں یہ نہیں چاہتا کہ ان تمام فضول خرچیوں کا یہاں تفصیل کے ساتھ ذکر کروں تاہم چند ایک باتوں کا ذکر اختصار کے ساتھ ضروری ہے۔

ہمارے ملک میں شادی سے پہلے منگنی کی رسم ادا کی جاتی ہے اور اس رسم پر نہایت بیدردی و بیدلی سے روپیہ صرف کیا جاتا ہے۔ لہذا ہمارے بھائیوں کو چاہیئے کہ جو رقم منگنی پر خرچ کیجاتی ہے اُسی یا کچھ اور ملا کر شادی کے اخراجات پورے کریں، شادی بیاہ میں باجا اور آتشبازی پر جو فضول خرچی کی جاتی ہے اسے بھی ترک کرنا چاہیئے۔ اسی طرح تیوہاروں اور تقریبوں پر بھی کوئی فضول خرچی نہ کریں نہ پنڈت جی کے لئے کھیر پکائیں اور نہ مولوی صاحب کے لئے شب برات پر حلوہ تیار کریں۔ ان پنڈتوں اور ملاؤں نے فضول رسومات مقرر کرکے اپنی شکم پُری کا خوب ڈھنگ نکالا ہے۔ شادی کے موقع پر بھی حاضر اور موت کے بعد بھی موجود، غرض ہر حالت میں ان کا دخل ہے۔ میں اس بات کا قائل ہوں کہ مذہبی رسومات کے لئے ان کی ہدایات ضروری ہیں مگر نکاح خوانی اور موت کے موقعوں پر ان کی فیسوں میں کمی کی سخت ضرورت ہے۔ چونکہ قوم کی مالی حالت کمزور ہے لہذا اس قسم کے اخراجات میں اس وقت تخفیف کی سخت ضرورت ہے۔ قصہ مختصر ہمیں چاہیئے کہ اپنی تمام ضروریات میں فضول خرچی سے احتراز کریں، اگر لباس کی ضرورت ہو تو ہمکی، ریشم اور سلک کے بجائے اپنے ملکی کپڑوں پر اکتفا کریں، اور اس طرح سے لباس پر فضول خرچی نہ کریں، اگر جوتے کی ضرورت ہو تو اپنے ملک کے وہ جوتے استعمال کریں جو سستے اور پختہ ہوں، اسی طرح کھانے پینے کے معاملات میں بھی کوئی فضول خرچی نہ کرنا چاہیئے

سب سے بڑی ضرورت اس وقت یہ ہے کہ ہم چھوٹی چھوٹی فضول خرچیاں بالکل ترک کر دیں مثلاً حقہ کشی اور سگرٹ نوشی بہت بڑی فضول خرچی ہے، صرف تمباکو پر ہمارے ملک کا کروڑوں روپیہ سالانہ صرف ہو جاتا ہے۔ پچھلے دنوں اندازہ لگایا گیا تھا کہ صرف تمباکو پر جو روپیہ صرف کیا جاتا ہے اگر اُسے ایک جگہ فراہم کرکے پشاور سے لے کر کلکتہ تک گرانڈ ٹرنک روڈ پر اسے ایک ایک کرکے بچھا دیا جائے تو پھر بھی کچھ روپے

بچ ہی جائیں گے۔ آپ آب ذرا حساب لگائیں کہ یہ رقم کتنی ہوتی ہے۔ پشاور سے لے کر کلکتہ تک کا فاصلہ پندرہ سو میل ہے اور ایک میل میں سترہ سو ساٹھ گز ہوتے ہیں اور ایک گز میں چھتیس انچ ہوتے ہیں۔ روپیہ انچ سے بڑا ہوتا ہے، اب آپ حساب لگا کر دیکھیں کتنا روپیہ صرف تمباکو پر صرف ہوتا ہے۔ کس قدر افسوس کا مقام ہے کہ ہندوستان جیسا غریب ملک کئی کروڑ روپے صرف تمباکو نوشی پر صرف کر دیتا ہے۔ اگر یہی رقم ہماری کسی دوسری ضرورت پر صرف ہوتی تو کتنا فائدہ ہوتا۔ اگر یہی رقم گورنمنٹ کے خزانہ میں یا ہماری جیبوں میں موجود ہوتی تو ہم کئی کام کر سکتے، اس لئے ضروری ہے کہ ہم حقہ اور سگرٹ دونوں سے پرہیز کریں، طبی نقطہ نگاہ سے بھی اسکی عادت اچھی نہیں ہے۔

اسی طرح ہم اپنے بچوں کے کان چھید کر انھیں زیورات نہ پہنائیں، اِس بدنصیب ہندوستان میں ہر روز ایک بچہ صرف اس لئے قتل کر دیا جاتا ہے کہ اس کے والدین اُسے زیور پہنا کر چوروں اور ڈاکوؤں کو موقعہ دیتے ہیں کہ وہ ان کے لخت جگر کو رسوماتِ بد کی دیوی کی بھینٹ چڑھا دے۔ جس ملک میں ہر سال تین سو پینسٹھ بچے اس رسم بد کی بدولت قتل کئے جاتے ہوں بھلا وہ کس طرح مہذب کہلا سکتا ہے۔ لہذا ہمیں چاہیئے کہ ہم اس فضول خرچی کو چھوڑ دیں اور جو رقم اس وقت زیوروں پر خرچ کرتے ہیں اس کو بچوں کی تعلیم و تربیت پر صرف کریں۔

متذکرہ بالا باتوں پر ہم انفرادی طور پر عمل کر سکتے ہیں، مگر اکثر اوقات ہم برادری یا گاؤں کے ڈر سے بہت سی رسومات ترک نہیں کر سکتے کیونکہ ہم میں اتنی جرأت نہیں ہوتی کہ برادری کی مخالفت کر سکیں لہذا ہمیں کسی ایسے نظام سے تعلق پیدا کرنا چاہیئے جس کی اعانت سے ہم مل جل کر امداد باہمی کے اصول پر ان فضول رسومات اور بیجا اخراجات سے نجات حاصل کریں۔ گورنمنٹ عالیہ نے انجمنہائے امداد باہمی کا محکمہ جاری کر کے ملک پر ایک احسان عظیم کیا ہے۔ اس محکمہ سے ہم اپنے تمام امراض کی دوا حاصل کر سکتے ہیں۔ آج چونکہ ہمارا مضمون فضول خرچی سے پرہیز کرنے کے متعلق ہے اس لئے ہم یہ دیکھیں گے کہ اس محکمہ نے اسکا کیا علاج کیا ہے

اس محکمہ نے انجمن ہائے اصلاح رسومات اور زندگی بہتر بنانے کی انجمنیں قائم کر کے ہمیں اس بات کی جرأت دلائی ہے کہ ہم اتفاق باہمی سے فضول اخراجات اور بیجا رسومات ترک کر دیں۔

اِن انجمنوں کے میمروں کیلئے ضروری ہے کہ وہ شادی غمی کے موقعوں پر اپنے اخراجات مقررہ حدود کے اندر رکھیں اور اگر ان سے تجاوز کریں تو جرمانہ کے مستوجب ہونگے یا انہیں برادری سے خارج کر دیا جائیگا۔ اسطرح تمام ممبران فضول خرچی ترک کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں اور انہیں اتنی جرأت پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ ان قوانین و ضوابط پر عمل کریں، نہ کوئی اعتراض

کرتا ہے نہ کسی کا ڈر باقی رہتا ہے۔ لہذا سب بھائیوں سے یہی گذارش ہے کہ جلد از جلد محکمۂ انجمن ہائے امداد باہمی کی اِن نعمتوں سے مستفیض ہوں اور اپنے اپنے گاؤں یا محلہ یا شہر میں اِس قسم کی انجمنیں قائم کریں۔

اس اسکیم کے مطابق جس وقت اصلاحِ دیہات کا کام صحیح معنوں میں شروع ہو جائیگا اقتصادی مشکلات سے خود بخود نجات مل جائے گی۔

جذباتِ بسمل

(از جناب بسمل الہ آبادی)

ہستی کو ذلیل کر رہے ہیں
جینے کے لئے جو مر رہے ہیں

اُلفت میں وہ کام کر رہے ہیں
مرنے کے لئے جو مر رہے ہیں

وہ ہیں کہ نہیں کہیں بھی ملتے
ہم ہیں کہ تلاش کر رہے ہیں

موجود ہے آسمان سر پر
کیا سوچ کے ہم اُبھر رہے ہیں

دنیا بھی نگاہ میں نہیں کچھ
دنیا پہ نگاہ کر رہے ہیں

منزل کا کہیں پتہ نہیں ہے
کس راہ سے ہم گذر رہے ہیں

آئیں گے نہ سامنے اَبد تک
پردہ جو ازل سے کر رہے ہیں

درشن نہ ہوئے نصیب لیکن
بے دیکھے کسی پہ مر رہے ہیں

اللہ رے عالمِ تصور
ہم بات کسی سے کر رہے ہیں

بس اُن کی قبول بندگی ہے
بندے جو خدا سے ڈر رہے ہیں

ہر رنگ میں وہ ہیں جب نمایاں
تو کیوں یہ حجاب کر رہے ہیں

منزل کے قریب ہم پہونچکر
ایک ایک قدم پہ ڈر رہے ہیں

دن رات تڑپنے کا سبب کیا
بسمل بھی کسی پہ مر رہے ہیں

پنڈت ناتھورام شنکر شرما مرحوم

(از منشی اقبال ورما سحر ہتگامی)

پنڈت ناتھورام شرما جن کا انتقال ۱۹۳۲ء میں ہوا ہندی کے چند برگزیدہ شعرا میں شمار ہوتے تھے آپ اُردو فارسی میں بھی اچھی لیاقت رکھتے تھے اور اوائل عمر میں آپ کو اُردو شاعری سے بھی ذوق تھا لیکن آخر میں آپ کی تمام تر توجہ ہندی شاعری پر مرکوز ہوگئی تھی، سنسکرت اور بنگلہ سے بھی خوب واقف تھے آپ کے مطالعۂ کتب کا یہ عالم تھا کہ دن رات پڑھا کرتے تھے۔ چنانچہ اُنھوں نے ستر۷۰۰ سو سے زائد کتابیں غور سے پڑھی تھیں، جس کی وجہ سے ان کی معلومات میں غیر معمولی اضافہ ہوگیا اور وہ کسی موضوع پر بلا تکلف گفتگو کر سکتے تھے۔

پنڈت ناتھورام ہندی کے اولین شاعر تھے جنھوں نے کھڑی بولی (جدید ہندی) کو اپنے شاعرانہ جذبات کے اظہار کا ذریعہ قرار دیا۔ مروجہ زبان ہندی میں اُنھوں نے اپنے طرز جدید کی بنیاد ڈالی حالانکہ اصول اور طرز بیان وغیرہ میں آپ نے اُن تمام اُمور کو ملحوظ رکھا جو شعرا قدیم کا طرۂ امتیاز تھا۔ درحقیقت وہ دَور قدیم ہی کے شاعر تھے، محض زور طبیعت کی بدولت جدید رنگ میں بھی اُنھوں نے اپنا کمالِ فن دکھایا۔ ان کے کمال فن کے قدردانوں میں بڑے بڑے راجہ مہاراجہ، ہندی شاعر، ادیب، نقادِ فن سبھی شامل تھے۔ پروفیسر گریرسن اور پنڈت مہابیر پرشاد صاحب دُوویدی (سابق ایڈیٹر سرسوتی) بھی آپ کے معترف تھے

برج بھاشا کی شاعری زیادہ تر تغزل کی شاعری ہے۔ پنڈت جی نے اسمیں خوب خوب کمالات دکھائے، ایسے بڑے بڑے معرکہ کی طرحوں کو آپ منٹوں میں پورا کر دیتے تھے، اور ایسے نادر و دلکش طریقہ پر کہ منہ سے بے اختیار کلمۂ تحسین نکل جاتا تھا۔ اس پر لطف یہ کہ تمام قواعد عروض کے آپ سخت پابند تھے۔ اس پر جدت کا یہ حال تھا کہ آپ نے شنکر راجگیت وغیرہ بعض چھند (بحر) بھی اختراع کیں۔

آپ کو قدرتی مناظر سے بھی خاص دلچسپی تھی، چنانچہ ان کے متعلق بڑی بڑی سبق آموز نظمیں لکھی ہیں جن میں سادگی کے ساتھ تاثیر بھی بدرجۂ اتم موجود ہے۔ آپ نے ۱۹۱۵ء میں اپنے عشقیہ کلام کا بیشتر

حصّہ اِس خیال سے کہ اس پیرانہ سالی میں ایسی شاعری باعثِ شرم ہے' آگ کی نذر کر دیا تھا۔ اِس مجموعہ کا نام کلت گلبنوز " (خوبصورت جسم) تھا جو اپنی دلکش و دلآویز نظموں کے اعتبار سے واقعی اسم بامسمیٰ تھا۔

وہ ۱۸۵۹ء میں ہردوا گنج ضلع علیگڈھ میں پیدا ہوئے، ذات کے گوڑ برہمن تھے، والد ماجد کا نام پنڈت روپ رام شرما تھا۔ چھ سات سال ہی کی عمر میں آپ کچھ نہ کچھ کہنے لگے تھے۔ گاؤں کے ورناکیولر اسکول ہی میں آپ نے اپنے اور اپنے ساتھیوں کے یاد کرنے کے لئے تاریخ اور جغرافیہ کو منظوم کر ڈالا تھا۔ ذہانت کی یہ کیفیت تھی کہ ڈیڑھ دو سال کے اندر ہی ہندی مڈل کی تعلیم ختم کر کے آپ مولوی لال محمد صاحب سے اُردو فارسی پڑھنے لگے، وہاں مشاعروں کی بھی دھوم تھی پنڈت جی ان میں بھی شریک ہونے لگے مگر اُن کے کلام کو کسی نے توجہ سے نہ سُنا تو آپ نے چڑھکر چند مہمل اشعار پڑھے جو ظاہراً صرف ادَق ہی معلوم ہوتے تھے۔ حاضرین سناٹے میں آگئے۔ جب مولوی صاحب نے پوچھا کہ یہ اشعار کس کے ہیں تو آپ نے اس شعر میں جواب دیا:۔

شاعرِ اشعارِ مہمل عُرف ناتھو رام نام شیخ سعدی بھی نہ سمجھے جس سخنور کا کلام

بچپن میں آپ نے بہارِ چمن نامی ایک ناٹک بھی لکھا تھا جو ضلع علیگڈھ کے کئی مقامات میں کھیلا گیا نواب لطف علی خاں صاحب رئیس طالب نگر اس ناٹک سے اس قدر محظوظ ہوئے کہ آپ نے مصنف کو ایک ریشمی دوپٹہ اور اکیاون روپیہ نقد انعام دیا۔ آپ کا دوسرا ناٹک ہریشچند بھی بہت مقبول ہوا۔ مگر افسوس اِن دونوں کی اشاعت کی نوبت نہ آئی۔

اکیس سال کی عمر میں پنڈت جی محکمہ نہر کانپور کے نقشہ نویس ہو گئے، مگر اس کے ساتھ ہی ساتھ مشقِ سخن بھی جاری رہی اور آپ نے طبابت سیکھی اور کئی انگریز انجینیوں کو ہندی بھی پڑھائی چھ سال تک کام کرنے کے بعد آپ سب اورسیر ہو گئے، مگر اگزیکیٹو انجینیر سے کچھ اَن بَن ہو جانے پر آپ ملازمت سے مستعفی ہو گئے اور آیورویدک طریقۂ علاج کی پریکٹس کرنے لگے۔ آپ کا دستِ شفا مشہور تھا، چنانچہ آپ کے اسّی فیصدی مریض شفا پا جاتے تھے، امیروں کو نسخے لکھ دینا اور غریبوں کو دوا مفت دینا اُن کا معمول تھا۔ دوکانداری کو اُن کے مزاج میں مطلق دخل نہ تھا اس لئے طبابت سے بسراوقات تو ہو گئی لیکن فراغت حاصل نہ ہو سکی۔ آپ عادتاً خانہ نشین واقع ہوئے تھے۔ اس لئے قدردانوں کے اصرار کے باوجود بھی آپ باہر علاج معالجے کے لئے نہ جاتے تھے۔

کانپور میں اُنھیں سوامی دیانند کی کئی تقریریں سننے کا اتفاق ہوا تھا چنانچہ وہ پکے آریہ سماجی تھے سوامی جی کی پہلی تقریر ہی سننے کے بعد اُنھوں نے اپنے گلے کا تعویذ توڑ کر پھینکدیا تھا۔ آریہ سماج کا اثر آپ

کے کلام میں بھی ہمیشہ نمایاں رہا جسکا ثبوت "انُراگ رتن" میں (جو آپ کی متفرق نظموں کا مجموعہ ہے) شنکر سروج اور بالسی بجے وغیرہ آپ کی سبھی تصانیف میں موجود ہے۔

ان کی شاعری کا باقاعدہ آغاز ہندی کے مشہور ماہواری رسالوں کے توسط سے ہوا تھا، چنانچہ ہندی کے مشہور و معروف رسالہ "سرسوتی" میں جو پنڈت مہابیر پرشاد دویدی کی ایڈیٹری میں انڈین پریس سے جاری ہوا آپ کی نظمیں باقاعدہ شائع ہوا کرتی تھیں۔ آپ نے اپنی نظموں کے لئے کبھی کسی سے کسی قسم کا معاوضہ نہیں لیا، مگر طرحی نقرات لوہا کرنے اور برجستہ نظمیں کہنے کے صلہ میں آپ کو بیسیوں دفعہ سونے چاندی کے تمغے نقد انعامات اور دوشالے وغیرہ ملے۔ ایک مرتبہ ہندی کے مایۂ ناز شاعر راجہ لچھمن سنگھ صاحب مرحوم نے فرطِ مسرت و عقیدت سے اپنے سر کی پگڑی تک اُتار کر دیدی تھی! بہت سی انجمنوں نے انھیں خطابات بھی دئیے تھے۔ مگر شنکر جی کا مزاج تعریف سے ہمیشہ مستغنی رہا اور عزت و شہرت کے باوجود بھی غرور و تمکنت کو ان کے مزاج میں دخل نہ تھا وہ خلیق و منکسر مزاج واقع ہوئے تھے، سادگی اور وضعداری میں اپنا جواب نہ رکھتے تھے۔ ہر شخص کے ساتھ بھلائی کرنا اُن کا شعار تھا، وہ مہمان نواز، بامروت دوست دار تھے۔ غرض آپ کی ذات میں وہ تمام اوصاف موجود تھے جو اُنیسویں صدی کے بزرگوں میں کہیں کہیں اب بھی پائے جاتے ہیں، طبیعت میں ظرافت بھی تھی۔

ایک مرتبہ دہلی کے سول اسپتال میں آنکھ دکھلانے گئے، ڈاکٹر نے دیکھکر کہا کہ ایک آنکھ تو بالکل خراب اور ناقابلِ علاج ہو گئی ہے اور اگر جلد علاج نہ ہوا تو دوسری بھی خراب ہو جائیگی، اُس وقت آپنے فی البدیہہ کہا:-

ہاتھ جوڑ بوڑھے شنکر سے کہتی ہے کیتا بالا ہو کے سور بھجو کیشو کو لے کر تلسی کی مالا

اسی پیرایہ میں آپ نے چند سبق آموز نظمیں کہی ہیں، نئی تہذیب اور اس کے نتائج کی آپ ہنسی اُڑایا کرتے تھے۔ ایک نظم کے چند منتخب اشعار درج ذیل کئے جاتے ہیں جس میں نئی تہذیب کے لوازمات کا دلکش بیان ہے۔ شاعر نے تبلیغ کے لئے ایک ایسی مقدس ہستی کو چنا ہے جس کا کلام ویش برہمند و معتقد ہے، شری کرشن جی سے مخاطب ہو کر کہتا ہے:-

مُکُٹ بھلادو بھوت کال[1] کی بھجے[2] ورتمان[3] کے ساج
فیشن پھیر انڈیا بھر کے گورے گاڈ بنو برج راج!
گوربرن[4] برشبھان سُتا[5] کا کاڑھو[6] کالے تن پر توپ۔

---

[1] دوشیزۂ شاعری۔ [2] ماضی۔ [3] حال [4] گورے رنگ والی۔ [5] برشبھان کی لڑکی رادھکا جی۔ [6] کاڑھنا۔

ناتھ! اوتارو مور مکٹ[1] کو سر پر سجو صاحبی ٹوپ
پوڈر، چندن پونچھ، لیپو، آنن[2] کی شری جوت[3] جگائے
اجن آنکھیوں میں مت انجو اعلیٰ عینک لیو لگائے
رو دھرا[4] کانوں میں لٹکا لو کنڈل کاڑھ[5] سیکرا تون
تج[6] پیتامبر کمبل کالا ڈاٹو کوٹ اور پتلون
پٹکٹ پارکا[7] پہنو پیارے بوٹ اٹالی کا سُکدار
ڈالو ڈبل واچ پاکٹ میں چمکے ہیمن[8] کنچنی[9] چار[10]
رکھ دو گانٹھ گٹھیلی مُرلی چھاتہ بینت بغل میں مار
مُرلی توڑ مروڑ، بجاؤ بانکی بگل سُنے سنسار
پھریا[11] چیر پھاڑ کُبری[12] کو پہنا لو بنج رنگی گون
ابتو لیڈی لال[13]! تمہاری[14] کہیئے اور بنے گی کون؟
بینتیہ[15] جج بیوم یان[16] پے کریئے چاروں اُور[17] بہار[18]
پھک پھک پھوں پھوں پھونکو چرٹیں اُگلیں گال دھواں کے دھار
یوں اوتم[19] پد دیجئے[20] ٹھکارو ماد ہو[21]! مسٹر نام دھرائے
بانٹو ٹکٹ[22] نئی[23] پہ بھوتا کے بھارت جات بھگت ہو جائے

اب لگے ہاتھوں شنکر جی کے ایک عشقیہ کبت سے بھی لطف اندوز ہو لیجئے جو بہت مشہور ہے
نازک خیال شاعر نے معشوق کے سیاہ بالوں میں مانگ کی کیفیت دکھائی ہے:-

کجل[24] کے کوٹ[25] پر دیپ شکھا[26] سوتی ہے کہ شیام گھن منڈل[27] میں دامنی[28] کی دھارا ہے
یامنی[29] کے انگ[30] میں کلادھر[31] کے کور[32] ہے کہ راہو[33] کے کبند[34] پہ کرال[35] کیتو[36] تارا ہے
شنکر کسوٹی پر کنچن[37] کی لیک[38] ہے کہ تیج[39] نے تمر[40] کے ہیئے[41] میں تیر مارا ہے

---

(۱) مور کے پروں کا مکٹ۔ (۲) چہرہ۔ (۳) رونق۔ (۴) سننے کا آلہ۔ (۵) ہٹا کر۔ (۶) چھوڑ کر (۷) دور کرکے (۸) کھڑاویں (۹) سونے کی۔ (۱۰) عمدہ۔ (۱۱) چھوٹا لنگا۔ (۱۲) یہ متھرا کی مالن تھی جو کرشن جی کی بڑی بھگت تھی اِس لئے کرشن جی بھی اُس پر مہربان تھے اور اُنھوں نے اُس کے کبڑے پنا کو بھی دُور کر دیا تھا۔ مگر برج کی گوپیاں اُسے طنزاً کرشن کی معشوقہ کہتی تھیں اور اپنی سوت۔ (۱۳) پیارے۔ (۱۴) تمہاری۔ (۱۵) [illegible] گرڑ جی (بشکل پرند) کا نام جن پر کرشن جی سوار ہو کر ہوائی سفر کیا کرتے تھے۔ (۱۶) ہوائی جہاز۔ (۱۷) طرف۔ (۱۸) سیر۔ (۱۹) اعلیٰ۔ (۲۰) مرتبہ۔ (۲۱) کرشن کا نام۔ (۲۲) تھنے۔ (۲۳) حکومت۔ (۲۴) کاجل۔ (۲۵) پہاڑ۔ (۲۶) چراغ کی لو۔ (۲۷) سیاہ بادلوں۔ (۲۸) بجلی۔ (۲۹) رات۔ (۳۰) گود۔ (۳۱) چاند۔ (۳۲) کنارا۔ (۳۳) مع تمام ستارا لا جو راکشش (سیاہ فام) تھا۔ (۳۴) دھڑ۔ (۳۵) خوفناک۔ (۳۶) مراد دُمدار ستارے سے۔ (۳۷) سونا۔ (۳۸) لکیر۔ (۳۹) نور۔ (۴۰) اندھیرا۔ (۴۱) کلیجہ

کالی ناگنوں کے بیچ موہنی کی مانگ ہے کہ ڈھال پر کھانڈا کام دیو کا دو دھارا ہے

شنکر جی سیاسیات سے بھی بے تعلق نہیں تھے، وہ حالات حاضرہ کا بغور مشاہدہ کرتے رہتے اور بعض موقعوں پر آپنے بعض نہایت زوردار سیاسی نظمیں بھی لکھی ہیں۔ لوکمانیہ تلک کی وفات پر آپ کا نوحہ از حد درد انگیز ہے۔

آپ کی طبیعت میں تعصب کو بالکل دخل نہ تھا، وہ اُردو کے بھی شاعر تھے اسلئے اپنی ہندی شاعری میں بھی مختارات اور متروکات کے بکھیڑوں سے علیحدہ رہتے ہوئے آپ نے اکثر کبت اُردو میں لکھے ہیں مثال کے طور پر آپ کا ایک کبت درج ذیل ہے جو تاج محل کی تعریف میں لکھا گیا تھا:۔

دیکھئے عمارت مزار دنیا کے سارے روضہ نے کہو تو شان کس کی نہ رَدّ کی
ہیرا پکھراج موتیوں کے وَرن[1] دور کر شنکر[2] کے شیل[3] کے بھی صورت زَرد کی
شوکت دکھا دی جمنا کے تیر[4] شاہجہاں، آگرہ نے آبرو ارم کی گرد کی
دھنیہ ممتاز! بیگموں کی سرتاج، تیرے نور کی نمایش ہے چاندنی شرد[5] کی

چند اور اشعار ملاحظہ ہوں جو شاعر نے ہندوستانی زبان میں معرفت کے رنگ میں لکھے ہیں:۔

میں سمجھتا تھا کہیں بھی کچھ پتہ تیرا نہیں — آج شنکر تُو ملا تو اب پتہ میرا نہیں
کچھ نہیں، کچھ میں سمایا، کچھ نہیں — کچھ نہ کچھ کا بھید پایا کچھ نہیں
کچھ نہ میں تو کچھ نہیں کچھ اور ہے — کچھ نہیں اپنا پرایا کچھ نہیں

افسوس دنیوی حیثیت سے آپ کی زندگی کچھ لطف و خوشی کی زندگی نہ تھی۔ سنہ ۱۹۲۰ء اور سنہ ۱۹۲۲ء میں آپکو بیوی اور لڑکی کی دائمی مفارقت کا صدمہ برداشت کرنا پڑا۔ ۲۵ء و ۲۶ء میں ان کے دو جوان بیٹے بھی داغ مفارقت دے گئے، ایک پوتی پہلے ہی مر چکی تھی، ان پیہم صدمات سے پنڈت جی کا نازک دل پاش پاش ہو گیا اور انکی صحت بگڑنے لگی، آخر سرطانِ جگر کے مہلک عارضے میں مبتلا ہو گئے اور تین مہینے بیمار رہکر ۲۱۔ اگست سنہ ۱۹۳۲ء کو تہتّر برس کی عمر میں اس دار فانی سے رحلت کر گئے۔ ہندی اخبار "آریہ متر" کے موجودہ اڈیٹر پنڈت ہری شنکر شرما آپ ہی کے صاحبزادے ہیں۔

---

[1] دل۔ [2] تیغا [3] حسن و عشق کا دیوتا۔ [4] دو دھاروں والا۔ [5] شیو جی کا پہاڑ یعنی کیلاش پربت۔ [6] کنارے [7] شرد ریت کی چاندنی مشہور ہے۔ اس ریت میں کنوار اور کاتک کے مہینے شامل ہیں۔

دارالامان کپریؒ

(از پروفیسر ایچ، سی، کمار بی۔ اے)

اٹلی کے مغربی ساحل پر خلیج نیپلز میں کپری نامی ایک چھوٹا سا کوہستانی جزیرہ ہے جس کو جزیرہ کپری کہتے ہیں، اور جسکا رقبہ ساڑھے پانچ مربع میل اور آبادی سات ہزار ہے۔ اس کے دو بڑے شہر کپری اور اناکپری نامی ہیں۔ اس کی آب و ہوا نہایت خوشگوار ہے اور ہر سال ہزارہا سیاح یورپ کے مختلف مقامات سے یہاں سیر کے لئے آتے ہیں۔

صدیوں سے اس جزیرے میں ایک درد انگیز رسم جاری تھی، اور مذہب کے نام پر وہ مظالم ہوتے تھے جن کو سنکر رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ ایسٹر سے پہلے ہی لوگ سیکڑوں پرندے پکڑ کر تیار رکھتے تھے، ایسٹر کی نماز کے بعد ان کے جھنڈ کے جھنڈ گرجا میں چھوڑ دیے جاتے تھے، بچارے پرند جو کئی دن کی قید سے بیحال ہو چکتے تھے پھڑپھڑا پھڑپھڑا کر اُڑتے اور گرجے کی چھت اور کھڑکیوں سے ٹکر کھا کر زمین پر گرتے اور ہلاک ہو جاتے تھے اور لوگ اسے صدقہ سمجھکر قہقہے لگاتے اور خوش ہوتے تھے۔

اس کے علاوہ لکھو کھا پرند تجارت کی غرض سے بھی پکڑے جاتے تھے، یہ یورپ کے بڑے بڑے ہوٹلوں میں امیروں کے کھانے میں آتے تھے۔

اس تجارت کے لئے سال میں دو موسم موزوں تھے، ایک گرمی کے شروع میں جب ساحل افریقہ کے گرم علاقوں سے نکل کر پرندوں کے جھنڈ شمالی علاقوں میں آ بستے ہیں، اور دوسرا جب خزاں کے موسم میں یہ نوزائیدہ بچوں کے جھول لیکر پھر ساحلِ افریقہ کا رخ کرتے ہیں۔ دونوں موسموں میں جب لکھو کھا پرند کپری کی پہاڑیوں میں آرام و آسائش کے خیال سے اُترتے تھے۔ تو باشندگان کپری کے جال میں گرفتار ہو جاتے تھے۔

بہر نوع اِس تجارت کے فروغ کی یہ حالت تھی کہ جب سنہ ۱۰۳۳ء میں پاپائے روم نے کپری میں نائب بشپ (Bishop) تعینات کیا تو اُس کے وظیفہ کا یہ انتظام تجویز ہوا کہ ہر صیاد کے لئے دس فیصدی پرندے بشپ مذکور کی نذر کرنا طے پایا، چونکہ ان میں زیادہ تعداد بٹیروں کی ہوا کرتی تھی اس لئے کپری کے بشپ کا

CAPRI. ؎

لقب ہی بشیر یا پدری پڑ گیا۔صدیوں تک یہی کیفیت جاری رہی اور کروڑہا بے زبان پرندے خودغرضی اور توہم کے بھینٹ ہوتے رہے۔

تیس سال ہوئے کہ ایک خدا ترس ڈاکٹر منتھے (Dr. Munthe) نے کپری میں بودوباش اختیار کی۔ان کے مکان کے پشت پر ایک قصاب کی پہاڑی تھی جو پرندوں کے پکڑنے میں اس قدر مشاق تھا کہ اپنی تجارت کی بدولت لکھ پتی ہو گیا تھا۔

اس شخص کی کامیابی کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ اُسے کسی نہ کسی طرح یہ راز معلوم ہو گیا تھا کہ اگر کسی مادہ کی آنکھیں پھوڑ دی جائیں تو وہ رات دن چیختی رہیگی اس کی آواز سنکر سب پرندے بہ کثرت اس کے پاس آجائیں گے۔لیکن یہ بڑا نازک کام تھا،سیکڑوں جانیں آپریشن کے دوران ہی میں تلف ہوجاتی تھیں مگر یہ قصاب اس فن میں ماہر کامل ہو گیا تھا اور جس مادہ کی آنکھ پھوڑنا چاہتا تھا آسانی سے پھوڑ دیتا تھا۔اس طرح وہ ہر سال لکھوکھا پرند پکڑ کر ان کی تجارت سے ہزاروں روپیہ پیدا کیا کرتا تھا۔مگر ڈاکٹر منتھے نے یہ پہاڑی قصاب سے خرید کر بے زبان پرندوں کو اس خونخوار ظالم کے ہاتھوں سے بچانے کا ارادہ کیا مگر انھوں نے قصاب سے پہاڑی خریدنے کی بابت سلسلہ جنبانی شروع کی تو اُس نے اس کی دس گنی قیمت طلب کی اور جب ڈاکٹر صاحب نے جوں توں کر کے زر مطلوبہ پیش کیا تو ہنسکر اس معاملہ کو مذاق میں اُڑا دیا اور کہنے لگا کہ میرا ارادہ پہاڑی فروخت کرنے کا نہیں ہے۔میں نے تو صرف آپ کا دل خوش کرنے کیلئے ہاں کر دی تھی۔

ڈاکٹر صاحب نے اس معاملہ میں پاپائے روم سے اپیل کی اور خود اس سلسلے میں پاپائے موصوف کے پرائیویٹ سکریٹری کی خدمت میں حاضر ہوئے لیکن وہاں بھی اُن کی کوئی سماعت نہ ہوئی بلکہ معلوم ہوا کہ خود پاپائے اعظم کے باغ میں ہر روز سیکڑوں پرند پکڑے جاتے ہیں،اور پاپائے روم بہ نفس نفیس تماشائیوں میں موجود رہتے ہیں۔

غرض ہر طرف سے مایوس ہو کر ڈاکٹر منتھے نے ایک اور تجویز سوچی،اُنھوں نے بہت سے کتے پالے، جو رات بھر بھونکتے رہتے تھے جس سے پرندوں کو پہاڑی پر اُترنے کی ہمت نہ ہوتی تھی،مگر قصاب نے کتوں کو زہر دیکر مارنا شروع کر دیا اور ڈاکٹر صاحب کے خلاف عدالتی چارہ جوئی بھی کی،چنانچہ انھیں کئی مرتبہ جرمانہ اور ہرجانہ بھی ادا کرنا پڑا۔یہ سلسلہ عرصہ تک جاری رہا،آخر پرندوں کی فریاد عرش تک جا پہنچی اور وہ ظالم قصاب ایک سخت مرض میں مبتلا ہوا۔مقامی ڈاکٹروں نے ہر چند کوشش کی مگر کسی کے علاج سے کوئی فائدہ نہوا تب اُس نے مجبوراً ڈاکٹر منتھے کو بلایا۔ڈاکٹر موصوف اس موقعہ کے منتظر ہی تھے،اُنھوں نے اپنے علاج

کے لئے دو شرطیں پیش کیں۔ اوّل یہ کہ قصاب صحت یاب ہونے پر پرندوں کی آنکھیں پھوڑنا ترک کردے دوسرے وہ اس پہاڑی کو منہ مانگی قیمت پر ان کے ہاتھ فروخت کردے۔ قصاب کو مجبوراً یہ دونوں شرطیں منظور کرنا پڑیں، اس کو تائید ایزدی کہئے یا ڈاکٹر صاحب کی نیک نفسی کا ثمرہ سمجھئے، بہرحال ان کے علاج سے قصاب کو صحت کلی نصیب ہوئی۔ اور ڈاکٹر صاحب کی سالہا سال کی آرزو پوری ہوگئی، اس کے بعد یہ خوفناک پہاڑی ڈاکٹر منتھے کی ملکیت ہوگئی اور پرندوں کی پہلی "دارالامان" بن گئی۔

مگر ڈاکٹر موصوف نے اسی پر اکتفا نہ کی بلکہ انھوں نے سارے جزیرے سے اس وحشیانہ رواج کو نیست ونابود کرنے کا ارادہ کرلیا، چنانچہ انھوں نے اس کے متعلق ایک کتاب لکھی جس کے دیباچے میں انھوں نے اٹلی کے ڈکٹیٹر مسولینی سے ایک زبردست اپیل کی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ حال ہی میں مسولینی نے ایک شاہی فرمان نافذ کرکے جزیرہ کیپری کو پرندوں کا "دارالامان" قرار دیدیا۔

یہ قصہ پرانے بھارت ورش کے اس سانحہ کی یاد تازہ کرتا ہے جو مہاتما بدھ کے زمانہ میں واقع ہوا تھا۔ اور جس کی تفصیل سر ایڈون آرنلڈ نے اپنی بیش بہا کتاب "ضیاء مشرق" (Light of Asia) میں لکھی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ایک دن جب مہاتما بدھ راج گرہ کی پہاڑی سے اترتے ہوئے راجہ بمبسارا کی نگری کی طرف آرہے تھے تو راستے میں ان کو ایک گڈریا ملا جو بھیڑ بکریوں کے ایک بڑے غول کو شہر کی طرف ہانکے لئے جارہا تھا، جب مہاتما بدھ نے دریافت کیا تو انھیں معلوم ہوا کہ یہ بے زبان جانور راجہ بمبسارا کی یگیہ میں قربانی کے لئے جارہے ہیں، چنانچہ آپ بھی اُن کے ساتھ ہو لئے اور راجہ کے دربار میں پہنچکر اُس سے کچھ ایسے لب و لہجہ میں اپیل کی کہ راجہ بمبسارا نے اُسی وقت سے اپنی سلطنت میں ہمیشہ کے لئے قربانی کی رسم موقوف کردی۔

مسولینی نے اور جو کچھ کیا ہو یا نہ کیا ہو مگر یہ کام جو اس کی ذات سے سرانجام ہوا ہے انسانی ہمدردی کی تاریخ میں یادگار رہیگا۔

یوجینی ملکہ نپولین ثالث

(از منشی دتّہ پرشاد فدا بی۔اے)

یوجینی کی ماں اسکاٹ لینڈ کی رہنے والی اور باپ ہسپانیہ کا ایک فلک زدہ امیر تھا بچپن میں ایک دن یہ لڑکی ہسپانیہ کے ایک چھوٹے سے گاؤں میلگا میں اپنی ماں کے ساتھ ہوٹل میں مقیم تھی کہ ایک رمال عورت نے اسکی جانب دیکھکر کہا:-

"تمھیں صحت و دولت اور عقل کی فراوانی حاصل ہوگی، تم ایک بڑے ملک پر راج کروگی،
اور تمھیں وہ تمام نعمتیں حاصل ہونگی جن کی عورتوں کو تلاش ہوتی ہے"۔

یہ کہکر وہ عورت ہوٹل کے دروازے سے آگے نکل گئی۔ ماںتا کی ماری ماں کو ان الفاظ سے پوری تسلی حاصل نہ ہوئی، وہ اس کے پیچھے پیچھے دوڑی گئی اور کہنے لگی "اچھا یہ تو بتاتی جاؤ کہ میری لڑکی کو چین تو نصیب ہوگا؟"

اُس عورت نے جواب دیا کہ "جب تک وہ اپنی تمام آسودہ حالی کو کھو نہ بیٹھے گی اُسے چین نہ نصیب ہوگا، اور یہ بھی سن لو کہ اُسکی عمر سو سال کی ہوگی"۔

اُس عورت کی بات سچی نکلی، یہی سنہرے بالوں والی کمسن لڑکی بلوغت کو پہونچکر دنیا کی بہترین حسینہ متصور ہوئی اور فرانس کی ملکہ بنی۔ اس کا نانا شاہ بروس کے خاندان کا چشم و چراغ ہونے کا دعویدار تھا۔

یوجینی کی اوائل عمر ہسپانیہ کے ایک گاؤں میں گزری، مگر ملکی خانہ جنگیوں اور مرض ہیضہ کے پھیل جانے کی وجہ سے اُس کے والد نے اپنے بال بچوں کو پیرس بھیجدیا، جہاں ایک گرجا میں کچھ عرصہ گزارنے کے بعد یوجینی اپنی ماں اور بہن کے ساتھ ہسپانیہ واپس چلی آئی۔ اس اثنا میں اسکے حسن و جمال کا شہرہ پھولوں کی خوشبو کی طرح اطراف عالم میں پھیل چکا تھا۔ کوئی صاحب جاہ و ثروت ایسا نہ تھا جو اُسے اپنی زندگی کا رفیق بنانا نہ چاہتا ہو۔ چنانچہ اسکی محبت کے بیسیوں افسانے زبان زد عوام ہیں۔ لیکن ان کی صحت کی تحقیق محال ہے۔ سب سے زیادہ مشہور قصہ یہ ہے کہ یوجینی

ایک شخص سے بیحد محبت کرتی تھی۔ لیکن سوء اتفاق سے اس کی شادی اس کی بہن کے ساتھ قرار پائی کہتے ہیں کہ اس موقعہ پر اس کی مایوسی کا یہ عالم ہو گیا تھا کہ جب شادی کی خبر کا اعلان کیا گیا تو یہ خودکشی کرنے کے لئے تیار ہو گئی تھی۔

اس واقعہ سے تھوڑے ہی عرصہ بعد یوجینی نے لوئی نپولین کے ساتھ خط و کتابت شروع کی جو اس وقت مقام ہیم پر پولٹیکل قیدی کی طرح اوقات بسر کر رہا تھا۔ اور شارلیمین سابق شاہ فرانس کی تاریخ لکھکر پیٹ پالنے کی فکر میں تھا۔ مفلسی کا یہ حال تھا کہ اس کو کاغذ خریدنے کی بھی توفیق نہ تھی۔ بعد میں وہی نپولین جلاوطن ہو کر لندن اور نیویارک گیا۔ اور وہاں بھی ان کی خط و کتابت جاری رہی۔

۱۸۴۹ء میں لوئی نپولین کو فرانس میں نئی اسمبلی کے ممبر کی حیثیت سے مدعو کیا گیا، یہ فرانس کی تاریخ میں وہ زمانہ تھا جبکہ لوئی فلپ شاہ فرانس کو پیرس سے بھاگ کر جان بچانا پڑی تھی اسی زمانہ میں یوجینی اپنی ماں کے ساتھ میڈرڈ سے پیرس میں وارد ہوئی تھی اور نپولین سے بھی اسکی ملاقات اسی اثناء میں ہوئی۔ اس ہسپانوی حسینہ کو دیکھکر نپولین نقش حیرت بن گیا۔ اگرچہ لوئی نپولین کے پاس شاہی گھرانے کی بیسیوں خواتین کی طرف سے نسبت کے پیغام آرہے تھے اور وہ مصلحت بھی اسی میں دیکھتا تھا، کیونکہ اس کے شہنشاہ بننے کے منصوبوں کو بھی اس سے مدد ملجاتی لیکن یوجینی کے حسن و جمال کی دلفریبی نے نپولین کو اپنی طرف کھینچ لیا۔ آخر کار ۱۸۵۲ء کے جاڑے کے شروع ہوتے ہی لوئی نپولین نے اس کی محبت کا مکمل اعتراف کر لیا۔ شاہی محل کی ایک دعوت میں یوجینی اپنی ماں کے ساتھ شریک تھی، اس کی دلآویزی سے متاثر ہو کر نپولین نے اسے چند تحائف اور پھولوں کا ایک گلدستہ نذر کیا۔ اس کے بعد سمند شوق کو دن بدن تازیانے لگتے گئے، آخر کار دونو کمپانیہ کی سڑکوں پر گاڑی میں بیٹھکر سیر کو آنے جانے لگے اور جلد ہی نسبت کی رسم بھی ادا ہو گئی۔

نسبت اور شادی کا درمیانی وقفہ ماں اور بیٹی نے ایلیسی محل میں گذارا۔ آخر کار جب شادی منعقد ہوئی تو فرانس پر تو گویا ایک قسم کی بجلی ٹوٹ پڑی۔ تمام یوروپ میں جوش و خروش کا ایک طوفان امنڈ آیا۔ تمام وہ جماعتیں جو جمہوریت کی حامی اور ملوکیت کی دشمن تھیں یعنی لیجٹمسٹ (Legitimists) اور لینسٹ اور جمہور پسند فرقے شادی کی مخالفت پر آمادہ ہو گئے۔ امرا کے معمر اور نوجوان طبقے بھی نپولین سے منحرف ہو گئے۔ اور خواتین نے نئی ملکہ کا بالکل خیر مقدم نہ کیا۔

۲۹ جنوری ۱۸۵۳ء کو سنیچر کے دن یوجینی فرانس کی ملکہ قرار دی گئی، اور اسی دن سے اُس نے عروج کے لئے تگ و دو شروع کی۔ رسم کے مطابق وہ مع اپنی ماں کے شاہی شان و شوکت کے ساتھ ٹولریز میں گئی، جہاں بونا پارٹ کے گھرانے کے ارکان کے سامنے سول شادی کی رسم ادا ہوئی، یہ موقعہ بھی ظاہرداری اور اندرونی حسد و غم و غصے کے مختلف مناظر کا ایک عجیب مرقع تھا۔

دوسرے روز نوترے دیم کے گرجا میں شادی کی مذہبی رسم ادا ہوئی، اس موقعہ پر عام لوگوں نے اس قدر خوشی منائی کہ شاہی گاڑی گلدستوں اور تحائف سے بھرپور ہوگئی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ شادی کے وقت ان تمام رسوم کا اعادہ کیا گیا تھا جو شاہ نپولین اول اور میری لوئیسی کی شادی کے وقت ادا ہوئی تھیں۔

اسی اثنا میں ایک دو واقعات ایسے پیش آئے جن سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ ملکہ کا مستقبل چنداں روشن نہ ہوگا۔ ایک تو یہ کہ جب اسکی تاجپوشی کی تقریب قریب تھی اور شہنشاہ کے ملازم ملکہ کے زیورات اور دیگر قیمتی اشیاء کی حفاظت کے لئے ملکہ کے پاس آئے تو ان کے ساتھ ہی ایک بلیف بھی آ پہونچا جس نے ملکہ سے بعض بلوں کی ادائیگی کا تقاضا شروع کر دیا۔

دوسرا واقعہ یہ تھا کہ شاہی کوچ میں بیٹھکر جب وہ تاجپوشی کے لئے روانہ ہوئی تو گاڑی کے اوپر کا سنہری تاج اُکھڑ کر نیچے گر پڑا۔ کہتے ہیں کہ بعینہٖ اسی قسم کا واقعہ نپولین اول کے وقت بھی ایسے ہی موقعہ پر ظہور میں آیا تھا۔ اس بات کو دیکھکر ہجوم سے ایک افسوسناک چیخ کی آواز نکلی۔ نپولین ثانی خوفزدہ ہوکر کانپنے لگا۔ اور سمجھا کہ شگون اچھا نہیں رہا۔ نیز ڈرتا تھا کہ لوگ اسکی مخالفت پر آمادہ نہ ہو جائیں۔ مگر یوجینی نے ہمت کو ہاتھ سے جانے نہ دیا، اُس نے ایک فلاکت زدہ چھوٹے سے لڑکے سے کہا "دیکھو وہ تاج اُٹھاکر مجھے دو" اور ساتھ ہی یہ الفاظ بھی کہے "بونا پارٹ کے خاندان کا یہ رواج ہے کہ وہ تاج اپنی رعایا سے حاصل کرتے ہیں"

یہ الفاظ سُنکر ہجوم بہت خوش ہوا اور یہ نعرے لگائے "یوجینی، یوجینی، تیرا راج سوایا ہو"

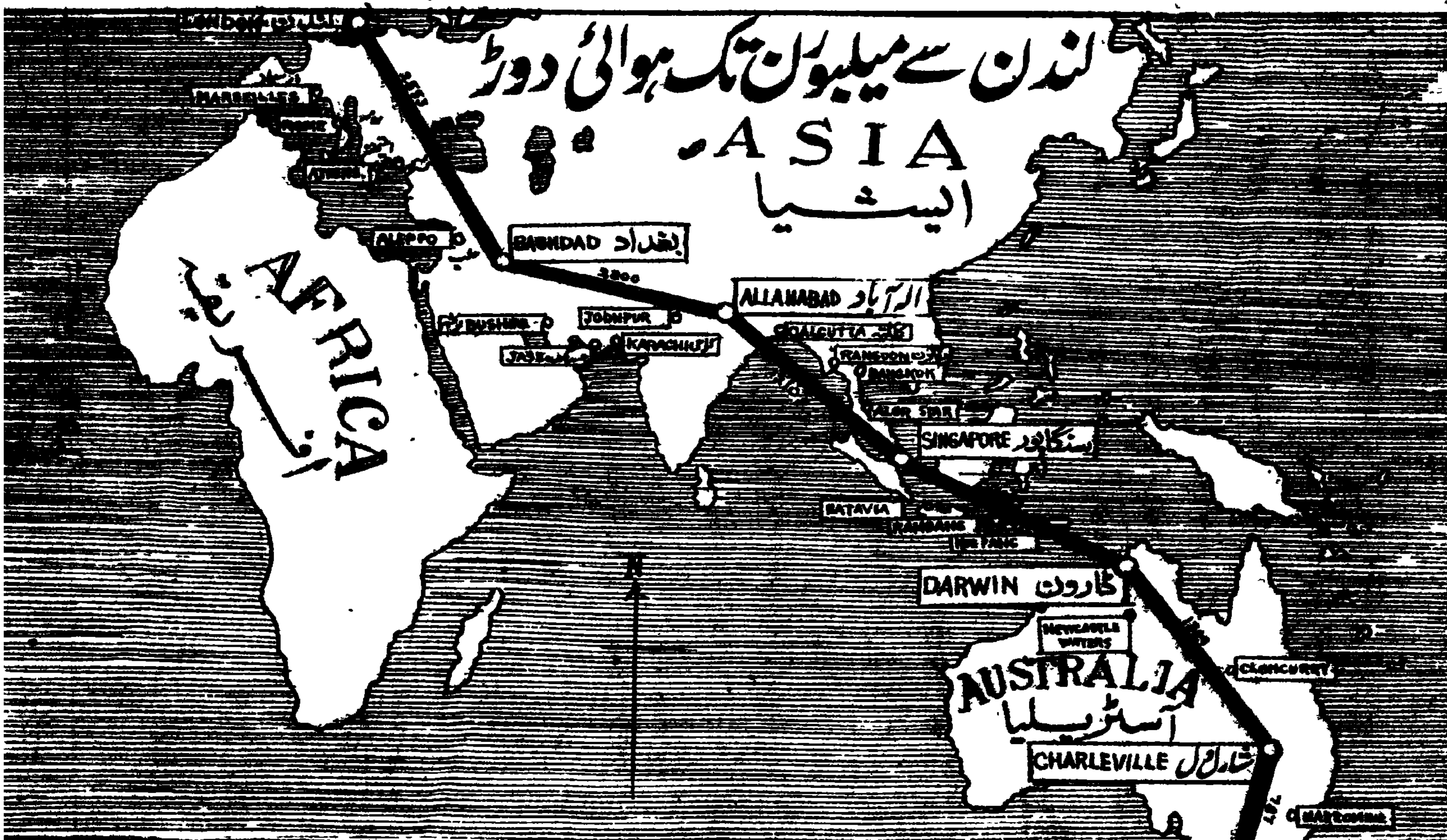
ایک موقعہ پر ایک آپیرا ہاؤس (تماشہ گاہ) کی افتتاحی رسم پر ایک آدمی نے شہنشاہ پر تین فیر کئے، جن میں سے دو اُسکی ٹوپی میں لگے، ہجوم میں ایک تہلکا سا مچ گیا۔ قریب تھا کہ بلوہ ہو جائے لیکن ملکہ نے موقعہ شناسی سے کام لیا اور شاہی ٹوپی کو اُچھالکر کہا "یہ ٹوپی اب عجائب گھر میں نمائش کے قابل ہوگئی ہے" بعض آدمیوں کو تھوڑے بہت زخم لگے تھے جنھیں باہر بھیجدیا گیا اور ملکہ نے اُن کے خون پر جو فرش پر پڑا ہوا تھا عوام سے پوشیدہ رکھنے کے لئے اپنا قیمتی کوٹ رکھدیا اور خود ٹہلنا

اتھ اخیر تک تماشہ دیکھتی رہی۔
دربار میں اسے بجد کامیابی نصیب ہوئی۔ فرانس میں وہ پہلی ڈپلومیٹ (Diplomat) تھی
بت عملی بہت مُوثر تھی۔ لوگوں کو یقین ہوگیا کہ وہ فرانس کی سچی خیر خواہ ہے۔
نپولین کو جن مشکلات سے گزرنا پڑا اُن کا ذکر یہاں بخوفِ طوالت مناسب نہیں صرف اس قدر لکھ
نی ہے کہ تقریباً تمام یورپ کی حکومتیں ان کی مخالفت پر تلی ہوئی نظر آتی تھیں، اور ملک میں طرح
افواہیں پھیل رہی تھیں، بعض کہتے تھے کہ ویسٹ فالیہ کا معزول بادشاہ جمہوریت پسندوں کی حمایت
حملہ آور ہوگا۔ بعض کہتے تھے کہ یورپ کے دیگر ممالک کی افواج فرانس پر چڑھ آئیں گی لیکن ملکہ
تمام غیر موافق حالات میں بھی اپنی بیخوفی اور اُولوالعزمی کا پورا پورا ثبوت دیا، وہ اپنے خاوند کو
دھارس دیتی رہتی، اور جس وقت اُسے متشوش یا پریشان دیکھتی اُس کی مشکلات کو حل کرتی
انتہائی درجہ کی کوشش کے بعد اُس نے انگلستان کے ساتھ دوستانہ تعلقات پیدا کر لئے، اور
۱۸۵۴ء میں لارڈ پامرسٹن کی مدد سے معاہدہ ہوگیا۔ اظہار دوستی کے لئے یوجینی نے انگلستان کا
بھی کیا۔ جہاں ملکہ معظمہ نے نپولین اور ملکہ کا قصر ونڈسر (Windsor Castle) میں خیر مقدم
س دورہ کا نتیجہ نہایت اچھا نکلا۔ ملکہ معظمہ آنجہانی اور ملکہ فرانس کے درمیان نہایت مخلصانہ تعلقات
گئے جو سنہ ۱۹۰۱ء تک یعنی ملکہ وکٹوریا کی وفات تک بدستور جاری رہے۔
فرانس واپس آکر یوجینی نے اپنے اقتدار کو مسلط پایا، اس کے بعد دو اور واقعات پیش آئے
سے اُسے اور بھی عروج حاصل ہوا، اُن میں سے ایک واقعہ تو ملکہ معظمہ کا فرانس کا دورہ اور دوسرا
چ سنہ ۱۸۵۶ء کو یوجینی کے ہاں فرزند کی پیدائش۔
سنہ ۱۸۵۷ء میں ملکہ کا اقتدار نصف النہار پر پہنچا ہوا تھا، اس کے بعد اور بھی بہت سے موقعے نصیب
سنہ ۱۸۶۹ء میں شاہ نپولین کی صدسالہ برسی منانے کے لئے یوجینی مع اپنے شہزادہ کے کارسیکا اور
ی۔ جہاں اُس نے نہر سویز کے افتتاح کے وقت اپنے خاوند کی نمائندگی کی۔ پھر قسطنطنیہ تشریف
، جہاں اسّی ہزار پونڈ لاگت کی ایک کشتی میں بٹھا کر اسے جہاز سے کنارے پر لایا گیا، خود سلطان
احل پر اسکا استقبال کیا اور بیس ہزار سپاہیوں نے دو رویہ کھڑے ہو کر اس کی تعظیم کی قسطنطنیہ
لوں اور بازاروں میں یوجینی پر سے زر نقد نچھاور کیا گیا۔
جب وہ پیرس واپس آئی تو اُس نے دیکھا کہ شہنشاہ کا اپنے اُمرا کے ساتھ بگاڑ ہوگیا ہے۔ بادشاہ
ی کی مرضی کے خلاف ایک وزیر اعظم منتخب کر لیا تھا، اُس روز سے امور سلطنت بد سے بدتر صورت

اختیار کرتے گئے۔ بچاری ملکہ نے حکمت عملی اور دور اندیشی سے بہتیرا کام لیا، لیکن زوال کی نئی سے نئی صورتیں پیدا ہوتی گئیں۔ اسی اثنا میں ہسپانیہ کا تخت خالی ہوگیا، اور جرمنی کا ایک شہزادہ اس کا دعویدار کھڑا ہوگیا۔ فرانس بھی اس لڑائی میں اس کی مخالفت پر تل گیا۔ شہنشاہ نپولین اور اس کا شہزادہ دونوں مسلح ہو کر لڑنے گئے، ان کی غیر حاضری میں ملکہ یوجینی ریجنٹ مقرر ہوئی۔ لیکن ادھر پروشیا کے میدان کارزار سے شکست کی خبریں آرہی تھیں اور ادھر اُمرا کی مخالفت کی آگ بھڑک رہی تھی، جو ملکہ کو طرح طرح کی اذیتیں دینے لگے۔ ستمبر ۱۸۷۰ء کے پہلے ہفتے میں مجلس قانون ساز کا ایک وفد ملکہ کے پاس آیا اور کہنے لگا اگر اپنی سلامتی چاہتی ہو تو تخت سے دست بردار ہو جاؤ۔ اس کے تھوڑے ہی عرصہ بعد پولیس کے کوتوال نے ملکہ کو آکر آگاہ کیا کہ لوگوں کا ہجوم ٹولریز کے دروازہ کا محاصرہ کئے ہوئے ہے اور محلوں میں داخل ہوا چاہتا ہے، اس پر بھی یوجینی کا عزم واستقلال متزلزل نہ ہوا، وہاں سے اُٹھکر وہ ایک دندان ساز کے گھر میں پناہ گزین ہوئی۔ پھر وہ ہجوم کے سامنے تن تنہا آئی، اسکے بعد پھر وہ ایک گاڑی میں بیٹھکر اسٹیشن پر آئی اور وہاں سے ساحل پر پہنچی، پھر وہ انگلستان میں پہلے برائی ٹن اور اس کے بعد ہیسٹنگز پہونچی اور یہاں شہنشاہ اور شاہزادہ بھی آکر اُس کے ساتھ مل گئے۔

۱۸۷۳ء میں شہنشاہ نپولین ثالث نے وفات پائی، یوجینی پر غم کا ایک کوہ گراں ٹوٹ پڑا، لیکن اُس کے دل میں ایک آرزو ابھی زندہ تھی۔ یعنی کسی طرح شاہزادہ کو تخت فرانس پر متمکن کیا جائے، لیکن یہ آرزو خاک میں ملگئی، کیونکہ شاہزادہ یکم جون ۱۸۷۹ء کو حبشی لوگوں کے مقابلہ پر لڑتا ہوا کام آیا۔ لوگوں کو اب پختہ یقین ہوگیا کہ ملکہ اس صدمہ سے جانبر نہ ہوسکے گی، لیکن یوجینی اس صدمہ کو بھی برداشت کر گئی مگر وہ سیاسیات سے کنارہ کشی اختیار کر کے عزلت گزین ہوگئی۔ اُس نے فارن برگ میں سکونت اختیار کر کے ایک مقبرہ تیار کرایا جسمیں اپنے خاوند اور اپنے لخت جگر اور اپنی قبریں بنوائیں۔ پھر وہ جگہ جگہ کی سیاحت کو نکلی، ایک روز ٹولریز کے باغوں میں بنفشہ کے پھول توڑنے ہی کو تھی کہ محافظ نے منع کیا۔ بیوہ ملکہ سے رہا نہ گیا، کہنے لگی "اِن پھولوں کو میں نے ہی تو یہاں لگایا تھا، اب مجھے ہی توڑنے کی ممانعت ہے۔"

اس طرح سیاحت کرتی کرتی ہسپانیہ میں جولائی ۱۹۲۰ء میں چورانوے برس کی عمر میں راہیِ ملک عدم ہوئی۔ اور اُس رمّال عورت کی پیشگوئی بڑی حد تک درست نکلی۔



لندن سے میلبورن تک ہوائی دوڑ
ASIA
ایشیا
AFRICA
افریقہ
AUSTRALIA
آسٹریلیا
LONDON
MARSEILLES
ROME
ATHENS
ALEPPO
BAGHDAD بغداد
BUSHIRE
JODHPUR
JASK
KARACHI
ALLAHABAD الہ آباد
CALCUTTA
RANGOON
BANGKOK
ALOR STAR
SINGAPORE سنگاپور
BATAVIA
DARWIN ڈارون
NEWCASTLE WATERS
CLONCURRY
CHARLEVILLE شارلویل

ہوائی دوڑ

تحریک میلبورن آسٹریلیا کا ایک بہت بڑا مشہور شہر ہے جس کو آباد ہوئے اب سو سال پورے ہوئے۔ چنانچہ اس مبارک تقریب کی خوشی میں اس شہر کے کروڑپتی سر میکفرسن رابرٹسن نے جو چاکلیٹ کے ایک عظیم الشان کارخانہ کے مالک ہیں لندن سے میلبورن تک ایک بین الاقوامی ہوائی دوڑ کرائی، جس میں دنیا کے بڑے بڑے نامور ہوابازوں نے شرکت کی۔ یہ دلچسپ مقابلہ تاریخ عالم میں "میکرابرٹسن بین الاقوامی ہوائی دوڑ" کے نام سے مشہور ہوگا۔ موصوف سر میکفرسن نے اس مقابلے میں اول آنیوالے ہواباز کو دس ہزار پونڈ اور اور بائیس انچ اونچا ایک شاندار طلائی پیالہ قیمتی پانسو پونڈ انعام اور دوسرے کو ڈیڑھ ہزار پونڈ اور تیسرے کو پانسو پونڈ انعام دینے کا اعلان کیا تھا۔ دراصل اس دوڑ کی پہلی شق تیز پروازی کا مقابلہ تھی، دوسرا مقابلہ "ہینڈیکیپ" کا تھا جس کے لئے اول انعام دو ہزار پونڈ اور دوسرا انعام ایک ہزار پونڈ مقرر کیا گیا تھا۔

شرائط اِس ہوائی دوڑ کے لئے لندن سے میلبورن تک ہوائی جہازوں کی قیام و سہولت کیلئے چوبیس اسٹیشن یا منزلیں قائم کی گئیں تھیں جن کے نام بقید فاصلہ درج ذیل ہیں:۔

(۱) لندن سے مارسیلز ۶۵۲ میل	(۲) مارسیلز سے رومہ ۳۰۴ میل
(۳) رومہ " ایتھنز ۶۵۴ "	(۴) ایتھنز " حلب ۷۵۱ "
(۵) حلب " بغداد ۴۵۰ "	(۶) بغداد " بوشہر ۴۰۶ "
(۷) بوشہر " جسک ۴۰۵ "	(۸) جسک " کراچی ۵۰۴ "
(۹) کراچی " جودھپور ۳۸۴ "	(۱۰) جودھپور " الہ آباد (بمرولی) ۵۴۲ "
(۱۱) الہ آباد " کلکتہ ۴۶۲ "	(۱۲) کلکتہ " رنگون ۶۳۹ "
(۱۳) رنگون " بنکاک ۳۶۲ "	(۱۴) بنکاک " آلوراسٹار ۵۳۳ "
(۱۵) آلوراسٹار " سنگاپور ۴۰۹ "	(۱۶) سنگاپور " بٹاویہ ۵۶۰ "
(۱۷) بٹاویہ " رامبنگ ۶۰۲ "	(۱۸) رامبنگ " کوئپانگ ۴۹۵ "

(۱۹) کوئپانگ سے پورٹ ڈارون ۵۱۱ میل (۲۰) پورٹ ڈارون سے نیوکاسل واٹرس ۴۹۲ میل
(۲۱) نیوکاسل واٹرس ،، کلونکری ۵۱۴ ،، (۲۲) کلونکری ،، چارلیوائل ۵۲۶ ،،
(۲۳) چارلیوائل ،، ناروماین ۴۴۰ ،، (۲۴) ناروماین ،، میلبورن ۴۲۵ ،،

اس طرح اس ہوائی پرواز کا فاصلہ گیارہ ہزار تین سو میل مقرر کیا گیا جو کرۂ ارض کے تقریباً نصف دَور کے برابر ہے۔ اِن درمیانی منزلوں میں پانچ مقام ایسے مقرر کئے گئے تھے جہاں ہر ہوائی جہاز کے لئے ٹھہرنا اور جانچ کرانا لازمی تھا۔ یہ مقامات حسب ذیل ہیں:-

(۱) بغداد - لندن سے (۲۵۳۰ میل) (۲) الہ آباد - بغداد سے ۲۳۰۰ میل
(۳) سنگاپور - الہ آباد سے ۲۲۱۰ میل (۴) پورٹ ڈارون - سنگاپور سے ۲۰۸۴ میل
(۵) چارلیوائل - پورٹ ڈارون سے ۱۳۸۹ میل

مگر ہینڈیکیپ میں مقابلہ کرنیوالوں کے لئے اِن منزلوں پر ٹھہرنا لازمی نہ تھا۔

اس دَوڑ میں درمیانی مقام الہ آباد مقرر تھا۔ بہت تیز پرواز ہوائی جہاز کے ذریعہ یہ فاصلہ تقریباً تین دن میں طے کیا جاسکتا ہے، لیکن یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے، اس میں نہ صرف ہوابازوں کی عام قابلیت، قوتِ ضبط و تحمل کا امتحان ہے بلکہ ہوائی جہازوں کی مضبوطی، ان کے انجنوں کی عمدگی، ہوابازوں کی مشق و مہارت فن کی بھی پوری جانچ ہے۔ علاوہ ازیں ہوائی جہازوں کو درمیانی منزلوں پر پٹرول لینے اور حسبِ ضرورت اپنی مشینوں کی مرمت کرنے کا اختیار تھا۔ اور چونکہ یہ دوڑ تین براعظم یعنی یورپ، ایشیا اور آسٹریلیا تک وسیع تھی اور اس مسافت میں مختلف موسموں سے مقابلہ تھا اس لئے ہر قسم کی موسمی ضروریات کا انتظام اور اسکی موسم شناس آلات سے پوری طرح کام لیا گیا تھا۔ اس مقابلہ میں ہینڈیکیپ والوں کو منزلِ مقصود تک پہونچنے کے لئے سولہ دن دیئے گئے تھے لیکن ہندوستان کو آٹھ دن کے اندر عبور کرلینا ضروری قرار دیا گیا تھا۔

شرکت اس انعامی مقابلے کا اعلان ہوتے ہی ہر طرف تیاریاں ہونے لگیں، بیش قرار انعام اور غیر فانی شہرت حاصل کرنے کے لئے پندرہ مختلف ممالک کے چونسٹھ ہوابازوں نے اس مقابلہ میں شرکت کی جن میں زیادہ تعداد امریکن، انگریزی، فرانسیسی، اطالوی اور ولندیزی (ڈچ) ہوائی جہازوں کی تھی۔ جن میں سے بعض ہواباز ایسے بھی تھے جو اس سے پیشتر پرواز میں ریکارڈ قائم کرچکے تھے، مثلاً امریکن ہواباز وائلی پوسٹ (Wiley Post) آئرش ہواباز کرنیل فٹز موریس (Fitzmaurice) اور آسٹریلوی ہواباز سر چارلس کنگسفورڈ اسمتھ Sir Charles Kingsford Smith

لیکن آخر میں صرف بیس ہوائی جہاز شریک مقابلہ ہوئے ان میں صرف امریکہ، انگلستان، ڈنمارک، ہالینڈ، آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کے ہوائی جہاز تھے

تیاریاں | دوڑ درحقیقت لندن سے نہیں بلکہ ضلع سفک کے مقام ملڈن ہال کے طیارہ خانہ سے شروع ہوئی تھی، اس کے دو روز قبل تمام ہوائی جہازوں کی سرکاری طور پر جانچ کر لی گئی تھی مسٹر کاتھکارٹ جونس کے ہوائی جہاز "کومیٹ" کا ایک آلۂ محرک زور پڑنے سے سیدھا ہو گیا تھا جسے بدلکر دوبارہ آزمائش کی گئی۔ عین آخر میں آئرش ہواباز کرنل فٹز موراِلس مقابلہ سے کنارہ کش ہو گئے۔

بہرحال دوڑ شروع ہونے سے دو ڈھائی گھنٹہ پیشتر طیارہ میدان میں ہزارہا تماشائی جمع ہو گئے پرنس آف ویلز بھی ہوائی جہاز میں ونڈسر سے تشریف لائے۔ اعلیٰحضرت ملک معظم اور ملکہ معظمہ بھی نیومارکٹ کی گھوڑ دوڑ دیکھکر اس دوڑ کی ابتدا ملاحظہ فرمانے تشریف لے آئے۔ غرض بڑی دھوم دھام سے یہ دوڑ تاریخ ۲۰۔ اکتوبر ۱۹۳۴ء کو ٹھیک ساڑھے چھ بجے صبح کے وقت شروع ہوئی۔ جہازوں کی روانگی حسب ترتیب ذیل ہوئی:-

(۱) ڈی۔ ایچ۔ کومٹ	جیپسی VI	مسٹر اور مسز مولیسن
(۲) بوئنگ ٹرانسپورٹ	پراٹ ووھٹنے "واسپ"	کرنل راسکوٹرنر اور کلائڈ پینگبارن
(۳) ڈی۔ ایچ۔ کومٹ	جیپسی VI	کاتھکارٹ جونس و کے ایف۔ ایچ۔ والر
(۴) پانڈر ایس ۴	رائٹ وھرلونڈ	ڈی ایل آسجیس اور جی جے گیسنڈا فر
(۵) ایرا سپیڈ اے۔ ایس۔ آر	جیپسی VI	کپتان نیوائل اسٹیک وایس۔ ایل ٹرنیب
(۶) ڈی۔ ایچ۔ کومٹ	جیپسی VI	سی ڈبلیو۔ اے اسکاٹ اور ٹی کیمبل بلیک
(۷) ڈگلس ڈی سی ۲	رائٹ سائکلون	کے۔ ڈی پارمنٹیر و جے۔ جے۔ مول
(۸) گرینوائل مونوپلین	پراٹ ووھٹنے "ہارنیٹ"	مس جیکولین کوچران اور ویسلی اسمتھ
(۹) لیمبرٹ مونوکوپ	وارنر سوپر اسکارب	جان ایچ۔ رائٹ۔
(۱۰) فیری III ایف	نیپئر لائن	سی جی۔ ڈیویس اور لفٹنٹ کمانڈر ہل
(۱۱) فیری فاکس	فیلکس کرٹس	ایچ ڈی۔ گلمان
(۱۲) لاک ہیڈ ویگا	پراٹ ووھٹنے ایس سی	جے ووڈس اور ڈی۔ سی۔ بینٹ
(۱۳) ڈی ایچ ڈریگن	جیپسی VI	جے۔ ڈی۔ ہیوٹ اور سی۔ ای کے

(۱۴) فیری فاکس | فیری فیکس ڈی ۲۱ | آر۔ پارر اور جی۔ای ہیمسورتھ
(۱۵) ڈیسو ٹر مارک III | جپسی III | لفٹنٹ ایم۔ہانسن
(۱۶) مائلس فیلکن | جپسی میجر | ایچ۔ایل۔بروک
(۱۷) مائلس ہاک | جپسی III | مالکم میک گرگیر اور ہنری واکر
(۱۸) برٹش کلیم ایگل | جپسی میجر | فلائٹ لفٹنٹ شا
(۱۹) ایر اسپیڈ کوریئر اے۔ایس ۵ | چیتا ۵ | اسکواڈرن لیڈر اسٹوڈارٹ و کے۔جی۔اسٹوڈارٹ
(۲۰) ڈی۔ایچ۔ماتھ | جپسی | سی۔جی۔میلروز

سر الفریڈ باور قائم مقام میئر لندن ہاتھ میں جھنڈی لئے میدان میں کھڑے تھے جس وقت ٹائم کیپر کسی ہوائی جہاز کا نام پکارتا تھا وہ فوراً اپنی جھنڈی گرادیتے تھے اور ہوائی جہاز روانہ ہوجاتا تھا بہرحال سب جہاز سہولت کے ساتھ روانہ ہوگئے۔موسم پرواز کے موافق تھا۔ہر ہوائی جہاز ۴۵ سکنڈ کے وقفہ سے روانہ ہوا۔اس طرح ۱۶ منٹ کے اندر اندر سب جہاز پوری طرح ہوا میں بلند ہوکر روانہ ہوگئے اس دوڑ کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ میسرز کنٹلر پامر نے مسٹر اسکاٹ اور کیمبل بلیک کو چلتے وقت اپنا ایک اشتہار اخبار پاینر لکھنؤ کے لئے دیا تھا جو اخبار مذکور کی اشاعت مورخہ ۲۲۔اکتوبر میں شائع ہوا۔

مقابلہ کی رفتار لندن سے میلبورن تک مقابلہ کی رفتار کا ایک نقشہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے جس سے ایک نظر میں یہ معلوم ہوسکیگا کہ کون کون ہوائی جہاز کس کس مقام پر کس وقت پہونچا اور کون کون کہاں کہاں تک آگے پیچھے رہے۔

مقام	ہواباز	تاریخ	وقت
مارسیلز	ووڈ اور بینٹ	۲۰۔اکتوبر	۱۰ بجکر ۵۰ منٹ
رومہ	پارمنٹیر اور مول	"	۱۱ بجکر ۳۰ منٹ
ایتھنز	"	"	۱۵ بجکر ۳۰ منٹ
بغداد	۱۔مسٹر و مسز مولیسن	"	۱۹ بجکر دس منٹ
	۲۔اسکاٹ و کیمبل	"	۲۱ بجے
	۳۔پارمنٹیر اور مول	"	۲۳ بجکر ۱۱ منٹ
کراچی	۱۔مسٹر و مسز مولیسن	۲۱۔اکتوبر	۱۰ بجکر ۱۵ منٹ
	۲۔پارمنٹیر و مول	"	۱۴ بجکر ۲۵ منٹ

مقام	ہوا باز	تاریخ	وقت
کراچی	۳- آسچیس اور گیسنڈارفر	۲۱- اکتوبر	۱۵ بجکر ۲۵ منٹ
الہ آباد	۱- اسکاٹ وکیمبل	"	۱۴ بجکر ۴ منٹ
	۲- پارمنٹیر و مول	۲۱- اکتوبر	۱۹ بجکر ۲۴ منٹ
	۳- آسچیس و گیسنڈارفر	"	۲۲ بجکر ۳۰ منٹ
سنگاپور	۱- اسکاٹ وکیمبل	"	۲۲ بجکر ۳۰ منٹ
	۲- پارمنٹیر و مول	۲۲- اکتوبر	۷ بجکر ۲ منٹ
	۳- ٹرنر و بینگیارن	"	۱۵ بجکر ۳۷ منٹ
میلبورن	۱- اسکاٹ وکیمبل	۲۳- اکتوبر	۵ بجکر ۳۴ منٹ
	۲- پارمنٹیر و مول		اول سے ۱۹ گھنٹہ ۱۹ منٹ بعد
	۳- ٹرنر و بینگیارن		دوم سے ۲ گھنٹہ ۴۴ منٹ بعد

اس طرح گویا اسکاٹ وکیمبل نے گیارہ ہزار تین سو میل کی مسافت دس سکنڈ کم اکہتر گھنٹہ میں طے کی اور دنیا میں تیز پروازی کے تمام ریکارڈ مات کردیئے جن کی تفصیل ہم آئندہ پیرے میں دینگے۔

چونکہ مسٹر و مسز مولیسن نے (جو مس ایمی جانسن ہیں جنھوں نے سنہ ۱۹۳۰ء میں آسٹریلیا تک پرواز کا ریکارڈ قائم کیا تھا) لندن سے بغداد تک براہ راست پرواز کی تھی اس لئے وہاں تک ان کا نمبر اول رہا۔ اور اگرچہ کراچی میں سرزمین ہند پر سب سے پہلے انھیں میاں بیوی نے قدم رکھا تھا لیکن بغداد سے اڑکر براہ راست الہ آباد میں سب سے پہلے اسکاٹ وکیمبل پہونچے اس لئے بغداد سے الہ آباد تک وہ اول رہے۔ الہ آباد پہونچکر مسٹر و مسز مولیسن نے اپنی مشین خراب ہوجانے کے باعث مقابلہ ترک کردیا۔ مس کوچران کا ہوائی جہاز بوڈاپسٹ میں خراب ہوگیا تھا، اور فیری فاکس نامی جہاز اٹلی کی فضا میں تباہ ہوکر جل گیا اور اس کے ہواباز بھی جل گئے۔

اسکاٹ اور بلیک کی کامیابی کا راز ان کی لندن سے بغداد اور بغداد سے الہ آباد تک یعنی آدھی مسافت براہ راست طے کرنا ہے۔ ان کا جہاز ۱۴ بجکر ۴ منٹ پر بمرولی (الہ آباد) پہونچا اور ایک گھنٹہ بعد سنگاپور کو روانہ ہوگیا۔

الہ آباد میں دوسرے نمبر پر پارمنٹیر اور مول کا ولندیزی جہاز ڈگلس پہونچا، جس میں ہوابازوں کے علاوہ سات مسافر اور بہت سی ڈاک بھی تھی۔ یہی ہوائی جہاز میلبورن میں دوسرے نمبر پر پہونچا۔

الہ آباد میں تیسرے نمبر پر پانڈر ایس نامی ولندیزی جہاز پہونچا، جس کے ہوا باز آجیس اور گیسنڈار خبر تھے۔ اس میں بھی مسافر سوار تھے، لیکن الہ آباد میں زمین پر اُترتے ہوئے وہ تباہ ہو گیا گو اُس کے مسافر بچ گئے۔ اسکاٹ اور بلیک کے ہوائی جہاز کو بھی عراق میں ایک دفعہ انجن کی خرابی کے باعث اُترنا پڑا تھا، اور بحیرۂ تیمور کو عبور کرتے ہوئے بھی انکا ایک انجن بگڑ گیا تھا۔

بقیہ ہوائی جہازوں کا حشر | متذکرہ بالا ہوائی جہازوں کے علاوہ مندرجہ ذیل ہوائی جہاز ایتھنز میں رہ گئے:-

(۱) لیمبرٹ مونوکوپ	وارنر سوپر اسکاریب	جان ایچ۔ رائٹ
(۲) بوئینگ ٹرانسپورٹ (امریکی)	پراٹ و ھٹنی "واسپ"	کرنل راسکو ٹرنر اور کلائڈ پینگیارن
(۳) فیری III ایف	نیپیر لائن	سی۔جی۔ڈیویس اور لفٹنٹ کمانڈر ہل
(۴) ڈی۔ایچ۔ ڈریگن	جپسی VI	ہیوٹ اور اے۔کے
(۵) ایرا سپیڈ کوریر اے۔ایس ۵	چیتاء ۵	اسٹوڈارٹ و اسٹوڈارٹ
(۶) ماتھ	جپسی	میلروز

ایتھنز سے اُڑ کر یہ ہوائی جہاز ۱۹ بجکر ۵ منٹ پر حلب اور ۲۳ بجکر ۱۱ منٹ پر بغداد پہونچے۔ کاتھکارٹ جونس اور والر کا ہوائی جہاز بحیرۂ اسود پر پریشان ہوتا ہوا ایران کے ایک گاؤں میں اُترنے پر مجبور ہوا کپتان اسٹیک اور ٹرنر کا ہوائی جہاز فرانس میں رہ گیا، یہی حشر فیری فاکس کا ہوا جو پیرس میں بگڑ گیا۔ لاک ہیڈ ویگا ایتھنز میں پہونچکر خراب ہو گیا۔ مسٹر پارپر اور بمسورتھ کا طیارہ ایبی وائل میں رہ گیا۔ ایرا سپیڈ اے۔ایس ۵ اسٹریس میں رُک گیا، اور لفٹنٹ شا کا طیارہ ساحل ہسپانیہ پر اُتر گیا۔ ولندیزی ہوائی جہاز ڈگلس منزل مقصود کے قریب پہونچکر راستہ بھول گیا اور مقام ڈونگا کے گرد چکر لگاتا رہا۔

سابقہ ریکارڈ | قبل اس کے کہ ہم اس ہوائی دوڑ کا نتیجہ بیان کریں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ لندن سے آسٹریلیا تک پرواز کے جو ریکارڈ اب تک قائم کئے گئے تھے ان کی تفصیل بیان کر دی جائے تاکہ ناظرین کو یہ معلوم ہو سکے کہ گذشتہ پندرہ سال کے اندر فن پرواز نے کس قدر ترقی کی ہے۔

سنہ	نام	وقت
۱۹۱۹	سر راس اسمتھ و کیتھ اسمتھ	۲۸ دن
۱۹۲۸	برٹ ہنکلر	۱۵½ "
۱۹۳۰	مس ایمی جانسن	۱۹ "
۱۹۳۲	سی۔ڈبلیو۔اسکاٹ	۸ دن ۲۰ گھنٹہ

۱۹۳۳	سر چارلس کنگسفورڈ اسمتھ	۷ دن ۵ گھنٹے
"	مسز الما	" " ۱۷ " ۵۶ منٹ
۱۹۳۴	اسکاٹ و کیمبل بلیک	دس سکنڈ کم تین دن

نتیجہ | جیسا کہ نقشۂ بالا سے ظاہر ہے اِس دوڑ میں سب سے اول اسکاٹ اور کیمبل بلیک کا ہوائی جہاز رہا جو انگریزی ساخت کا کومٹ ہے۔ دوسرے نمبر پر ولندیزی جہاز ڈگلس پہونچا جس کے ہوا باز پار منٹیر اور مول تھے۔ یہ ہوائی جہاز اس قدر وزنی اور بڑا تھا کہ اس میں ہوائی ڈاک کے علاوہ سات آدمی بھی سوار تھے۔ اگر یہ راستہ نہ بھولتا تو غالباً اول آتا۔ لیکن اب بھی باوجود اس قدر وزنی اور بڑا ہونے کے اس کی تیز پروازی انجن اور مشین کی مضبوطی اور قابل اعتماد پائداری قابل داد ہے۔ تیسرا نمبر کرنل راسکو ٹرنر اور پینگیارن کا امریکن ہوائی جہاز رہا۔ چنانچہ ان تینوں کو ہز رائل ہائینس ڈیوک آف گلاوسٹر نے اپنے ہاتھوں مقررہ انعامات تقسیم فرمائے۔

مقابلہ ختم ہونے کے بعد اسکاٹ کو لندن کے اخبار "نیوز کرانکل" نے اپنے شعبۂ ہوائی کا ایڈیٹر مقرر کر لیا۔ اور جس ہوائی جہاز کو پارمنٹیر اور مول نے چلایا تھا اس کے مالک نے وہ جہاز انھیں کو نذر کر دیا۔ اس ہوائی جہاز کو امریکہ کی ایک کمپنی نے تین لاکھ روپیہ میں خریدنا چاہا تھا لیکن انکار کر دیا گیا۔ معلوم ہوا ہے کہ ایک کمپنی نے اس دوڑ کا فلم بھی تیار کیا ہے جس پر بارہ ہزار روپیہ فی فٹ خرچ ہوا ہے۔

نصف کرۂ ارض کی اس اہم اور بیش قیمت ہوائی دوڑ کی غرض محض تفریح ہی نہیں تھی بلکہ بہت سے تجارتی، اقتصادی اور سیاسی اغراض و مقاصد اس سے وابستہ ہیں۔ جس طرح بین الاقوامی موٹر کار کی دوڑوں کا نتیجہ موجودہ مکمل موٹر نکلی ہے اسی طرح اس ہوائی دوڑ کا نتیجہ مستقبل کا مکمل ہوائی جہاز ہوگا۔ علاوہ ازیں اس دوڑ کے نتیجہ سے انگلستان، امریکہ، فرانس اور ہالینڈ کو خاص فائدہ پہونچے گا۔ جن کے مقبوضات مشرق و مغرب میں دُور دُور تک پھیلے ہوئے ہیں۔ چنانچہ گورنمنٹ فرانس نے ایک ایسی ہی دوڑ کا انتظام کرنیکا ارادہ ظاہر کیا ہے۔ جو پیرس سے ہنوئی واقع ہند چینی تک ہوگی۔

اس دوڑ نے یہ بات بھی پوری طرح سے ثابت کر دی ہے کہ ولندیزی ہوائی جہاز ڈگلس ۲ء قسم کے ہوائی جہاز بمقابلہ انگریزی ہوائی جہاز کومٹ کے زیادہ کار آمد ہیں، کیونکہ ولندیزی جہاز میں ہوائی ڈاک کے علاوہ مسافر بھی تیز پروازی کے ساتھ لیجائے جا سکتے ہیں۔ اس لئے گمان غالب ہے کہ آئندہ کا مکمل ہوائی جہاز ڈگلس کی طرز پر تیار کیا جائیگا۔

سیاسی لحاظ سے بھی یہ دوڑ بہت اہم تھی، ہر سلطنت اپنی ملکی فضا کو دوسروں کی مداخلت

اور تصرف سے آزاد رکھنا چاہتی ہے۔ ۱۹۱۹ء میں ایک بین الاقوامی ہوائی معاہدہ ہوا تھا جس میں بعض سلطنتوں نے پرائیویٹ طیاروں کو اپنی فضا پہ عبور کرنے کی اجازت دیدی تھی۔ لیکن امریکہ برازیل۔ ارجنٹائن۔ چین۔ روس۔ ٹرکی۔ جرمنی اور ایران اس معاہدہ میں شامل نہیں ہوئے تھے فرانسیسی اور ولندیزی ہوائی جہازوں کی لائن ان کے مشرقی مقبوضات تک قائم ہے اور چونکہ یہ لائن ایران سے گذرتی ہے اس لئے ان کو ہر ہفتہ اجازت نامہ کی تجدید کرانا پڑتی ہے۔ اسی طرح اگر اطالوی بلاد الصومال جانا چاہیں تو انھیں مجبوراً انگریزی مقبوضات کے اوپر سے اڑنے کی اجازت لینی پڑے گی۔ اور اس میں عموماً بڑی دقتیں ہوتی ہیں۔ کیونکہ ہر سلطنت دوسری قوم کے ہوائی جہاز کو شبہ کی نگاہ سے دیکھتی ہے۔

کلام آرزو

خالص اردو کا نمونہ

(از حضرت انور حسین آرزو لکھنوی)

بناؤ کو کیا کوئی بگاڑے، بگاڑ کو کیا کوئی بنائے
یہ کھیل سب اس کے ہاتھ کے ہیں وہی بگاڑے وہی بنائے

یہ سمجھو پھیر اس الٹ پلٹ کا کہ سکھ میں دکھ ہے تو دکھ میں سکھ ہے
بنائے وہ دھوپ چاندنی کو، کہ دھوپ کو چاندنی بنائے

بناوٹ آنکھوں کی کہہ رہی ہے، نہ رات الگ ہے نہ دن الگ ہے
اسی کو دھبا بنا دے کالا، اسی کو سورج مکھی بنائے

ادھر بھی یہ رٹ لگی ہوئی ہے کہ میری بگڑی تمھیں بناؤ
ادھر بھی کچھ ہٹ سی ہو گئی ہے کہ جو بگاڑے وہی بنائے

یہاں سے جانے کی جو گھڑی ہے نہ ٹل سکے گی نہ ٹل سکی ہے
جب ان کی چتون بدل گئی ہے کسی سے کیا بن سکے بنائے

نہ نکلا برسوں میں کوئی اتنا کہ ٹوٹا تارا ہی جوڑ دیتا
بنانے والے نے ایک پل میں یہ چاند سورج سبھی بنائے

وہی ہے پیلا وہی دُلارا، اسی کے ہم ہیں وہی ہمارا
بنا کے رکھے بگاڑ سارا، وہ آرزو کو ذرا بھی بنائے

بدی کا پھل

(از خواجہ عبدالرؤف صاحب عشرت لکھنوی)

آخری شاہ اودھ مرزا محمد واجد علی شاہ کے زمانۂ سلطنت میں کاکوری کے ایک شخص مرزا وصی علی خاں نواب امین الدولہ کے دفتر میں واصل باقی نویس تھے، وہ اُن کے مشیر خاص بھی تھے کیونکہ اُنھوں نے نواب صاحب کو ہر طرح سبز باغ دکھا کر اپنا ہم خیال بنا لیا تھا۔ اتفاق سے نواب محمد خاں سفیر شاہی سے باتوں باتوں میں مرزا صاحب سے چشمک ہو گئی، اُنھوں نے بڑے صاحب سے لگانا شروع کیا کہ یہ آدمی جعلساز ہے اور جنرل لو صاحب اور جنرل کالیفیلڈ صاحب کے زمانہ میں اسکا اخراج عمل میں آچکا ہے، قوم اور فرقہ کا حال بھی صاف صاف بیان کر دیا۔ تو بڑے صاحب نے کاغذات ماضیہ ملاحظہ فرمائے اور موقع سوچ رہے تھے ایک دن بڑے صاحب بادشاہ کی مزاج پُرسی کے واسطے تشریف لائے اور ضمناً یہ بھی فرمایا کہ مرزا وصی علی خاں آدمی بدنفس ہے اور سابق میں بھی شہر بدر ہو چکا ہے اس کا شہر میں رہنا اچھا نہیں ہے اخراج لازم ہے۔

نواب علی نقی خاں وزیر مال نے بڑے صاحب کو مفصل حال لکھا ہے کہ وصی علی خاں میرے وقت کا ملازم نہیں ہے نواب امین الدولہ کے عہد سے اس خدمت پر مامور ہے، سر دست ایسا کارپرداز بہم نہیں پہونچ سکتا، سابق میں جو اس پر الزام لگایا گیا تھا اُس میں بہت تحقیقات ہوئی اور عدم ثبوت قصور سے نواب امین الدولہ نے مہتمم کاروبار وزارت کیا تھا اور زمانۂ امجد علی شاہ میں اسکی روبکاری بھی ہوئی تھی۔ ایک مرتبہ کپتان برناڈ صاحب نے بھی اسکی شکایت کی تھی مگر آنکو وزارت سے یہ جواب دیا گیا تھا کہ آپ نے خود ایک سابق چٹھی میں اسکو مرد ذی عزت لکھا تھا اسی بنیاد خیال پر دیانتدار سمجھکر ان کو جگہ دی گئی تھی۔ اسکا جواب آیا کہ نیاز مند کو تحقیقات کی ضرورت نہیں ہے مناسب یہ ہے کہ ایسے آدمی کو مداخلت کاروبار سے معطل کیا جائے۔ آخر مرزا مذکور حکم حاکم سے مجبور ہو کر معطل کئے گئے اور دو سو روپیہ ماہوار کی تنخواہ جاری رہی۔

بادشاہ نے بھی ان کے اخراج کا حکم لکھدیا اور تنخواہ بھی بند ہو گئی۔ مرزا وصی علی خاں کا جانا فیض آباد

میں منظور ہو گیا۔ کیونکہ کانپور کی ہوا خلاف صحت و مزاج تھی، چاروناچار مرزا وصی علی خاں مع کل متعلقین اور اسباب کے بحفاظت سپاہ راجہ مان سنگھ قیام جنگ فیض آباد بھجوا دیے گئے۔ اور اس سے پیشتر بھی بحکم رزیڈنٹ بہادر، نواب شرف الدولہ کے عہد میں کانپور بھیجد یئے گئے تھے۔

جب جرنل سلیمن صاحب ولایت کو چلے گئے تو میدان خالی دیکھکر یہ بھی کاکوری میں چلے آئے سنہ ۱۲۷۰ھ میں پھر وزیر علی نقی خاں کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ پانچ اشرفیاں نذر کیں اور قدموں پر سر رکھدیا، پھر عصمت مآب بیگم صاحبہ وزیر کو نذر دی اور لکھنؤ میں اپنے مملوکہ مکان میں رہنے لگے۔ مجلسیں اور نذر و نیاز نہایت اہتمام سے کرتے تھے، شہر میں تمام مومنین شیعہ ان کے یہاں آتے تھے مگر کوئی سلسلۂ روزگار قائم نہ ہوتا تھا اسواسطے کہ عملہ شاہی ان کی کارروائیوں سے خائف رہتا اور ریزیڈنٹ بھی ان سے خوش نہ تھے۔ جرنل سلیمن صاحب تو سلطنت اودھ کے حق میں کانٹے بو چکے تھے یعنی کتاب بلیو بک میں تمام اودھ کی بدانتظامی لکھکر گورنمنٹ سے درخواست کی تھی کہ ملک اودھ سرکار کو لے لینا چاہیئے اور اسی سلسلہ میں ولایت جارہے تھے، ان کو ایک مرض ذیابیطس اور رمد چشم تھا جسوقت جہاز پر سوار ہوئے مرض کی شدت ہوئی اور جہاز پر مر گئے۔ مرزا وصی علی خاں بھی آزاد ہو چکے تھے اور نئے ریزیڈنٹ سے ساز باز چاہتے تھے مگر کوئی موقع نہیں ملتا تھا حسن اتفاق سے گنگا بخش زمیندار موضع بھٹائی کے ذمہ کچھ مالگذاری واجب الادا تھی وہ سرکشی سے ادا نہیں کرتا تھا فوج شاہی اس کے استیصال کے لئے گئی اور ریزیڈنٹ کے حکم سے چھاؤنی سے ایک کمپنی مع توپ مع کپتان فوج کے موافق دستور قدیم روانہ کی گئی۔

کپتان فوج انگریزی نے دلیرانہ حملہ کیا گڑھی کو ناچیز محض سمجھکر گھیر لیا اور شاہی فوج پر طعنہ زن ہوا، کمیدان شاہی نے کہا ہم لوگ ہمیشہ سے زمینداروں سے لڑتے رہے آپ ذرا تامل کیجئے یہ زمینداروں کی لڑائی ہے اسکا ڈھنگ دوسرا ہوتا ہے، ان پر رسد بند کر دی جاتی ہے اس کے بعد یہ خود عاجز آکر صلح کر لیتے ہیں اور ایک دم سے گولہ اندازی کرنے میں خطرہ ہے اس میں اکثر خطا دیکھی گئی ہے۔ صاحب نے کچھ پرواہ کی اور دفعتہً یورش کر دی۔ جب زمیندار نے یہ حالت دیکھی اور کوئی مفر نظر نہ آیا تو اس نے بھی گھبرا کر پھاٹک کھول دیا اور ایک باڑھ ماری، کپتان صاحب کے گولی لگ گئی اور فوراً مر گئے، فوج ان کی لاش منڈیاون میں لائی اور وہیں دفن ہوئے۔

زمیندار بیچارہ اس خوف سے کہ اب رزیڈنٹ سے مقابلہ ہو گا فوراً اپنی جان لیکر بھاگ نکلا، گورنمنٹ کی فوج اس کے تعاقب میں رہی کہیں پتہ نہ ملا۔ جب سر چارلس نیپیر صاحب Sir Charles Napier نے یہ واقعہ سنا ناگوار خاطر ہوا اور نواب گورنر جنرل کے بھی خلاف مزاج ہوا کئی مہینے تک اسکی تحریر

زیڈنٹ سے رہی اور فوج بھی تعاقب کرتی رہی۔ برسات کا زمانہ آیا تو یہ بیچارہ پریشان ہوا۔ اسکے ساتھ کے سپاہی بھی شاہی اور گورنمنٹی فوج سے سازباز کرنے لگے بیچارہ کو کسی نے اپنے یہاں قیام کرنے کو جگہ نہ دی اور عورتیں جو اس کے ساتھ تھیں جنگلوں میں پھرتے پھرتے عاجز آگئی تھیں کہتی تھیں کہ اس سرگردانی سے مرجانا بہتر ہے۔ گورمنٹ اور شاہی فوج کے ڈر سے کوئی انکا طرفدار نہ ہوتا تھا۔

ایک دن نواب منورالدولہ وزیر شکار کو جارہے تھے گنگا بخش زمیندار ان سے بحالِ تباہ ملا اُس نے وزیر صاحب سے کہا آپ دیا کر کے رزیڈنٹ بہادر سے ہماری سفارش کرم کے جرم معاف کرادیجئے تو ہماری جان بچ سکتی ہے اور آپکی نیکنامی بھی ہوگی کیونکہ کئی مہینے سے فوج ہمارے واسطے سرگردان ہے اور آج تک کسی نے ہم کو نہیں پایا۔

نواب نے کہا میں جب شکار سے واپس ہو کر آؤنگا تو ریزیڈنٹ سے ملونگا اور جہاں تک ہوسکے گا تمہاری سفارش کرونگا۔ اس امید پر اسکا وکیل نواب کے پاس حاضر رہا تھا۔ نواب کو تو کوئی موقع ریزیڈنٹ بہادر کے پاس جانے کا نہیں ملا۔ لیکن یہ خبر مرزا وصی علی خاں کو کسی طرح مل گئی، یہ بیچارے خود ریزیڈنٹ کے معتوب تھے۔ دل میں کہا اگر یہ شکار میرے ہاتھ آجائے تو ریزیڈنٹ سے بھی سرخروئی ہو اور بادشاہ کے دل میں بھی گھر ہو جائے۔ اس تجویز میں رات دن کوشش کر رہے تھے۔ ان کو معلوم ہوا کہ زمیندار کے گاؤں کے پاس ایک شخص شیخ قطب الدین بھی چھوٹے سے زمیندار ہیں اور وہ شیخ احمد بخش داروغہ دیوان خانہ نواب امین الدولہ بہادر کے دوست ہیں۔ دل میں بہت خوش ہوئے کہ پالا مار لیا۔ مرزا وصی علی نے داروغہ صاحب سے خصوصیت پیدا کی اور ان کے ذریعہ سے شیخ قطب الدین کو بلوایا اُن سے اپنا منصوبہ کہا اور وعدہ کیا کہ اگر کام ہو گیا تو تم کو بھی کئی ہزار روپیہ انعام کا ملے گا۔ اور سرکار شاہی سے کوئی عہدہ بھی دلوادوں گا۔

شیخ صاحب نے گاؤں میں آکر گنگا بخش ٹھاکر کا سراغ لگایا اور اپنا رسوخ جتا کر ٹھاکر کو راضی کیا کہ ہم منورالدولہ سے تمہارا تصفیہ بخوبی کرادیں گے۔ وہ بیچارہ اجل گرفتہ ان کے فریب میں آگیا اور نہ سمجھا کہ یہ سراسر جعل ہے تاہم اُس نے کہا کہ نواب کا مُہری خط مجھے لادو تو یقین آئیگا۔ شیخ صاحب لکھنؤ گئے اور ایک کاغذ لائے جسکی مُہر میں احمد علی خاں کا نام لکھا ہوا تھا کسی غیر معروف کی مہر تھی اور اسمیں قرآن کو ضمانت میں دیا تھا اور لکھا تھا تم چلے آؤ ہم صاحب سے کہکر تمہارا قصور معاف کرادیں گے۔ اُس نے اتنا پوچھا کہ اس مہر میں نواب منورالدولہ تو لکھا نہیں ہے۔ شیخ نے کہا یہ ان کی پُرانی مہر ہے بیچارہ یہ نہ سمجھا کہ یہ جعلی مہر کسی غیر آدمی کی ہے، خیال کیا کہ نواب احمد علی خاں نام تو ہے خطاب نہیں ہے تو کچھ اندیشہ کی بات نہیں۔

ادھر مرزا وصی علی خاں نے یہ کارروائی کی کہ بادشاہ کے وزیر کے ذریعے سے ریزیڈنٹ کو اطلاع دی کہ اگر حکم ہو تو گنگا بخش کو مرزا وصی علی خاں گرفتار کرلیں، اُنھوں نے بخوشی اجازت دیدی۔ بیچارہ ٹھاکر گنگا بخش ان فریب کاریوں سے ناواقف تنہا شیخ صاحب کے پاس میانے میں باپ بیٹے دونوں سوار ہوکر آگئے شیخ جی ساتھ لیکر لکھنؤ روانہ ہوئے اور کہا کہ جسوقت ہم لکھنؤ پہنچیں گے تو نواب وصی علی خاں نواب منورالدولہ کی طرف سے ہمارے استقبال کو آئیں گے۔ مرزا وصی علی ۵ شوال یوم پنجشنبہ ۱۲۶۶ھ کو مع اپنے معتمدین جان نثار اور ایک جاسوس شاہی اور ایک چوبدار شاہی اور ایک فرمان شاہی افسرانِ فوج کے نام لیکر چلے افسران کو حکم تھا کہ مرزا وصی علی خاں کی اطاعت کریں۔ فوج کی ضرورت اس واسطے خیال کی کہ اگر گنگا بخش کو کوئی ہم سے زبردستی چھین لے اور اپنے نام سے ریزیڈنٹ کے حوالے کرے تو ہم لوگ انعام واکرام سے محروم رہ جائیں گے۔

غرضکہ جب یہ اسیر دامِ بلا شام کے قریب گگرال کی ندی سے آگے بڑھے تو مرزا صاحب نے فوج کو حکم دیا کہ ایک ہوائی باڑھ بندوقوں کی مارو، بندوقوں کا چھوٹنا تھا کہ ٹھاکر خواب غفلت سے بیدار ہوا اور فوراً میانہ سے کود کر بھاگنا چاہا، لیکن فوج تو سر پر آچکی تھی اُسی وقت دونوں اجل رسیدہ کی مشکیں باندھ لیں اور مرزا وصی علی خاں کی بہینس میں ڈال دیا اور دروازے بند کردیے، دونوں باپ بیٹے بندھے ہوئے بہینس میں پڑے ہیں بہینس کے دروازے بند ہیں، کوئی اُن کا مونس و رفیق نہیں جو کام آئے مرزا وصی علی خاں پیدل بہینس کے ساتھ ساتھ ہیں اور خدا جانے کیا کیا منصوبے باندھ رہے ہیں۔ شہر میں ایک چوکی پر ٹھہرے، اس عرصے میں فوج شاہی اپنی سرخروئی کے لئے آپہونچی، چوبدار نے شاہی فرمان دکھادیا کہ یہ کارگذاری مرزا وصی علی خاں کے نام لکھی جاچکی ہے وہ خاموشی سے واپس گئے۔

آدھی رات کو درِ دولت پر پہونچے، اس رات کو بادشاہ خورشید باغ میں نواب خاص محل کے یہاں تھے جو کربلا کے پُل کے قریب تھا۔ مرزا وصی علی خاں نے عرض کی کہ سرکاری اسیر حاضر ہیں، بادشاہ نے حکم کیا راجہ ٹھاکر سنگھ تربیدی کے حوالہ کردو۔ اس دن نوچندی جمعرات تھی بادشاہ کربلائے میر خدا بخش میں زیارت کو آئے تھے اور خاص محل میں رہے تھے، کربلا میں بڑا ہجوم تھا ہر قسم کے دکاندار آئے تھے تھے صبح کو جمعہ کا دن تھا مرزا نے ارکانِ دولت سے اپنی بہادری کا قصیدہ بیان کیا، سب نے کہا یہ آپ ہی کا حق تھا، ان کو اتوار کے دن بادشاہ کی طرف سے سترہ پارچے کا خلعت مع پالکی اور ہاتھی کے مرحمت ہوا اور بیچارے قطب الدین کو دوشالہ اور رومال ملکر رہ گیا۔ دوسرے دن مرزا کی سفارش سے

دس ہزار روپے سرفروشی کے عنایت ہوئے۔

دو دن کے بعد عید کی تہنیت میں ریزیڈنٹ بہادر بادشاہ کے پاس آئے۔ بہت دھوم سے مرزا کی حسن خدمت کا تذکرہ گوش گزار کیا گیا۔ ریزیڈنٹ بہادر نے کچھ اعتنا نہ کی۔ ایک دوست نے مرزا سے کہا صاحب تم سے کبھی صاف نہ ہونگے چاہے تم رستم کو پکڑ لاؤ۔

آخر اس کی کارروائی صاحب ریزیڈنٹ کی طرف سے ہوئی، بعد تحقیقات فتوائے قتل مجتہد العصر سلطان العلما کی طرف سے نافذ ہوا۔ اور روز پنجشنبہ ماہ ذی قعدہ کی ۱۲۶۶ھ میں وقت صبح زیر اکبری دروازہ گنگا بخش اور اس کے بیٹے کو قتل کرنے لائے اور دونوں کی گردن کاٹی گئی۔ اس سے پہلے راجہ ٹھاکر سنگھ نرمدی کی نگرانی میں کوتوالی میں تھے۔ کوتوال نے بہت سمجھایا کہ چودھری اب غم و غصہ کھانے کا وقت نہیں ہے جو قسمت میں تھا وہ ہو چکا اب تم کچھ کھا پی لو۔ اُس نے کچھ سنگھاڑے بازار سے کھائے اور کہا اب ہم گنگا نہیں جانتے مگر قرآن کو جانتے ہیں۔ یہ سنکر سب حاضرین رونے لگے، کوتوال نے کہا کیا کریں ہم تو حکم حاکم سے مجبور ہیں، مگر جس نے تم کو قرآن کے بہانے فریب دیا ہے اس کو بھی بہت جلد سزا ملجائیگی اور تمہارے بعد وہ کمبخت بھی ذلیل ہو کر مارا جائے گا۔ آخر وہی ہوا مرزا وصی علی خاں اگرچہ شیدائے امام تھے، مومن نماز گزار تھے، دیندار تھے، مجلسوں میں ہزارہا روپیہ صرف کرتے تھے مگر منتقم حقیقی تو خدا ہے، ہندو ہو یا مسلمان، عیسائی ہو یا مجوسی، جو بدی کسی سے کرتا ہے اسکا بدلہ بھی جلد ملجاتا ہے، اسکی عدالت میں قید کسی مذہب کی نہیں، مرزا صاحب اپنے حسن خدمت پر بہت نازاں تھے مگر سوائے بدنامی کچھ حاصل نہ ہوا، ریزیڈنٹ اُن سے ناراض، بادشاہ کا عملہ اُن سے خوش نہوا شہر میں جس طرف سے جاتے تھے یہی آواز آتی تھی کہ غریب گنگا بخش کا قاتل جاتا ہے۔

ابھی چند روز بھی گزرنے نہ پائے تھے کہ ایک لاعلاج مرض میں گرفتار ہوئے یعنی حلق سے کوئی چیز نہیں اُترتی تھی دن رات سوکھتے جاتے تھے، دنیا کی دوا ہوئی، دنیا کے علاج ہوئے دنیا کے تعویذ ہوئے بڑے بڑے عامل آئے یہاں تک کہ ایک جوتشی ہندو سے ہوم کرایا گیا، کچھ نہ ہوا، عامل نے کہا گنگا بخش کہتے ہیں میں اسکی چھاتی سے نہ اُترونگا اس نے بیخطا مجھے قتل کرایا ہے۔ آخر یہاں تک عاجز ہوئے، کہتے تھے کوئی حکیم، کوئی ڈاکٹر کوئی عامل، کوئی ملا سیانا میری ساری جائداد لے لے اور مجھے صرف ایک دکان رہنے کے واسطے دیدے مگر اس مرض سے مجھے بچائے۔ دنیا کے لوگ کہتے تھے کیا جلدی بدلہ ملا ہے آخر اجل نے بہت جلد انتقام لے لیا، مر گئے اپنے مسکونہ حویلی اسمٰعیل گنج میں دفن ہوئے اور قبر میں بھی آرام سے رہنے نہ پائے وہ سارا محلہ اور وہ حویلی سڑک میں آگئی، قبر بھی کھد گئی، اسمٰعیل گنج کا نام و نشان نرہا۔ یہ بدی کا پھل ہے۔

تنقیدِ کتب

جواہرِ سخن

ملک میں آئے دن اردو شعرا کے چھوٹے بڑے تذکرے مع انتخاب کلام شائع ہوتے رہتے ہیں، لیکن ان تذکروں میں عموماً شعرا کے حالات پر تو کافی زور دیا جاتا ہے مگر کلام کے انتخاب کا معیار خاطر خواہ نہیں ہوتا۔ انھیں امور کو مدِ نظر رکھکر ہندوستانی اکیڈیمی الہ آباد کی مجلس انتظامیہ نے ۱۹۲۶ء میں یہ فیصلہ کیا تھا کہ اردو کے سربرآوردہ سخنوروں کے کلام کا انتخاب شایع کیا جائے۔ کتاب "جواہرِ سخن" انھیں اصولوں کو مدِ نظر رکھکر مولانا کیفی چریاکوٹی نے چھ سال کی دماغ سوزی و عرق ریزی سے بہت سے دیوان، کلیات، تذکرے، انتخابات اور سوانحمریاں مطالعہ کرکے مرتب کی ہے۔ پورا تذکرہ چھ جلدوں میں مکمل ہوگا۔ فی الحال اس کی پہلی جلد شائع ہوئی ہے، اکیڈیمی کی مجلس انتظامیہ نے اس تذکرے کی نظرثانی کے لیے چھ مشہور ادیبوں کی ایک مجلس مقرر کی تھی، اس کی ایک ایک جلد فرداً فرداً ان اصحاب کے سپرد کی۔ چنانچہ پہلی جلد مولانا سلیمان ندوی صاحب کی نظرثانی کے بعد طبع ہوئی ہے، اس کے دو حصے ہیں۔ پہلے حصہ میں وجہی سے لیکر شفیق تک شعرائے دکن کے حالات اور انتخاب کلام ہے۔ جن میں شعرائے گجرات، شعرائے بیجاپور، شعرائے اورنگ آباد اور شعرائے احاطۂ مدراس بھی شامل ہیں۔ دوسرے حصہ میں خان آرزو سے لیکر بقا تک شعرائے دہلی کا تذکرہ اور انتخاب کلام ہے۔ ہم کو افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ کتاب زیرِ تنقید میں اکیڈیمی کے قائم کردہ اصولوں کی تکمیل نہیں ہو سکی۔

حصہ اول کی جس میں شعرائے دکن کے حالات اور انتخاب کلام ہے ترتیب میں وہی طریقہ برتا گیا ہے جو اس سے پہلے دوسرے تذکرہ نویس برت چکے ہیں، یعنی گجرات، بیجاپور، گولکنڈہ، اورنگ آباد اور مدراس کے شاعر خلط ملط ہیں اور ان کے تذکرے میں زمان و مکان وغیرہ کا کوئی خیال یا زبان و محاورات کی تفریق کا کوئی لحاظ نہیں رکھا گیا۔ علاوہ بریں مرتب نے صبائی گجراتی اور محمود گجراتی کو شعرائے مدراس و اورنگ آباد میں شامل کر دیا ہے۔ حالانکہ

دونوں ملکوں کی زبانوں اور محاوروں میں بڑا فرق ہے۔ اگر فاضل مرتب نے گجرات، بیجاپور، اورنگ آباد اور مدراس کے علیحدہ علیحدہ مرکز قائم کرکے ہر مرکز کے شعرا کے حالات بلحاظ سنین و مدارج زبان ترتیب دیئے ہوتے تو بہت اچھا ہوتا۔ اس کے علاوہ فاضل مرتب نے دکن کے کئی نامور شعرا کی طرف توجہ نہیں فرمائی جس سے یہ حصہ ادھورا رہ گیا ہے۔ شعرائے دکن کے انتخاب کلام میں دربار علی عادل شاہ کے ملک الشعرا نصرتی کے صرف چند اشعار ادھر ادھر سے لکھ دیئے گئے ہیں لیکن نصرتی کے قصائد کا جن کی بدولت وہ ملک الشعرا ہوا کوئی انتخاب نہیں کیا گیا۔

فاضل مرتب نے ایجاز و اختصار کو بھی اس قدر ملحوظ رکھا ہے کہ اردو شاعروں کے باوا آدم حضرت ولی دکھنی کا ذکر صرف چند سطروں میں ختم کر دیا ہے۔ اور دکن کے مشہور شاعر داؤد کو صرف ڈیڑھ سطر عطا فرمائی ہے۔ تحقیق و تدقیق کے متعلق بھی بہت کچھ کہنے سننے کی گنجائش نکلتی ہے مثلاً صفحہ ۵۰ پر قصہ ملکہ مصر کو فاضل مرتب نے عارف الدین خاں عاجز کی تصنیف لکھا ہے حالانکہ خود اس قصے کے مصنف کا تخلص محمود ہے جیسا کہ وہ اس کے خاتمہ پر خود لکھتا ہے:۔

اے محمود اب پیر کا ناؤں لے　　　ختم کر درازی سو اب چھوڑ دے

اسی طرح فاضل مرتب نے ملا غواصی دکنی کے فسانہ سیف الملوک اور بدیع الجمال کا سال تصنیف صفحہ ۴۴ پر ۱۰۴۵ھ لکھا ہے، مگر خود غواصی نے اس کا سنہ تصنیف کتاب کے خاتمہ پر ۱۰۳۵ھ لکھا ہے ؎

برس ایک ہزار اور پینتیس میں　　　کیا ختم یہ نظم دل نشیں میں

فاضل مرتب نے صفحہ ۱۸۲ پر منشی لچھمی نراین شفیق قوم کایستھ کے جو حالات درج کیے ہیں ان کا ماخذ فٹ نوٹ میں "مخزن نکات، چمنستان شعرا، نکات الشعرا، تذکرہ میر حسن" لکھا گیا ہے۔ لیکن "چمنستان الشعرا" کے سوائے جو خود شفیق کی تصنیف ہے اور کسی تذکرہ میں ان کا حال درج نہیں ہے۔ شفیق بقول مرتب ۱۱۵۸ھ میں پیدا ہوئے، اور میر نے اپنا تذکرہ نکات الشعرا ۱۱۶۵ھ میں تالیف کیا۔ ایسی صورت میں شفیق کا ذکر میر کے تذکرے میں کیسے مل سکتا ہے؟

کتاب کا دوسرا حصہ بھی ان نقائص سے محفوظ نہیں رہ سکا۔ اس میں یہ اور غضب ہوا ہے کہ میر، سودا، میر سوز جیسے نامور شاعروں کو بالکل نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ جن شاعروں کو اس میں جگہ دی گئی ہے ان کے بھی بلند پایہ کلام کا انتخاب نہیں کیا گیا۔ اس سلسلے میں دہلوی اور دکھنی شاعروں کی خصوصیات کے لحاظ سے مختلف دور قائم کرکے اردو

کی تدریجی ترقی پر بھی بحث کیجا سکتی تھی ۔ اِن نقائص کے علاوہ اس کتاب کا ایک بدنما نقص یہ بھی ہے کہ انتخاب کلام میں صحت کا کوئی لحاظ نہیں رکھا گیا ہے ۔ اور شعراء کے کلام میں الفاظ توڑ کر نا مصرعے کے مصرعے غلط لکھدیے گئے ہیں جو عروض سے خارج اور بلحاظ معنی مہمل ہو گئے ہیں ۔ ابھی اس کتاب کی پانچ جلدیں اور شائع ہونیکو باقی ہیں ۔ ہم کو امید ہے کہ یہ جلدیں کافی غور و نظر ثانی کے بعد شائع کیجائیں گی تاکہ اکیڈیمی کا روپیہ فضول ضائع نہ ہو ۔ اس کتاب کا حجم ۴۱۶ صفحات ہے ، کاغذ قیمتی عمدہ ہے ۔ قیمت ساڑھے چار روپیہ غیر مجلد ۔ ملنے کا پتہ : دفتر ہندوستانی اکیڈیمی ، الہ آباد ۔

تذکرۂ ہندی[1]

یہ اُردو زبان کے ایکسو ساٹھ سے شاعروں اور پانچ شاعرات کا تذکرہ معہ انتخاب کلام ہے جسے فارسی زبان میں شیخ غلام ہمدانی مصحفی نے ۱۲۰۹ھ ہجری میں لکھا تھا ۔ مصحفی نے شاعروں کے تین تذکرے لکھے ہیں ، ایک کا تعلق فارسی شعرا سے ہے اور دو اُردو شاعروں کے تذکرے ہیں ، یہ تذکرے عرصہ سے نایاب تھے اب انھیں مولوی عبد الحق صاحب سکریٹری انجمن ترقی اُردو اورنگ آباد دکن نے کئی نسخوں سے مقابلہ کر کے معہ حوالجات و حاشیہ مرتب کر کے اپنے فاضلانہ مقدمہ کے ساتھ شائع کیا ہے ۔ مقدمے میں مصحفی کے مفصل سوانح حیات اور ان تذکروں کی خوبیوں پر محققانہ بحث کی گئی ہے ۔ ان تذکروں کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ ذاتی رجحانات ، شخصی تعصبات اور شاعرانہ چشمکوں اور تنگدلی سے بالکل بلند رہ کر اپنے مخالف و موافق شاعروں کے حالات اور ان کے متعلق منصفانہ رائیں لکھی ہیں ۔ اس اعتبار سے یہ تذکرہ بہت مستند ہے اور حوالجات کی کتابوں میں رکھے جانے کے قابل ہے ۔

تجلیات تخیل

بابو جگیشور پرشاد ورما بیتاب لکچرار بریلی کالج نے فن مصوری و نقاشی پر ۳۰-۱۹۳۱ء میں کئی وقیع ، جامع مضامین رسالہ زمانہ میں لکھے تھے ۔ ان مضامین میں فن مصوری پر قابل قدر معلومات جمع کر دی گئی ہیں اور قدیم و جدید ہندی مصوری و نقاشی نیز پچیکاری پر سیر حاصل محاکمہ کیا گیا ہے ۔ بودھوں ، مغلوں اور راجپوتوں کے زمانہ کی مصوری پر مفصل بحث کی گئی ہے ۔ غارہائے اجنتہ و ایلورا وغیرہ اور دہلی و لاہور کے قلعہائے شاہی نیز دیگر مشہور عالم عمارات کی بے نظیر تصاویر اور نقاشیوں پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے ۔ بہر حال کتاب اسلوب بیان ، ترتیب و تہذیب سبھی لحاظ سے قابل قدر ہے ۔ صرف تصاویر کی کسر رہ گئی ہے

ملنے کا پتہ ۔ رائے صاحب لالہ رام دیال اگروال ۔ الہ آباد ۔

---

[1] حجم ۲۰۲ صفحات ۔ قیمت مجلد دو روپیہ ۔ ملنے کا پتہ : انجمن ترقی اردو ۔ اورنگ آباد دکن

معاشقۂ نپولین

فرانس کے مشہور ادیب لین وائل ڈی ریور کے پرزور ناول کا سلیس وبامحاورہ ترجمہ ہے جسے مکتبۂ ابراہیمیہ حیدرآباد دکن نے باتصویر شائع کیا ہے۔ اس قصہ کا ہیرو فرانس کا نامور بہادر نپولین اعظم ہے جس کے سطوت وجبروت سے تمام یورپ تھراتا تھا، دوسرے لعبت فرانس مارگریٹ پالو یا میڈیم فورس کے حسن خداداد کے تذکرے نے اس افسانہ کو بہت دلکش بنادیا ہے، اور کوئی شخص اُسے شروع کرکے ختم کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ ترجمہ میں کافی سلاست وروانی ہے، حجم وغیرہ کے لحاظ سے قیمت ایک روپیہ کسی قدر زیادہ معلوم ہوتی ہے۔ ملنے کا پتہ مکتبۂ ابراہیمیہ حیدرآباد دکن۔

سپارۂ دل

قاضی احمد میاں ساکن جوناگڈھ متخلص بہ اختر کی غزلیات کا یہ دلکش مجموعہ نہایت خوشخط شائع ہوا ہے شروع میں شاہ دستگیر جالی (اکبرآبادی) کی تقریظ مع ان کے منتخب کلام کے درج کیگئی ہے۔ اس کے بعد خود اختر صاحب نے اردو شاعری پر ایک دلچسپ مقدمہ تحریر کرکے غزلیات کا حصہ شروع کیا ہے۔ کلام میں پختگی کے ساتھ ساتھ جدید فکر وتلاش کی جھلک بھی موجود ہے مگر فارسی ترکیبوں کے استعمال نے بعض بعض جگہ سلاست اور برجستگی میں کمی کردی ہے۔ تاہم بحیثیت مجموعی غزلیات کے تمام اشعار حسن معنی میں ڈوبے ہوئے ہیں ضخامت ۸۰ صفحات

عثمان نامہ

یہ چودہ علمی تاریخی وادبی مضامین نظم ونثر کا مجموعہ ہے جسے سید احمد اللہ قادری صاحب اڈیٹر تاریخ نے سر محمد عثمان گورنر مدراس کی خدمت میں ان کی گورنری احاطہ مدراس کی یادگار کے طور پر پیش کیا تھا۔ اس کے شروع میں صاحب ممدوح کا درباری لباس میں فوٹو بھی دیدیا گیا ہے۔ اس مجموعے کے سب مضامین ایک سے ایک بڑھ چڑھکر ہیں، خصوصاً "فلسفۂ ملل ہنود" اور "عثمان" نامی مضامین بڑی تحقیق ومحنت سے لکھے گئے ہیں۔ اس میں سر محمد عثمان کے سوانح حیات بھی دیدئے گئے ہیں۔ اس کے بعد ہز اکسلنسی مہاراجہ سر کشن پرشاد کی فارسی نظم، نواب لطافت جنگ بہادر کی اردو غزل، مولوی مسعود علی صاحب محوی کی فارسی نظم اور تاریخیں وغیرہ ہیں، غرض یہ مجموعہ ایک قابل قدر اور دلچسپ ادبی مرقع ہے۔

سرگذشت اسیر

یہ کتاب فرانس کے مایۂ ناز شاعر وادیب وکٹر ہیوگو کی کتاب مجرم کے آخری ایام Last Days of the Condemned

کا اُردو ترجمہ ہے جسے سعادت حسن صاحب منٹو امرتسری نے کیا ہے۔ اس کتاب کا پلاٹ دردانگیز اور مقصد اصلاحی ہے۔ مصنف سزائے موت کے خلاف اور اس کی تنسیخ کا حامی ہے۔ ترجمہ بھی اچھا ہے گو کہیں کہیں عبارت میں اُلجھن پیدا ہو گئی ہے اور کہیں کہیں املا کی غلطیاں بھی رہ گئی ہیں۔ مثلاً قطرآتش۔ ضخامت ۱۵۱ صفحات، قیمت ایک روپیہ، ملنے کا پتہ، اُردو بک اسٹال بیرون لوہاری دروازہ لاہور

جوانی کا تحفظ اور بڑھاپے کی روک تھام

یہ کتاب لفٹنٹ کرنل ڈاکٹر محمد اشرف الحق صاحب قلعہ گولکنڈہ کی ایک محققانہ و فاضلانہ تصنیف ہے، اس میں ڈیڑھ جزو کی ایک تمہید اور اٹھاون ابواب ہیں، جن میں جدید تحقیقات سے پورا فائدہ اُٹھایا گیا ہے۔ اور تندرستی قائم رکھنے اور نیز بڑھاپے کی قبل از وقت آمد روکنے کے سہل العمل طریقے آسان اور سلیس زبان میں بتائے گئے ہیں، جو لوگ تندرست اور خوش وقت رہنا چاہیں اُنہیں اس کتاب کا ضرور مطالعہ کرنا چاہیئے۔ اس کے پڑھنے کے بعد اس قسم کی دوسری کتابوں کے پڑھنے کی ضرورت باقی نہ رہیگی دراصل یہ کتاب لکھکر ڈاکٹر صاحب نے اُردو زبان پر بڑا احسان کیا ہے۔ اس کے شروع میں نواب حسن یار جنگ بہادر کی تصویر دی گئی ہے جو جنوری ۱۹۳۳ء سے تعلق رکھتی ہے، مگر اس کے چھ ماہ کے بعد کی ایک دوسری تصویر سے معلوم ہوتا ہے کہ چند ہی ماہ میں اس کتاب کی ہدایات اور نسخوں پر عمل کر کے وہ کیسے تندرست و توانا ہو گئے ہیں۔ اس کے آخر میں ایک جزو پر مصطلحات ڈاکٹری کا ترجمہ بھی درج کر دیا گیا ہے

سُبل السلام

اِس چھوٹی سی کتاب میں جامعہ ملیہ دہلی کے معلم دینیات مولوی عبدالحیٔ صاحب نے موجودہ زمانہ کی سیاسی اور تمدنی حالت کا لحاظ رکھتے ہوئے قرآن شریف کے اٹھائیسویں پارے قد سمع اللہ کی نو سورتوں کی عالمانہ تفسیر کی ہے۔ اس کا مطالعہ انگریزی داں مسلمانوں کے لئے بہت مفید ہوگا۔ یہ رسالہ ۹۶ صفحات پر عمدہ کاغذ و کتابت کے ساتھ طبع ہوا ہے۔ قیمت بارہ آنہ ۱۲؍ ملنے کا پتہ۔ مکتبۂ جامعۂ ملیۂ دہلی۔

پھول "سالگرہ نمبر"

پھول بچوں کا مشہور اور ہردلعزیز اخبار ہے جو دارالاشاعت پنجاب لاہور سے آب و تاب کے ساتھ مولوی سید ممتاز علی صاحب کی ادارت میں ہفتہ وار نکلتا ہے۔ یہ اس رسالہ کا سالگرہ نمبر ہے زیر تبصرہ نمبر میں تیتلی سے زیادہ قابل قدر مضامین نظم و نثر ہیں۔ ان کا اُلٹا نامی رنگین تصویر لاجواب ہے۔ ٹائیٹل سہ رنگا دیدہ زیب۔ قیمت آٹھ آنہ۔ ملنے کا پتہ۔ دارالاشاعت پنجاب لاہور

عالمِ نسواں

پچھلے پرچہ میں ہم نے ہندوستانی عورتوں کی سیاسی اور معاشرتی سرگرمیوں کے متعلق چند واقعات بیان کئے تھے اس پرچہ میں چند دیگر واقعات قابل گذارش ہیں ۔ انجمن خواتین میسور کی ایک کانفرنس بنگلور میں منعقد ہوئی جس میں اطرافِ ملک سے تین سو ڈیلیگیٹ خواتین نے تین دن تک غور و فکر کر کے حکومت سے یہ مطالبہ کیا کہ غیر ممالک سے آئے ہوئے فلموں کے دکھانے کی اُس وقت اجازت دیجائے جب اُن کے اخلاق بگاڑ اثر ڈالنے والے سین ا . . خارج کر دیئے جائیں ۔ اس کانفرنس نے ہر جگہ فلم سنسر بورڈ قائم کئے جانے کی سفارش کی ہے ۔ اور ان بورڈوں میں خواتین ممبروں کی تقرری پر بھی زور دیا ہے ۔

اس کانفرنس نے جس میں یورپین اور ہندوستانی دونوں قوم کی خاتونیں شریک تھیں تین دن کے غور و فکر کے بعد مندرجہ ذیل تجویزیں پاس کیں :۔

(۱) ہر جگہ دو سے سات برس تک کی عمر کے بچوں کے لئے تربیت گاہیں (Nursuries) قائم کئے جائیں ۔

(۲) دیہات میں تعلیم یافتہ عورتوں کی امداد سے حفظانِ صحت ، صفائی ، گھریلو صنعتوں کا شوق پیدا کرایا جائے ۔

(۳) کم عمر بیواؤں کی دوبارہ شادی کے متعلق ضروری قانون پاس کیا جائے ۔

(۴) گداگری کو قابلِ سزا قرار دیا جائے اور محتاجوں کے لئے محتاج خانے قائم کئے جائیں ۔

(۵) بالغوں کی جبری تعلیم کے لئے ایک پنجسالہ اسکیم مرتب کیجائے ۔

پچھلی جنگ آزادی و استقلال میں ترک عورتوں نے جو فوجی خدمت انجام دی تھی اس کے صلہ میں حکومت نے اُن کو مردوں کے برابر حقوق دیدیے ہیں ۔ چنانچہ ترکی میں اس وقت عورتیں حکومت کے ہر شعبے میں مردوں کے دوش بدوش نظر آ رہی ہیں ۔ بیرونی دشمنوں کی مدافعت اور خارجی حملہ آوروں سے ملک کو محفوظ رکھنے کی کوشش میں بھی ترکی عورتیں مردوں سے پیچھے رہنا نہیں چاہتی ہیں ۔ چنانچہ اس وقت دیہات کی ہزاروں ترکنیں اسلحہ سازی کے کارخانوں میں رات دن کام کر رہی ہیں ۔ حکومت نے ایک لاکھ

ترک عورتوں کو جنگی تعلیم دینے کی اسکیم تیار کی ہے، تاکہ ضرورت کے وقت وطن کی حفاظت میں عورتوں سے بھی ویسی ہی مدد ملے جیسے کہ مردوں سے۔

لیجسلیٹو اسمبلی کے تازہ انتخاب میں (جو نومبر ۱۹۳۴ء میں ہوئے ہیں) سب سے بڑی خصوصیت یہ رہی ہے کہ ہر جگہ عورتوں نے اپنے حقوق رائے دہندی سے فائدہ اٹھانے میں غیر معمولی مستعدی دکھائی چنانچہ مدراس میں مسٹر ستیہ مورتی کے انتخاب میں تین ہزار عورتوں نے ووٹ دیے۔ مولانا شوکت علی صاحب کے انتخاب میں بھی بہت سی عورتوں نے ووٹ دیے۔

حال میں اندور کے زنانہ اسکولوں کا ایک انٹر اسکول مباحثہ مقرر ہوا، جس کا موضوع یہ تھا کہ "سونا اچھا ہے یا لوہا" اس مباحثہ میں لڑکیوں نے اچھی اچھی تقریریں کیں۔ ججوں نے مس بیبی طامسن کو بہترین اور مس سروپ رانی کول کو درجہ دوم کی مقررہ قرار دیا۔

پچھلے ماہ صوبہ برار کی انجمن خواتین کی چوتھی سالانہ کانفرنس نے جو یوت محل میں مسز کملا دیوی متھا یکیبے کے زیر صدارت منعقد ہوئی، گورنمنٹ سے ساردا ایکٹ کو سختی کے ساتھ نافذ کرنے کی درخواست کی ہے اس کانفرنس نے ہر خواندہ عورت کے لئے حق رائے دہی، عورتوں کی تقرری بحیثیت جوری، اور عورتوں کے توسیع حقوق کا بھی پُرزور مطالبہ کیا ہے۔ شہری عورتوں سے دیہاتی حلقوں میں دورہ کرکے وہاں کی عورتوں کے خیالات بلند اور اُن کی حالت درست کرنے کی اپیل کی گئی۔

اب تک جنوبی افریقہ میں دو نسوانی انجمنیں تھیں، ایک انڈین وومنس ایسوسی ایشن (ہندوستانی) دوسری نیشنل کونسل آف وومن (یوروپین)۔ اب کنورانی مہاراج سنگھ صاحبہ کی کوشش سے یہ دونوں انجمنیں متحد ہو گئی ہیں کنورانی صاحبہ نے اس سلسلے میں جو خدمت انجام دی ہے۔ وہ بہت قابل قدر ہے

ٹرکی میں عورتوں کو ووٹ کا پورا حق حاصل ہے، چنانچہ بائیس برس سے اوپر عمر کی ہر عورت کو سیاسی انتخاب میں حصہ لینے کا اختیار دیدیا گیا ہے تیس سال سے زیادہ عمر کی عورتیں نیشنل اسمبلی کی ممبر بھی منتخب ہو سکتی ہیں

مس جیٹھی کرپلانی کراچی کارپوریشن کی ممبر منتخب ہو گئی ہیں، آپ کے مقابلے میں کئی امیدوار تھے لیکن کسی کو آپ کے برابر ووٹ نہیں ملے۔ آپ پہلی خاتون ہیں جو کارپوریشن کی ممبر منتخب ہوئی ہیں۔

بی۔ ایس۔ گرلس انٹر کالج مراد آباد کی مسز لکھن پال کو "استریوں کی سکشا" لکھنے کے صلے میں ایک خاص انعام دیا گیا ہے جو سکسینہ پرائز کے نام سے موسوم ہے

ڈیرہ دون کی مشہور سوشل ورکر خاتون مسز رام کشور صاحبہ وہاں کی استری آریا سماج کی پریسیڈنٹ منتخب ہوئی ہیں۔

رانی پھول کماری صاحبہ شیر کوٹ نے خواتین کانفرنس صوبہ متحدہ کے آٹھویں اجلاس منعقدہ لکھنؤ کی صدارت فرمائی۔

صوبہ کورگ کی کماری پدماوتی نے ہندی پربھاکر کا امتحان اول درجے میں پاس کیا ہے۔ اب آپ حفظان صحت اور دیہات کی تعمیر کا فن سیکھنے انگلستان تشریف لے گئی ہیں۔

مس چندر کانتا دوشی کاٹھیاواڑ کی پہلی خاتون ہیں جنھوں نے حال میں بمبئی یونیورسٹی سے ایم۔ اے کی ڈگری حاصل کی ہے۔

ہز ایکسیلنسی گورنر صوبہ متحدہ نے با اجلاس کونسل اٹہ کی مسز رادھا پیاری ماتھر صاحبہ کو مجسٹریٹ درجہ دوم کے اختیارات عطا کئے ہیں۔ آپ اٹہ میونسپلٹی اور تحصیل اٹہ کے تمام تھانوں کے معمولی مقدمات فوجداری کی سماعت کریں گی۔

جنگ و جدال

یہ ایک ترکی ڈرامہ کا ترجمہ ہے جسے سید سجاد حیدر صاحب نے اردو کا جامہ پہنایا ہے۔ اس ڈرامہ سے ترکوں کی سیرت اور زندگی پر بہت کافی روشنی پڑتی ہے۔ اردو میں ترجمے کی زبان کچھ کرخت ہو جاتی ہے۔ لیکن ڈرامہ بہت دلچسپ اور جنگ آموز ممالک کے حالات سے دلچسپی لینے والوں کے لیے قابل دید ہے۔ لکھائی چھپائی کاغذ عمدہ۔ چھوٹی تقطیع ضخامت ۹۰ صفحات قیمت چودہ آنہ ملنے کا پتہ: مسلم یونیورسٹی بک ڈپو۔ علی گڈھ۔

حسنِ بیمار

(حضرت جوش ملیح آبادی)

کیا غضب ہے حسن کے بیمار ہونے کی ادا
جیسے کچی نیند سے بیدار ہونے کی ادا

انکسارِ حسن، پلکوں کے جھپکنے میں نہاں
نیم وا بیمار آنکھوں سے مروّت سی عیاں

جنبشِ مژگاں میں غلطاں سازِ غم کا زیر و بم
خامشی میں پرفشاں ایفائے پیماں کی قسم

احترامِ عشق کی رَو دل نشیں آواز میں
ایک پھیکے پن کا سناٹا دیارِ ناز میں

الاماں، آنکھوں کی نیم افسردہ سی افسونگری
ایک بجھتا سا تبسم اِک تھکی سی دلبری

ہلکی ہلکی جھلکیاں رخسار پر یوں نور کی
جیسے بن میں صبحِ کاذب کی سہانی چاندنی

لے رہا ہے کروٹیں عارض میں یوں رنگِ شباب
جیسے طوفانی سمندر میں ضیائے ماہتاب

حسن یوں کھویا ہوا سا بزمِ محسوسات میں
جیسے دونوں وقت ملتے ہوں بھری برسات میں

یوں ہے اِک مبہم نمی سی چشمِ سحر انداز میں
صبح کو شبنم ہو جیسے معرضِ پرواز میں

سرخیٔ عارض میں اِک ہلکی سفیدی کی جھلک
آسماں پر صبح جیسے خیطِ ابیض کی جھلک

جیسے کہرے میں کوئی تابندہ منظر دور کا
جیسے بھیگی رات کے سینے پہ ڈورا نور کا

رباعیات

ساقی کوئی اس سے زیادہ ہوگی نہ بدی
خود دیکھ کہ حالت ہے مری اتنی ردی
اِک آن کو ہاتھ تو نے روکا مے سے
اور غم کی یہاں گذر گئی ایک صدی

یارب جس شے کا دل ہے عاشق دیدے
پھر نعمتِ یارانِ موافق دے دے
بے پیر تو دوست، بزمِ جاں ہے تاریک
اِس شب کو دوبارہ صبحِ صادق دیدے

غصہ ظالم اتار دے گا دل پر
نقشِ حسرت ابھار دے گا دل پر
اس ڈر سے دکھاتا ہی آنکھیں سوئے ماہ
دیکھونگا تو ڈنک مار دے گا دل پر

مُفلسی

(از حضرت جوشؔ ملیح آبادی)

مفلس ہوئے تو دہر میں عزت نہیں رہی — آنکھوں میں دوستوں کی مروت نہیں رہی
محبوب کی نظر میں بھی اُلفت نہیں رہی — حد یہ ہے ماں کی آنکھ میں شفقت نہیں رہی
دریائے بے کنارِ جوانی اُتر گیا
موتی کی قدر کیا ہو جو پانی اُتر گیا

وہ زمزمے، وہ لَے، وہ ترنم نہیں رہا — وہ چہچہے، وہ لطفِ تکلم نہیں رہا
وہ بحرِ دلبری میں تلاطم نہیں رہا — ہونٹوں پہ دوستوں کے تبسم نہیں رہا
دل سے تھے جو فدا وہی دل توڑنے لگے
جو ہاتھ چومتے تھے وہ منہ موڑنے لگے

مفلس کو سچ ہے دھیان میں لاتا نہیں کوئی — بے زر کو اپنے پاس بٹھاتا نہیں کوئی
بے آب آئینے کو اٹھاتا نہیں کوئی — روتے ہوؤں سے آنکھ ملاتا نہیں کوئی
چہرے سے آب اڑی تو کوئی جانتا نہیں
دشمن تو کیا ہیں دوست بھی پہچانتا نہیں

بگڑی جو بات خلق کے تیور بگڑ گئے — ملتے تھے جھک کے جو وہ یکایک اکڑ گئے
میداں سے پاؤں اہلِ وفا کے اُکھڑ گئے — دم میں شبانہ روز کے ساتھی بچھڑ گئے
دوشِ صبا پہ رات کے افسانے اُڑ گئے
گل ہو گئی جو شمع تو پروانے اُڑ گئے

اِک جان اور لاکھ بلاؤں سے ردّ و کد — دشمن کو بھی خدا نہ دکھائے یہ روزِ بد
آخر مصیبتوں کی بھی ہوتی ہے کوئی حد — اے زندگی سلام ہو اے موت المدد
مل جائے جان کھو کے جو گوشہ قرار کا
یہ کہہ کے سوؤں شکر ہے پروردگار کا

کنول

(از جناب محمود اسرائیلی)

پانی کی پری نے سر نکالا — جھونکوں سے ہوا کے ہل رہی ہے
دامانِ قبا کو پھاڑ ڈالا — اور پھر بھی خوشی سے کھل رہی ہے

دریا میں کسی کا دستِ گلگوں — آغوشِ ہوا میں کھیلتا ہے
یا ماہِ فلک کا عکسِ موزوں — موجوں کی فضا میں کھیلتا ہے

یہ سرخ کنول کھلا ہوا ہے — یا پانی میں آگ جل رہی ہے
اک ٹکڑا شفق کا گر گیا ہے — سورج کی کرن نکل رہی ہے

سیمیں کشتی ہے اک سبک رو — اور اس میں طلا ملا ہوا ہے
لے جس سے تجلیاں مہِ نو — پانی میں وہ گل کھلا ہوا ہے

جذباتِ شایق

(از مسٹر کیلاش ورما شایق ہنگامی)

اللہ رے عکسِ حسن عدیم المثال کا — عالم بنا ہوا ہے مرقع جمال کا
تھا بدر کل جو آج ہے نقشہ ہلال کا — انجام دہر میں ہے یہی ہر کمال کا
طولِ شبِ فراق کا پھر شکوہ کس لئے؟ — جب دیکھتا ہوں ہجر میں جلوہ وصال کا
دیدار اُس کا اور ان آنکھوں کو ہو نصیب — جس کے حریم تک نہ گذر ہو خیال کا
فرزانہ تو اگر ہے تو مستقبل اپنا سوچ — افسانہ سب فضول ہے ماضی و حال کا
کام آسکے گا صرف وہی ملک و قوم کے — جس کو ذرا خیال نہ ہو جان و مال کا
میرے لئے وہ چشمۂ آبِ حیات ہے — قطرہ جو بن گیا عرقِ انفعال کا
کیوں زندگی میں شکوۂ رنج و ملال ہے — جب زندگی ہی نام ہو رنج و ملال کا
بدبختیوں کا اپنی گلہ کس سے کیجئے — پرساں نہیں ہے کوئی بھی شایق کے حال کا

ایک درخت کی کہانی اپنی زبانی

(ایک محبِ وطن کے قلم سے)

خاک کا کچھ دن پڑا رخ پر رہا میرے نقاب — میں رہا نظروں سے پنہاں مثلِ مہ زیرِ سحاب
پڑ گئی جب نامیہ کی مجھ پہ نظرِ انتخاب — آ گیا میری طبیعت میں عجب اک انقلاب
اک منٹ میں توڑ ڈالا میں نے وہ باطل حجاب
اور شریکِ بزمِ امکاں ہو گیا با اضطراب

کوئی بیخود ہو گیا میری نزاکت دیکھ کر — غرقِ بحرِ فکر تھا کوئی لطافت دیکھ کر
دل کسی کا شاد تھا میری ملاحت دیکھ کر — کوئی ششدر رہ گیا میری صباحت دیکھ کر
اہلِ دل کہتے تھے میں ہوں قدرتِ حق کا ظہور
دہریے کہتے تھے یہ سب ہے مادّہ کا فتور

تربیت سے میں عناصر کی تناور ہو گیا — راہ رو پر ابر آسا سایہ گستر ہو گیا
میری ہستی بن گئی ابرِ کرم بحرِ سخا
فیض نے مجھکو بنایا مرجعِ خلقِ خدا

رفتہ رفتہ ہو گئی رخصت مری ساری بہار — نامیہ نے پھیر لیں آنکھیں ہوا بے برگ و بار
فیض پا سکتا نہیں مجھ سے کوئی اب زینہار — اس لئے اسبابِ زحمت میں ہوا میرا شمار
جن کو اُلفت مجھ سے تھی اب اُنکو نفرت ہو گئی
کیا ستم ہے گل کو بلبل سے عداوت ہو گئی

میری صورت سے تھی نفرت میرا جینا ناگوار — میں کھٹکتا ہر گھڑی آنکھوں میں تھا مانندِ خار
آ گیا وہ وقت بھی بیجد تھا جس کا انتظار — لوحِ ہستی سے مٹا حرفِ غلط انجام کار
فعلِ فطرت نے سُکھا کر مجھ کو ایندھن کر دیا
حضرتِ انساں نے کاٹا، نذرِ گلخن کر دیا

جن کو قدرت نے عطا کی ہے بصیرت دیکھ لیں کھول کر اہلِ جہاں چشمِ حقیقت دیکھ لیں
کس قدر رکھتا زمانہ ہے مروت دیکھ لیں کیسی ہے واقع ہوئی اسکی طبیعت دیکھ لیں
ہیچ ہے دنیا کوئی اپنا ہے نے بیگانہ ہے
فطرتِ عالم کا آئینہ مرا افسانہ ہے

حضرت ریاضؔ مرحوم

(از فصاحت جنگ حضرت جلیلؔ)

ہند میں اک ریاضؔ باقی تھے بادۂ صاف کے جو ساقی تھے
وہ ریاضِ سخنور کامل شاعرِ فرد جوہر قابل
عندلیبِ ریاضِ گویائی مستِ صہبائے جامِ مینائی
یوسفِ کاروانِ شعر و سخن کوکبِ آسمانِ شعر و سخن
آہ دنیا سے ہو گئے راہی غرقِ حسرت ہے مہ سے تا ماہی
سحرِ افسوں تھا ہر کلام اُن کا شہرۂ روزگار نام اُن کا
شعرِ مستانہ اُن کا حصّہ تھا مے و مے خانہ اُن کا حصّہ تھا
ہر غزل ایک میکدہ پُر جوش جس کا ایما یہ تھا بیا و بنوش
شوخیِ طبع ان کی فطرت میں مستیِ عشق اُن کی طینت میں
اُن کے احباب اُن کے پروانے ایسے پروانے جیسے دیوانے
نثر بھی مثلِ نظم دلکش تھی خلق شیدا تھی، لوٹ تھی، غش تھی
ایک اخبار تین افسانے بادۂ نثر کے تھے پیمانے
چھپ کے نکلا نہیں ابھی دیواں گنجِ مخفی کی شکل ہے نہاں
سرو بزمِ مے سخن ہے جلیلؔ ہائے صہبا ہے ان کا ذکرِ جمیل
کہہ گیا یہ چھلک کے جامِ ریاضؔ
چمنِ خلد ہے مقامِ ریاضؔ

۱۹۳۲ء

چودھری جگت موہن لال رواںؔ مرحوم

(از جناب اقبال ورما سحرؔ ہتگامی)

اے رواںؔ! افسوس آج تو مرحوم ہے — صفحۂ آفاق تیرے نقش سے محروم ہے
یا خدا یہ کیسی اپنی شومیِ مقسوم ہے — کل جو تھا موجود ہم میں آج وہ معدوم ہے
تیرے ہی ہاتھوں بنے جب زندگی اے کردگار!
تو وہی پھر کیوں ہو آخر اس قدر ناپائدار!

اس قدر ناپائدار اور اس قدر بے اعتبار — زندگی کا جیسے ہستی میں نہ ہو کوئی شمار
جیسے ہو خود نیستی کی اک نمودِ بے قرار — یا عدم کی جیسے کوئی چلتی پھرتی یادگار
جیوں کسی شے کا ہو پانا اور کھونا ایک سا
ہو کسی حالت کا جیوں ہونا نہ ہونا ایک سا

چشمِ ظاہر میں سے گو دکھلائی دیتا ہے یہ حال — پھر بھی بالاتر نہیں ہے وہم سے ایسا خیال
ساتھ بننے کے ہمیشہ ہے بگڑنے کا سوال — انقلابِ دہر میں یوں واقعی ہے اعتدال
گرچہ مرنا اور جینا ہیں یہاں دونوں بہم
رنگِ شادی پر مگر ہوتا ہے غالب رنگِ غم

ایسے ہی جذبات سے ہم اے رواںؔ! مجبور ہیں — ہاں طلسمِ رنگ و بو سے سر بسر مسحور ہیں
کیوں نہ پھر روئیں کہ ہم بے بس ہیں بے مقدور ہیں — اس پہ گریاں ہیں کہ ہم وا ماندہ ہیں مہجور ہیں
تیری خوش ذوقی، خوش آہنگی جو تھی جانِ مراد
کتنی یاس افزا ہے اپنے واسطے اب اُن کی یاد!

اُن کی یاد اور یاد تیرے اُس عظیم احسان کی — تو نے نظم و نثرِ اردو پر کیا جو واقعی
تازگی کی رو تری تخئیل و فطرت میں جو تھی — تو نے دی علم و ادب کو اِک نئی سی زندگی
زندگی وہ جس میں تیری زندگی مستور ہے
موت یوں اے مرنے والے تجھ سے کوسوں دور ہے

صرف ظاہر تک نہ تھیں تیری خیال آرائیاں دیکھتا تھا تو اُسے بھی جو عموماً ہے نہاں
ہے جہاں نظموں میں قدرت کے مناظر کا بیاں پیش کرتی ہیں غزلیں ایک بہتر سا سماں

گو تغزل کے بھی اُنیں کچھ نہ کچھ انداز ہیں
بیشتر اُن سے نمایاں ہند ہی کے راز ہیں

دلکشی کا اِک نمونہ تیری ہر تحریر ہے جو مرقع ہے، سراپا عالم تصویر ہے
ہر رُباعی دل کے احساسات کی تفسیر ہے شاعرانہ خواب کی بگڑی بنی تعبیر ہے

گتھیاں ارض و سما کی کھولتا جاتا ہے تو
کچھ کو سلجھاتا ہے تو اور کچھ کو اُلجھاتا ہے تو

گو ابھی تجھ سے بہت کچھ تھی اُمید رنگ و بُو رہ گئی اس وقت دل میں لیکن اِک خاص آرزو
لکھ رہا تھا مثنوی میں بدھ جی کا حال تو بل رہی تھی تیرے ہاتھوں دمبدم جس کو نمو

سحر وہ اِک کام پُورا ہوتے ہوتے رہ گیا
نظم کا انجام پُورا ہوتے ہوتے رہ گیا

رُباعیاتِ فرحت

(از مسٹر گنگا دھر ناتھ فرحت کانپوری بی اے ایل ایل بی)

مندر میں بتوں کی سب فضیلت دیکھی مسجد میں خدا کی بھی حقیقت دیکھی
کتنے گمراہ ہیں برہمن اور شیخ میں نے دونوں ہی کی جہالت دیکھی

آسان جو عقدۂ تنفر کر دے جلوے فردوس کے جہاں میں بھر دے
تفریق رہے نہ کوئی ہم جنسوں میں مذہب ہو وہی جو سب کو یکساں کر دے ۳

نادیدہ خدا، خدا پرستی کیسی بے پیئے جام کے یہ مستی کیسی
مذہب سے ہوئی نہ جستجو کی سیری فرحت سوئی ہے یہ بھی بستی کیسی

علمی خبریں اور نوٹ

۱۲ دسمبر کو پٹنہ کے مشہور ادیب نواب نصیر حسین خاں صاحب خیال کی اچانک موت اردو ادب کے لئے ایک ناقابلِ تلافی حادثہ ہے۔ آپ نواب صاحب چھتاری سے ملاقات کرنے علیگڈھ تشریف لے گئے تھے کہ واپسی کے وقت اچانک قلب کی حرکت بند ہو گئی اور آپ رہگرائے عالم جاودانی ہوگئے۔ آپ ایک صاحب طرز ادیب اور مصنف تھے۔ آل انڈیا اُردو کانفرنس لکھنؤ میں آپ کی صدارتی تقریر عرصے تک یاد رہیگی۔ آپ نے اس کو چند سال کی محنت سے وسعت دیکر ایک مبسوط کتاب "داستان اُردو" کے نام سے مرتب فرمائی ہے، جس کا ایک اہم باب حال میں "مغل اور اُردو" کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ ابھی چند روز ہوئے آپ نے کلکتہ میں فردوسی کی برسی کے موقعہ پر بھی ایک گرانبہا مضمون پڑھا تھا۔ آپ کا سن تقریباً ساٹھ برس کا تھا مگر ذوقِ ادب ہنوز جوان تھا۔ ہندوستان کے علاوہ آپ نے دیگر ممالک کی بھی سیر و سیاحت کی تھی۔ آپ شگفتہ مزاج پابندِ وضع بزرگ اور صاحبِ طرز انشا پرداز تھے، جو شخص ایک مرتبہ بھی آپ سے مل لیتا تھا وہ ہمیشہ کے لئے آپ کا گرویدہ ہو جاتا تھا۔ افسوس قضا نے آپ کو ہم سے ہمیشہ کے لئے جدا کر دیا۔

فردوسی کی ہزار سالہ جوبلی میں جو مشہد میں منعقد ہوئی تھی ڈاکٹر طلا تھر اپہم پوپ نے حضرت امام رضا کے روضہ کے متصل ایک نادر و نایاب کتب خانہ دیکھا ہے جسے ڈاکٹر موصوف علمی دنیا میں بےمثال قرار دیتے ہیں۔ اس کتبخانہ میں دیگر علوم و فنون کی کتابوں کے علاوہ صرف قرآن شریف کے نو ہزار مختلف نسخے ہیں، جن میں سے بعض بعض نسخوں کا ایک ایک صفحہ سالہاسال کی محنت و دیدہ ریزی کے بعد مطلّا و منقش کیا گیا ہے۔ ایک نسخے کی لوح سات سال کی محنت میں مکمل ہوئی ہے۔

شکاگو یونیورسٹی امریکہ کے علما اور ماہرینِ آثار قدیمہ نے عراق کے قدیم شہر خورس آباد سے بعض ایسی چیزیں برآمد کی ہیں جو تاریخی لحاظ سے بہت اہم ہیں۔ ان میں ایک لوح پر سنہ ۲۳۰۰ ق م سے لیکر سنہ ۵۰۰ ق م تک تمام آشوری بادشاہوں کے نام ترتیب وار درج ہیں۔

زمانہ" بابتہ نومبر میں ہم یہ اطلاع دے چکے ہیں کہ دار المصنفین اعظم گڈھ کے مولوی سید ابو ظفر ندوی ہندوستان کے عہد اسلامی کی ایک مفصل و مکمل تاریخ لکھنے والے ہیں۔ اس کتاب کی حسب ذیل پندرہ جلدیں ہونگی (۱) آغاز اسلام سے غزنویوں کی پیدائیش تک (۲) غزنویوں کا عہد (۳) غوریوں سے لیکر حکومت غلامان کے خاتمہ تک (۴) خلجی و تغلق (۵) تیمور تا خاندان لودھی (۶) بابر سے خاندان سوری تک (۷) ہمایوں بار دوم سے جہانگیر تک (۸) شاہجہاں سے عالمگیر تک (۹) بہادر شاہ اول سے بہادر شاہ ثانی تک (۱۰) بہمنیہ و عادلشاہیہ وغیرہ سلاطین دکن (۱۱) گجرات، مالوہ و خاندیس (۱۲) کشمیر، ملتان، و سندھ (۱۳) جونپور، بنگال و دیگر مقامات (۱۴) اسلامی ہند کا آخری دور، نظامت حیدرآباد، مرشدآباد، عظیم آباد، اودھ، روہیلکھنڈ، میسور، ارکاٹ۔ (۱۵) ہندوستان میں اسلامی تمدن کی تاریخ۔ اس کی تکمیل کے لئے سترہ ہزار روپیہ کی ضرورت ہے جس کی فراہمی کے لئے دار المصنفین نے اہل ملک سے اپیل کی ہے، مصنف صاحب تاریخ کے متعلق نایاب قلمی نسخوں، شاہی فرمانوں اور قدیم یادداشتوں کی تلاش میں بھی ہیں۔ جن صاحبوں کے پاس اس قسم کا کوئی سرمایہ ہو وہ براہ مہربانی اس کی اطلاع صاحب موصوف کو دیدیں۔

سید ابو محمد صاحب کاوش ہسوی فارسی زبان کے ہندو شاعروں کا ایک تذکرہ لکھ رہے ہیں، جس میں سکندر لودھی کے زمانہ کے ہندو شعرا بھی شامل کر لئے گئے ہیں۔ یہ تذکرہ پنڈت جواہر لال نہرو کے نام سے معنون کیا گیا ہے، اور راجہ نریندر ناتھ صاحب نے مصنف کو ہر ممکن امداد دینے کا وعدہ کیا ہے

اردو زبان میں خود نوشت سوانحعمریوں کا پتہ نہیں ہے، مگر حال میں کارنامۂ سروری کے نام سے حیدرآباد دکن کے مشہور مدبر نواب سرور الملک کی خود نوشت سوانحعمری شائع ہوئی ہے، اس کا انگریزی ترجمہ نواب صاحب کی حیات ہی میں شائع ہو گیا تھا، مگر اب دی دکن بک اینڈ اسٹیشنری مارٹ عابد بلڈنگس حیدرآباد دکن نے اصل کتاب کو مع تصاویر شائع کیا ہے اسکی ضخامت ۴۰۰ صفحات اور قیمت آٹھ روپیہ ہے

مولانا عبد الماجد بی۔ اے دریابادی کے فلسفیانہ مضامین جو ملک کے رسالوں میں وقتاً فوقتاً شائع ہو چکے ہیں فلسفہ کی کتاب کے نام سے کتابی صورت میں شائع ہو گئے ہیں۔ پہلی کتاب دو سال ہوئے شائع ہوئی تھی، اسکا دوسرا حصہ حال ہی میں شائع ہوا ہے اور آٹھ آنہ قیمت پر دار المصنفین اعظم گڈھ سے ملسکتا ہے

مسٹر اے ۔ ایچ ۔ میکنزی، ایم ۔ اے،

(سی ۔ ایس ۔ آئی، سی آئی ۔ ای، آئی ۔ ای ۔ ایس)

مسٹر میکنزی ڈائرکٹر سر رشتۂ تعلیم صوبۂ متحدہ چھبیس برس تک اہل صوبہ کی تعلیمی خدمات انجام دینے کے بعد اکتوبر گذشتہ میں جامعہ عثمانیہ کے پرو وائس چانسلر مقرر ہو کر حیدر آباد دکن تشریف لے گئے ہیں۔ آپ اس صوبے میں ٹریننگ کالج الہ آباد کے پرنسپل مقرر ہو کر آئے تھے اور چند ہی سال کے اندر آپ نے اس کالج میں ایک نئی روح پھونک دی جس سے وہ صوبہ بھر میں اپنی قسم کا بہترین کالج بنگیا ہے۔ چنانچہ اسی نمونہ پر دوسرے کالج بھی قائم کئے گئے۔ اور اس وقت اس کالج کے ہزارہا گریجویٹ شمالی ہند کے اسکولوں میں توسیع تعلیم کی خدمت پر مامور ہیں اور سر رشتہ تعلیم کے بعض بڑے بڑے عہدہ داران بھی اسی کالج کے تعلیم یافتہ ہیں۔ پرنسپل کالج کی حیثیت سے مسٹر میکنزی کی سب سے بڑی کامیابی یہ ہے کہ آپ نے اپنے شاگردوں میں فرض شناسی کی اعلیٰ اسپرٹ پھونک دی ہے جس کی بدولت ہمارے صوبے کے مدرسین کی وقعت میں روز افزوں اضافہ ہو رہا ہے۔

۱۹۱۱ء میں گورنمنٹ نے ابتدائی تعلیم کی توسیع و ترقی کے لئے مسٹر میکنزی کو ورنیکولر ایجوکیشن کا چیف انسپکٹر مقرر کر کے میونسپل اور ڈسٹرکٹ بورڈوں کے اسکولوں کی تنظیم کا کام ان کے سپرد کر دیا آپ نے اس اہم خدمت کو بھی اس قدر خوش اسلوبی اور جانفشانی سے انجام دیا کہ صوبہ بھر میں ابتدائی تعلیم میں غیر معمولی ترقی ہو گئی۔ اس شاندار خدمت کے اعتراف و قدر دانی کے طور پر ۱۹۲۱ء میں آپ صوبہ بھر کے ڈائرکٹر سر رشتۂ تعلیم مقرر کئے گئے۔ اس جلیل القدر عہدہ کے لئے علم و فضل کے علاوہ جس قابلیت و تجربہ کاری کی ضرورت ہوتی ہے وہ سب آپ میں بدرجۂ اتم موجود تھی۔ یہی وجہ ہے کہ سر رشتہ تعلیم کا انتظام ہاتھ میں لیتے ہی آپ نے سکنڈری ایجوکیشن (ثانوی تعلیم) کے نظام کو بالکل نئے سانچے میں ڈھال دیا۔ اس وقت صوبہ کے وزیر تعلیم مسٹر چنتامنی تھے، چنانچہ مسٹر میکنزی اور مسٹر چنتامنی دونوں کی کوشش سے بورڈ آف ہائی اسکول اینڈ انٹرمیڈیٹ ایجوکیشن قائم ہوا۔ یونیورسٹی تعلیم کے نظم و نسق میں بھی از سر نو ترمیم ہوئی اور ابتدائی تعلیم کی مزید توسیع کی گئی۔ اس سلسلے میں مسٹر میکنزی نے

ہر ضلع میں تعلیمی کمیٹیاں قائم کرا کے تمام ڈسٹرکٹ اور میونسپل بورڈوں کے رقبہ میں پرائمری تعلیم جبریہ کرادی۔ آپ نے ٹیچروں کی امداد و ترقی کا بھی بہت کافی لحاظ رکھا، چنانچہ آپ کی سرپرستی اور رہنمائی میں اسکول ماسٹروں کے حقوق کی حفاظت و نگہداشت کے لئے انجمنیں قائم ہوئیں اور گورنمنٹ نے انھیں باضابطہ تسلیم کیا۔ تعلیم کو ملک کے حسب حال بنانے کے لئے آپ کی یہ کوشش رہی کہ اسکولوں کی تعلیم عملی رنگ لئے ہوئے ہو۔ چنانچہ آپ مروجہ نظام تعلیم میں بڑی اہم تبدیلیاں تجویز کر گئے ہیں جو اس وقت لوکل گورنمنٹ کے زیر غور ہیں۔

آپ پہلے ڈائرکٹر ہیں جن کو ڈپٹی سکریٹری وزارت تعلیم کے فرائض بھی انجام دینا پڑے۔ آپ نے اس ذمہ داری کو بھی نہایت قابلیت و کامیابی سے پورا کیا۔ انھیں اعلیٰ کارگزاریوں کے اعتراف میں گورنمنٹ نے ۱۹۲۰ء میں آپ کو سی۔ آئی۔ ای اور ۱۹۳۲ء میں سی۔ ایس۔ آئی کے قابل قدر خطابات عطا فرمائے۔

اعلیٰ درجہ کی انتظامی قابلیت رکھنے کے علاوہ مسٹر میکنزی ایک فصیح و خوش بیان مقرر بھی ہیں صوبہ کی قانونی کونسل میں آپ نے بعض موقعوں پر بڑے معرکہ کی تقریریں کی ہیں۔ اکثر اہم موقعوں پر آپ کو اپنے حسن اخلاق و خوش مزاجی سے بڑی بڑی فتوحات حاصل ہوئی ہیں۔ آپ کی فطری زندہ دلی طبعی خوش خلقی اور معاملہ فہمی کے آگے آپ کے مخالفین کو بھی آپ کے سامنے سپر اندازی کرنے ہی میں مصلحت نظر آنے لگتی ہے۔

تعلیم نسواں کے بھی آپ بڑے حامی ہیں۔ چنانچہ آپ کے وقت میں صوبۂ متحدہ میں لڑکیوں کے مدارس میں غیر معمولی ترقی ہوئی ہے۔ لطف یہ ہے کہ اس بارے میں آپ کا نقطۂ خیال وہی ہے جو ہر ہندوستانی قوم پرست کا ہوگا۔ یعنی آپ کی ہمیشہ یہی خواہش و کوشش رہی کہ ہندوستانی لڑکیاں مغربی تعلیم سے بہرہ ور ہو کر کسی طرح مشرقی اخلاق سے محروم نہ ہو جائیں۔

غرض اس صوبے پر آپ کے احسانات بیشمار ہیں۔ ہم کو خوشی ہے کہ گو آپ اپنے جلیل القدر عہدہ سے پنشن یاب ہو گئے ہیں مگر ملک آپ کی اعلیٰ خدمات سے محروم نہیں ہوا ہے۔ اور آپ عثمانیہ یونیورسٹی حیدر آباد دکن کے وائس چانسلر مقرر ہوئے ہیں۔ ہم کو قوی امید ہے کہ آپ کی رہنمائی عثمانیہ یونیورسٹی کی ترقی میں بہت ہی مفید ثابت ہوگی۔

عرضِ حال

"زمانہ" کی زندگی کا ایک سال اور ختم ہو گیا اور اس خدمت کو بتیس سال پورے ہو گئے۔ پچھلا سال تمام دنیا کے لئے منحوس ثابت ہوا۔ "زمانہ" کے لئے بھی مالی حیثیت سے ۱۹۴۱ء کا سال خوشگوار نہیں رہا۔ گو مضامین نظم و نثر کے اعتبار سے یہ سال بھی نہایت کامیاب رہا جس کا ثبوت یہ ہے کہ سال بھر تک "زمانہ" کے مضامین ملک کے بڑے بڑے اخبارات میں کبھی حوالے سے اور زیادہ تر بلا حوالہ نقل ہوتے رہے مالی حیثیت سے البتہ ہماری مشکلات میں کوئی کمی نہیں ہوئی۔ اور "زمانہ" کے مصارف اس کی آمدنی سے پورے نہیں ہو سکے۔ اس طرف کئی سال سے یہی کیفیت ہے کہ "زمانہ" کا بجٹ اخبار "آزاد" کی بچت سے جو اسی دفتر سے ہفتہ وار شائع ہوتا ہے بمشکل پورا ہوتا ہے

یہ حالت کسی طرح اطمینان بخش نہیں - - - ذاتی حیثیت سے یہ ایک المناک حقیقت ہے کہ جس خدمت کو بتیس سال تک جاری رکھنے میں اس قدر وقت سرمایہ صرف کیا گیا ہو اس کے آئندہ قیام کی ابھی تک کوئی مستقل صورت پیدا نہیں ہو سکی ہم کو افسوس ہے کہ ابھی تک "زمانہ" کی زندگی ذاتی ایثار و استقلال و خلوص و ہمت ہی پر منحصر ہے۔

ہم نادم ہیں کہ پچھلے تین ماہ سے "زمانہ" کی اشاعت میں آخر تاخیر ہوئی۔ لیکن اس بے قاعدگی کا اصلی سبب بھی رسالہ کی مالی کمزوری ہے جس کی وجہ سے رسالہ کی ترتیب اشاعت کا بار زیادہ تر ایک فرد واحد ہی کی گردن پر ہے۔ جب کبھی کسی کام کی ساری ذمہ داری ایک جز و ضعیف پر ہوگی تو تقاضائے بشریت سے وقتاً فوقتاً اس میں ہرج واقع ہو جانا کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔ پچھلی ششماہی میں بھی ایسی ہی صورتیں پیش آئیں جن کے سبب سے دو نمبر دیر سے شائع ہوئے ناظرین "زمانہ" کو اس تاخیر سے جو تکلیف ہوئی ہوگی اس کا ہم کو بھی افسوس ہے۔ لیکن اس سے زیادہ صدمہ ہم کو اردو کی کس مپرسی کا ہے جس کی بدولت آج بتیس سال کی مسلسل خدمت کے بعد بھی "زمانہ" کی اشاعت کا سارا دارومدار ایک ذاتِ واحد کی کوشش پر ہے اور ابھی تک رسالہ باقاعدہ تنخواہ دار ایڈیٹوریل اسٹاف رکھنے کے قابل نہیں ہو سکا۔ اسی مرتبہ کے ہندی اور بنگلہ رسالوں میں تین چار تنخواہ دار ایڈیٹر مامور رہتے ہیں جن پر چار پانچ سو روپیہ ماہوار سے کم صرف نہیں ہوتا۔ مگر اردو کے کتنے رسالے اس کی نصف رقم بھی اپنے علمی خادموں کو ادا کر سکتے ہیں؟

"زمانہ" و "آزاد" کا اسٹاف مشترکہ ہے اور دونوں پرچوں کا ایڈیٹوریل بوجھ زیادہ تر دو شخصوں کے کندھوں پر ہے۔ ایڈیٹر اور اسسٹنٹ ایڈیٹر دونوں کا پورا وقت انہیں دونوں کے نذر ہو جاتا ہے اس پر بھی بہت سے ضروری کام ادھورے رہ جاتے ہیں۔ اور جب انہیں سے کسی کو کوئی مجبوری یا معذوری لاحق ہوتی ہے تو سخت ہرج واقع ہو جاتا ہے۔ دفتر "زمانہ" میں کم سے کم دو اسسٹنٹوں کی اور ضرورت ہے لیکن "زمانہ" کی مالی حالت ایک اور کارکن کے اضافے کی بھی اجازت نہیں دیتی۔

ایسی صورت میں پرچہ کی آئندہ زندگی کے متعلق ہمارے دل میں تشویش ہونا لازمی ہے۔ ہماری دلی آرزو تو یہی ہے کہ جو علمی خدمت کو ۱۹۰۳ء میں شروع کی گئی تھی اور جس کو اس وقت تک قائم و برقرار رکھنے میں زندگی کا بہترین حصہ ختم ہو چکا ہے وہ آئندہ مستحکم و مستقل طریقے سے جاری رہے۔ اس کی صرف دو تین صورتیں ممکن ہیں۔ اول یہ کہ قدردانانِ "زمانہ" توسیع اشاعت کی کوشش کر کے ایک مرتبہ رسالہ کی بنیاد مضبوط کر دیں یا کوئی علم دوست رئیس یا بلند حوصلہ جماعت یا اولوالعزم پبلشر اس کے آئندہ قائم رکھنے اور چلا دینے کی ذمہ داری اپنے سر لے لے۔ تیسری صورت یہ ہو سکتی ہے کہ محدود سرمایہ سے ایک کمپنی یا ٹرسٹ قائم کر کے "زمانہ" کو اس کے سپرد کر دیا جائے لیکن مشکل یہ ہے کہ کارکنانِ رسالہ ...

نہیں کیا ہے۔ بعض قدردانوں نے وقتاً فوقتاً ہماری امداد کا وعدہ ضرور کیا لیکن ہمکو ابھی تک ان کی امداد سے فائدہ اٹھانے میں پس و پیش ہی رہا اب تک جس طرح بھی ہوسکا ہے ہم نے احباب کو تکلیف دیے بغیر ہی کام چلایا ہے اور مشکلات کے باوجود کہ رسالہ کی اشاعت میں کوئی رخنہ نہیں پڑنے دیا پچھلے دس سال کے اندر ابتدائی نقصانات کے پورا کرنے کے بعض ذرائع بھی پیدا ہوگئے۔ چنانچہ پچھلی زیرباری قریب قریب رفع ہوچکی ہے جنانچہ اب بوجوہ مصارف کو پورا کرنے کی فکر کے علاوہ "زمانہ" کے آئندہ قیام و استقلال کی صورت پیدا کرنیکا خیال دامنگیر ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ زمانہ کے سرپرست ہم کو اس فکر سے جلد آزاد کویں۔ اردو ادب کو اب بھی "زمانہ" جیسے پرچوں کی ضرورت ہے۔ جن اعلیٰ مقاصد کو پیش نظر رکھکر یہ رسالہ جاری کیا گیا تھا اُن کی آج بھی ملک کو ویسی ہی ضرورت ہے جیسی کہ ایک تہائی صدی پہلے تھی۔

اس میں شک نہیں کہ اس وقت اُردو میں ہر قسم کے صدہا رسالے شائع ہورہے ہیں بعض بڑے اہتمام سے بھی نکل رہے ہیں لیکن سچ پوچھئے تو ادبی حیثیت سے اُردو کی خدمت کا اصلی حق ادا کرنے والے پرچوں کی تعداد نصف درجن سے بھی کم ہے، ہم کو اس پر فخر ہے کہ زمانہ کا شمار اس مختصر جماعت کی صف اول میں ہے۔ شروع سے ہماری کوششوں کی کامیابی کا یہی معیار رہا ہے کہ زمانہ کے مضامین انکی ترتیب تہذیب، انکا لب و لہجہ، انکی متانت و سنجیدگی، غرض اور غایت اپنے مقررہ نظریہ سے گرنے نہ پائیں۔ اس کے صفحات بلا لحاظ مذہب و ملت ہر مفید مضمون اور دلچسپ مباحثے کیلئے یکساں کھلے رہیں۔ ہر تحریک کا جو ملک یا قوم کے فائدہ کیلئے جاری ہو کشادہ دلی سے خیر مقدم کرنا۔ ہر سوال کے مختلف پہلوؤں کو سنجیدگی و متانت کے ساتھ ناظرین کے سامنے بلا رعایت و رنگ آمیزی پیش کرنا زمانہ کا فرض اولین ہے۔ آج بھی اپنی ناچیز بساط کے مطابق زمانہ اس اہم فرض کو جوش و مستعدی کے ساتھ ادا کر رہا ہے۔ پچھلے سال کی فہرست مضامین پر ایک سرسری نظر ڈالنے پر آپکو معلوم ہوجائیگا کہ زمانہ کو ملک کے بہترین اہل قلم کی جس قدر امداد حاصل ہے وہ کسی اور رسالہ کو نصیب نہیں۔ اُردو کا شاید ہی کوئی انشاپرداز یا شاعر ہو جسکا بہترین کلام زمانہ میں شائع نہ ہوتا ہو۔ آجکل بہت سے رسالوں میں زمانہ کی پچھلی جلدوں کے مضامین اکثر بلا حوالہ نقل خاص مضامین شائع ہوتے رہتے ہیں۔ دلدادگان شعر و سخن کیلئے بھی زمانہ کے صفحات میں کافی دلچسپی کا سامان رہتا ہے۔ اردو کے بہترین شعرا کی تازہ ترین نظموں کی اشاعت کا فخر اسے حاصل ہے۔

پچھلے سال کے مضامین کیا باعتبار نوعیت اور کیا بلحاظ قابلیت اُردو ادب میں مستقل جگہ پانے کے مستحق ہیں۔ نئی کتابوں کی تنقید اور مختلف نوٹوں کے علاوہ زمانہ میں چالیس مضامین نثر اور اس سے کچھ زائد نظمیں شائع ہوئیں۔ ان میں سے بیشتر مضامین اُردو ہندی کے بڑے بڑے روزانہ اور ہفتہ وار اخباروں میں نقل ہوکر شائع ہوئے۔ ہمارے لئے اس سے زیادہ اور کیا خوشی کی بات ہوسکتی ہے کہ زمانہ کے مضامین کی زیادہ سے زیادہ اشاعت ہو۔ مگر اسکے ساتھ ہی اگر زمانہ کا حوالہ بھی دیدیا جائے تو مزید شکریہ کا باعث ہو۔

بہرحال ہماری کوشش ہوگی کہ آئندہ سال بھی ناظرین رسالہ کی ادبی خدمت میں کسی طرح سے کوتاہی نہ ہونے پائے ہم صدق دل اور خلوص نیت سے اس بات کے لئے دست بدعا ہیں کہ مثل سابق آئندہ بھی زمانہ کے مقاصد اعلیٰ اور اسکا معیار بلند رہے۔ ہم اپنے شائقین کی خدمت کے لئے ہمیشہ آمادہ ہیں، اور اس ناچیز خدمت کو اپنی زندگی کی آخری گھڑی تک جاری رکھنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ ہم ہندستانی زبان کے سچے بہی خواہ ہیں، اسکی ترقی کیلئے اپنے کئی جتن نثار کرنے کو مستعد ہیں، ہماری کوشش و عقیدت، خلوص و استقلال کامیابی کا مستحق ہے۔ اور جب ہم اپنی بے بضاعتی اور بے سروسامانی پر نظر کرکے دیکھتے ہیں کہ تمام مشکلات کے باوجود بھی "زمانہ" ابھی تک سرگرم خدمت ہے تو ہم کو یقین ہوجاتا ہے کہ تائید غیبی ہمارے شامل حال ہے، آیندہ اسی کا بھروسہ ہے، لیکن اسی کے ساتھ علم دوست احباب کی روز افزوں اعانت و ہمدردی کی بھی ضرورت ہے۔ محض دلی قدرشناسی یا زبانی ہمدردی سے کوئی فائدہ نہ ہوگا۔ اس ہمدردی کو عملی صورت اختیار کرنا چاہیئے۔ قدرشناس ناظرین نے ابھی تک "زمانہ" کی توسیع اشاعت پر کوئی دھیان

ہی نہیں دیا ہے۔ حالانکہ بہت سے احباب ایسے ہیں جن کے لئے ایک ایک دو دو نئے خریدار پیدا کر دینا کوئی مشکل امر نہیں ہے۔ سررشتۂ تعلیم نے "زمانہ" کو ہر صوبہ کے اسکولوں کے لئے پسند کر لیا ہے۔ لیکن ابھی بہت سے اسکول ایسے ہیں جن کی توجہ اس کی خریداری کی طرف مائل نہیں ہوئی ہے۔ دیسی ریاستیں بھی اپنے اپنے قلمرو کے مدارس کے لئے رسالہ کو خرید سکتی ہیں بہت سے احباب اپنے معزز دوستوں سے زمانہ کی خریداری کی سفارش کر سکتے ہیں۔ غرض ہمارے قدردان ذرا سی توجہ سے بھی کام لیں تو زمانہ کی نہ صرف موجودہ مشکلات ہی کا خاتمہ ہو جائے بلکہ اس کی آئندہ زندگی کی ضمانت بھی ہو جائے۔ غرض ہمارے قدردان ہماری امداد و حوصلہ افزائی پر کمربستہ ہو جائیں تو کیا نہیں ہو سکتا ہے۔ کم سے کم ہم اس کے مستقبل سے تو بے فکر ہو ہی سکتے ہیں۔ ہم کو بھروسہ ہے کہ احباب کی بروقت امداد سے اتنے دنوں کی محنت رائیگاں نہ ہونے پائیگی۔ بلکہ "زمانہ" کے استقلال و ترقی کی کوئی نہ کوئی صورت ضرور پیدا ہو جائے گی۔ ہم اپنی طرف سے اس کو زندہ رکھنے اور معراجِ ترقی پر پہونچانے کے لئے سب کچھ کرنے کو تیار ہیں۔ مگر اس خدمت میں ہمارا ہاتھ بٹانا ہندستانی زبان کے ہر ہی خواہ کا فرض ہے۔ اسی عزم اور اسی بھروسے پر ہم نئے سال کا خیر مقدم کر رہے ہیں۔ خدا کرے سنہ ۱۹۲۵ء مضمون نگاران و ناظرینِ زمانہ کے لئے مبارک ہو۔

زمانہ کے قلمی معاونین کی فہرست میں پچھلے سال چند قابل قدر ناموں کا اضافہ ہوا ہے۔ یہ سلسلہ آئندہ بھی برابر جاری رہیگا، اور ہمارے اکثر نوجوان مضمون نگار عنقریب ہی اردو کے چوٹی کے انشا پردازوں میں شمار ہونے لگیں گے۔

"زمانہ" کی گذشتہ جلدوں کا بیشتر حصہ اردو ادب میں مستقل جگہ پانے کا مستحق ہے، لیکن اس کے لئے بھی ایک علحدہ فنڈ کی ضرورت ہے۔ یہ مفید اور ضروری کام بھی بلا سرمایہ نہیں ہو سکتا ہے، لیکن زمانہ کی توسیعِ اشاعت سے اس میں بھی خاطر خواہ مدد مل سکتی ہے۔ اور رسالہ کے محاسنِ ظاہر و باطن میں بہت کچھ اضافہ ہو سکتا ہے بہرحال عرض کرنا ہمارا فرض ہے، شنوائی کرنا یا نہ کرنا قدردانانِ زمانہ کا کام ہے۔ اپنی طرف سے ہم خدمت کے لئے مستعد ہیں، آپ بھی ضروری امداد سے دریغ نہ فرمائیے تو یقیناً نیا سال "ناشر" اور "زمانہ" دونوں کے لئے مبارک ثابت ہو۔

تصحیح

ہمکو افسوس اور ندامت ہے کہ کارکنانِ رسالہ کی کوشش کے باوجود "زمانہ" کے پچھلے نمبروں میں لکھائی چھپائی کی بہت سی غلطیاں رہ گئیں۔ اکتوبر کے بعض علمی نوٹ کی عبارت بہت غلط چھپ گئی۔ زمانہ نومبر کے مضمون "حضرت مقدر کی تاریخگوئی" میں بعض فاش غلطیاں رہ گئیں جن سے اس مضمون کا لطف بہت کم ہو گیا۔ ان غلطیوں پر جس قدر اظہارِ افسوس کیا جائے کم ہے۔ ہم ان کے لئے ناظرینِ زمانہ و صاحبِ مضمون سے خواستگارِ معافی ہیں۔ چند غلطیوں کی تصحیح ذیل میں کی جاتی ہے، ناظرین نوٹ فرمالیں۔

صفحہ ۲۷۸ سطر ۱۲ - دوسرے مصرعہ میں "وقر" ہے بمعنی قلعہ

" ۲۷۹ " ۱۵ - پہلے مصرعہ میں "سہاں" کی جگہ "یہماں" پڑھئے۔

" ۲۸۰ " ۱۹ - "تمیز" کے بجائے "تمیہ" صحیح ہے۔

" ۲۸۱ " ۱۵ - "آہ اکمل خاں حکیم شان مسیحائے زمن" میں "عالیشان" چاہیئے"

" ۲۸۲ " ۱۵ - "حیف بہ اوستاد کامل نظر" میں "نظرے" چاہیئے۔

" ۲۸۲ " ۲۱ - دوسرے مصرعہ میں "نکرد" کی جگہ "نکوز" چاہیئے۔

" ۲۸۳ دوسرے مصرعہ میں "جوان" کے بجائے "عیاں" چاہیئے۔